

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

ستمبر 2016

گلران علی

سحران جلیل



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM





07

انشاریکہ

جون ایلیا

سارے شاعر کے علاوہ
کے والے مسیحا کا توحہ

08

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و دستارین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور چٹا بوس مشورے

16

ننگ و ناموس
کی داستان

الیاس سیتاپوری

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

107

آخری گلاس

تنویر ریاض

کالج کے گلاس اور دل ٹوٹنے
کی آخری صدا کی گونج

72

شیش محل

اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ
بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

61

پھر یاد آئی

طاہر جاوید مغل

رشتوں کو تڑپوں تلے روندنے
والے ایک فاحش کی بے بسی کا احوال

150

مخفل شعرون

قاری تین

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نئے جگہ تک
آپ کی پسند آپ کے فوق سے ہم آہنگ

147

کوٹا اندیش

سلیم انور

حیا لاک چور کی خود
فسرینوں کا دلچسپ ماحیرا

118

کوہ گراں

مرزا امجد بیگ

اندھے کنویں میں چھب لنگ لگانے
والے ایک عاشق کی نامرادیوں کا قصہ

جلد 46 • شماره 09 ستمبر 2016 • در سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے

خط کتابت کاپتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 فیکس: (021) 35802551 E-mail: jdp-group@hotmail.com

پہاڑ تلے

اثر نعلانی

جے ایس این کی بے ایمانی شجاعت کرنے کے لیے ایمانداروں کی تھوڑی سی بے ایمانی

لاچر کولا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

غیر ملکی معاشرے اور نئے پس منظر میں انوکھا منظر

مار جوئی

محی الدین نواب

ایک چوڑی روپ کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل با سلسلہ

محبوب الہی

ضیاء تسنیم بلکرامی

حضرت نظام الدین اولیاء کی زندگی کے شیب و سنراز

عفريت

ثمر عباس

انسانی خون سے پیاس بجھانے والے ایک عفريت کا ماجرا

خسارہ

زویا اعجاز

جیسی کھیتی ویسی فصل کے مصداق زمین پر بسنے والوں کا انتخاب

رخ تقدیر

سلیم فاروقی

زمین کے اٹھ کر آسمان پر یہ ٹھننے والے ایک فیے کی حقیقتوں کی عکاسی

آحیات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

موت کے بعد زندگی پانے والے ایک حیات کی داستان

غیر ملکی کہانیاں

منظر امام

ایٹھائی مختصر... بکر جامع پر لطف تحریر... ایک مختصر و انداز

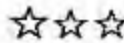
ابتلا

جہاں تم ہو وہاں انسانیت گندی اور گھناؤنی بیماریوں میں پڑی سڑ رہی ہے، افلاس اس کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے اور اس کا لہو چوس رہا ہے اور محرومی اس پر جھکی ہوئی اس کے پھوڑوں سے رستی ہوئی پیپ چاٹ رہی ہے اور اس کے تیار دار ہیں کہ اپنے سانس روکے ہوئے دور کھڑے ہیں اور اگر کوئی پاس سے گزرتا بھی ہے تو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر۔ اطراف و جہات میں سمیت سرایت کر چکی ہے۔ ایسے میں کسی احتیاط سے بھلا کیا ہوگا؟ تم بدروزگاری میں مقیم ہو اور بیماری میں متوطن۔ جہاں فضا کو عارضہ لاحق ہو اور ہوا اعلیل ہو گئی ہو وہاں کس کی خیریت مزاج، دریافت کی جائے گی۔ مہلکے میں سانس روکا تو کیا اور سانس لیا تو کیا؟

یہ بیماریاں نسلوں سے پالی جاتی رہی ہیں اور یہ پھوڑے زمانوں سے پک رہے ہیں۔ جنہوں نے اس کیفیت کا رونا رویا نہیں ہمیشہ عافیت دشمن کہا گیا اور کہا گیا کہ یہ تو مقسوم ہے اور مقسوم سے کس نے سرتابی کی ہے اور یہ بھی کہ صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پہلو میں بیماری بھی پائی جانی ہو اور ایسے بھی جالینوس ہیں جنہیں جو نسخے بہت زیادہ عزیز ہیں وہ صرف انہی کو استعمال کرانا چاہتے ہیں، خواہ بیماری کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

بے لاگ تشخیص، بے باک تجویز اور بے لوث علاج کے بغیر بیمار کی صحت اور اپنی عافیت کی امید باندھنا ہوسنا کی ہے۔ قریب ہے کہ یہ ہوسنا کی خود تمہیں اس حال تک پہنچا دے کہ دنیا تمہاری عیادت کرے، یہاں تک کہ تعزیت فرض ہو جائے مگر تم ہو کہ اصل علاج کو طرح طرح سے ٹالنا چاہتے ہو اس لیے کہ اس علاج میں بیمار سے زیادہ بیمار داروں کو پرہیز کرنا پڑے گا۔ پس وہ کچھ ایسے نسخے استعمال کرانے پر زور دیتے ہیں جن میں بیمار کو پانی کے ساتھ سفوف پھانکنے اور بیمار داروں کو معجونیں اور مرے چاٹنے کی ہدایت کی گئی ہو۔ وہ فرض تشخیص کیا گیا ہے جس کے علاج سے بیمار کو شفا ہونے کے بجائے بیمار داروں کی نومندی میں اضافہ ہو۔

پر کیفیت حال کچھ ایسی ہے کہ اگر اب بھی بیماری کا صحیح علاج نہ ہو تو پھر سب ہلاکت میں پڑیں گے اور یہ دامن دراز ابتلا سب کو چاٹ جائے گا۔



عزیزانِ من
السلام علیکم!

یادِ ستمبر 2016ء کا شمار آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ لیجئے جناب ہماری قومی یادگار تاریخوں میں سے 6 ستمبر یومِ دفاع اور 7 ستمبر یومِ فضا ہے۔ تاریخی لمحات کی یادیں لیے ایک بار پھر حاضر ہیں اور ہم پھر سے صرف دن منانے کا فریضہ انجام دیں گے..... گزشتہ دنوں جشنِ آزادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں کہ اچانک 8 اگست کو بلوچستان کے صوبائی دار الحکومت کوئٹہ کے سول اسپتال میں انسانیت کے دشمنوں نے دہشت گردی کا مظاہرہ کر کے پاکستانیوں کے دلوں کو لبو لہان کر ڈالا۔ جس سے یومِ دفاع کے بنیادی مقصد پر بھی ایک سولہ نشان بن گیا ہے۔ اس سے پہلے کراچی میں آرمی کے جوانوں پر کھلے عام قاتلانہ حملہ..... جس میں دو جوان شہید ہوئے۔ کیا اس سے تحفظ فراہم کرنے کے دعوے ریت کی دیوار ثابت نہیں ہو رہے۔ ایک طویل عرصے سے پاکستان دہشت گردی کی زد پر ہے..... ایسے میں تو حفاظتی انتظامات کا وہ معیار ہونا چاہیے تھا کہ کسی کے ایک قدم کی لڑکھڑاہٹ سے ہی اس کی غلط سٹ کا احساس ہو جائے مگر ہم صرف باتیں ہی کر سکتے ہیں اور کارروائی کرنے والے اپنا کام کر گزرتے ہیں..... اب چاہے یہ دھماکا انہوں نے کیا ہو یا غیروں نے..... یہ سانحہ تو بہت سارے گھروں میں صفِ ماتم بچھا چکا..... جو تعلیم، قابلیت اور مقام لوگ سالوں میں حاصل کرتے ہیں انہیں یوں چند لمحات میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ یہ لکھ کر یہ نہیں تو کیا ہے۔ عوام سراپا احتجاج ہیں کہ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا.....؟ مگر مانہ کارروائیوں کو اگر ٹھیک سطح پر ہی چل دیا جائے تو شاید جرائم پرورش پاک بڑے پیمانے پر ایسے سانحات کی وجہ نہ بنیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے کئی مقامات پر تیز بارش نے باغیچہ طبعی کے دعوؤں کی بھی حقیقت کھول دی۔ یہ قدرت کی رحمت تھی جسے بدانتظامی اور تاہلی نے عوام الناس کے لیے زحمت بنا ڈالا اور بعض مقامات پر یہ رحمت سیلابی تباہی کی شکل میں بدل گئی۔ اللہ نے انسان کو عقل و شعور سے صرف اپنے مفادات کے منصوبے بنانے کے لیے ہی نہیں نوازا بلکہ دوسروں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں منصفانہ اصولوں پر ادا کرنے کے لیے بھی اسے استعمال کرے اور..... جب ایسا نہیں کیا جاتا تو حنا کے آستے ہی خطرناک نکلتے ہیں۔ یہ ناقص پالیسیوں کا بھی نتیجہ ہے کہ ایک طرف سیلابی صورت حال ہے اور دوسری طرف صاف پانی روڈ پر بہہ رہا ہوتا ہے اور گھروں میں بوند بوند کوترسنے والے شہری اپنے گھروں کے تعلق کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ اب دیکھیے صوبائی سطح پر روزِ راز کی تبدیلی حالات و ماحول میں کوئی مثبت بدلاؤ بھی لاتی ہے یا..... میں تیرا حاجی گوتم تو میرا حاجی بنو“ والی کیفیت برقرار رہتی ہے کیونکہ سیاسی جماعتوں کی مخالفتیں اپنی جگہ مگر..... کھاتے وقت تمام انگلیاں برابر ہوجاتی ہیں۔“ حقائق کی آنکھوں سے انکار ممکن نہیں مگر ہم اپنی محفل کی مٹھاس کیسے بھول سکتے ہیں تو چلیے جناب پھر دیر کس بات کی.....

محمد مرتضیٰ، جنگ سٹی سے بڑی امیدوں کے ساتھ تہجرہ لے کر حاضر ہو رہے ہیں۔ ”خوبصورت کہانیوں سے سچے ڈائجسٹ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے گھر پہنچے تو اطمینان کا سانس لیا۔ سرورق پر بڑے نور سے نظر ڈالی تو مردانہ وجاہت کا کوئی شاہکار نظر نہ آیا۔ صنفِ نازک، حسینہ ماہِ حیدر کی موتی موتی خوب صورت آنکھیں اداسیوں کی داستان سناتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ دل و دماغ کو آنکھیں بنا کے پڑھا۔ انشائیہ کیا تھا ایک المیہ تھا پھر پوچھل اور سو گوار قدموں کے ساتھ اداریہ پڑھا۔ دہشت گردی کی بہت بڑی سنگین اور سنگدلانہ واروات امجد صابری کے، جہانگیر گل کی خبر نے پورے ملک کے ہر طبقہ فکر کو کربناک درد میں مبتلا کر دیا اور پھر عبدالستار ایدھی کی وفات نے تو جسم و جاں پہ غم کے پہاڑ گرادیے۔ اس کے بعد فقیر اقبال گچہ فرام بھکر کو کری صدارت کی بات سیٹ پر برا بھان پایا۔ دل کی پر خلوص کہرائیوں کے ساتھ مبارک باد۔ اس کے بعد صادق مجاویہ سعیدی فرام خان پور ضلع رحیم یار خان بجلی اور واپڈا والوں کو کوسے اور سپنس ڈائجسٹ سے پر خلوص اور بھی نہ مٹنے والی کشمکش نبھاتے نظر آئے۔ آپ کا مشورہ انتہائی مناسب ہے مگر نثار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ محمد صفر مجاویہ ہمارے پڑوسی ضلع خانیوال سے اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ ایک مکمل اور دلکش تبصرے کے ساتھ دل کی دھڑکنوں میں خوشیوں کے ارتعاش جگانے میں کامیاب رہے۔ سید عبادت کاظمی ذریعہ اسامیل خان سے اپنے دکھوں اور اداسیوں کو الفاظ میں ڈھال کر بیان کرتے نظر آئے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کو دل کی کہرائیوں سے پر خلوص جذبوں اور بے پناہ دعاؤں کے ساتھ سالگرہ مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔ رمضان یا شا اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل صحت دے اور آپ اسی طرح سپنس ڈائجسٹ سے اپنی کہری وابتسالی کا اظہار کرنے آتے رہیں۔ اس کے بعد دلوں میں لچل چلی داستانوں اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرتی کہانیوں کی جانب دھمے دھمے بڑھے۔ داستان رزم و بزم، الیاس سیتا پوری اپنے منفرد اور جداگانہ انداز میں تاریخ کے جھروکوں سے سبق آموز واقعات لے کے آئے۔ خالی پن، خوریر ریاض اپنی کہانی میں سپنس اور دلچسپ موڑ لے کے آئے۔ سپنس ڈائجسٹ کے صفحات سے ابھرتی اور ظہور ہوتی ہوئی یادگار اور مرد و محبت سے بھری داستان شیش محل اساقہ قوری کے علامہ خیر قلم سے نکلے محبت کے موتی دل کے فرش پہ بچھا کے آنکھوں کے آنسوؤں سے چنے۔ گرمیوں کی جس زندہ راتوں میں اور دن کی کھلتی دھوپ میں ٹھنڈک بھرا مرہم بن کے شیش محل کے الفاظ ہماری زندگی کو جلا بخشتے ہیں۔ عمدہ منظر نگاری، زبردست تحریر دل کے تاروں کو چھیڑنے میں کامیاب رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ایک جانا پہچانا اور اپنا ہوا ہوتا ہوا نام، ان کے پرسکون قلم سے آتش فشاں کو کوڑے میں بند کرتی کہانی ”وصیت“ سپنس ڈائجسٹ کے صفحات پر جلوہ افروز ہوئی۔ جس میں دو بچی اور لاڈ وال محبت کے امینوں کو جدا کرنے کے عذاب میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور آخر میں دنیاوی آزمائشوں کا مقابلہ کرتی طوطی نے اپنے شوہر کی وصیت پر عمل کر کے اپنے سر کو بتا دیا کہ رشتوں کی اہمیت مال و دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ”حکمِ ربی“ میں ملک صفر حیات نے ہمیشہ کی طرح اپنی خدا واد صلاحیتوں



سے کیس کو حل کر لیا۔ ”بندگی“ میں مصنف اختر علی نے ایک مجبور، لاچار اور بے بس غریب گھرانے کی لڑکی کے انتقام کا واقعہ بیان کیا۔ رشید جو کہ نہایت چالاک، کینہ پرور اور مطلب پرست انسان تھا۔ دوسروں کے حالات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا اور بلیک میلنگ کر کے اپنا مطلب نکالنا اس کا پیشہ تھا۔ آخر کار اپنی خراب اور بری عادتوں کے باعث قتل ہو گیا۔ محفل شعر و سخن میں محمد زاہد سیال، سیدہ ثانیہ کاظمی، ہادیہ ایمان، ماہا ایمان، افضل خان اور محمد قاسم کے انتخابات دل کی دلکشی اور رومانیت بڑھانے میں کامیاب رہے۔ ”دھماکا“ کہانی میں عظیم جمال نے اس قول کو جی ثابت کر دکھایا۔ ”جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں جا گرتا ہے۔“ محی الدین نواب صاحب مرحوم کے پراسرار اور بے چین قلم سے لکھی داستان ماروی آہستہ آہستہ قارئین کے دل کی دھڑکن بنتی جا رہی ہے۔ جس طرح سورج کی کرنیں دھند کو ختم کر کے انسان کی راحت کا سامان بنتی ہیں، اسی طرح ماروی کہانی تنہا اور اس راتوں میں رات کی رانی کی خوشبو بن کے ہمارے دل کی فضا کو معطر کر رہی ہے۔ منظر امام صاحب کی آگ کا دریا محبت جیسے نازک اور سلگتے موضوع پر لکھی گئی کہانی بہت عمدہ ہیرائے میں لکھی گئی تھی۔ روحانی سلسلے کی ایک اور عظیم کڑی شیخ نجیب الدین متوکل، حضرت بابا فرید گنج شکر کے برادر محترم جن کے ایمان افروز واقعات نے روح کو تسکین پہنچائی۔ ڈھونگ سلیم انور ہمارے لیے ادب سے حقد لے کے آئے۔ پولیس نے اپنی حکمت عملی سے زیور نیلی جیسے خطرناک مجرم سے اعتراف کروایا اور آخری صفحات پر مرحوم کا شرف زبیر صاحب جن کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کا ٹپ جاتے ہیں۔ اسیر خیال ایک ایسے انسان کی داستان جو خونی رشتوں کا ڈسا ہوا تھا۔ بڑے دلچسپ موڑ دے کے کہانی کے رموز و اوتاف کو بیان کیا گیا۔ اگر قیصر کوڈا کٹر عزیز جیسا فرشتہ صفت انسان نہ ملتا تو اس کا کامیاب نفسیاتی علاج ممکن نہ تھا۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ سہنس ڈائجسٹ کی ہر سطر دل اور دماغ کے حسین استخراج کو ملا کے اور اپنے لاشعور میں خوشیوں اور امیدوں سے بھری دنیا بنا کے پڑی جاتی ہے۔ برائے مہربانی نئے تبصرہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اپنے پراتے چاہنے والوں کو مت بھولیں۔“ (آپ کی بات سے سو فیصد ہم اتفاق کرتے ہیں۔ یہ محفل اور یہ رسالہ آپ سب کے لیے ہی تو ہے۔ یہاں سب اپنے ہیں، کوئی غیر نہیں)

✽ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانوالہ سے دوڑے چلے آ رہے ہیں ”اگست کا سہنس 16 کو سرور بیس کراچی میں ملا۔ اس دفعہ انکل نے سرورق کو خزاں کے مانند دکھایا۔ ماڈل کو سائنولی سی صورت دے کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی جیسے آنے والے وقت کی امید میں ہو کہ شاید ہمیں بھی بہار دیکھنا نصیب ہو۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی ایک آرزو تک پہنچے جہاں پر محترم اپنے اندر کا درد و کرب اپنے قلم کے ذریعے باہر نکالتے نظر آئے۔ اندر کا دکھ واقعی بہت دردناک ہوتا ہے۔ ادارہ میں آپ تک آئے سچ کہا، دن منانے کا کیا فائدہ، جس مقصد کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ وہ مقصد دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا، بے روزگاری، دہشت گردی، بے راہ روی، ظلم و ستم کی وجہ سے ہم دنیا میں بدنام ہوئے۔ ذہنی طور پر میں خود کو آج بھی غلام دیکھتا ہوں۔ جو شخص صرف اقتدار روپے پیسے کا غلام ہو وہ خاک اچھا سوچے گا۔ پاکستان کے بارے میں۔ اللہ رحم فرمائے ہم پر۔ بے آسراؤں کا آسرا، بے سہاروں کا سہارا، بے پاؤں کا سر ڈھانپنے والا یتیم کو آغوش میں لینے والا خدا کا عظیم تر حقد عبدالستار ایدی سی اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایسا انسان صدیوں میں کوئی ایک ملتا ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ انہوں نے اپنی آنکھیں بھی عطیہ کر دیں میرا ہاتھ خود بخود دھو دھو دھو گیا۔ قیصر اقبال کو عمدہ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ آپ آئے اور چھا گئے بہت مبارک ہو۔ سزا صدیقی آپ کی دعاؤں کا بہت شکر یہ آپ نے مجھے دینا کہا، اگر میں آپ کو ماں جی کہوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا، ماں کو گزرے اس جہاں سے بارہ برس پہلے کو آئے، زبان ترس گئی ماں کہنے کے لیے۔ اللہ پاک آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ لمبی عمر نصیب فرمائے۔ کاشف زبیر کی اسیر خیال بہت عمدہ تحریر تھی۔ قیصر جمال کی زندگی بہت ٹھن گزری پھر کچھ بہتری آئی پھر ایک حادثے نے اسے خیالوں کی دنیا میں پہنچا دیا مگر ڈاکٹروں کی محنت سے وہ اپنی دنیا میں واپس آیا اسے شیمال گنی جو خود بھی ایسی ٹریجڈی سے گزر چکی تھی۔ کہانی کے دو حصوں کو آخر میں جس طرح ملایا یہ کاشف زبیر کی مہربان منت تھا آپ کو میرے دھیروں سلام۔ پھر شیش گل پہنچے جہاں فاروق کی واپسی، ربین دادا کا ولیم سے حساب چمکانا، آغا کو انجام تک پہنچانے کے لیے دادا کا بخوسر ہونا، بلا کا چاند بانو پر حملہ کرانا، ماجد علی کا فاروق سے ٹکرائنا اور زندگی کی بازی ہارنا آخر میں اکبر کی مدد کرنا دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے اکبر اور پارو کا۔ ماروی تک پہنچے جہاں گھمسان کارن پڑا ہے۔ سیر پر کوئی سوا سیر آنا چاہتا ہے پر ابھی سیر بھاری پڑ رہا ہے۔ ماروی کی موت کا دکھ ہوا۔ الیاس بیتا پوری کے قلم سے تاریخی تحریر داستان رزم و بزم پڑھی۔ یہ حقیقت ہے دشمن کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا جتنا خود بادشاہ کی بے راہ روی اور انہوں کی غداری کی وجہ سے مات کھانی پڑتی ہے شاید درد داغ کے دل پر اسلام اثر کر رہا ہے یا پھر علیہ۔ تنویر ریاض کی خالی پن بھی اچھی تحریر رہی۔ کرداروں کو صحیح طریقے سے ڈھالتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالرب کی خوب صورت تحریر وصیت۔ اگر میں اس کو سبق آموز تحریر کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ جو کچھ شاد احمد نے افکار کے ساتھ کیا وہ اچھا تو نہ تھا ہمیشہ کبھی بھی رجبہ اور پیسا ایک کے پاس نہیں ٹھہرا۔ ملک صفدر حیات حکم ربی کے ساتھ جاوید کے قاتلوں کو ڈھونڈنا مشکل تھا پر ملک صاحب کے لیے نہیں۔ علی اختر کی بندگی میرے خیال میں زونیلانے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا کیونکہ جس قسم کا رشید کا کردار تھا اس کی سزا یہی بنتی تھی۔ محفل شعر و سخن کو بہترین اور عمدہ اشعار سے مزین دیکھا۔ عظیم جمال دھما کا لے کر آئے۔ مل ٹاپوں اور چین کونہ اور ڈوکوم سے اڑانا چاہتے تھے۔ وہ ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر مارنے کے چکر میں پڑ گیا تو پھر گئے تینوں جان سے۔ منظر امام آگ کا دریا لے کر آئے، مولوی صاحب کے کردار نے متاثر کیا وہیں اسلم کی ہمت کی داد دینی پڑے گی۔ شیخ (نجیب اللہ) نجیب الدین متوکل کے بارے میں پڑھ کر دل کو منور کیا۔ اگست کا پورا شمارہ عمدہ اور بہترین تحریروں سے مزین تھا۔ اللہ پاک آپ کے ادارے کو اور زیادہ ترقی نصیب کرے۔ (آمین)“ (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✽ رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے کھالے چلی آ رہی ہیں۔ ”خطوط کی محفل میں اپنے خط کا جواب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب نے میرے خط کے جواب پر بہت خوب صورت تبصرہ کیا ہے۔ سب پڑھ کر بہت خوش اور حیران ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے محمد خواجہ کو کرسی صدارت اور آٹکھ کے آپریشن کی کامیابی کی مبارکباد۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ مرد حضرات کو ہر صورت غم روزگار کی تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ آپ نے جو اردو زبان کی



اہمیت کو سمجھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جو خوب صورتی اردو زبان میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ اردو دنیا کی سب سے آسان زبان ہے جسے کسی کو سمجھانے کے لیے دوسری زبان کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ آپ سب کی تعریف بہت حوصلہ دیتی ہے۔ اس دفعہ محفل میں طاہرہ گلزار کا نام نظر نہیں آیا۔ رضوان خونی کیوں غیر حاضر ہیں۔ ہم رسالوں میں ان کے اور رمضان پاشا کے اقتباسات اور شعر ضرور تلاش کرتے ہیں۔ مرزا گل، آپ نے خود کو ٹائٹل گرل سے کیوں ملایا۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں اپنا لکھا خط محفل میں نظر نہ آئے تو دنیا ویران لگنے لگتی ہے۔ محمد صفدر معاویہ آپ کا تبصرہ پڑھنا سب کے بارے میں خوب صورت تبصرہ کرنے والے خود کو کہتے دیکھی ہیں، پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آپ کا دل بہت اچھا ہے اپنا دکھ درد چھپا کر دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ عبدالجبار رومی، بے ڈی بی میں مقام آپ سب کی وجہ سے ہے۔ آپ نے جو محبت اور عزت دی ہے کسی خزانے سے کم نہیں۔ آپ سب کی طرح تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں گی۔ سسپنس میں اسلامی اور تاریخی خزانہ موجود ہوتا ہے۔ ماروی کی اقساط احساس دلاتی ہیں کہ نواب صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی، اسلامی اور دوسری مشہور شخصیات کی کہانیاں لا جواب ہوتی ہیں۔ شرعباس کی کہانیاں لا جواب ہوتی ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی راز ان میں ہوتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ملک صفدر حیات کی کہانیاں ہر ماہ ہونی چاہئیں، عورتوں کی عزت کرنے والا انسپٹر کاش پولیس کے ہر جگہ میں ہو۔ مرزا امجد بیگ کے مقدمات دلچسپ ہوتے ہیں، سب کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ عزت کا سوال، ناواقف اور گونگوں کی داستان چونکا دینے والی کہانیاں تھیں۔ ہمارے یہ رسالے، کتابیں ہمارے مصنفین کی وجہ سے شہرت پارہے ہیں۔ سسپنس کی 22 اہم شخصیات بے شک دنیا سے چلی گئی ہیں لیکن ان کی کہانیاں انہیں تاقیامت زندہ رکھیں گی۔ ہم کتنا ہی اچھا لکھ لیں ان کی تحریروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ میرے قلم میں اتنی طاقت ہے۔“ (آپ کا تبصرہ عمدہ رہا..... ایک بات کہنا چاہتے ہیں کہ رسالے سے متعلق بات چیت ادارے اور ایڈیٹر تک محدود رہے تو اچھا لگتا ہے، مگر ان اعلیٰ کو ذاتی طور پر پریشان کرنا ہرگز بھی مناسب بات نہیں۔ آپ کا بچھلا خط لیٹ ملا دوسرا وقت پر لہذا جگہ مل گئی۔ امید ہے آئندہ چند باتوں کا خیال رکھا جائے گا)

مرزا گل، درابن سے محفل میں معاونت فرما رہی ہیں ”گری سے بے حال حینہ پیاسے کوئے کی طرح منہ کھولے درخت کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شاید ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ جون ایلیا کا انشان یہ پڑھایوں لگتا ہے کہ میرے تمام خیالات کو جون ایلیا نے الفاظ کا روپ دے دیا ہے۔ اس لیے تو قلم کار کو معاشرے کا نباض کہا جاتا ہے۔ پھر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ وہی ہنگامے کھنی پٹنی باتیں، چٹ پٹے فقرے اور خوب صورت تبصرے کہ مزہ آگیا اور یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک بے کیف ماحول سے اٹھ کر رونق اور زندگی سے بھرپور ماحول میں آگئی ہوں۔ وکٹری اسٹینڈ پر اقبال گچہ رونق بڑھا رہے تھے۔ مبارکباد بھئی، کبھی کبھی دھرنا دینا پڑتا ہے۔ سرصفدی کی محبت ایک یار بھر اچھی لگی۔ آپ بیسی ماں پر بھی ہم بیسیوں کو فخر ہے۔ آپ کی دعا میں ہمارے لیے سب ساریہ دار ہیں۔ معاویہ تو بہت بڑھ گئے ہیں محفل میں۔ وارث علی ملاح ہمیں بس ایک دفعہ سرورق پر چھانا اچھا لگا دوسری مرتبہ آپ کی ”وہ ہوگی۔ ہم پر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا۔ ویسے آپ نے کیا خوب مراسلہ لکھا قسم سے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ سب سے پہلے شیش محل کی طرف چلا گیا۔“ تاہم البتہ سلامت رہی..... ہم تو سسپنس کے انتظار میں ایسے لگ جاتے ہیں جیسے گورالفر ولیم بہر حال 20 کول ہی جاتا ہے۔ جو زمین کو محبت کی سزا حویلی سے بے دخلی پر ملی جس پر کافی افسوس ہوا۔ پلیز بیہ فارق کو کہاں پھنسا دیا۔ اب جلد از جلد اسے ممی لاکر جو لیٹ سے ملائیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا تحفہ پڑھا۔ ایسی وصیت جسے سن کر روح کا نپ بھی۔ اچھا ہوا اس سے بہتر سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ ویلڈن جناب، علی اختر کی بندگی ایک یاد رہ جانے والی تحریر تھی۔ شاید سنئے رائٹر ہیں۔ اس کے بعد بہترین سلسلہ ماروی پڑھی جہاں سب کچھ ہو جاتا ممکن ہے نواب صاحب کی مہربانی سے معصوم عالی پر کافی ظلم ہوا..... مارویہ کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ منظر نامہ ایک بار پھر محبت بھری تحریر لائے۔ اسلم اور ناجو کے ملاپ نے دل خوش کر دیا۔ جگ جگ جیو میرے پیارے رائٹر..... پہلی تاریخی کہانی کے بعد کاشف زبیر کی جگہ نور ریاض نے لے لی..... جگہ پر ہو گئی۔ (جگہ پر ہو جاتی ہے مگر..... دلوں میں خلا کبھی نہیں بھرتا..... محبتیں ہیں آپ کی) پر ہمیں تو کاشف زبیر صاحب کی کہانی دیکھنے کی عادت ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اب مریم کے خان سے امید ہے کہ مغربی اسٹوری لے کر آئیں ورنہ ہمارا گزارہ ناممکن ہے۔ خالی پن بھی زبردست تحریر تھی، واقعی محبت کی سچائی سے کس کو انکار ہے۔ جب کاشف زبیر کی تحریر دیکھی تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہمارے دلوں میں تو ہمیشہ رہیں گے۔ اسیر خیال ایک اچھوتی منفرد تحریر تھی۔ سمیر اور قیصر کی مشابہت نے دل کو سکون دیا۔ جیسے بھی ہو شیمیا کو تو سمیر کا ہم شکل ہی کسی کوئی تول کیا محبت کرنے والا ویلڈن جناب۔ شعروں میں قیصر اقبال گچہ اینڈ محمد زاہد چھائے رہے۔ (تبصرہ دلچسپ رہا..... بہت عمدگی سے لکھا..... شکریہ)

سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”گری نے ہوش اڑائے ہوئے ہیں لیکن گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں سسپنس کی ورق دانی شروع کی۔ سرفہرست ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ حینہ مجھے کاظمی بھائی کی شکفت کی کاپی لگ رہی تھی جو کہ نئی دریافت ہوئی ہیں۔ سسپنس کا ٹائٹل ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جون ایلیا لگ کر تے نظر آئے مگر مجال جو کسی کے کان پر جوں تک نہ لگے ہو۔ جانے پہچانے سے قیصر اقبال کا کافی عرصے کے بعد تبصروں کی محفل میں نظر آئے اور آتے ہی صدارت پر قبضہ کر لیا جناب زرین آفریدی کو ہمارے پاس چھوڑنے پر بضد ہوئے مگر ہم نظر بچا کے نکل پڑے بھی آخر ہماری وہ اگر دیکھ لیتی تو پھر..... صادق معاویہ بجلی کا روتا روتا نظر آئے۔ نادر سیال رہائی کی مبارک ہو..... محمد صفدر معاویہ شاندار تبصرے کے ساتھ شریک محفل تھے۔ طاہرہ گلزار کی دھواں دھار انٹری پسند آئی۔ داستان رزم و بزم شمس الدین کی داستان حیات اچھی لگی۔ شیش محل میں کافی تبدیلیاں نظر آئیں۔ فاروق محبت کرنے والوں کا سچا ہے۔ میرا پسندیدہ کردار چاند بانو کا ایکسٹنٹ بھلا نے ہی کروایا ہوگا۔ جو لیٹ کا اس ماہ ذکر نہیں تھا۔ جو زمین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہی ہے جو لیٹ، گولو کا کردار اچھا لگتا ہے۔ ماروی تو سر سے گزر جاتی ہے۔ وصیت اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے طوبی اور انتہا درد بردہ ہوئے لیکن سینہ کو عمر بھر کے لیے بے سکون کر گئے۔ پچھلے ماہ دو تبصرہ نگاروں سے ملاقات کی خوب صورت پرستائی کے مالک کبیر عباسی جن



سے ملنے کی بہت خواہش تھی اور سویرے ٹھیکل کاظمی اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ قیصر کے کردار نے کچھ خاص ساثر نہیں کیا۔ شیدا اچھی رہی مابہر نفیات پر مبنی کہانی اچھا ساثر چھوڑ گئی۔ اگست میں ہمارا رزلٹ ہے یعنی ستمبر کے سپنس آنے تک ہم دیکھ چکے ہوں گے۔ محفل شعر و سخن میں اپنی کزن ثانیہ کاظمی، مہتاب احمد کے انتخابات اچھے لگے۔" (اللہ تعالیٰ آپ کو ذمہ داریوں کا سایا عطا فرمائے۔ آمین)

مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے محفل میں شریک ہیں۔ "اگست کا سپنس اور جون ایلیا صاحب کی ایک آرزو دونوں زبردست اور نٹ کھٹ محفل میں قیصر اقبال صاحب سر قمر ست ہیں۔ ظاہر ہے تبصرہ بھی خوب ہو گا۔ صفدر صاحب اور طاہرہ مگرار نے بھی اچھے تبصرہ لکھے۔ داستان رزم و بزم تاریخی داستان آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ گوٹ جیسے کردار ہیں جنہوں نے تاریخ کو اپنے گھٹاؤ نے کردار سے داغدار کیا، ایسے ہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی میر صادق ہو، میر جعفر ہو یا کوئی اور یہ سب مجرم ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو آج تاریخ کچھ اور کہتی۔ ڈاکٹر صاحب کی وصیت کا بھی جواب نہیں۔ شاعر جیسے کردار آپ کو افسانوں یا فلموں میں ہی نہیں بلکہ اصل زندگی میں جیتے جاتے کردار بھی ملیں گے۔ انجام خوب رہا، جیسے کوتیسا۔ ملک صاحب نے بھی نل کی گتھی بڑی جافشانی سے سلجھائی۔ مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے، ساجد صاحب مارے گئے۔ ہندو بھی خوب صورت تحریر اور انجام بھی خوب صورت مگر عظیم جمال صاحب بازی لے گئے، کیا بدیہی کہانی کو زبردست اسکرین پلے کے ساتھ حیران کن انجام بہت خوب عظیم صاحب بہت خوب۔"

محمد قمر صائم، قائد آباد، خوشاب سے پسندیدگی لیے حاضر ہیں۔ "لیجیے..... ایک سال کی طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی دوستوں کی محفل میں شرکت کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ خوش آمدید کہیں گے۔ (کمال ہے سال بھر غیر حاضری کے بعد اتنی دیدہ دلیری کہ خوش آمدید بھی کہا جائے) دراصل کچھ ہوا یوں کہ پچھلے جولائی کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا اور پھر سیمسٹر سٹم میں یوں مصروف ہوئے کہ راپٹوں میں کی آگنی مکر سپنس پڑھنا نہیں چھوڑا۔ ہر ماہ کی 18 تاریخ کو رسالہ ایجنسی سے طلب کر لیا کرتا تھا۔ تاہم تحریر، شام کا وقت ہے، سادوں کی بارش محفل کے تپتے رنگزاروں پر برس کے گویا چہار سو گل و گزار کر گئی۔ موسم انتہائی بہترین ہے۔ ورنہ آج صبح کی گرمی! الحفیظ والامان.....! چلتے ہیں تبصرے کی جانب۔ خدا لگتی کہوں تو جس طرح کسی وقت میں مسافر پسندیدگی کے باوجود پرچی آج کل شیش محل ہے۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے شیش محل کو بغور پڑھا کہ پچھلے واقعات سے تعلق بھی قائم رکھنا تھا۔ اگر سب سے پہلے شیش محل پڑھ لی جائے تو باقی شمارہ روکھا پھیکا لگتا ہے۔ ماروی میں اتنے کردار ہو گئے ہیں کہ..... ایس ابائی کتر نہیں بہت سزے کی تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اپنی محفل میں اس دفعہ کسی بھی اسیر زندان کی زندہ دلی نہ تھی۔ اب کوشش کروں گا کہ باقاعدہ حاضری دے سکوں۔" (یہ ہوئی نابات)

غلام حسین نوناری، چوک سرور شہید سے محفل میں شریک ہیں۔ "ماہ آزادی کا شمارہ 16 جولائی کو دستیاب ہوا۔ سرورق سے نکالیں چراتے ہوئے جون ایلیا کی ہر مغز تفریر و تحریر سے مستفید ہوئے۔ جون ایلیا کا دل احساس سے لبریز تھا اور اس احساس نے انہیں ایسی شاہکار تخلیق کا خالق بنا دیا۔ ان کی پر معنی گفتگو ذہن کے درپہلوں میں احساس کے کئی دروازے کھلی۔ محفل یاراں میں قدم رکھا، ماہ آزادی کے حوالے سے بھرپور اور جامع ادارہ پڑھنے کو ملا۔ حالات پاکستان کی منظر کشی خون کے آنسو رلا گئی۔ محفل کی صدارت فیس بک سے بہت اچھے دوست اور خلیق انسان قیصر اقبال کر رہے تھے۔ تبصرے میں سادگی اور بے ساختگی چار چاند لگا گئی..... بہت ہی عمدہ لکھا۔ پشاور والی بہن طاہرہ وگزار مری میں بیٹھ کر خط لکھا تو موکی اثرات خط میں بھی نظر آئے۔ نفرت بھرے جملوں کی جگہ چاشنی نے لے لی لیکن خط میں کہیں بھی ہمارا ذکر نہ پا کر ہم بہت ناراض ہوئے۔ رمضان پاشا نے دلچسپ انداز میں لکھا۔ بہت خوب۔ رضوان سلطان تنولی کریم زوی کی گشدگی معنی خیز ہے۔ بجٹی لوٹ آؤ نا..... دیکھو، محفل کتنی اداس ہے۔ ورنہ ہم ہوئے ناراض..... جب سے ماروی شروع ہوئی، ایک معمول سا چلا آرہا ہے کہ کہانیوں میں سب سے پہلے ماروی کو ہی پڑھنا ہے۔ اس ماہ بھی ماروی سے کہانیوں کا آغاز کیا..... داستان مرادو ماروی ظلم ہوشر باد داستان بن بچکی ہے۔ عابد علی منگی کم عمری میں جنائی مہمات سر کرتے ہوئے حقیقت سے دور کسی ہوشر باد داستان و گلداز کا شہزادہ لگا۔ ویسے ماروی اپنے اصل پلاٹ سے ہٹ چکی ہے۔ اب تو ہوا کے رخ پر اڑی جا رہی ہے..... آخری صفحات پر محبوب مرحوم مصنف کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی مگر دل غم سے بھر گیا۔ ان کی یاد نے افسردہ کر دیا۔ آہ..... کمال کا لکھتے تھے۔ ہر شمارے میں ان کی تحریر نظر آتی تھی۔ اب اتنے ماہ بعد ان کی کہانی شامل دیکھ کر غم و خوشی کے امتزاج سے آنسو بہہ نکلے..... کہانی بے مثال تھی۔ ہمیشہ کی طرح..... عمدہ اور مضبوط پلاٹ..... دلچسپ پتویشن اور خوب صورت منظر کشی..... شیش محل کی یہ قسط بہت پسند آئی..... اب تو اس پر اعتراض کرنے والے بھی اسے پسند کرنے لگے ہیں اور ہمیں تو خیر شروع سے ہی ناپسند نہیں رہی۔ داستان رزم و بزم (الیاس بیتا پوری) وصیت (ڈاکٹر عبدالرب بھٹی) آگ کا دریا (منظر امام) بیٹ کہانیاں تھیں۔" (شکریہ جناب! محفل میں شرکت کا)

علی رحمان، سندھ لیا نوالی سے دیکھتے ہیں کیا فرما رہے ہیں۔ "سرورق کو دیکھ کر خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ پہلی مرتبہ آسمانی رنگ سرورق دیکھا۔ دل کو نہایت بھایا۔ لڑکی کو دیکھ کر ہمارے معصوم سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن ایک اور چیز کو دیکھ کر زیادہ تیز ہو گئی۔ وہ بھی لڑکی کا پوز ہے تو ہمارے پوز کرنے کا انداز ہے۔ ارے باپ رے آپ کو ہماری خواہش..... چلیے چھوڑیں۔ ڈاکٹر انکل کمال کے سرورق بناتے ہیں۔ کہانی کی فہرست دیکھی اور مطمئن ہو کر آگے بڑھے اور خطوں کی محفل میں داخل ہوئے۔ ادارہ پڑھا۔ کافی اچھا تھا۔ ہم آپ کی تمام باتوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ قیصر اقبال صاحب کرسی پر اکبر بادشاہ کی طرح اکڑ کر اپنی پوری شان و شوکت پیش کر رہے تھے۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ مبارک ہو قیصر بھائی۔ آپ سب کو چکر دے رہے ہیں خیریت ہے۔ مسز صدیقی نے کافی اچھا تبصرہ لکھا اور دعاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، امید ہے کہ آئندہ ہمیں بھی ملیں گی۔ رانا بشیر احمد طاہر انکل تو سب

کے دل کے تار ہلا دیتے ہیں۔ ہم تو ان کے عاشق ہیں۔ محی الدین نواب مرحوم کی ماری اچھی لگی۔ یہ قسط نہایت تیز اور پسندیدہ پانچ قسطوں میں سے ایک ہے۔ ان دنوں کی ٹیلی ویژن نے سٹار کیا۔ سٹریٹ ٹیلی ویژن نے جہاں میں حیران کیا وہاں بیودی خاص کر مسٹر ہوش کو پریشان کیا۔ آگ کا دریا منظر امام کی یادگار اور اچھی تحریر تھی۔ اسلام کی محبت اور مولوی صاحب نے کافی سٹار کیا۔ محفل شعر و سخن یوں تو تمام شعر اچھے تھے پر سیدہ ثانیہ کاظمی، محمد قدرت اللہ نیازی، سید عبادت کاظمی وغیرہ کے شعر اچھے لگے۔ دھماکا نہایت اچھی تحریر تھی۔ عظیم جمال کی تابوں اور جبین نے بلکہ ہاورڈ نے بھی حیران کیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا سب گئے کام سے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ ایک گزارش ہے کہ طاہر جاوید انکل سے آخری صفحات پر کہانی ہونی چاہیے۔ (جی جناب آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے طاہر جاوید مغل کے پاس..... اب دیکھیے کیا ہوتا ہے) محمد صفدر معاویہ نہایت اچھا عمدہ تبصرہ، آپ کا دوستوں کو ویکم کرنے کا انداز ہمیں پسند آیا۔ سید عبادت کاظمی نہایت افسردہ تھے۔ طاہرہ آبی کا تبصرہ جادو تھا۔ ایک بات آپ کی کچھ قلم کار حقیقت بیان کرتے ہیں زندگی کی تنخیاں جیسا طاہر انکل۔ ویسے آبی Happy Birthday مجھے بھی ملے ہے کہ مجھے بھی کسی نے Birthday دیا نہیں کیا۔ حسب معمول شیش محل سے آغاز کیا۔ ولیم کو دادا نے اچھی سزا دی لیکن دادا جیل سے رہائی پا گیا۔ اب ہمارا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ جو لٹ نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اس کے بعد چاند بانو کے زخمی اور زردیا نو (سوری گرمی میں نام بھی غلط ہو رہے ہیں) زرد بانو کی موت کا افسوس ہوا۔ ہلا کی چالاکی سامنے آگئی۔ جو زمین پر الزام لگنے سے ہمیں دکھ سا ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی وصیت پڑھی۔ نہایت اچھی کہانی تھی۔ ثار نے اچھا نہ کیا اپنے بیٹے کے ساتھ۔ آخر میں مرنے کے بعد بھی انکار نے اس کے ساتھ بدلہ لے لیا۔“

طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ آپ سب کو یوم آزادی بہت مبارک ہو۔ میرا خط بہت تفصیلی شائع ہوا ہے۔ اس بار اپنے فیورٹ عبدالرب بھٹی اور اپنے بہت ہی سویت بھائی کاشف زبیر کا نام دیکھ کے خوشی بھی ہوئی لیکن کافی دیر تک سسپنس ہاتھ میں لے کر اور سواگل میں کاشف بھائی کی تصویر کو دیکھ کر دیر تک روئی۔ میں نے ابھی تک ذہنی طور پر کاشف زبیر بھائی کی موت قبول نہیں کی۔ انسانیہ میں جون ایلیا ایک آرزو کو آرزو بنانے پہ لگے رہے اور اس دنیا سے یہ آرزو لے کر چلے گئے منوں مٹی میں کہ شہر کراچی پھر سے امن کا شہر بن جائے۔ کب یہ ملک ظلم و جبر کے اندھیروں سے نکل کر امن کی روشنی سے منور ہو جائے لیکن ہائے افسوس۔ مدیر اعلیٰ کی دل سوز اور کھری کھری بچی باتیں پڑھ کے سوچ میں پڑ گئی کہ حیرت کا مقام ہے کہ یہ ہمارے حکمران بے حس اور خود غرض زیادہ ہیں یا بے شرم زیادہ ہیں۔ چلتے ہیں اپنے دوستوں کی محفل میں۔ پہلے نمبر پر قیصر اقبال کچھ اتنے عرصے کے بعد آئے تو انکل نے رحم کھا کے کہ چلو مہمان ہیں کرسی صدارت پہ بٹھا دیا اور نہ تبصرہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ ان سے اچھا تبصرہ تو صفدر معاویہ اور ابراہیم وارث کا تھا چلو پھر بھی دل پہ ایک، ایک کلوا کا پتھر رکھ کے مبارک باد دیتے ہیں۔ (بہت بری بات ہے بھٹی یہ تو) سمنہ صدیقی کا تبصرہ بہت مختصر لیکن محبت بھر اور دعاؤں سے پر تھا۔ سید عبادت کاظمی بھائی یہ دنیا ہے یہاں دکھ زیادہ اور خوشیاں بہت کم ہیں، مرنا جیتا ہم سب کے ساتھ لگا ہے، ہمت و حوصلہ سے کام لو۔ پلیز تمام پرانے تبصرہ نگار حاضر ہوں۔ حسب عادت اساتذہ قاری کا شاہکار ناول شیش محل دیکھا۔ شیش محل پہ کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے لیکن تنقید کرنا بھی ضروری ہے۔ ہلا نے چاند بی بی پہ حملہ کیا، اتنا سخت چاند بی بی کے چہرے پہ صرف چند زخم آئے۔ جو زمین کی کہانی البتہ بہت دلچسپ جا رہی ہے۔ رہن دادا بہت ہی اسٹراٹگک کردار میں سامنے آ رہے ہیں۔ سسپنس کے آخری صفحات پر ہم سب کے فیورٹ کاشف زبیر کی آخری تحریر اسیر خیال پڑھی۔ مجھے اللہ پر مکمل بھروسہ ہے کہ اس نے اسی وقت میرے کاشف بھائی کو بخشا ہوگا۔ بہت ہی زبردست تحریر انسانی رویوں اور نفسیاتی الجھنوں میں ایک شاہکار تحریر جو برسوں نہیں بھلائی جا سکے گی۔ ایک ایک لفظ سے یوں لگ رہا تھا جیسے کاشف زبیر خود کو کتنی مشکل سے نفسیاتی تکلیف سے بچاتے رہے ہوں گے۔ کتنی بہادری سے اس نے زندگی گزار لی۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں سب سے اونچا مقام عطا کریں۔ آمین۔ سلیم انور کی مختصر تحریر ڈھونگ پڑھ کے بہت ہنسی آئی۔ بے چارے بلی کو خوش نہی میں رکھ کے اس سے حقیقت انکوائی..... اسلامی صفحات پر عرصے سے ضیاء تنسیم بلگرامی کی تحریریں پڑھ کے دل و دماغ منور کرتے ہیں..... منظر امام صاحب اس بار پھر ایک انوکھے اور بہت ہی حساس موضوع پر تحریر آگ کا دریا لے کر آئے۔ اپنے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے بھی اپنی تحریر وصیت پڑھی میں ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی نازک موضوع پر قلم اٹھایا۔ انکار نے بہت اچھا کیا اور بیوی کو ایسی انوکھی وصیت پوری کرنے کا کہا۔ اس بار ملک صفدر حیات ایک اور نرالا کیس حکم ربی لے کر آئے۔ جاوید جیسے شوہر کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے اور رحمت بی بی اور خالہ جیسی کم بخت عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا تو بہت اچھا ہوا۔ اس بار الیاس سیتا پوری داستان رزم و بزم میں داستان طوی لے کر حاضر ہوئے۔ یہ ان کے قلم کی جادوگری ہی تو ہے کہ قاری کو جس دور میں چاہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ تنویر ریاض کی تحریر خالی پن رائٹرز کے بارے میں بہت اچھی اور معلوماتی تحریر، بل جتنا مشہور شخصیت تھی اندر سے اتنا ہی چھوٹا انسان نکلا۔ کہانی کا ہیرو آخر کامیاب ہو گیا..... اپنے تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے ایک بار پھر التجا دوستوں واپس آ جاؤ۔“ (اتنا بڑا تبصرہ لکھنے کا شکر یہ مگر کبھی کبھی اختصار سے بھی کام لینا پڑتا ہے)

صادق معاویہ سعیدی، رحیم یار خان سے کھٹی بیٹھی باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگست 2016ء کا سسپنس زیب نگاہ ہے۔ سرورق کی دو ٹیڑھ مرحا گل کی دھڑا دھمکی پر، پریشانی محسوس ہوئی۔ خوب صورت فہرست میں کاشف زبیر کا نام دیکھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ جون ایلیا شہر قائد کے دکھ جھیلنے کی نوکری اور زخم دھونے کی چاکری بغیر تنخواہ کرتے رہے۔ جون ایلیا تو ہمارے اور لاکھوں پاکستانیوں کے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کا اداریہ ہمارا تولد دہلا دیتا ہے لیکن آپ کے خطاب صم بکم می اور دل، انسانیت، محفل و خرد سے جی دست و پی داماں ہیں۔ اپنی محفل میں حاضری دی۔ قیصر اقبال کچھ کرسی صدارت پر جلوہ فگن ہیں۔ مبارکال سرکار۔ پوری بزم و داستان سے یکسر مختلف، نہایت نفیس اور دل کو چھو تا تبصرہ خوب مزہ دے گیا۔ ہمیں یاد کرنے



کا شکر یہ اور اس دفعہ تو صدارت ہم سے ایک قدم کی دوری پر رہ گئی۔ تیرہ سو ستہ رے شجر سے امید بہار رکھ۔ طاہرہ گلزار جی اور وارث علی ملاح ہمارے احتجاج کا اندازہ غلط تھا، ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے پوری بزم دوستان اور ادارے سے معذرت خواہ ہیں۔ محمد صہد ر معاویہ آپ نے ٹھیک کہا کہ ہمارے سیاسی بازی گر الگ الگ نظریات کا ڈراما کر کے ہمیں کھینچنے اور برباد کرنے کے لیے قطعی متحد و متفق ہیں۔ اللہ کرے پاکستان کو قتلص اور پاکستان کی ہمدرد قیادت میسر آئے، آئین صہد ر معاویہ آپ کو دیکھ کر ہمیں بھی لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ سدا سلامت رہو۔ عظیم مسلمان سماجی قائد عبدالستار ایدھی کے لیے پوری امت سے تعزیت۔ ایسی تابعدار روزگار شخصیت شاید کبھی دیکھنے کو ملے۔ سب سے پہلے اپنے محبوب کاشف زبیر کی اسیر خیال پڑھی۔ تبصرہ کی گستاخی نہیں کرتا۔ شیش محل اسما قادری آپ تو کمال کرتی ہیں۔ قاروق کو واپس آ لینے دیں۔ اتنا تر پانا اچھا نہیں ہوتا اور لگتا ہے رہن و ادا اگلی قسط میں دلدار آغا کو چھاپ لے گا اور منظر امام کی آگ کا دریا، فلسفہ محبت کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا اور مولوی کے کردار کو ثبت اور صحیح انداز میں اجاگر کیا گیا۔ باقی ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے۔“ (تبصرہ کرنے کا شکر یہ)

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”برکتوں کا مہینا گزر گیا۔ جون کی گرمی رمضان کے روزے، بے تحاشا مہنگائی، بجلی کا شدید بحران، بحری میں بجلی نہیں، دن بھر بار بار بجلی جاتی رہی۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد نقص دور ہو کر بجلی آئی تو پھر لوڈ شیڈنگ کا وقت ہو گیا۔ ڈھائی گھنٹے پھر بجلی کے انتظار میں کٹ جا میں گئے۔ بڑے بڑے دعوے کیے تھے خادم اعلیٰ نے 3 سال میں بجائے سہولت کے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے جو غریب پیشین یافتہ یا ریٹائرڈ لوگوں کے مختلف آمدنی کے ذرائع سے نان نفقہ چلتا رہا اس میں بے تحاشا کمی کر دی گئی۔ نو جوان کو روزگار نہیں۔ آخر کوئی قانون ہے کہ جو ہمیں ایسے مسائل سے نکال سکے۔ سرورق پر خاتون کس طرح انجان پریشان سوچوں میں گم ہے۔ درخت پر پتی کو نہیں پھوٹ رہی ہیں۔ کیا حالات کی مار سہہ سلیں گی یا جل جائیں گی۔ جون ایلیا کی ایک آرزو، بڑی دردناک انداز میں کی گئی ہے۔ یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے اگر قوم زندہ ہو۔ ہمارا شہر جو سارے ملک کا پیٹ پالتا رہا، اسی کو بی لہو لہان کر دیا گیا۔ جون ایلیا آپ کے قلم کا نشتر کند ہو جائے گا لکھتے لکھتے لیکن کوئی اثر نہیں ہوگا۔ دوستوں کی محفل بڑی دل پذیر ہوتی ہے۔ ہمارے پیارے بھائی بہن نے محبت کے بندھن باندھ رکھے ہیں۔ ہم چھ بھائی ہیں لیکن بہن کوئی نہیں۔ طاہرہ گلزار بہن کی محبت پڑھ کر دل میں بہن کی کمی کی آرزو آنکھیں نم کر دیتی ہے۔ ایک رمضان پاشا ہیں۔ دوستوں کی محفل میں رہتے ہیں لیکن کسی دوست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنا اپنا مزاج ہے۔ تمام دوستوں کے تبصرے رنگارنگ ہوتے ہیں۔ داستان رزم و بزم، الیاس سینا پوری تاریخ کے اور ماضی کے واقعات کو زندہ و جاوید بنانے کے ماہر ہیں۔ میں تاریخ کا طالب علم رہ چکا ہوں اور تاریخی واقعات کا بڑا پرستار ہوں اور الیاس سینا پوری تاریخ کے استاد ہیں۔ بڑی عمدہ تحریر ہے اور سبق آموز بھی۔ شیش محل، کہانی نے بڑا موڑ لیا ہے۔ حالانکہ کہانی تیزی سے آگے بڑھی نہیں لیکن اپنی دلچسپی کو پوری طرح برقرار رکھا ہوا ہے۔ رہن و ادا، جوزفین اور قاروق سب نئی انجمنوں میں الجھ گئے ہیں۔ حکم ربی، انسپٹر ملک صاحب کی نیک نیتی پر خدا بھی ان کا مددگار رہتا ہے، ایک پڑون نے بڑے احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا اور آنے والے حالات کی پیش گوئی کر دی لیکن حالات نے عجیب انارنگ دکھا دیا۔ ظالم مشعل بن گیا۔ خالی پن، ایک غیر ملکی کہانی لیکن واقعی کسی بھی تخلیق احساس اور دلی جذبے کے ذریعے ہی وجود میں آتی۔ مصنف کی تحریر میں لکھنے کے ساتھ جذبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ غور سے پڑھنے والی کہانی وصیت، دولت سے کھیلنے اور رشتوں کو اہمیت نہ دینے والوں کی کہانی۔ ایک بیٹے نے اپنے دولت مند باپ کے لیے ایک وصیت ایسی چھوڑ دی کہ باپ کو خون کے آنسو روٹا پڑے۔ ایک بہت معمولی کہانی کو آخر کار بڑی جذباتی بناتی ہے۔ بندگی، ایک بد خصلت شخص کی کہانی جس کو زندہ رہنے کا حق نہیں تھا۔ جب وہ مارا گیا تو اس کا قتل ایک معاہدہ کیا۔ مجرم ایک معصوم لڑکی تھی جس نے ایک بڑا قدم اٹھایا، اپنی عزت کو بچانے کی خاطر۔ دھماکا، ایک شخص جو ایک شادی شدہ عورت کا محبوب تھا۔ دونوں نے مل کر ایک پلان بنایا کہ عورت کے شوہر کو بم سے اڑا کر عورت آزادی حاصل کر لے لیکن تدبیر اپنی ہو گئی۔ آگ کا دریا، ہمارے بعض علاقوں کے فرسودہ جرگہ قوانین پر ایک طنز بھری تحریر۔ شکر ہے کاری کے خلاف اب قانون بن چکا ہے۔ ورنہ معمولی دھمکی پر کارروکاری کا الزام دھر کے لوگوں کو قتل کیا جاتا رہا۔ ڈھونگ، ایک کمال کی تحریر۔ مجرم سے جرم کا اقرار کروانے کا انتہائی عجیب تجربہ لیکن ایسا طریقہ کار جس میں بہت ساری انتظامی سرگرمیاں۔ ایک آبادی کو جھوٹ موٹ بسانا۔ بہت سارے لوگوں کو اداکاری کرنا۔ ہمارے یہاں تو منٹوں میں اقرار جرم کروا لیا جاتا ہے۔ کتر نہیں، لطائف، حکایتیں، سنہری باتیں سب کچھ رسالے کا حسن بھی ہے اور چٹکارے بھی۔ اشعار میں بھی چنیدہ پھولوں کا گلہ ستر نظر آتا ہے۔ خدا اس رسالے کو ترقی دے اور قائم و دائم رکھے۔ آمین۔“ (بہت شکر یہ اتنا تفصیلی تبصرہ کرنے کا)

محمد شہباز ناز، سرگودھا سے تعریف لائے ہیں ”سب سے پہلے تو میں شکر گزار ہوں ادارہ سپنس ڈائجسٹ کا کہ آپ نے میرا خط شائع کیا۔ ٹائٹل کی بات کرتے ہیں حینہ بہت خوب صورت تھی ایک ہاتھ منہ پر نکالے سوچوں میں گم اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ میرے پاس ایک دوست فیصل حسن نے رسالہ دیکھا جس میں میرا خط شائع ہوا تھا، وہ بہت خوش ہوا، میں نے پوچھا کہ تم کون سا رسالہ پڑھتے ہو جبکہ وہ دوسرے رسائل شوق سے پڑھتا تھا۔ میں نے اس کو رسالہ پڑھنے کے لیے دیا جب وہ واپس دینے کے لیے آیا تو میں نے پوچھا کہ کیسا لگا؟ میرے دوست فیصل حسن نے بتایا، یار مزہ آ گیا زندگی میں پہلی بار سپنس پڑھا۔ دل کرتا تھا پڑھتا ہی رہوں ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ داستان رزم و بزم اعلیٰ پائے کی کہانی ہے۔ دھماکا اچھی تھی، آگ کا دریا اچھی تھی، مادی بیٹ کہانی۔ آخری قسط کا انتظار رہے گا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد ساز رکھے۔ آمین۔“ (پسندیدگی کا بہت شکر یہ..... آپ کا بھی اور آپ کے دوست فیصل حسن کا بھی)

اشفاق شاہین، لاہور سے محفل میں شریک ہیں ”سپنس کے ساتھ میری رفاقت تو برسوں پر محیط ہے لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں (مگر



کیونکہ بھی (جی جی سن تو لیں لاہور سے پہلی بار لکھ رہا ہوں، کراچی سے لاہور کے سفر نے سسٹن سے ایک ماہ کے لیے دور کر دیا تھا، خط لکھا بھی تھا، شاید نئے راستوں کی وجہ سے بروقت منزل نہ پاسکا، اب کے کوشش پھر سے ہے۔ سسٹن سے دوری تو براشت نہیں ہوتی، ہمارے بس میں ہوتا ہے پندرہ روزہ کر دیں (اللہ انہ کریں) خیر ڈائجسٹ 18 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بھی بہت خوب صورت تھا حسینہ انجانی سوچوں میں گھری نظر آئی۔ جون ایلیا کا انشائیہ ایک آرزو، تلخ حقیقت، جانے کب جون ایلیا کا خواب شرمندہ تعبیر ہو۔ محفل میں پہنچے جہاں قیصر اقبال کچھ اپنے مخصوص اور منفرد انداز کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے، بہت شاندار تبصرہ رہا آپ کا۔ صادق معاویہ اس بار وزارت آپ کے نام رہی، مزے کیجیے اور خوش رہیے۔ وارث علی ملاح اور صفدر معاویہ زبردست خطوط کے ساتھ شامل بزم تھے، کیا بات ہے۔ سب سے پہلے شیش محل کا مطالعہ کیا۔ چاند بانو ہلا کی فحشگی کا شکار ہوئی ہے، فاروق کیسے بدلہ لیتا ہے۔ ملا سے، یہ آگے دیکھیں گے۔ ربین دادا بھی دلدار آغا کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے، جو زمین سازش کا شکار ہو کر بے گھر ہوئی، ٹرین میں پھر فاروق اور ماجدی آگے چھوٹی بلکہ لڑائی ہوئی، ہنوز ہم جولیت کی فاروق سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ ماروی آہستہ آہستہ دیوتا بنتی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی اسیر خیال عام ٹاپک سے ہٹ کر تھی مگر ایک بہترین تحریر تھی خصوصاً قیصر کا کردار۔ ملک صفدر حیات حکم زبی میں اپنے تمام کرداروں میں انصاف کرتے نظر آئے۔ ملک صاحب کا سادہ پن شک تک نہ تھا لیکن چوٹ کھا یا بندہ کچھ بھی کر سکتا ہے، اچھی تحریر تھی۔ مختصر کہانیاں بھی اپنی جگہ بہترین تھیں، خصوصاً ڈھونگ اور خالی پن مزہ دے گئیں۔ تاریخی کہانی داستان رزم و بزم بھی لا جواب تھی۔ کتر نہیں بھی اس بار خوب رہیں۔ محفل شعرو سخن میں انتخاب اس بار بے مثال تھا خصوصاً زمین اعجاز، محمد قاسم اور انہم کمال کا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔

(بہت شکریہ جناب حاضری لگانے کا)

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں، پچھلے چند ماہ سے ایسی پریشانی میں مبتلا ہوں کہ تبصرہ تحریر کرنا تو دور کی بات شمارہ پڑھنے کی نوبت بھی کم کم آئی۔ آپ سب سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ پاک اس پریشانی کو آسانی میں بدل دے۔ (اللہ آپ کے مسائل حل کرے، آمین) اگست کا شمارہ بروقت لیا تو تبصرہ تحریر کرنے کا خیال آیا اور ہم نے کاغذ قلم اٹھالیا۔ جون ایلیا نے کیا تلخ حقیقت بیان کی کہ اس شہر کا نہ کوئی چارہ گر ہے نہ بیمار دار، دوسرے شہر صرف اس پر ترس ہی کھا سکتے ہیں۔ ادارہ بھی اس بار زبردست رہا ایسا لگا کہ "زیر پوائنٹ" کا کوئی کالم پڑھ رہے ہیں۔ جو لوگ دہشت گردی کا شکار ہوئے یا حادثات میں ہلاک ہو گئے ان کے پیاروں کے لیے تو قیامت واقع ہو گئی اور بازی مگر طبقہ بیانات تک ہی محدود رہا۔ رہی بات لوڈ شیڈنگ ختم ہونے کی تو وہ ٹانگن ہے۔ ایک سو میگا واٹ بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں بڑھی تو ختم کیسے ہوگی۔ سچ کہا سب کچھ ہے پر "اخلاص" کا قند ان۔ محفل کی صدارت پیارے بھائی قیصر اقبال کے حصے میں آئی۔ "ست ست مبارک" جناب! آپ نے تو چکر بازی کی حد کر دی اور محفل میں سب کو چکر دیتے نظر آئے لیکن یہ خواتین کے پاس رکنا ذرا نہ بھایا، کرسی صدارت کے پائے سے جسے صادق معاویہ اپنی ہمت دکھاتے نظر آئے۔ مسز صدیقی! بیٹیوں کے ساتھ ساتھ ہم بیٹوں کے لیے بھی دعا کر دینی تھی۔ محمد انعام! آپ معیاری مواد نکالنے کی بات کر رہے ہیں جبکہ حکومت 2018 تک تمام سرکاری تعلیمی اداروں کو پرائیویٹ کرنے کا عندیہ دے رہی ہے، اس ضمن میں 5000 پرانہ می اسکولز این جی اوز کے حوالے کر بھی چکے ہیں اور این جی اوز کے جو مقاصد ہیں ہر باشعور پاکستانی جانتا ہے۔ حافظ شعیب معاویہ! کتنی بچت ہوئی جرمانے کی؟ وارث علی! ایسی انگلیاں دیکھ کر جھرجھری کھاتے نظر آئے۔ محمد خواجہ! یقیناً کہانیوں پر سب سے عمدہ تبصرہ آپ کا رہا تاہم کچھ فحش شیش محفل کی بھی ہو جاتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ طاہرہ گلزار مری کی سر فضاؤں میں بیٹھ کر باقی سب کو لپٹائی نظر آئیں۔ رمضان پاشا! صحت مبارک ہو اور سب مریضوں کے لیے بھی دعا کریں۔ محمد شہباز ناز! یہ حسینہ کو 402 نمبر کس کیس کیس کے تحت دیا اور شریف آدمی کب پھنستا ہے؟ ہلا ماروی میں نیلی بیٹی کی واپسی سے ماروی میں دوبارہ دلچسپی لی لیکن وہ دیوتا جیسا مزہ کہاں؟ ملک صفدر حیات کی حکم ربی میں اس بار کافی مشکل کیس کی روکنا پڑھنے کو ملی۔ ہولا کی اچانک اس جگہ سے گرفتاری کیس کو حل کرنے کا سبب بن گئی۔ ایک بات جو نوٹ کی کہ ملک صاحب کی روکناؤں میں اکثر قاتل یا مستول کی مین بازار میں کپڑے کی ہی دکان ہوتی ہے اس بار خود شید بیگم کے حوالے سے ملک صاحب نے ذہین قارئین کے لیے ایک سوال چھوڑا کہ اس کو کیا سزا دی گئی ہوگی شاید ضمیر کے کٹھن سے اسے لاکھڑا کیا گیا ہوگا۔ تاریخی کہانی رزم و بزم میں ہلا کوخان کے بغداد پر حملے سے پہلے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کو جتنا نقصان غداروں نے پہنچایا شاید دشمن بھی اتنا نہ پہنچا سکے۔ خلیفہ متعصم باللہ کے وزیر ابن عسکری نے ملت اسلامیہ کے لیے اس عظیم سانحے کی راہ ہموار کی جس میں ہلا کوخان نے بغداد کے مسلمانوں کا اس قدر خون بہایا کہ دریا کا پانی بھی اس خون سے رنگین ہو گیا اور تمام علمی سرمایہ کو آگ لگا کر دیگر اقوام پر مسلمانوں کی علمی برتری کو بھی ختم کر دیا گیا۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کو ہم سائنس دان کے طور پر پڑھتے آئے ہیں۔ خلیفہ کے دربار میں رسائی حاصل نہ کرنے کے بعد ذاتی عنوان کی وجہ سے ہلا کوکا ساتھ دینا نظر آیا۔ کاشف زبیر مرحوم کی اسیر خیال ہمیشہ کی طرح دلچسپی سے ماسور اور اسرار و تجر کے پردوں میں لپٹی ہوئی تحریر تھی جس کا موضوع انسانی ذہن کی اپنے حساب سے قلابازیاں تھا، پڑھتے ہوئے مرحوم کا چہرہ دل و دماغ میں گردش کرتا رہا۔ ہماری تجویز ہے کہ ہم ان کی کوئی ایک تحریر منتخب کر کے سسٹن کی زینت بنائی جائے کم از کم 12 کہانیوں کا انتخاب کر لیا جائے (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے) شیش محل میں ربین دادا اینڈ کمپنی پہلی بار مشکل میں نظر آئی تاہم ان حالات میں بھی دلدار آغا کی گوشا کی کاغذ رزم ربین دادا کی حوصلہ مندی کا ثبوت ہے۔ محفل شعرو سخن میں زویب احمد اور اعجاز کا انتخاب پسند آیا۔

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

رمضان پاشا، محسن اقبال، کراچی۔ اسرار ساقی، ڈسٹرکٹ جیل انک۔ محمد زکریا، نامعلوم مقام۔ مختار احمد، حیدرآباد۔ نازیہ خان، بہاولپور۔ وقار حسن،

راولپنڈی۔ مدثر علی، پشاور۔ زریان سلطان، کراچی۔

انسانی قدم ہوں یا گزرا وقت... کسی نہ کسی حوالے سے اپنے نشان تو چھوڑ جاتے ہیں... یہ اور بات کہ ان سے وابستہ یادوں میں شدت ہے یا بس معمولی احساسات... قوموں کے حوالے سے تاریخ جہاں کی بھی ہو اپنی ایک مضبوط حیثیت دنیا سے تسلیم کراتی ہے... جیسے تاتاری اپنی سفاک فطرت کے باعث ایک الگ شناخت اور فتوحات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ منگولوں نے جب عروس البلاد بغداد کی فتح کا ارادہ کیا تو چن چن کر اپنے لیے ہر کاروں کا انتخاب کیا۔ یہ جنگ کئی محاذوں پر لڑی گئی۔ ہلاکو خان کی خوفناک تباہی نے بغداد میں انتشار پھیلانے کی انتہا کر دی۔ بغداد کے بااثر طبقے نے معمولی اور مبہم فائدے کے لیے اپنے ہی آشیانے کو آگ لگادی۔ معتبر لوگ اپنی حرص و طمع کے ہاتھوں غیر معتبر ہو گئے... عجیب و غریب جبلت کے ہاتھوں متغیر حالات اور اس قوم کے عروج و زوال کی سبق آموز داستان۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ننگو ناموس کئی داستان الیا س سیتا پوری





DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

شہزادے نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب اپنے ہی آدمی ہیں استاد محترم! آپ کو جو کچھ کہنا ہے، بے خوف و خطر کہہ ڈالیے۔“
لیکن استاد اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً شہزادے نے محل کا پھانک کھلوا دیا اور دونوں کو اندر لے گیا۔ شہزادے کے سامنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
شہزادے نے کہا۔ ”استاد محترم! اب فرمائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

استاد نے ساری روداد سنا دی۔ شہزادے نے درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں پوچھتا ہوں یہ حرکت تو نے کی ہے؟“
درداغ نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ ”میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ دراصل ہمیں ہلا کو خان نے بھیجا تھا۔ ہم اس کے خلاف کس طرح جاسکتے تھے؟“
شہزادے نے کہا۔ ”اب اس کے خلاف کیوں جا رہا ہے؟“
استاد نے کہا۔ ”شہزادے! وقت کی نزاکت کا خیال کیجیے، مجھے ڈر ہے کہ گوت ابن علقمی یا امیر المومنین سے کوئی ایسا ویسا فرمان نہ حاصل کر لے۔“
شہزادے نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین رات کو کوئی فرمان نہیں جاری فرماتے۔ رہ گیا ابن علقمی تو اس کا میں علاج کر دوں گا۔“

شہزادے نے ایک فرمان جاری کیا۔ ”استاد محترم شمس الدین اپنے مدرسے میں موجود رہیں کیونکہ کل میں معائنہ کروں گا۔“
دوسرا فرمان گوت کی گرفتاری کا جاری کر دیا۔ انہوں نے ان دونوں فرماؤں کو لیا اور سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچے تو گوت کو کمرے میں لیٹا پایا۔ وہ ناکام اور مایوس واپس آیا تھا۔ شہزادے کے آدمیوں نے گوت کو بیدار کیا اور شہزادے کا فرمان پڑھ کر سنا دیا۔ گوت کی نیند جاتی رہی۔ نیم غنودگی میں پوچھا۔ ”یہ فرمان کس نے جاری کیا؟“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”شہزادے نے۔ کیوں کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟“
گوت نے کہا۔ ”ہاں، مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیا شہزادہ یہ نہیں جانتا کہ میں اس کے دوست ہلا کو خان کا ایک آدمی، خاص آدمی ہوں؟“

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ شہزادہ واقعی یہ نہیں جانتا کہ تو ہلا کو خان کا خاص آدمی ہے۔“

درداغ اسی وقت استاد شمس الدین کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”استاد محترم! گوت اپنا آخری وار کرنے وزیر ابن علقمی کے پاس جا چکا ہے۔ اب آپ کو بھی کوئی فیصلہ کن اور مؤثر قدم اٹھانا ہے۔ جلدی کیجیے۔ وقت نہیں ہے۔“
استاد شمس الدین نے کہا۔ ”اتنی رات کو، رات کے اندھیرے میں، میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ کل صبح شہزادے کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس وقت میں نہیں جاسکتا۔ شہزادہ کیا سوچے گا؟“

درداغ نے بے چینی سے کہا۔ ”استاد محترم! آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔ صبح تک گوت کوئی فرمان بے دخلی لے آئے گا اور ہم سب نہایت بے رحمی اور سفاکی سے نکال باہر کیے جائیں گے۔“

استاد نے پوچھا۔ ”پھر بتا کہ ہم کیا کریں؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ میرے ساتھ اسی وقت شہزادہ ابوبکر کے پاس تشریف لے چلیں۔“

استاد نے پوچھا۔ ”اور اس سے بات کیا کریں؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے کو سب کچھ بتا دینا ہوگا اور اسی کے توسط سے ساری باتیں امیر المومنین کے گوش گزار کرنی ہوں گی۔ اس کے بعد اگر ابن علقمی امیر المومنین سے ہمارے خلاف کوئی فرمان لینا بھی چاہے گا تو نہیں لے سکے گا۔“

طوعاً و کرہاً استاد شمس الدین درداغ کو لے کر شہزادہ ابوبکر کے پاس چلے گئے لیکن اس وقت شہزادہ اپنے محل میں نہیں تھا۔ وہ ہلا کو خان کے خلاف تیاریوں میں مشغول تھا۔ ابن علقمی فوج کم کر رہا تھا اور شہزادہ ابوبکر اپنی فوجی قوت کو بحال رکھنا چاہتا تھا۔ دونوں شہزادے کے انتظار میں محل کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ تقریباً نصف رات کو شہزادہ اپنے چند جیالے سرداروں کے ساتھ واپس آیا۔ چند مشعل بردار شہزادے کے آگے آگے چل رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں شہزادے نے اپنے محل کے دروازے پر دو آدمی بیٹھے دیکھے تو ٹھنک کر دور ہی کھڑا ہو گیا اور بہ آواز بلند پوچھا۔ ”کون ہے؟ کھڑے ہو جاؤ۔“

استاد شمس الدین اور درداغ کھڑے ہو گئے۔
شہزادے نے استاد کو پہچان لیا۔ حیرت سے پوچھا۔ ”استاد محترم آپ! خیریت تو ہے؟“

استاد نے شہزادے کے آدمیوں کی طرف دیکھا، جواب دیا۔ ”شہزادے! اس وقت میں آپ سے بہت اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“

گوت نے استاد شمس الدین کو گالیاں دینا شروع کر دیں، وہ کہہ رہا تھا۔ ”تو مجھ کو گرفتار کر سکتا ہے، تو مجھے قتل بھی کر سکتا ہے مگر ایسا کرنا تیرے، تیری قوم کے، تیرے خلیفہ اور تیرے بغداد کے خلاف ہوگا۔ ہلا کو خان تم سب سے اس کا جواب طلب کرے گا۔“ پھر وہ دردناغ کی طرف مڑ گیا۔ ”اور تو..... تو غدار ہے۔ یہ آگ تیری ہی لگائی ہوئی ہے۔ میں چشم تصور میں تجھ کو بھی پابجولاں دیکھ رہا ہوں۔“ شہزادے کے آدمی گوت کو لے کر چلے گئے۔

دردناغ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ استاد کے چہرے پر خوشی کا نام تک نہ تھا۔ دردناغ نے پوچھا۔ ”استاد محترم! کیا آپ اداس ہیں؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”میں اداس نہیں فکر مند ہوں۔“

دردناغ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ گوت پر قابو پا لیا گیا ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”دردناغ! میری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مسئلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس طرح ایک اور جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ ابن عثمٰی سے جنگ کا آغاز اور ابن عثمٰی کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔“

دردناغ نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ شہزادہ جو ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”اور ابن عثمٰی کے ساتھ امیر المومنین جو ہیں۔“

دردناغ نے کہا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیا ہوگا؟“

اس رات وہ دونوں بالکل نہ سو سکے۔ دونوں ہی کروٹیں بدل بدل کر بیداری میں بھیا تک خواب دیکھتے رہے۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی استاد شمس الدین نے ایک نیا فیصلہ سنا دیا۔ ”دردناغ! رات بھر کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہیے۔“

دردناغ بوکھلا گیا، بولا۔ ”لیکن میں کہاں جاؤں گا؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں تو کہاں جائے گا لیکن تو یہاں سے میرے پاس سے ضرور جائے گا۔“

دردناغ نے کہا۔ ”میں یہاں سے ہٹا تو ہلاک کر دیا جاؤں گا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”اگر نہیں ہٹا تب بھی ہلاک کر دیا جائے گا کیونکہ تیرے دشمنوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔“

دردناغ نے التجا کی۔ ”استاد محترم! مجھ پر رحم کیجیے، میں بے سہارا ہو کر رہ جاؤں گا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”دردناغ! میرے دل میں تیرے لیے بڑی ہمدردیاں تھیں۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ جب تو مسلمان ہونے کے بعد امیر المومنین کے حکم سے کوئی اچھا سا عہدہ حاصل کر لے گا تو میں علیہ کو تیرے حوالے کر دوں گا۔ میرے دل میں تیری بڑی عزت تھی، بڑی وقعت تھی مگر افسوس تو نے اس کی قدر نہ کی۔“

دردناغ نے کہا۔ ”استاد محترم! میرا صرف اتنا سا تصور ہے کہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اگر میں آپ کو کچھ بھی نہ بتاتا تو آپ علیہ کو میرے حوالے کر دیتے اور میرے لیے شاندار ٹھکانا بھی یہیں ہو جاتا لیکن اب میں سچ کا گھاؤ کھا کے کہیں کا بھی نہ رہا۔ خدا را مجھ پر رحم کیجیے۔“

استاد خاموشی سے سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے، پھر کہا۔ ”تجھ کو میری بات مان لینی چاہیے۔ میں ابن عثمٰی سے نہیں لڑ سکتا اور یہ طے ہے کہ آج دن کے کسی بھی حصے سے ہم دونوں میں جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔“

دردناغ نے پوچھا۔ ”اگر میں یہاں رہوں گا تو اس سے آپ کو کیا نقصان پہنچے گا؟“

استاد نے بتایا۔ ”نقصان یہ پہنچے گا کہ بارشوت مجھ پر ڈال دیا جائے گا۔ ابن عثمٰی اور امیر المومنین دونوں ہی مجھ سے یہ کہیں گے کہ دردناغ نے جو کچھ بتایا ہے... اس کو سچ ثابت کرنے کے ثبوت پیش کرو۔ اس وقت میں کیا کروں گا؟“

دردناغ نے پوچھا۔ ”پھر میں کہاں جاؤں؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”برتنوں کے سوداگر کے پاس، اسی دکاندار کے پاس چند دنوں کے لیے چلے جاؤ جس کی خواہش بھی یہی تھی کہ تم چند دنوں کے لیے اس کے مہمان بن جاؤ۔“

دردناغ سوچنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”استاد محترم! میں ایک شرط پر اس کے پاس جا سکتا ہوں۔“

استاد نے پوچھا۔ ”کون سی شرط؟“

دردناغ نے جواب دیا۔ ”شرط یہ کہ علیہ بالآخر میری ہی ہوگی۔“

استاد نے بے رخی سے کہا۔ ”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ کچھ پتا نہیں کل حالات کیا رخ اختیار کریں۔“

دردناغ نے کہا۔ ”استاد محترم! میں نے جو کچھ بتایا، اس میں جھوٹ ذرا بھی نہیں۔ آخر کار میں ہی سچا ٹھہروں گا۔“

استاد نے کہا۔ ”اگر تو سچا ثابت ہو گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا اور تو جو کہے گا حتی الوسع کروں گا۔“

دردناغ نے استاد سے ہاتھ ملایا، پوچھا۔ ”کیا میں

باہر سے آواز آئی۔ ”درداغ! اب آجا۔ وقت ہو گیا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیا ملاقات کا وقت.....“

باہر سے پھر آواز آئی۔ ”درداغ! ہمارا اور اپنا وقت نہ ضائع کر۔“

درداغ نے جھکے ہارے لہجے میں کہا۔ ”اچھا علیہ! میں جا رہا ہوں۔ بس میری تو آپ سے ایک ہی درخواست ہے۔ مجھ کو بھلا نہ دینا، مجھ کو نہ بھول جانا۔“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی اور انتظار کروں گی۔ خدایا! مجھے پائے استقلال عطا فرما اور جو کچھ عہد و پیمان ہوئے ہیں اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما۔“

اس بار استاد نے کوئی آواز تو نہیں دی، خود ہی اندر چلے آئے اور درداغ کے سر پر کھڑے ہو کر چلائے گئے۔

”صاحبزادے! تجھ کو وقت کی قدر و قیمت کا کیا پتا۔“

درداغ نے علیہ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور اپنے استاد سے کہا۔ ”استاد محترم! میں اپنی غلطیوں اور زیادتیوں پر شرمندہ ہوں۔ امید ہے آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”معاف کر دوں گا، بالکل معاف کر دوں گا لیکن خدا کے لیے اب کسی مصیبت میں نہ پھنسا دینا تم۔“

درداغ نے کہا۔ ”وقت آنے دیجیے، اللہ نے چاہا تو میں یہ ثابت کر دوں گا۔ اس دنیا میں، میں نے آپ سے زیادہ کسی کو بھی اہمیت نہیں دی۔ میں آپ کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں۔“

استاد نے اس کو گھوڑے پر بٹھا کر دکاندار کے پاس روانہ کر دیا۔ برتنوں کے سوداگر نے درداغ کو خلاف توقع اپنے در پر دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔ گھوڑے پر درداغ کے سامان کی پوٹلی دیکھی تو اس کا ماتھا ٹھنکا، پوچھا۔ ”منگول دوست! خیریت تو ہے؟ آج میں تمہیں کیوں یاد آ گیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”تمہاری خواہش تھی کہ میں کچھ دن تمہارے ساتھ رہوں، چنانچہ میں چلا آیا۔“

سوداگر نے سرد مہری سے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے لیکن اس کی ایک ایک حرکت، ایک ایک ادائیہ بتا رہی تھی کہ وہ درداغ پر یقین نہیں کر رہا۔ وہ درداغ کو جھوٹا سمجھ رہا تھا۔ درداغ نے اپنی پوٹلی ہاتھ میں لی اور گھوڑے کو

جاتے جاتے علیہ سے مل سکتا ہوں؟“

استاد کو رحم آ گیا، جواب دیا۔ ”مل سکتا ہے مگر بہت زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ تھوڑی سی دیر کے لیے۔“

درداغ نے کہا۔ ”استاد محترم! جب یہ تھوڑی سی دیر پوری ہو جائے، آپ مجھ کو بلوایے گا۔“

اس کے بعد درداغ نے علیہ کے در پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور خادمہ اس کو اندر لے گئی۔ وہاں علیہ نیلے لباس میں صحن میں کھڑی درداغ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی خوش آمدید کہا اور بولی۔ ”میرا دل کہہ رہا تھا کہ تو آج ضرور آئے گا۔“

درداغ کے دھواں دھواں چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت نمایاں تھی، بولا۔ ”علیہ! میں غیر معینہ مدت کے لیے جدا ہونے جا رہا ہوں۔ اب معلوم نہیں کب ملاقات ہو۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“ علیہ بھی ایک دم اداس ہو گئی۔

درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھے استاد محترم نے یہ حکم دیا ہے کہ میں کچھ عرصے کے لیے ان سے جدا ہو جاؤں۔“

علیہ نے کہا۔ ”اور تو نے ان کا یہ حکم مان لیا؟“

درداغ نے کہا۔ ”اگر نہ مانتا تو کیا کرتا؟“

علیہ نے پوچھا۔ ”تو اب تو جائے گا کہاں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں۔“

”مگر یہ گھر نکالا کس جرم، کس خطا میں دیا جا رہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔ خدا کے لیے اس ذریعے سے وقت کو سوال جواب میں مت ضائع کر۔“

علیہ اداس ہو رہی تھی، بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں، کیا سوال کروں؟ میں تو گوی ہو گئی ہوں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”علیہ! کیا آپ مجھے یاد رکھیں گی؟“

علیہ نے سر جھکا لیا۔ بولی۔ ”یہی سوال میں تجھ سے کرنے والی تھی۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”علیہ! کیا آپ میرا دوسروں سے ذکر کریں گی؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”یہی سوال تو میں تجھ سے کرنے والی تھی۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”علیہ! میں نے آپ کو دل و جان سے چاہا ہے۔ کیا آپ نے بھی مجھ کو اسی شدت سے چاہا ہے؟“

علیہ کے پاس ایک ہی جواب تھا، سوال نما جواب۔

”یہی سوال تو میں تجھ سے کرنے والی تھی۔“

خاص چیز نہیں تھی۔ کشکی نامی کھانا تھا۔ یہ گیہوں، دودھ اور گوشت کے آمیزے سے تیار ہوا تھا۔ درداغ نے کشکی پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ اسے یہ بہت لذیذ لگا۔ خوب پیٹ بھر کے کھایا اور تاجر کا شکر یہ ادا کیا۔

جب گندم کا خمار چڑھا اور درداغ کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو تاجر نے کہا: ”درداغ ایک عجیب و غریب خبر سنی ہے۔ جب میں بازار پہنچا تو وہاں وزیر ابن علقمی کی طرف سے ایک اعلان ہو رہا تھا۔ حکومت کو اس منگول کی تلاش ہے جو کچھ دنوں پہلے یہ اعلان کرتا ہوا بغداد میں داخل ہوا تھا کہ وہ مسلمان ہو جانا چاہتا ہے اور یہ کہ منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے مقبول ہوتا جا رہا ہے۔“

درداغ کا نشہ ہرن ہو گیا، گھبرا کر پوچھا: ”کیا اعلان ہو رہا تھا؟“

تاجر نے جواب دیا: ”میری باتیں غور سے سن، خلافت کو تیری تلاش ہے کیونکہ تو ہلا کو خان کا نمائندہ ہے اور تو نے ہم سب کو دھوکا دیا ہے۔“

درداغ نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی، بولا: ”میزبان محترم! میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ مذکورہ اعلان میں میرا نام نہیں لیا گیا ہوگا۔ حکومت کو گوت نامی منگول سے اس قسم کی شکایت رہی ہوگی کیونکہ میں بغداد میں اسلام ہی قبول کرنے آیا ہوں۔“

تاجر نے منہ بنایا: ”گوت تو پکڑا جا چکا، تو فرار ہے۔ تلاش تیری ہے لیکن میں نے وزیر ابن علقمی سے اس شرط پر تیری حوالگی کا وعدہ کر لیا ہے کہ وہ میرے کئی کام کر دے گا اور میں تجھ کو ابن علقمی کے حوالے کر دوں گا۔“

درداغ نے کہا: ”مجھے ابن علقمی کے حوالے کر دینے سے تمہارے کام نہیں ہوں گے کیونکہ میں شہزادہ ابو بکر سے مل کر اپنے لیے امان حاصل کر چکا ہوں۔“

تاجر مسکرا رہا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی: ”شہزادے نے تجھے پناہ دے کر میرے پاس بھیج دیا تھا۔ خوب! تیرا جواب نہیں۔“ تاجر نے سلسلہ گفتگو منقطع کر کے تالی بجائی اور جب دو غلام ایک ساتھ حاضر ہو گئے تو

درداغ سے کہا: ”کیا خیال ہے؟ میں نے وزیر ابن علقمی سے وعدہ کر لیا ہے کہ شام سے پہلے پہلے میں تجھ کو وزیر کے حوالے کر دوں گا۔ تو چاہے تو خود کو رضا کارانہ طور پر وزیر کے حوالے کر دے لیکن اگر تامل ہو تو مجھے اپنے ان دونوں غلاموں سے کام لینا پڑے گا۔“

درداغ نے جواب دیا: ”پہلے تم مجھے شہزادے کے

برتنوں کے تاجر کے اصطل میں باندھ دیا۔ تاجر نے اسے ایک کمرادے دیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں پیالیوں، طشتریوں، قابوں اور سلاخیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ درداغ کو برتنوں کے اس چھوٹے سے گودام میں جگہ دی گئی تھی۔

تاجر نے کہا: ”منگول دوست! میں نے تمہیں اپنے گھر میں بٹھرا تو لیا ہے لیکن تم میرے مہمان نہیں ہو، کیونکہ مہمان اس طرح نہیں آتے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے تم کو اچانک میرے گھر آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ڈرے سبے بھی نظر آتے ہو۔ معلوم نہیں کیوں؟“

درداغ نے سوچا کہ تاجر کو سب کچھ سچ سچ بتادے لیکن پھر سچ بولنے میں خطرہ محسوس کیا۔ تاجر نے درداغ کو ہاتھ چھوڑ دیا اور چلا گیا۔ وہ کئی گھنٹے غائب رہا۔ درداغ کو بھوک لگنے لگی۔ اس کو تاجر کی غیر حاضری اور بے پروائی سے یہ شبہ گزرا کہ شاید وہ درداغ کو مہمان بنا کر بھول گیا ہے۔ تیسرے پہر اس طرح اس کے کمرے میں داخل ہوا کہ ایک غلام ایک طباق اٹھا۔ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ تاجر نے رسماً کہا: ”دوست! افسوس کہ میں ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ تمہیں بھوک تو ضرور لگ رہی ہوگی۔“ پھر غلام نے یہ طباق درداغ کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں خشک میوہ رکھا ہوا تھا۔ اسی طباق کے ایک حصے میں ایک چھری اور چھلکوں اور گٹھلیوں کے لیے شیشے کی طشتری رکھی تھی۔ بغداد والوں کا قاعدہ تھا کہ کھانے سے پہلے خشک اور تر میوہ یا پھل کھاتے تھے۔

تاجر درداغ کے پاس کھڑا ہو گیا، بولا: ”فواکھات نوش فرمائیں حالانکہ مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ تم میرا کام کر سکتے تھے مگر نہیں کیا۔ تم نے امیر المومنین سے ملاقات کی۔ وزیر ابن علقمی سے ملے لیکن میرا کام نہیں کرا سکے۔“

درداغ نے جواب دیا: ”اس کا مجھے خود بھی افسوس ہے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا یہ قرض ایک نہ ایک دن اتار دوں گا۔“

تاجر نے بے نیازی سے کہا: ”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

درداغ فواکھات کھاتا رہا کچھ دیر بعد وہی غلام سرپوش سے ڈھکا ہوا کھانوں کا خوان لے آیا۔ فواکھات کا طباق درداغ کے آگے سے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ایک دوسرا غلام سلاخی میں ہاتھ دھلانی لگا۔ خوان پر سے سرپوش ہٹا کر، اس میں ایک طرف رکھے ہوئے تو لیے نما رومال سے ہاتھ پونچھے اور کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں کوئی

درمیان سے گزر کر ایک شاندار عمارت میں داخل ہو گئے۔ اس عمارت میں چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے اور ان کمروں کے درمیان ایک ہال تھا۔ لمبا چوڑا ہال۔ ہال کے اندر آرائش و زیبائش کا سامان نہایت سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک سرے پر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اس تخت پر گائیکے لگے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ہی دیوار سے لگی ہوئی میز تھی۔ اس میز پر فواکھات کا ڈھیر تھا اور فواکھات کے پاس بنیڈ سے لبریز مٹکے اور جار رکھے تھے۔ تخت کے سامنے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ اس ہال میں ابن علقمی انہی لوگوں کو بلاتا تھا جو واقعی اس کے رحم و کرم یا غضب و عتاب کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔

تاجر اور درداغ کو کرسیوں پر بٹھا دیا گیا لیکن اسی دوران ہال کے اندرونی دروازے سے ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر درداغ کا گریبان پکڑ لیا، بولا۔ ”یہ جگہ تیرے بیٹھنے کے لیے نہیں ہے، کھڑا ہو جا۔“

انہوں نے درداغ کو کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور درداغ کو حکم دیا کہ اب وہ چپ چاپ اس وقت تک کھڑا رہے جب تک کہ وزیر ابن علقمی اس ہال میں داخل نہ ہو جائے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وزیر ابن علقمی اندرونی دروازے سے ہال میں داخل ہوا۔ درداغ اور وزیر کی نظریں ملیں تو وزیر نے طنزاً کہا۔ ”ہاں بھائی، اسلام کے شیدا! یہ تو کہاں روپوش ہو گیا تھا؟“

درداغ نے غصے میں جواب دیا۔ ”میں روپوش نہیں ہوا تھا۔ اگر میں روپوش ہوا ہوتا تو اس وقت یہاں نہ دکھائی دیتا۔“ ابن علقمی نے برا سامنہ بنایا۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں، بولا۔ ”بکو اس، جھوٹ، فریب..... کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح تیری جان چھوٹ جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا۔“

ابن علقمی نے اپنی بات کا جواب سننے بغیر اپنے غلاموں کو حکم دیا۔ ”باہر محل کے در پر ایک باغی پابجولاں کھڑا ہے، اس کو میرے پاس لے آؤ۔“

لیکن درداغ بھی خاموش نہیں رہا، بولا۔ ”میں کیا ہوں؟ آپ خوب جانتے ہیں۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں پر رحم فرمائیں۔ ہلا کو خان جیسا ذہین، سفاک اور بے رحم دشمن اسلام اور خلافت کی تباہی کے درپے ہے۔ اگر بغداد برباد ہو تو آپ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔“

ابن علقمی غصے سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں

پاس لے چلو، اس کے بعد میں کہیں بھی چل سکتا ہوں۔“ تاجر کو غصہ آ گیا۔ طیش میں بولا۔ ”پتا نہیں تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ وزیر ابن علقمی کی جو حیثیت ہے، وہ شہزادے کی بھی نہیں..... اگر تو شہزادے کی پشت پناہی میں شیر بنا پھر تار ہے گا تو یاد رکھ تو ایک نہ ایک دن دار پر چڑھ جائے گا۔ تو چپ چاپ میرے ساتھ چل تا کہ میں تجھے وزیر کے حوالے کر دوں۔“

درداغ مایوس اور شکستہ خاطر اٹھا اور اپنے سامان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اپنا سامان یہیں رہنے دوں یا ساتھ لیتا چلوں؟“

تاجر نے جواب دیا۔ ”اپنی کوئی چیز بھی یہاں چھوڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب تو یہاں کبھی نہیں آئے گا۔“

درداغ نے اپنے سامان کی پوٹلی سنبھالی اور تاجر کے ساتھ اس کے گھر سے باہر نکلا۔ گلی کوچے کے لوگ اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ درداغ تاجر اور اس کے دو غلاموں کے درمیان پوٹلی سنبھالے چوروں یا مجرموں کی طرح چلا جا رہا تھا۔ درداغ نے اپنا سر جھک کر رکھا تھا۔

راستے میں ایک بار پھر درداغ نے تاجر سے درخواست کی۔ ”معزز میزبان! آپ کا بڑا کرم ہوگا اگر آپ مجھ کو پہلے شہزادے سے ملوادیں گے اور یاد رکھیے کہ جب شہزادہ یہ خبر سنے گا کہ آپ نے مجھے ابن علقمی کے حوالے کر دیا تھا تو آپ کے ساتھ بھی کچھ اچھا سلوک نہیں ہوگا۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”تو میری فکر نہ کر، مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، میں خوب جانتا ہوں۔“

تاجر نے درداغ کو ابن علقمی کے محل پہنچ دیا۔ اس وقت محل کے در پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں کئی پابجولاں کھڑے تھے۔ کچھ نے اپنے ہاتھوں میں درخواستیں پکڑ رکھی تھیں۔ ان میں دو شاعر بھی تھے، جواذن باریابی کی امید میں صبح سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بدوسبزیوں کا ٹوکرا لیے بیٹھا تھا۔ یہ ابن علقمی کے لیے سادہ لوح بدو کا پر خلوص نذرانہ تھا۔

محل کے دربانوں نے تاجر کو دیکھتے ہی خندہ پیشانی سے سلام کیا اور اسے اسی وقت محل کے اندر لے گئے۔ جو باریابی کی امید میں بیٹھے سوکھ رہے تھے، انہیں تاجر اور درداغ پر رشک آیا۔ وہ زیر لب دربانوں کو گالیاں دینے لگے۔

محل کے اندر داخل ہوتے ہی انہیں ایک دوسرا پھانک نظر آیا۔ یہاں انہیں روک لیا گیا مگر ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اندر بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک سبزہ زار کے

بالکل ایسی ہی غلطی تو خود بھی کر رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک میرے دل میں تیرے لیے تھوڑی بہت عزت بھی تھی مگر اب وہ بھی نہیں۔ جس طرح تاجر تیری چکنی چڑی باتوں اور دم دلاسون میں آ کر تیرے زیرِ عتاب آ گیا، بالکل اسی طرح تو بھی ہلا کو خان کی باتوں میں آ چکا ہے اور تیرا حشر بھی اس تاجر سے مختلف نہیں ہوگا۔“

ابن علقمی نے غضب ناک نظروں سے دردناغ کو گھورا اور منہ پھیر لیا۔ چونکہ شہزادہ ابوبکر کی نظر کرم دردناغ پر بھی اس لیے ابن علقمی کچھ دیر تو خاموش رہا مگر جب پابجولاں قیدی کو اس کے سامنے کھڑا کیا گیا تو وہ بناوٹی طیش میں اس کی طرف بڑھا اور پھر پے در پے کئی طمانچے قیدی کے دونوں رخساروں پر رسید کر دیے، بولا۔ ”تو غدار ہے۔ تو نے خلافت عباسیہ کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ تیری سزا موت ہے۔“

قیدی بلا کا کھل وضبط والا معلوم ہوتا تھا۔ ابن علقمی کو نہایت باوقار لب و لہجہ میں سمجھایا۔ ”ابن علقمی! غدار میں نہیں تو ہے۔ اگر میں غدار ہوں تو میرا مقدمہ امیر المومنین کے سامنے لے جا۔ تجھ کو سزا دینے یا مقدمہ چلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“

ابن علقمی نے پانچ چھ تھپڑ اور رسید کر دیے۔ ”میں اتنے اختیارات رکھتا ہوں کہ غداروں پر مقدمہ چلا کر سزا دے سکوں۔ مگر میں یہ مقدمہ امیر المومنین کے روبرو اس لیے لے جاؤں گا کہ وہاں یا تو، تو مجھے غدار ثابت کر دے یا میں تجھے غدار ثابت کر دوں۔“ پھر اچانک دردناغ سے مخاطب ہو گیا۔ ”اور تو..... میں تجھے بھی امیر المومنین کے سامنے پیش کروں گا لیکن تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ امیر المومنین کے سامنے جھوٹ نہ بولنا، سب کچھ سچ بتا دینا۔“

تاجر نے کہا۔ ”تب پھر میں تو چلا۔ اب میرا یہاں کیا کام؟“ ابن علقمی نے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر تاجر کو بٹھا دیا۔ ”کیا کہا، اب تیرا یہاں کیا کام؟ تیرا تو یہاں اس وقت تک کام رہے گا جب تک کہ تو دردناغ کو پناہ دینے کا خطا کار ہے۔“

تاجر پھر گڑ گڑانے لگا۔ ”وزیر محترم! میں بے گناہ ہوں، میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔“

ابن علقمی نے تاجر کو بھی مارا اور ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرادیا۔ اس نے بھی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی لیکن تاجر کے علاوہ ایک بھی شخص وزیر سے خوف زدہ نہیں تھا۔ ابن علقمی نے اپنے محل ہی کے ایک حصے میں ان نام نہاد

مٹھیاں بھیج کر بولا۔ ”کوئی ہے جو اس گستاخ کی زبان کو لگام دے۔“

تاجر پر کچکی طاری ہو گئی۔ وہ دردناغ کی خوشامد کرنے لگا۔ ”منگول دوست! خدا کے لیے چپ ہو جا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھ۔“

لیکن ابن علقمی کے ایک خدمت گار نے دردناغ کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کی کوشش کی۔ دردناغ اپنے ڈیل ڈول اور صحت کے اعتبار سے وہاں کے ہر شخص پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی مگر خدمت گار نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

تاجر نے کہا۔ ”دردناغ! دیکھ خواجواہ کی مزاحمت اچھی نہیں۔“

دردناغ نے جواب دیا۔ ”میں انسان ہوں، اپنے منہ میں لگام نہیں ڈالنے دوں گا۔“

لیکن خدمت گار بھی جوش نمک حلائی میں اپنی کوشش سے باز نہیں آیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کوشش سے دردناغ کا منہ کھولنا چاہا تو دردناغ نے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ خدمت گار چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔

ابن علقمی سوالیہ نظروں سے خدمت گار کو دیکھنے لگا۔ خدمت گار چیخ رہا تھا۔ ”ہائے میرا ہاتھ، کم بخت نے کاٹ لیا۔ ہائے میرا ہاتھ۔“

ابن علقمی نے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”ذلیل انسان..... تو نے تو بے ہودگی کی حد کر دی۔ میں تجھ کو امیر المومنین کے روبرو پیش کر کے ایسی سزا دلاؤں گا کہ تو اپنے جیسوں کے لیے عبرت بن جائے گا۔“

تاجر گہرا رہا تھا کہ کہیں وہ بھی وزیر کے زیرِ عتاب نہ آجائے۔ اس نے وزیر سے واپسی کی اجازت چاہی۔ ”وزیر محترم! کیا میں جاسکتا ہوں؟ غالباً میرا کام تو ختم ہو گیا؟“

ابن علقمی نے بدستور ناخوشی سے جواب دیا۔ ”نہیں، ابھی تو یہیں رہے گا کیونکہ تو نے اس منگول کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ اس طرح تو بھی شریک جرم ٹھہرا۔“

تاجر رونے لگا۔ ”جناب! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے تو ازراہ وفاداری اس کو حاضر کر دیا ہے اور مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھ کو اس منگول کی گرفتاری کے صلے میں.....“

ابن علقمی نے تاجر کو ڈانٹ دیا۔ ”تو اپنی زبان بند نہیں کرے گا۔ میں نے کہہ جو دیا تو بھی شریک جرم ہے اس لیے تجھ کو بھی سزا ملے گی۔“

دردناغ نے ابن علقمی سے کہا۔ ”وزیر بے تدبیر!

ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ہم پر سکون رہیں۔“

رقاصہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! خدا نے جس کو جتنا کمتری اعلیٰ مقام دیا ہے، اس کی زندگی میں اتنی ہی مشکلات اور دشواریاں بھی لکھ دی گئی ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔“

خلیفہ بہت ادا اس تھا۔ اس نے ایک مغنیہ کو حکم دیا کہ وہ کوئی طریقہ چیز سنائے۔ مغنیہ خلیفہ کے قریب گئی اور بیٹھ کر گانا شروع کر دیا۔

”میں نے انسانوں کی پیدائش اور موت کے مناظر بار بار دیکھے ہیں۔

جب یہ پیدا ہوتا ہے تو خود تو روتا ہے اور دوسرے خوشی سے ہنستے ہیں۔

میں نے اپنے دل سے کہا، اے دل! تو ادا اس اور غمزدہ کیوں ہے جبکہ.....

تیری اصل غم ہے اور خوشی فضول اور فروغی۔ اگر تو اپنی اصل پر قائم رہے تو، تو.....

اپنے غموں اور دکھوں پر قابو پا لے گا۔

افسوس کہ میں نے فقیر کو بلاش اور بادشاہ کو ادا اس دیکھا۔“

خلیفہ نے اسے ٹوک دیا۔ ”میں نے کہا تھا تو کوئی طریقہ کلام سنا کر تو اپنے کلام سے اور زیادہ ملول کر رہی ہے۔“

ایک دوسری مغنیہ نے عرض کیا۔ ”اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں امیر المومنین کی منشا پر ضرور پوری اتروں گی۔“

خلیفہ نے اسے اجازت دے دی۔ ”اجازت ہے۔“

دوسری مغنیہ نے اپنی دانست میں طریقہ کلام سنانا شروع کر دیا۔

”انسان کی اصل غم نہیں خوشی ہے، رجا کیا ہے؟ خوشی!

کامل مایوسی کیا ہے؟ غم..... انسان کی زندگی سے رجا کو نکال دو تو زندگی ختم ہو جائے گی۔

انسان کا زندہ رہنا، اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خوش ہے، زندگی تو رجا ہے۔

امیر المومنین! خوش رہیے، خوش رکھیے۔

بہت زیادہ کی تمنا اور ہل من مزید کا رجحان، انسان کی بربادی کے لیے کافی ہیں۔

دنیا کسی ایک کی میراث نہیں ہے، کھلے آسمان پر

آوارہ و سرگرداں بادلوں کی طرح.....

اس کا سایہ کسی کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔

امیر المومنین! سود زیاں سے پیچھا چھڑائیے اور

☆☆☆

امیر المومنین کی محفلِ رقص و موسیقی بے کیف ہو چکی تھی۔ رقا صائیں اپنے پاؤں میں گھٹکرو باندھے رقص میں مشغول تھیں۔ ان میں دو رقا صائیں موصل کے حکمران بدرالدین لولو کی طرف سے آئی تھیں۔ خلیفہ مستعصم باللہ اپنے حکمرانوں سے اکثر بہترین رقا صائیں اور مغنیائیں طلب کیا کرتا تھا۔ جب سے ابنِ عقیلی نے خلیفہ کو یہ بتایا تھا کہ دردناغ ہلا کو خان کا جاسوس ہے اور گوت سیدھا سچا نو مسلم منگول ہے۔ اس کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کو دردناغ پر غصہ آ رہا تھا اور اشتعال نے اس کے دل و دماغ کو بے کار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ شہزادہ ابوبکر سے بھی ناراض تھا جس نے استاد شمس الدین اور دردناغ کو رعایتیں دی تھیں اور گوت کو قد خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سامنے رقا صائیں گھٹکرو کو چھٹکا چھٹکا کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور گانے والیاں آواز میں آواز ملا کر عشقیہ کلام سنا رہی تھیں۔ موسیقی اور رقص نے خلیفہ کے اندر اور باہر آگ سی لگا دی تھی۔ مغنیائیں ابنِ عقیلی کے ایما اور ہدایت پر ایسا کلام سنا رہی تھیں جس سے مستعصم باللہ کی خواہشات نفسانی کو تقویت پہنچ رہی تھی مگر یکسوئی اور اطمینان کے فقدان نے خلیفہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس کی بے چینی اور طبیعت کے انتشار کو رقا صائوں اور مغنیائوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک رقا صا رقص کرتے کرتے خلیفہ کے قریب چلی گئی اور ایک دم اچانک رقص بند کر دیا۔ سازندے پریشان ہو گئے۔ ان کے ہاتھ، انگلیاں اور بعض دوسرے اعضا بھی اچانک رک گئے۔ رقا صا خلیفہ کے پہلو میں سکر کر بیٹھ گئی اور سوال کیا۔ ”امیر المومنین، آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ نصیب دشمن! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

خلیفہ نے اپنا سر پکڑ لیا اور گردن جھکا کر جواب دیا۔ ”رقا صا! رشکِ حور! کیا تو نے میری پریشانیوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنایا پھر تو تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی ہے؟“

رقا صا نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! بخدا ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم!“

خلیفہ نے کہا۔ ”رقا صا! دنیا کیسی عجیب جگہ ہے۔ یہاں ہر طرف چھندے بچھے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کاروبارِ حیات سے پیچھا چھڑا کے کچھ دیر غم غلط کر لوں، چنانچہ جب میں غم غلط کرنے بیٹھا تو یہ معلوم ہوا کہ دشمن

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

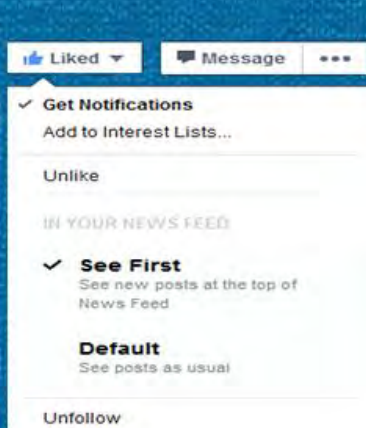
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



خوش رہیے اور خوش رکھیے۔

خشت میں خفت ہے اور کشادہ مستی میں کیف و مستی۔
میں نے کسی بخیل کو خوش اور سخی کو اداس نہیں دیکھا۔ امیر المومنین!
مت سوچے، کل کیا ہوگا، خوش رہیے اور خوش رکھیے۔“
خلیفہ نے اپنا سر پکڑ لیا اور آہستہ سے حکم دیا۔ ”محفل
برخواست، تجلیہ!“

مغنیہ کا جادو بے کار ہو گیا تھا، محفل اجڑ گئی۔ خلیفہ کے
دل کا بوجھ کسی طرح کم ہی نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنے دانش
مند حاجب رنج کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ”خوشی اور غم کی
بابت تیرا کیا خیال ہے؟“

حاجب نے جواب دیا۔ ”خوشی اور غم ایک ہی سکے
کے دو رخ ہیں۔ زندگی سکے کی طرح ہے، زندگی ہے تو خوشی
بھی ہے اور غم بھی۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”اور قسمت کیا ہے؟“
حاجب نے جواب دیا۔ ”مشیت ایزدی۔ قائل
مطلق کی انگلیاں اس سکے کو مستقلاً حالات و حوادث کی شکل
میں اچھالتی رہتی ہیں۔ جس سے کبھی غم کا رخ اوپر آ جاتا ہے
اور کبھی خوشی کا رخ..... یہی انسانی قسمت ہے۔“
خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا مشیت ایزدی میں رد و بدل
ممکن ہے؟“

حاجب نے جواب دیا۔ ”ناممکن، قطعی ناممکن، سراسر
ناممکن۔“

خلیفہ نے انتہائی کرب سے کہا۔ ”تب پھر مجھ کو یہ
الزام کیوں دیا جاتا ہے کہ میں فرائض خلافت کی بجا آوری
میں سستی، غفلت اور بے تدبیری سے کام لے رہا ہوں۔“
حاجب نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! حکمرانی سے
زیادہ مشکل امور حکمرانی پر نظر رکھنا ہے۔ اگر خدا نے کسی
انسان کو کارِ جہاں بین کی صلاحیت عطا فرمائی ہو تو جہاں بانی
اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتی۔“

خلیفہ نے حاجب کو ڈانٹ دیا۔ ”تو معلوم نہیں کیسی
دقیق باتیں کر رہا ہے۔ دفعان ہو جا یہاں سے۔ ایک تو دل
و دماغ یوں ہی بوجھل اور بھاری ہو رہے ہیں۔ اس پر تیری
دقیق گفتگو، میں تو اس کے بوجھ تلے کھلا جا رہا ہوں۔“

خلیفہ ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ اب وہ آرام کرتا چاہتا تھا
لیکن اسی وقت خلیفہ کو مطلع کیا گیا کہ وزیر ابن علقمی ایک
انتہائی ضروری کام سے اذن باریابی کا خواستگار ہے۔ خلیفہ
نے اسے فوراً بلالیا۔ اس وقت ابن علقمی کے ساتھ دردناغ
بھی تھا۔ خلیفہ نے ابن علقمی سے پوچھا۔ ”فرمائیے! کیسے

تکلیف فرمائی آپ نے؟“

ابن علقمی رونے لگا۔ اس نے خلیفہ سے عرض کیا۔
”امیر المومنین! مجھے ملازمت سے علیحدہ فرمادیں کیونکہ میں
وزارت کی بے عزتی اور ذلت گوارا نہیں کر سکتا۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”تیرے ساتھ ہوا کیا؟ کچھ بتا تو سہی۔“
ابن علقمی نے رورور کر عرض کیا۔ ”امیر المومنین! یہ
خاکسار تو جاسوسوں اور دشمنوں کو گرفتار کرتا ہے اور شہزادہ
کلاں ابوبکر اس کی رہائی کا فرمان جاری فرما دیتے ہیں۔
بتائیے! ان حالات میں، میں کیا کروں؟“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”اصل معاملہ کیا ہے؟ پورا واقعہ
بیان کرو۔“
ابن علقمی نے پورا واقعہ سنا دیا اور خلیفہ سے پوچھا۔
”امیر المومنین! آپ ہی فرمائیے کہ ان حالات میں، میں کیا
کر سکتا ہوں؟“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”وہ منگول کہاں ہے؟“
ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”اس کو میں اپنے ساتھ لایا
ہوں۔ میں اس کو سزا دے سکتا تھا مگر شہزادے کی وجہ سے
میں خاموش ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔“

خلیفہ نے حکم دیا۔ ”اس منگول کو میرے سامنے لایا جائے۔“
حکم کی دیر بھی کہ دردناغ کو خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا
گیا۔ خلیفہ کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ دردناغ کو دیکھتے ہی
برہم ہو گیا۔ ”تو ہلا کو خان کا جاسوس ہے۔ تو نے ہمیں
دھوکا دیا اور بغداد کے حالات کی خبریں اپنے آقا ہلا کو خان کو
بھیجوا دیں اور یہ بھی نہ سوچا کہ جب یہ راز کسی طرح افشا ہوگا
تو تجھ کو اس کی کتنی عبرت تاگ سزا دی جائے گی۔“

عین کارروائی کے دوران شہزادہ ابوبکر بھی خلیفہ کے
سامنے پہنچ گیا اور نہایت ادب سے عرض کیا۔
”امیر المومنین! اس منگول پر رحم کیا جائے اور اس کی باتیں
بھی غور سے سنی جائیں تو بہتر ہوگا۔“

خلیفہ نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ”اب اس کے پاس
کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟ یہ کیا کہے گا؟ شاید جھوٹ
بولے گا۔“

شہزادے نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! اس کو
بولنے کی اجازت تو دیں۔“

ابن علقمی نے پہلو بدلا۔ ”شہزادے! میں آپ سے
زیادہ عمر رسیدہ اور تجربے کا رہوں۔ آپ اس منگول کی
باتوں میں نہ آئیں۔“

لیکن شہزادے نے ابن علقمی کو کوئی اہمیت نہ دی۔

ابھی استعفا نہ دے۔“ پھر شہزادے سے کہا۔ ”اب تو بتا کیا چاہتا ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”درداغ کو میرے حوالے کر دیجیے۔ میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ درداغ اس وقت تک میری تحویل اور عنایت میں رہے گا جب تک اس کا گناہ پایہ گناہی ثابت نہ ہو جائے۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے شہزادے کی تجویز مناسب ہے اور درداغ کے ساتھ گوت کو بھی رہا کر دیا جائے۔“ لیکن شہزادے کو ابن علقمی کی یہ تجویز بالکل پسند نہ آئی۔ اس نے احتجاجاً کہا۔ ”امیر المومنین! گوت کو ہرگز نہ چھوڑا جائے کیونکہ گوت کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔“ ابن علقمی نے ذرا تیزی دکھائی۔ ”امیر المومنین! میں کہتا ہوں کہ گوت بے گناہ ہے۔“

لیکن شہزادہ پھر اکر گیا۔ ”گوت گناہ گار ہے۔ آپ لوگوں کو میری بات کا یقین کرنا چاہیے۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو آپ کے جو جی میں آئے کیجیے۔ میں امیر المومنین کے ہاتھوں کسی پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔“

خلیفہ دونوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کی خاطر کہا۔ ”تم دونوں اپنے اپنے طور پر جو چاہو کرو، لیکن اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔“

دونوں ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے دربار سے باہر نکلے۔ درداغ کے ساتھ شہزادہ تھا۔ ابن علقمی نے بھی اپنی بات منوالی تھی اور وہ بیمار گوت کو قید خانے سے رہائی دلوا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔

شہزادے نے چلتے چلتے ابن علقمی کو متنبہ کیا۔ ”گوت کو تو رہا کر الے، کوئی بات نہیں لیکن آج دربار میں امیر المومنین کے روبرو جو انکشافات ہوئے ہیں، میں ان کی روشنی میں غداروں کو بے نقاب کر کے رہوں گا۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”اور میں بھی۔ میں ان لوگوں کو امیر المومنین کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں گا جو شریف اور سادہ لوح لوگوں کو درغلا تے رہتے ہیں۔“

شہزادہ درداغ کو اپنے محل میں لے گیا۔ اسے کھانا کھلوا یا جبکہ وہ خود بھوکا رہا۔ معلوم نہیں کیوں؟ شہزادے نے کھانا نہیں کھایا۔ یہاں شہزادہ درداغ سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ خلیفہ پر برہم تھا جو بہت کچھ جان لینے کے بعد بھی کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔

درداغ کو کام کی فکر لگ چکی تھی۔ اب وہ استاد شمس الدین کا دست نگر بن کے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے

خلیفہ سے کہا۔ ”امیر المومنین کچھ اس کی بھی سن لیں۔“ خلیفہ اپنے ولی عہد کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ منگول کو بولنے کی اجازت دے دی گئی۔

شہزادے نے درداغ سے کہا۔ ”تو کسی سے مرعوب ہوئے بغیر سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ کسی سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! واقعتاً میں ہلاکو کا آدمی ہوں۔ میں نے اپنی آمد کی جو غرض و غایت پہلے بیان کی تھی، غلط تھی۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ میں امیر المومنین کو اور پورے بغداد کو اس خوش فہمی میں مبتلا کرنے آیا تھا کہ ہلاکو خان اور منگول اسلام سے بے حد متاثر ہیں اور یہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں جبکہ معاملہ یہ ہے کہ ہلاکو خان مسلمانوں کو غافل کر کے بغداد پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے۔“ اس کے بعد اس نے ابن علقمی کی طرف دیکھا۔

”میں نے جو کچھ عرض کیا، آپ کے وزیر موصوف بھی اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ بھی میرے راز دار ہیں۔“

ابن علقمی نے گھبرا کر تردید کی۔ ”نہیں امیر المومنین! ایسی کوئی بات نہیں، یہ جھوٹا ہے اور مجھ پر تو اتنا الزام لگا رہا ہے۔“ شہزادے نے کہا۔ ”وزیر محترم! اک ذرا تحمل

فرمائیں۔ اس کو اپنی بات تو پوری کر لینے دیں۔“ خلیفہ نے ابن علقمی کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو، تو خاموش رہہ درداغ کو اپنی بات کہہ لینے دے۔

درداغ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! اب میں بسم قلب مسلمان ہو چکا ہوں اور ہلاکو خان سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا لیکن افسوس کہ آپ میری بات پر یقین نہیں فرمائیں گے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کا وزیر ابن علقمی غدار ہے اور آپ سے معلوم نہیں کیوں ایک بھیا تک انتقام لینا چاہتا ہے یہ شخص یہ ہلاکو خان کا آدمی ہے۔ گوت بھی ہلاکو

خان کا آدمی ہے۔“ ابن علقمی کھڑا ہو گیا۔ ”امیر المومنین! اگر میں غدار ہوں اور ہلاکو خان کا آدمی ہوں تو مجھے منصب وزارت پر فائز رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں وزارت سے مستعفی ہو جانا چاہتا ہوں کیونکہ میرے مخالف، میرے دشمن یہی چاہتے ہیں۔ میں شہزادہ ولی عہد پر کوئی الزام نہیں رکھوں گا کیونکہ یہ سادہ لوح اور ناتجربہ کار ہیں۔“

خلیفہ سوچ میں پڑ گیا کیونکہ وہ ابن علقمی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور شہزادے ابو بکر کو بھی خوش رکھنا چاہتا تھا۔ ابن علقمی سے کہا۔ ”میں واقعات کی خود تحقیق کروں گا، تو

شہزادے سے کہا۔ ”شہزادے! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں اتار سکوں گا۔ اب مجھ پر ایک کرم اور کر دیجیے۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

درداغ نے سر جھکا کر عرض کیا۔ ”شہزادے! میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں، کچھ تو میرا ساتھ دیجیے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”تو کچھ دن انتظار کر۔ تیرا یہ کام بھی ہو جائے گا۔“

شہزادے نے اسے اپنی فوج میں شامل کر لیا اور اسے رہنے کے لیے ایک مکان بھی دے دیا۔ یہ مکان مدرسہ مستنصریہ کے قریب واقع تھا۔ شہزادے نے درداغ سے کہا۔ ”تو میرے آدمیوں کو منگولوں کے طریقہ جنگ سے آشنا کر دے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میدان جنگ میں حوصلہ، دلیری، استقلال اور حاضر دماغی انسان کے تمام ہتھیاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ منگولوں کے رعب کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کی جائے تو فتح یقینی ہو جائے گی۔“

شہزادے نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”تیری قوم فلاح ہے جو قراقرم سے نکل کر اقصائے عالم پر چھا گئی۔ فلاح کا رعب تو ہوتا ہی ہے، میں اس رعب کو اپنی فوج کے دل سے کس طرح نکالوں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! ایک نکتہ اپنے ذہن میں بٹھالیجیے۔ اب وہ پہلے جیسی بات منگولوں میں بھی باقی نہیں رہی۔ تہذیب اور تمدن نے آہستہ آہستہ انہیں مغلوب کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے ہماری نظرس آسمان کی طرف اٹھ جایا کرتی تھیں جو نیلا اور جاوداں ہے مگر اب ہم میں نفاق پیدا ہو چکا ہے۔ ہم میں سے کچھ کے دلوں میں مسیحیت گھر کر رہی ہے اور کچھ کے دلوں میں اسلام نے گھر کر لیا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ جو ہیں، وہ اپنی روش قدیم اور طرزِ کہن پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنے منہ کی اور مسلمان بھائیوں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس طرح ہم منگول نا اتفاقی کے شکار ہو چکے ہیں۔ آپ اپنے سپاہیوں کو یہ ساری باتیں بتادیں پھر دیکھیں کہ ان کے دلوں سے منگولوں کا خوف نکلتا ہے یا نہیں۔“

شہزادے کو درداغ کی باتیں بہت اچھی اور قابل قبول محسوس ہوئیں، کہا۔ ”درداغ! تو منگول ہے اگر تو میری فوج کے سامنے یہ درنا یا ب بکھیر دے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اثر نہ ہو۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں لیکن.....“

شہزادے نے بات کاٹ دی۔ ”لیکن کچھ نہیں۔ تو اپنا کام شروع کر دے، اللہ تیری زبان کو اثر دے۔“

درداغ کو شہزادے نے اپنی فوج میں پہنچا دیا۔ یہ فوجی بغداد کی مستقل چھاؤنی میں قیام پذیر تھے۔ درداغ ان میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ وہ صبح سے شام تک ان کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ ہلا کو خان اور اس کی قوم منگول میں پہلا جیسا جوش و خروش اور شوق کشور کشائی نہیں رہا۔ انہیں بھی تہذیب و تمدن نے فتح کر لیا ہے۔ اتحاد، یکجہتی اور جوش ایمانی سے انہیں شکست دی جاسکتی ہے۔ درداغ کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ مسلم سپاہ اس کی پراثر باتوں سے اپنے آپ میں ولولہ اور حوصلہ محسوس کرنے لگی۔

درداغ کو ذرا سکون جو ملا تو اسے علیہ اور استاد شمس الدین کی یاد آئی۔ اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ استاد شمس الدین نے اسے برتنوں کے تاجر کے حوالے کر کے اپنا بیچھا چھڑا لیا تھا۔ علیہ کی محبت اپنی طرف مٹھتی مگر استاد شمس الدین کا تکلیف دہ طرزِ عمل مانع آجاتا۔

اسے برتنوں کا تاجر جب بھی یاد آتا، وہ غصے سے اپنے دانت پیسنے لگتا۔ یوں اس کا بغداد میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ خود کو خالی خالی اور تنہا تنہا محسوس کرتا رہتا۔ فرصت کے اوقات میں شام کے وقت وہ دجلہ کے کسی بجرے میں بیٹھ کر سیر و تفریح کرنے لگتا۔ اس بجرے پر دوسرے لوگ بھی ہوتے مگر درداغ کسی کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا۔

شام کو سورج کے غروب ہونے سے ذرا دیر پہلے درداغ دجلہ کے ساحل پر کھڑا، کسی بجرے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی عالم میں کسی نے اس کے پاس آکر پوچھا۔ ”آپ کہاں جائیں گے بھائی صاحب؟“

درداغ نے گھوم کر اس عرب کو دیکھا اور بے پروائی سے جواب دیا۔ ”کہیں نہیں، بس بجرے میں بیٹھ کر دجلہ کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

اس عرب نے ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”تب پھر میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں دجلہ کی سیر کراؤں گا۔“

یہ عرب درداغ کو ایک ایسے کنارے پر لے گیا جہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، عرب نے کہا۔ ”کیا تو منگول ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں منگول ہوں مگر

جرمن کہاوتیں

☆ افواہ انسان کو مار ڈالتی ہے۔
 ☆ افواہ ہمیشہ حقیقت سے بڑی ہوتی ہے۔
 ☆ اگر حسد جل سکتا تو کڑیاں اتنی مہنگی نہ ہوتیں۔
 ☆ اگر مرغی کڑکنا چھوڑ دے تو آدمی نہیں جان سکتا کہ اس نے انڈا دیا ہے۔
 ☆ اگلے وقتوں میں لوگوں کے پاس ضمیر تھا بغیر علم کے۔ ہمارے پاس علم ہے بغیر ضمیر کے۔
 ☆ الفاظ ادا کرنے سے پہلے نو بار منہ میں گھمانے چاہئیں۔
 ☆ امیر وہ نہیں جس کے پاس بہت کچھ ہے بلکہ امیر وہ شخص ہے جس کی ضرورتیں محدود ہیں۔
 ☆ نیند سب سے بڑی چور ہے۔ وہ انسان کی آدمی زندگی چرائیتی ہے۔
 ☆ ہر ماں کا بچہ خوب صورت ہوتا ہے۔
 ☆ مرغ یا نگ دینے سے پہلے آنکھیں میچ لیتا ہے کیونکہ یا نگ اسے زبانی یاد ہے۔
 ☆ کوئی خوش قسمت ہو تو اس کا تیل بھی بچھڑا جاتا ہے۔
 ☆ مہمان مچھلی کی طرح ہوتا ہے زیادہ دیر تازہ نہیں رہتا۔
 ☆ ہر شخص اپنے پیتل کو سونا سمجھتا ہے۔
 سرسہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

گوشت کا لوتھڑا دبا ہوا تھا پھر جب اس کے باپ سے اس کا نام رکھنے کو کہا گیا تو اس نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کہیں پاس ہی لوہے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ پس باپ نے اس کا نام تموجن (فولاد) رکھ دیا۔
 عرب نے پوچھا۔ ”کیا یہ بھی درست ہے کہ تم لوگ قول و قرار کے پابند نہیں ہوتے؟“
 درداغ نے پرتاسف لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں، وہ قول و قرار کے پابند نہیں ہوتے۔“
 عرب نے پوچھا۔ ”وہ لوگ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟“
 درداغ نے جواب دیا۔ ”وہ مسلمان اس لیے نہیں ہوتے کہ انہیں مسلمان کرنے والے آج تک نہیں ملے۔ جو جی کے بیٹے برکائی کو ایک مسلمان مل گیا تھا، وہ مسلمان ہو گیا۔“

ایک مسافر نے پوچھا۔ ”سننے میں آیا ہے کہ منگول پیاس کی حالت میں گھوڑے کے جسم میں سنگ گھسیڑ دیتے ہیں اور

خوش قسمتی سے مسلمان ہو چکا ہوں، اس طرح میں مسلمانوں کا بھائی ہوں۔“

عرب نے کہا۔ ”میں نے یہ کب کہا کہ تم میرے دینی بھائی نہیں ہو؟“ اس کے بعد اس نے کنارے سے لگے ہوئے بجرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”بجرا موجود ہے، بیٹھ جاؤ اس میں۔“

درداغ بجرے میں بیٹھ گیا تو اسے بجرے پر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ خود عرب بھی بجرے میں بیٹھ گیا اور بجرا آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔

عرب نے پوچھا۔ ”منگول سردار! اس خوشگوار موسم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو فضا کی اداسی میں خوشیاں بکھیر دے۔“
 درداغ نے جواب دیا۔ ”میں گاسکتا ہوں مگر گانے کی وجہ سے میں موسم کی خوشگواریت سے لطف اندوز نہیں ہو سکوں گا۔“

بجرے کے دوسرے مسافر پہلو بدلنے لگے۔ عرب نے ایک سرد آہ بھری بولا۔ ”خلیفہ ہارون رشید کا وقت بھی کیا وقت تھا۔ خلیفہ اپنے وزیر جعفر کو لے کر بھییں بدل کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ آج ہم لوگ سیر و تفریح میں مشغول ہیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”وہ تمہارا دور عروج تھا اور یہ تمہارا.....“

وہ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عرب کو درداغ کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ”منگول سردار! کچھ اپنی قوم کے قصے سناؤ۔ سننا ہوں تم لوگ بہت بہادر، سفاک اور جاہل ہوتے ہو، یہ کہاں تک درست ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ بہادر اور سفاک اس لیے ہوتے تھے کہ ہم پر قدرت نے کبھی بھی رحم نہیں کیا۔ صحرائے گوبی کے اس پار قدرت کے بے رحم جان لیوا موسموں سے لڑ جھگڑ کر زندہ رہنا میری قوم کا خاصہ رہا ہے۔ ہم میں سے بیشتر کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا مگر ہم لوگ جاہل نہیں ہوتے۔ ہمیں مردم شناسی دوسروں سے زیادہ آتی ہے۔ ہم قوموں کے عروج و زوال کے راز سے باخبر ہیں۔“

بجرے کا ایک مسافر درداغ کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تمہارا سب سے بڑا خان جب پیدا ہوا تھا تو اس کے ایک ہاتھ میں گوشت کا لوتھڑا دبا ہوا تھا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جب ہم منگولوں کا سب سے بڑا خان چنگیز خان پیدا ہوا تھا تو اس کی داہنی مٹھی میں

پھر رخم سے خون ٹلیکوں کے ذریعے چوس لیتے ہیں؟“
ایک نے اپنے گال تھپتھپائے۔ ”توبہ توبہ! اور پھر بھی وہ زندہ ہیں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میری قوم پر ہنسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں مسلمان ہو چکا ہوں مگر میرے دل میں اب بھی اپنی قوم اور اپنے مذہب کے لیے ہمدردی اور.....“
عرب نے درداغ کو سمجھایا۔ ”جب تم مسلمان ہو چکے ہو تو پھر.....“

مسافروں نے درداغ سے فرمائش کی کہ وہ انہیں کوئی گیت سنائے۔ لوگوں کے اصرار نے اسے گانے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت استاد شمس الدین کی سردمہری، علیہ کی محبت اور برتنوں کے تاجر کی حرص نے اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ برپا کر رکھی تھی پھر اس نے اپنے پرستاروں کو خوش کرنے کی خاطر گانا شروع کر دیا۔

آواز کی گھن گرج اور اشعار کے شاندار معانی و مطالب نے حاضرین پر ایک سحر سا طاری کر دیا۔ اس نے آخری اشعار میں کہا تھا۔
”استاد، جو صبر و تحمل کا درس دیتا ہے، سردمہری اختیار کرنے لگا۔“

علیہ بے بس ہو گئی، کیونکہ اسے اپنے آپ پر بھی اختیار نہیں ہے۔

برتنوں کا تاجر مجھے سامان تجارت سمجھ کر ایک ایسے شخص کے حوالے کر آیا.....

جو غدار ہے، فریبی ہے، دھوکے باز ہے۔ امیر المومنین سے غداری کرتا ہے، خدا اس کو تباہ و برباد کرے۔“

جب وہ کافی دیر تک بجرے کی سیر اور گانے سے لطف اندوز ہو چکے تو دوسرے مسافروں کے ساتھ اندھیرے میں درداغ بھی بجرے سے خشکی پر کود کرا ترا۔
عرب نے دوسرے دن بھی آنے کی دعوت دی، بولا۔

”منگول سردار! کل ضرور آنا۔“

درداغ نے وعدہ کر لیا۔ ”ضرور آؤں گا۔“
ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ کسی مرد نے پیچھے سے اسے آواز دی۔ آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر اسے اندھیرے میں پہچان نہ سکا۔ آواز دینے والا درداغ کے بالکل پاس پہنچ گیا اور آہستہ سے کہا۔
”درداغ! تو کیسا ہے؟“

اب درداغ نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ استاد شمس الدین تھے۔ اس نے پڑمرہ آواز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہوں، استاد محترم!“
استاد شمس الدین نے کسی اور کو مخاطب کیا۔ ”تو نے درداغ کو اس کی آواز ہی سے پہچان لیا تھا؟“

درداغ نے اندھیرے میں اس دوسری شخصیت کو بھی پہچاننا چاہا مگر جب دوسری طرف سے کوئی آواز ہی نہیں آئی تو درداغ بے بس ہو گیا۔ استاد شمس الدین سے پوچھا۔ ”یہ دوسرا کون ہے..... استاد محترم؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”علیہ! اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا اس لیے میں وجہ کی سیر کرانے لے آیا۔“

درداغ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پورے وجود میں لطف و سرور کی ایک لہری دوڑ گئی۔

استاد نے شکایتیں کرتے رہتے ہوئے۔ ”کیوں درداغ! تم اپنے اشعار میں میری شکایتیں کرتے رہتے ہو؟“

درداغ نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میرے جذبات مجھے بے بس کر دیتے ہیں اور میں جو کچھ بھی کہتا ہوں، مجھے اس کا احساس اور شعور تک نہیں ہوتا۔“

استاد نے ہنس کر کہا۔ ”میں تم سے شکایت نہیں کر رہا بلکہ میں تم سے خوش ہوا ہوں کہ تم بات دل میں نہیں رکھتے، زبان پر لے آتے ہو، یہ اچھی بات ہے۔“

درداغ کٹنا جا رہا تھا، بولا۔ ”ان دنوں..... جن کام میں شکوہ کرتا رہتا تھا، میں بہت مایوس اور دل برداشتہ تھا۔ اگر شہزادہ ابوبکر نے بھی میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! میں نے تجھے اپنا بیٹا سمجھا ہے لیکن ان دنوں میں بالکل مجبور تھا۔ میں نے جو کچھ کیا، مجبوراً کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ابن علقمی ہم دونوں کا کام تمام کر دیتا۔“

پھر بڑے جذباتی لہجے میں شکایت کی۔ ”اور پھر جب خطرات سے نکل کر تم امیر المومنین اور مسلمانوں کے معتمد قرار پائے تو مجھ کو بھلا دیا، علیہ کو بھلا دیا۔“

درداغ نے بے چینی سے کہا۔ ”میں نے ابھی تک کسی کو بھی نہیں بھلایا۔ میں آپ کے پاس آنا بھی چاہتا تھا مگر محض اس لیے نہیں آسکا کہ معلوم نہیں میری آمد سے آپ خوش بھی ہوتے یا نہیں۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”یہ ساری فضول باتیں ہیں، تم اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آج تو نہیں، کل صبح ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! تم میری طبیعت اور مزاج سے واقف ہو۔ اگر تم اس وقت میرے ساتھ نہ گئے تو میں پھر کبھی بھی اپنے گھر نہیں بلاؤں گا۔“

درداغ مجبور ہو گیا اور استاد شمس الدین کے گھر چلا گیا۔ وہاں شمعوں کی روشنی میں اس نے علیہ کو دیکھا۔ دکھتا، چمکتا چہرہ، اس کے ہونٹوں پر خوشی سے مسکراہٹ آئی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں بھی ابھریں اور درداغ کے چہرے کا طواف کرنے لگیں اور کبھی محض جھکی ہی رہتیں۔

استاد شمس الدین درداغ کو علیہ کے پاس چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ جاتے جاتے کہہ گئے۔ ”میں ابھی آیا، تم جانا مت۔“

استاد کے جاتے ہی علیہ ایک دم سوگوار اور افسردہ ہو گئی اور منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ درداغ اب بات کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”علیہ! کیا تم خفا ہو مجھ سے؟“

علیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ درداغ ادھر ادھر دیکھ کر علیہ کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ”مگر تم کیوں خفا ہو مجھ سے..... جبکہ خفا مجھ کو تم سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو بڑی زیادتی کی بات کر رہی ہو تم؟“

علیہ نے آہستہ سے تنک کر پوچھا۔ ”میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، یا میں نے تیرے ساتھ کیا، کون سی زیادتی کی تھی؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”علیہ! اگر سچی بات سن کر برداشت کی قوت رکھتی ہو تو کچھ کہوں، ورنہ خاموش رہوں۔“

علیہ نے بیزاری سے کہا۔ ”تو ساری باتیں استاد پر ڈال دے گا۔ سارا الزام استاد کو دے دے گا اور میں تیرے اس عذر کو کسی قیمت پر بھی نہیں مانوں گی۔“

درداغ نے کہا۔ ”یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ میں تمہارے پاس محض اس لیے نہیں آسکا کہ استاد محترم میری آمد سے خوش نہ ہوتے۔ میں نے بڑے درد سے ہیں، بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ میں چاہتا تو یہاں سے واپس چلا جاتا لیکن میں نہیں گیا۔ محض اس لیے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ بغداد کو چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔“

علیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”جاننا ہے تیرے نہ آنے سے کیا ہوا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا، کیا ہوا؟“

علیہ نے کہا۔ ”مدرسہ مستنصریہ کا ایک رضی نامی طالب علم، استاد محترم کے ساتھ آنے جانے لگا اور اس نے ایک دن مجھ سے اظہارِ عشق بھی کر دیا۔ شاید استاد محترم بھی

اپنے اس شاگرد کو بہت پسند فرماتے ہیں۔“

درداغ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ تمللا کر کھڑا ہو گیا۔ ”کون ہے وہ طالب علم؟ کیا وہ میرا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا تم نے اسے میری بابت بتائیں دیا؟“

علیہ نے دل جلے لہجے میں کہا۔ ”میں اگر بتا بھی دیتی تو اس کا اس نوجوان طالب علم پر کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ تو، تو میدان چھوڑ کر بھاگ ہی چکا تھا۔“

درداغ نے جل کر حاسدانہ انداز میں کہا۔ ”مجھ کو الزام نہ دو۔ میں بالکل بے تصور ہوں۔ میرے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ میں مزید ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ اور علیہ! میں تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب اس نے تجھ سے اظہارِ عشق کیا تھا تو، تو نے اس کو کیا جواب دیا؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس کو اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہنا ہے استاد محترم سے کہے۔ اس سلسلے میں میں خود کوئی بات نہیں کر سکتی۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا اس نوجوان نے استاد محترم سے بات کی اس مسئلے پر؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں شاید کی تو تھی۔“

درداغ نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ”اس نوجوان کو استاد محترم نے کیا جواب دیا؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”شاید یہ کہ کچھ دن صبر کر، پھر دیکھا جائے گا۔“

درداغ کو کسی حد تک قرار آ گیا لیکن شکوک سراٹھا رہے تھے۔ پوچھا۔ ”کیا وہ آج کل بھی آتا جاتا رہتا ہے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں وہ آج کل بھی آ جا رہا ہے کیونکہ وہ ذرا بھی مایوس نہیں ہوا۔“

درداغ نے علیہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں، پوچھا۔ ”وہ تجھ کو کیسا لگتا ہے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”وہ برا نہیں ہے، اچھا لگتا ہے اور تو خود دیکھے گا تو، تو بھی پسند کرے گا۔“

درداغ غصے سے کھڑا ہو گیا۔ ”جب وہ تجھ کو پسند ہی آ گیا ہے تو میرا یہاں مزید رکنا فضول ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“

علیہ نے سرد مہری سے کہا۔ ”تیری مرضی۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

لیکن اسی وقت درداغ کو یہ خیال آیا کہ استاد محترم سے ملے بغیر چلے جانا اچھی بات نہیں ہے۔ رک گیا۔ استاد محترم کافی دیر تک نہیں آئے تو درداغ چلا آیا۔ علیہ نے اسے روکا بھی نہیں۔ جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو اس نے

تو جاسکتا ہے۔ مجھے اپنا کام کرنے دے۔ تو اپنا کام کرتا رہ۔“
گوت طیش میں کھڑا ہو گیا۔ ”تو نے جو کچھ کیا ہے
اچھا نہیں کیا۔ میں تجھ کو قتل کر سکتا ہوں۔ ابن علقمی تجھ کو قتل
کر سکتا ہے اور اگر ہلا کو خان چاہے تو تجھ کو قتل کر دے۔“
درداغ نے کہا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

گوت کھڑا ہو چکا تھا۔ درداغ نے اس سے ہاتھ بھی
نہیں ملایا اور اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ گوت نے جاتے
جاتے کہا۔ ”میں دیکھوں گا تو ہم سے منحرف ہو کر کتنے دن
زندہ رہتا ہے؟“

درداغ کچھ کھائے پیے بغیر ہی بستر پر گر گیا۔ وہ
برآمدے میں لیٹا ہوا تھا۔ یہاں سے وہ آسمان پر بکھرے
ہوئے ستاروں کو بہت ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو اپنی
برگشتہ تقدیر پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اس
نے کسی نہ کسی طرح رات گزاری اور علی الصبح وہ شہزادہ
ابوبکر کے پاس چلا گیا۔ اس وقت شہزادہ فجر کی نماز کے لیے
مسجد جا رہا تھا۔ اس نے درداغ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور
مسجد میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں نے دوسرے بہت
سارے مسلمانوں کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی اور دعا مانگ کر
مسجد ہی میں رک گئے۔ درداغ نے شہزادے کو رات والی
روداد سنا دی، بولا۔ ”شہزادے! یہ بات ہم مسلمانوں کے
لیے بڑی افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے کہ ہمارے دشمن
کے آدمی بغداد میں دندناتے پھریں اور اہل بغداد انہیں کچھ
بھی نہ کہہ سکیں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”لیکن میں تنہا کیا کروں؟
امیر المومنین ابن علقمی کی گرفت میں ہیں۔ اگر ہم انہیں کوئی
بات بتائیں گے بھی تو وہ اسے درخور اعتنا بھی نہ سمجھیں گے۔“
درداغ نے بڑے کرب کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی
آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں وہ
زیر لب ہلا کو خان کو گالیاں دے رہا تھا۔ شہزادے نے اس
کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”درداغ ہوش میں آ، مت
گھبرا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

درداغ نے آنکھیں کھول دیں اور شہزادے کے
سامنے کچھ ندامت سی محسوس کی۔ اس کا دل بھر آیا۔ بھراگی
ہوئی آواز میں بولا۔ ”انسان کو اتنی آزادی ضرور ہونی
چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کے اختیار اور اظہار میں کسی کا خوف
نہ محسوس کرے۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”گوت رہتا کہاں ہے؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا لیکن وہ

چاندنی میں کسی شخص کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے
دیکھا۔ قریب پہنچنے پر درداغ نے اسے پہچان لیا۔ یہ گوت
تھا۔ درداغ نے اس سے بات کیے بغیر ہی گھر میں داخل
ہو جانا چاہا مگر گوت نے اسے آواز دی، بولا۔ ”درداغ! اتنی
غیریت اچھی چیز نہیں ہے۔ میں تجھ سے ملنے آیا ہوں اور تو
مجھے نظر انداز کر کے گھر میں گھسا جا رہا ہے۔“

درداغ نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”میں نے تجھے پہچانا
نہیں تھا۔ ورنہ ملاقات نہ کرنا.....“

گوت نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”بے شک تو اپنوں کو
نہیں پہچانتا، بہر حال مجھ کو تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“
درداغ نے گوت کو اپنے دروازے پر ہی بٹھالیا۔
دیوار سے ملحق لکڑی کا ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ درداغ اپنے ہم
قوم ساتھی گوت کو لے کر اس تختے پر بیٹھ گیا۔ درداغ نے
پوچھا۔ ”تمہیں کس نے رہائی دلوائی؟“

گوت نے متکبرانہ شان سے جواب دیا۔ ”درداغ!
کس کی ہمت ہے جو مجھے قید میں رکھے۔ ابن علقمی کے ایک
اشارے سے میں رہائی پا گیا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”تو مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟“
گوت نے جواب دیا۔ ”درداغ! کیوں اپنی زندگی
کے پیچھے پڑا ہے۔ تو نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ
ہلاکت کی طرف جاتی ہے۔ وقت ہے، اب بھی سوچ لے
اور ہلا کو خان سے غداری نہ کر۔“

درداغ نے کہا۔ ”کیا تو اتنی سی بات کہنے کے لیے
میرے پاس آیا تھا؟ خیر! مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا
مجھے خوب معلوم ہے۔ اب تو جاسکتا ہے۔“

گوت نے تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ ”درداغ! میرے
پاس ہلا کو کا آدمی آیا ہوا ہے۔ وہ ہم دونوں کی کارگزاریوں
کی تفصیل معلوم کر رہا ہے میں اسے کیا جواب دوں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس سے کہہ دے کہ
درداغ منحرف ہو گیا ہے اور میں وہی کروں گا، میرا ضمیر جس
کی اجازت دے گا۔“

گوت نے کہا۔ ”اگر تو اس لڑکی علیہ کی محبت میں اپنی
دنیا برباد کر رہا ہے تو فاش غلطی کر رہا ہے۔ اگر تو مسلمان ہو گیا
ہے تو اب بھی ہلا کو کے لیے کام کر سکتا ہے۔ یہاں دو فرقے
رہتے ہیں۔ تو اپنے لیے جس فرقے کو مفید سمجھتا ہو، وہی
اختیار کر لے اور کچھ ایسی تدبیر کر کہ یہ دونوں فرقے آپس
ہی میں برسر پیکار ہو جائیں۔“

درداغ نے ایک بار پھر سخت لہجہ اختیار کیا۔ ”گوت! اب

شہزادے نے مولے شخص سے پوچھا۔ ”تو کون ہے اور گوت کے پاس ہلا کو خان کا کیا پیغام لے کر آیا ہے؟“
مولے نے گویا شہزادے کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ حیرت سے ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔

شہزادے نے مولے کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔
”میں تجھ سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ تو میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا؟“
مولے نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور شہزادے کی صورت دیکھتا رہا۔

شہزادے نے گوت سے پوچھا۔ ”یہ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتا؟“
گوت نے جواب دیا۔ ”اے عربی یا فارسی نہیں آتی۔“
شہزادے نے درداغ سے کہا۔ ”ذرا منگول زبان میں اس سے یہ تو پوچھ کہ یہ یہاں کیوں آیا ہے؟“
درداغ نے مولے سے منگولی زبان میں سوال کیا۔

”تو ہلا کو خان کی فوج میں کیا کرتا ہے؟“
مولے نے جواب دیا۔ ”ابھی تو کسی کی فوج سے بھی اپنا کوئی تعلق نہیں۔ میں اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور بغداد اسی لیے آیا ہوں کہ میں مسلمان ہو کر اسلام کی خدمت کروں۔“
شہزادے نے پوچھا۔ ”پھر تو ابھی تک مسلمان کیوں نہیں ہوا؟“

مولے نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔“
پھر اس نے گوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ یہ مجھے کسی عالم دین کے پاس پہنچا دے تاکہ میں مسلمان ہو جاؤں مگر گوت ٹال مٹول کرتا رہا۔“

شہزادے نے گوت سے پوچھا۔ ”یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس سلسلے میں تو کیا کہتا ہے؟“
گوت نے جواب دیا۔ ”یہ درست کہتا ہے میں نے ہی سستی سے کام لیا ورنہ یہ تو اسلام قبول کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔“

شہزادے کو ان کی باتوں سے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے گوت سے پوچھا۔ ”بغداد میں قیام سے تیرا کیا مقصد ہے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں بھی اسلام قبول کرنے آیا تھا مگر یہاں میں نے مسلمانوں کو جس حال میں دیکھا اس سے میں پس و پیش میں پڑ گیا اور اسی لیے میں ابلی تک

جہاں کہیں بھی ہوگا۔ ابن علقمی کو اس کا علم ضرور ہوگا۔“
شہزادے نے کہا۔ ”میں گوت کے خلاف ایک انتہائی سخت قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔ خدا مجھے اس کی توفیق عطا کرے اور مجھے حوصلہ دے۔“

درداغ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ شہزادے کی صورت دیکھنے لگا۔ پوچھا۔ ”شہزادے! یہاں کس کی حکومت ہے؟“
شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہماری، اسلام کی، میرے باپ مستعصم باللہ کی۔۔۔۔۔ مگر کیوں؟“
درداغ نے کہا۔ ”پھر گوت کے خلاف قدم اٹھانے میں خدا سے حوصلہ یا توفیق طلبی کی کیا ضرورت ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہم غداروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ابن علقمی جیسا مضبوط آدمی ہلا کو خان کے مفادات کی نگرانی کر رہا ہے۔ گوت یا اس جیسے کسی شخص کے خلاف کوئی قدم بھی اٹھانا معمولی بات نہیں ہے۔“
شہزادہ درداغ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی سپاہ میں پہنچا اور یہاں سے پچاس سپاہیوں کو لے کر گوت کو تلاش کرنے لگا۔ گوت کو ڈھونڈ نکالنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ جس مکان میں مقیم تھا ابن علقمی کا دیا ہوا تھا۔ گوت آواز سن کر باہر نکلا۔ اس نے اپنے سامنے شہزادہ ابو بکر اور درداغ کو دیکھا تو پریشان ہو گیا، پوچھا۔ ”آپ کو مجھ سے کوئی کام؟“
شہزادے نے پوچھا۔ ”وہ شخص کہاں ہے جسے ہلا کو خان نے تیرے پاس بھیجا ہے؟“

گوت اور زیادہ پریشان ہو گیا، بولا۔ ”یہاں تو میں تنہا ہی رہتا ہوں، میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔“
شہزادے نے طیش میں کہا۔ ”مجھ سے جھوٹ مت بول۔ میں اسی وقت تیرے گھر کی تلاشی لے کر ہلا کو خان کے فرستادے کو پکڑ لوں گا۔“

شہزادے نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اندر داخل ہو جاؤ اور وہاں جو کوئی بھی ہے اس کو گرفتار کر کے باہر لے آؤ۔“
پچاس سپاہیوں کا دستہ گوت کے مکان میں داخل ہو گیا اور کچھ دیر بعد چند سپاہی ایک مولے آدمی کو پکڑ کر باہر لے آئے۔ اس فربہ انسان کی شکل پر کڑھکی پائی جاتی تھی۔ سپاہیوں نے اسے شہزادے کے قدموں میں گرادیا۔ شہزادے نے گوت کی طرف شاکی نظریں ڈالیں اور کہا۔ ”تو تو کہتا تھا اندر کوئی بھی نہیں۔ پھر یہ کہاں سے نکل آیا؟“

گوت نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”کیا کسی آدمی کا اندر موجود ہونا جرم ہے؟ اور پھر یہ منگول تو مسلمان ہونے آیا ہے۔ اس کے دل میں اسلام کی بڑی عزت ہے۔“

بندھا ہوا نہ ہوتا تو شاید ہاتھ پائی کر بیٹھتا۔ اس نے شہزادے سے پوچھا۔ ”شہزادے! آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں تیرے مکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“

مسلمان نہیں ہو سکا۔ اسلام نہیں قبول کر سکا۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”یہاں تو نے مسلمانوں کو کس حال میں دیکھا؟ اور مسلمانوں کی کس چیز نے تجھ کو پس و پیش میں ڈال دیا؟“

گوت نے منگولوں کے اجڈ انداز میں جواب دیا۔ ”شہزادے! میں آپ کے ادب و احترام میں مروت اور رعایت سے کام نہیں لوں گا۔ بات صاف صاف کروں گا۔ میں نے بغداد میں دو قسم کے مسلمان دیکھے ہیں۔ ان دونوں کے طریقہ عبادت میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ عقیدوں میں بھی فرق ملتا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں کون سا اسلام قبول کروں؟“

شہزادے نے کہا۔ ”جب تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تو کون سا اسلام قبول کرے، تو تجھے بغداد سے چلے جانا چاہیے۔ یہاں رہ کر تو اپنا وقت کیوں برباد کر رہا ہے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”وقت میرا اپنا ہے۔ میں اسے برباد کروں یا کام میں لاؤں۔ آپ اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔“

شہزادے نے بگڑ کر کہا۔ ”میں اس میں دخل اندازی کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تو یہاں کیوں آیا ہے؟ تو ہلا کو خان کا جاسوس ہے، تو خیر ہے، تو سازشی ہے، تو مفسد ہے۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”شہزادے! آپ مجھ پر تہمت لگا رہے ہیں۔“

شہزادے نے دردناغ سے کہا۔ ”دردناغ! تو اس موٹے منگول سے پوچھ کہ یہ میرے ساتھ چل کر اسلام قبول کرنے کو تیار ہے یا نہیں؟“

دردناغ نے جب بھی سوال موٹے منگول سے کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں اس کے لیے تیار ہوں۔

شہزادے نے اس کو اپنے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ انہیں ہدایت کی کہ وہ اسے چھاؤنی میں لے جائیں اور میرا انتظار کریں۔

پانچ سپاہی موٹے منگول کو چھاؤنی لے گئے۔ شہزادے نے گوت کو رسیوں سے بندھوایا اور دردناغ اور گوت کو لے کر گوت کے مکان میں گھس گیا، بولا۔ ”آج میں اپنے شکوک کی چھان بین کروں گا۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ گوت کے مکان میں کچھ ہے۔“

دردناغ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”گوت کے مکان میں کیا کچھ ہے شہزادے؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

گوت کو شہزادے پر بڑا غصہ آ رہا تھا..... اگر وہ

گوت نے سختی سے منع کیا۔ ”آپ ایسا نہیں کریں گے شہزادے! یہ بڑی زیادتی ہے اور خاص کر اس صورت میں کہ میرے گھر میں مشتبہ کوئی چیز بھی نہیں۔ آپ اپنے مہمان کو ذلیل نہ کیجیے۔“

شہزادے نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا کام شروع کریں اور گوت کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیں۔

تلاشی لینے والوں کے ساتھ ساتھ شہزادہ اور دردناغ بھی تھے۔ گوت نے دھمکی دی۔ ”میں ابن علقمی سے آپ دونوں کی شکایت کروں گا کیونکہ پورے بغداد میں اس سے زیادہ شریف، دیانتدار، معاملہ فہم اور ہوشیار ایک آدمی بھی نہیں اور مجھے یہ یقین ہے کہ ابن علقمی ہی تمہیں تمہاری شرارتوں کا بہترین جواب دے سکے گا۔“

شہزادے نے گوت کے سامان کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ یہاں زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک لکڑی کا صندوق تھا۔ اس صندوق میں گوت کے کپڑے رکھے تھے۔ شہزادے نے کپڑے کے جوڑوں اور موڑھوں کو خوب خوب ٹٹول کر دیکھا۔ برتنوں کو الٹا پلٹا اور ان کے مجلہ حصوں میں کسی قسم کی تحریر کے آثار ڈھونڈتے رہے۔ جوتیوں کے تلے ادھیڑ ادھیڑ کر کچھ تلاش کرتے رہے۔ اس تلاش کے دوران وہ جب بھی کوئی چیز اٹھاتا یا دیکھنے کی نیت کرتا تو وہ کچھ کرنے سے پہلے گوت کی صورت ضرور دیکھتا۔ اس طرح شہزادہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ گوت اپنی کس چیز پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔

اس کے بستر سے بھی کوئی مشتبہ چیز نہیں برآمد ہوئی۔ ایک طرف نیزے کی انیوں کی بڑی بہتات تھی جبکہ نیزے کی چھڑندار تھی۔ شہزادے نے نیزے کی انیاں اٹھائیں تو گوت تلملانیے لگا، بولا۔ ”شہزادے! آپ میرے ہتھیاروں کو ہاتھ نہ لگائیں، براہ کرم میری درخواست پر توجہ دیں۔ مجھ پر رحم کریں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”شاید میں ان انیوں کے علاوہ تمہارا ایک ہتھیار بھی نہ چھیڑوں کیونکہ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مجھ کو ان انیوں ہی سے وہ چیز مل جائے گی جس کی مجھے تلاش ہے۔“

سے کچھ بھی نہ نکلا۔ اب شہزادے نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ جملہ انیوں سمیت... گوت کو لے کر چھاؤنی چلیں۔ حکم پر فوراً عمل ہوا اور یہ لوگ چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

چھاؤنی میں موٹا منگول پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ گوت کو چھاؤنی میں لے جا کر ایک خیمے میں قید کر دیا گیا۔ شہزادہ دونوں خطوں کو اپنے خیمے میں لے گیا اور اسے اپنے بستر پر پھیلا کر پڑھنے لگا۔

دونوں میں سے ایک خط خواجہ نصیر الدین طوسی کے نام لکھا گیا تھا، ابن علقمی نے اپنے اس خط میں لکھا تھا۔ ”میں نے منگول فاتح ہلاکو خان کے لیے بغداد کی تسخیر آسان کر دی ہے۔ آپ اسے جلد از جلد لے آئیں۔ میں جس فرقے سے تعلق رکھتا ہوں، وہ ہلاکو خان کے ساتھ ہے۔ یہاں کے نصرانی بھی منگول فاتح کا ساتھ دیں گے۔ ہلاکو خان کو جلد از جلد بغداد پر حملے کے لیے آمادہ کر لیجئے۔ ہم سب خوش آمدید کہنے کے لیے چشم براہ ہیں۔“

دوسرا خط ہلاکو خان کے نام تھا۔ اس میں منگول فاتح کو یقین دلایا گیا تھا کہ وہ بغداد تشریف تولائے۔ اہالیان بغداد اس کا شاندار استقبال کریں گے اور اگر چند حقوق نے اس کا راستہ روکا بھی تو انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح منتشر کر دیا جائے گا۔ فصل تیار ہے اور اب فصل کاٹنے والوں کا انتظار ہے، و جتنی جلدی آئیں گے یہ کام اپنے انجام کو پہنچے گا۔

شہزادے نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ چشم تصور سے بغداد کو آگ اور خون میں ڈوبتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے گوت سے پوچھا۔ ”یہ خط ابن علقمی کے ہیں۔ اس قسم کے اور کتنے خط ہلاکو خان کو بھیجے جا چکے ہیں۔“ گوت نے انکار کر دیا۔ ”ایک بھی نہیں، ان خطوں میں مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“

شہزادے نے کہا۔ ”لیکن یہ دونوں خط مجھے تیرے پاس سے ملے ہیں تو انکار کس طرح کر سکتا ہے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”جس طرح انکار کر رہا ہوں۔“ شہزادے نے گوت کو اپنے محل کے ایک حصے میں قید کر دیا کیونکہ وہ خیمے میں قید کر کے اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دردناخ سے مشورہ پوچھا۔ ”تو بھی ہلاکو خان جاسوس بن کر آیا تھا؟ تیرا کیا خیال ہے، یہ گوت اصل بات چھپا رہا ہے نا؟“

دردناخ نے جواب دیا۔ ”شہزادے! آپ کی کزنہ

گوت نے تملاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اسلام اپنے مہمانوں سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے؟“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”تو میرا مہمان کب سے اور کیونکر بن گیا؟ تو ابن علقمی کا مہمان ہو سکتا ہے، میرا مہمان نہیں ہو سکتا۔“

گوت زمین پر گر کر مچلنے لگا۔ ”شہزادے! مجھے آزاد کر دو تاکہ میں اس تلاشی میں آپ کی مدد کروں۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے شاید اس کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔“

شہزادہ بدستور نیزے کی انیوں ہی میں کچھ تلاش کرتا رہا تھا۔ انیوں کے خول والا حصہ شہزادے کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پندرہ سولہ انیوں میں سے دو کو اس نے الگ کر لیا۔ ان کے خول میں کچھ بھرا ہوا تھا..... شہزادے نے انگلیوں کی مدد سے خول سے دو باریک کیڑے نکالے، ان کیڑوں کو کھول کر زمین پر پھیلا دیا تو اس پر عربی میں لکھا ہوا نظر آیا۔ شہزادے نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ دو خط تھے۔ ایک خط..... نصیر الدین طوسی کے نام تھا اور دوسرا ہلاکو خان کے نام۔

شہزادے نے گوت کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”گوت! یہ کیا ہے؟“ گوت نے جواب دیا۔ ”میں کیا جانوں یہ کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہے آپ کے سامنے ہے اور آپ کا اپنا ہے۔“ شہزادے نے پوچھا۔ ”میرا اپنا کس طرح؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھ کو باندھ کر بے بس کر دیا اور میری بے بسی کا فائدہ اس طرح اٹھایا کہ نیزے کی دو انیوں کے خول میں دو فرضی اور جعلی خط رکھ دیے۔ اب پتا نہیں ان خطوں میں کیا لکھا ہوا ہے؟“

شہزادے نے غصے سے کہا۔ ”گوت! دیکھ مجھے غصہ نہ دلا، مشتعل نہ کر، ورنہ میں اس کا ایسا جواب دوں گا.....“ گوت نے کہا۔ ”اب بھی وقت ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیا جائے ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”بات تو جتنی بگڑنی تھی بگڑ چکی۔“ شہزادے نے ان دونوں خطوں کو پڑھا نہیں، چپ چاپ اپنی تحویل میں لے لیا اور تلاشی لینے والوں کو حکم دیا کہ خول والی چیزوں پر خاص نظر رکھی جائے اس میں سے کچھ نکل سکتا ہے۔

شہزادے کے آدمیوں نے ایک ایک چیز دیکھ ڈالی۔ ہر چیز کی تلاشی لے ڈالی مگر ان دو خطوں کے علاوہ اس گھر

شہزادے نے ورداغ کی مدد سے موٹے منگولوں سے باتیں کیں مگر اس سے بھی کوئی کام کی بات نہیں معلوم ہو سکی۔ وہ باصرار یہی کہتا رہا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے اور بغداد میں وہ صرف اس لیے آیا ہے کہ اسلام کی بابت تحقیق کرے۔

☆☆☆

خلیفہ مستعصم باللہ کے لیے یہ بات وبال جان بنی ہوئی تھی کہ اس کے امرا اور منصب داروں میں بڑی زور شور کی جنگ جاری تھی۔ یہ درباری امرا دو فریقوں کی شکل میں نمودار ہوئے تھے اور ہر فریق دوسرے فریق کو غدار، جاہل، نالائق اور موقع پرست کہہ رہا تھا۔ ان میں سے ایک فریق ابن علقمی کے ساتھ تھا اور دوسرا شہزادہ ابوبکر کے ساتھ۔

مجاہد الدین نے خلیفہ سے تخلیہ میں ملاقات کی اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دونوں خط خلیفہ کے سامنے رکھ دیے اور کہا۔ ”امیر المومنین! آپ ان امور اور ان معاملات پر غور کیجیے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ آپ انہیں بھی وقت کے حوالے کر کے گہری نیند سو جائیں۔ مجھے معتبر ذرائع اور عقلی تجربے سے جو کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بہت ہی افسوس ناک ہے۔ آپ ان پر فوراً توجہ فرمائیں۔“

خلیفہ نے ان دونوں خطوط کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا یہ دونوں خط اصلی ہیں؟“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”بالکل اصلی ہیں امیر المومنین۔“

خلیفہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ خاموش سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر خفت زدہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”یقین نہیں آتا، ابن علقمی ایسا کیوں کرے گا؟“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! ابن علقمی عباسی خلافت کو تباہ کر کے علوی خلافت کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے۔ ابن علقمی کی نیت صاف نہیں ہے۔“

لیکن خلیفہ متامل تھا۔ وہ معلوم نہیں کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد بولا۔ ”میں حیران ہوں کہ ابن علقمی ایسا کیوں کر رہا ہے۔ مجھے کو اب بھی ان خطوط کی صداقت پر شبہ ہے۔ میں کس طرح یقین کر لوں کہ یہ دونوں خط ابن علقمی ہی کے ہیں؟“

مجاہد الدین نے عرض کیا۔ ”آپ اس لیے میری باتوں پر یقین کر لیں کہ ان دونوں خطوط کو شہزادہ ابوبکر نے گوت نامی منگول کے گھر سے برآمد کیا ہے اور شہزادہ دروغ گو ہرگز نہیں ہے۔“

خلیفہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر میں کیا

حکومت گوت، ابن علقمی اور ان جیسے دوسروں کے خلاف کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ ورنہ یہ جتنا کچھ معلوم ہو گیا ہے اس کے پیش نظر غداری میں ملوث حضرات کو قتل ضرور کیا جاسکتا تھا۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”کیا موٹا منگول بھی اس سلسلے میں کچھ بتا سکتا ہے؟“

ورداغ نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں بتایا جائے گا یا نہیں، لیکن اس کو معلوم سب کچھ ہوگا، آپ حکمت عملی سے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔“

شہزادہ سوچنے لگا کہ اس مسئلے کو آگے کس طرح بڑھایا جائے۔ اس کو یاد آیا کہ خلافت کی انتظامیہ میں ایک صاحب موجودہ خلیفہ سے پہلے کے ہیں، مجاہد الدین ایک سرودات دار (چیف سیکریٹری) خلیفہ ان کی بڑی عزت کرتا ہے۔ شہزادہ ابوبکر نے مجاہد الدین ایک کو بلوایا اور ابن علقمی کے بارے میں ان سے کئی سوال کیے، پوچھا۔ ”محترم بزرگ! آپ ابن علقمی کی بابت کیا جانتے ہیں؟“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”یہ کہ وہ قابل اعتبار ہرگز نہیں۔ یوں ابن علقمی لائق انسان ہے مگر ساتھ ہی غدار بھی ہے۔“ پھر اس نے خطوط کو غور سے دیکھا، پہچان بھی لیا کہ یہ دونوں خطوط ابن علقمی ہی کے ہیں۔

مجاہد الدین نے کہا۔ ”شہزادے! آپ امیر المومنین کے پاس جانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیجیے گا کہ آپ وہاں ثابت کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میں ان دونوں خطوط کو امیر المومنین کی خدمت میں اکیلا لے جاؤں گا لیکن شاید یہ بھی درست ہے کہ ابن علقمی اس کا توڑ تیار رکھے گا۔“

مجاہد الدین نے مشورہ دیا۔ ”شہزادے! ان دونوں خطوط کو امیر المومنین کے پاس آپ نہ لے جائیں کیونکہ امیر المومنین آپ کے والد ہیں۔ آپ ان سے بات نہیں کر پائیں گے۔ انہیں میں لے جاؤں گا امیر المومنین کے پاس.....“

شہزادے نے مجاہد الدین کی باتوں میں وزن محسوس کیا اور اس نے دونوں خط ان کے حوالے کر دیے، کہا۔ ”آپ امیر المومنین کو کسی طرح یہ یقین دلا دیجیے کہ ابن علقمی غدار ہے۔ اس کا فوراً ہی ہٹایا جانا بہت ضروری ہے۔“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”میں کوشش تو پوری پوری کروں گا مگر پتا نہیں کہ اس میں مجھے کامیابی بھی ہوگی یا نہیں۔“

مجاہد الدین شہزادے کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ دونوں خط لے کر واپس چلا گیا۔

ابن علقمی نے ایک بار پھر مجاہد الدین کی طرف دیکھا اور عاجزی سے عرض کیا۔ ”میں امیر المومنین کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔“

خلیفہ نے دونوں خط ابن علقمی کی طرف بڑھا دیے، پوچھا۔ ”کیا وہ دونوں خط تمہارے ہیں؟“

ابن علقمی دونوں خطوں کو پڑھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ آخر میں پوچھا۔ ”امیر المومنین! یہی دو خط ہیں یا کچھ اور بھی ہیں؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”فی الحال تو یہی دو خط ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اور بھی ہوں اور مجھ تک نہ پہنچے ہوں۔“

ابن علقمی ہنسنے لگا۔ ”یہ منصوبہ ہے کسی بڑے شاطر اور ماہر کا میں تو ان دونوں خطوط کو دیکھ اور پڑھ کر سناٹے میں آ گیا ہوں۔“

خلیفہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں! میں خود حیران ہوں کہ آخر یہ شرارت ہے کس کی؟“

ابن علقمی نے زیر لب مسکراتے اور سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔ ”جس شخص نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اس سے کسی حد تک واقف ہو چکا ہوں اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اسی وقت اس سازش اور سازشیوں کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔“

خلیفہ نے ابن علقمی سے دوسرے معاملات پر بات چیت شروع کر دی اور ابن علقمی بھی بڑے مزے میں مصروف گفتگو رہا۔

مجاہد الدین خاموش بیٹھا تھا۔ اس کو خلیفہ پر غصہ آ رہا تھا کہ ابن علقمی کو جس مقصد سے طلب کیا گیا تھا۔ خلیفہ کو اس کا ہوش ہی نہ تھا بلکہ ابن علقمی کی موجودگی میں خلیفہ نے مجاہد الدین کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جب وہ بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تو اس نے خلیفہ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے کسی تامل کے بغیر اجازت دے دی۔

مجاہد الدین جیسے ہی کھڑا ہوا۔ ابن علقمی نے کہا۔ ”کہاں چلے؟ اچھی رکو۔ مجھ کو تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

مجاہد الدین نے تعجب سے پوچھا۔ ”مجھ سے باتیں کرنا ہیں۔ آپ کو! کس قسم کی باتیں؟“

ابن علقمی نے حیکمے انداز میں کہا۔ ”زیادہ چالاک نہ بنو۔ میں تم سب کو خوب پہچانتا ہوں۔“

مجاہد الدین نے تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ ”وزیر محترم! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

ابن علقمی نے خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کچھ مشورہ تو دو۔“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”آپ ابن علقمی کو فوراً معزول کر دیں اور غداری کے الزام میں اس پر مقدمہ چلائیں۔“

خلیفہ کانپ گیا۔ ”میں اتنا بڑا قدم ابن علقمی کے خلاف کس طرح اٹھاؤں؟“

مجاہد الدین نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! وقت کسی کا پابند نہیں ہوتا۔ اس وقت زمانہ آپ کا ہے، آپ حکم دے سکتے ہیں کسی بھی قسم کا حکم..... حکم کی تعمیل کرانے کے لیے انتظامیہ ہے۔ آپ اس کا فائدہ اٹھائیے۔“

خلیفہ مستقل فکر مند تھا۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ایسا کیوں نہ کروں کہ ابن علقمی کو یہیں خلوت میں بلوالوں اور یہ ساری باتیں اس کے سامنے ہو جائیں۔“

مجاہد الدین اداس ہو گیا، بولا۔ ”امیر المومنین کے کسی فیصلے میں تغیر و تبدل کا حق مجھے کس نے دیا؟ امیر المومنین جو مناسب سمجھیں کریں۔“

خلیفہ نے اسی وقت حکم جاری کیا کہ ابن علقمی کو فوراً دربار خلافت میں حاضری دینے کا پابند کیا جائے۔

اس دوران خلیفہ مستقل فکر و تردد اور تذبذب کا شکار رہا۔ وہ مجاہد الدین سے بار بار یہی کہتا رہا کہ شاید یہ خط جعلی ہیں۔ ابن علقمی ایسے خط کیوں لکھے گا؟ اور یہ کہ کوئی ابن علقمی کے خلاف یہ شرارت تو نہیں کر رہا۔

اور مجاہد الدین بار بار یہی سمجھانے اور بتانے کی کوشش کرتا کہ دونوں خط اصلی ہیں۔ ابن علقمی غدار ہے۔ اس کو برطرف کر کے غداری کے جرم میں مقدمہ چلائیے اور سزا دلوائیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو زمانہ بہت جلد ہم سب پر اناللہ پڑھ دے گا۔

خلیفہ کو جیسے ہی مطلع کیا گیا کہ ابن علقمی باریابی کا طلب گار ہے اس نے فوراً ہی طلب کر لیا۔ جب ابن علقمی سامنے آیا تو خلیفہ ازراہ احترام کھڑے ہونے کے انداز میں ہلا اور بیٹھ گیا۔

ابن علقمی نے مجاہد الدین سر دوات دار کو غور سے دیکھ کر منہ بنایا اور خلیفہ سے پوچھا۔ ”امیر المومنین! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے، نصیب دشمنان، صحت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

خلیفہ کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ جواب دیا۔ ”میں نے تمہاری بابت جو کچھ سنا ہے، اس کی تصدیق یا تردید کے لیے تمہیں بلوایا ہے۔ خدا کرے تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

مجاہد الدین نے مجاہد الدین سر دوات دار کو غور سے دیکھ کر منہ بنایا اور خلیفہ سے پوچھا۔ ”امیر المومنین! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے، نصیب دشمنان، صحت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

خلیفہ کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ جواب دیا۔ ”میں نے تمہاری بابت جو کچھ سنا ہے، اس کی تصدیق یا تردید کے لیے تمہیں بلوایا ہے۔ خدا کرے تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

مجاہد الدین نے مجاہد الدین سر دوات دار کو غور سے دیکھ کر منہ بنایا اور خلیفہ سے پوچھا۔ ”امیر المومنین! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے، نصیب دشمنان، صحت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

خلیفہ کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ جواب دیا۔ ”میں نے تمہاری بابت جو کچھ سنا ہے، اس کی تصدیق یا تردید کے لیے تمہیں بلوایا ہے۔ خدا کرے تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

مجاہد الدین نے مجاہد الدین سر دوات دار کو غور سے دیکھ کر منہ بنایا اور خلیفہ سے پوچھا۔ ”امیر المومنین! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے، نصیب دشمنان، صحت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

امیر المومنین کے انتقال پر ملال کا کب تک انتظار کریں۔ ان کے اندر حکومت اور فرماں روا کی ہوک سی اٹھتی رہتی ہے۔ وہ حکمران بننا چاہتے ہیں مگر افسوس کہ میں ان پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، میں ان سے سے باخبر رہتا ہوں۔ چنانچہ شہزادے نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ بنایا تا کہ وہ مجھے وزارت سے نکلوا کے اپنی خلافت کی راہ ہموار کر لیں۔“ پھر وہ اور زیادہ بلند آواز میں بولنے لگا۔ ”مجاہد الدین! شہزادے سے کہہ دینا کہ جب تک ابن علقمی موجود ہے، وہ زندہ ہے، امیر المومنین کو کوئی بھی ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔“

خلیفہ نے حیرت سے ابن علقمی کو دیکھا اور پھر پوچھا۔ ”کیا یہ جو کچھ تو نے کہا، یہ درست ہے؟“ ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔“

خلیفہ نے مجاہد الدین سے کہا۔ ”اگر یہ بات درست ہے تو تم شہزادے سے کہہ دینا، بہت بری بات ہے۔“ مجاہد الدین نے کہا۔ ”امیر المومنین! وزیر موصوف بلا کے چالاک اور ہوشیار ہیں۔ شہزادے کو حکومت کی کوئی بھی خواہش نہیں۔ یہ خط جعلی نہیں ہیں اصلی ہیں اور ابن علقمی ہی نے ہلا کو خان اور نصیر الدین طوسی کو الگ الگ خط لکھے ہیں۔“ ابن علقمی برہم ہو کر ٹپکنے لگا، بولا۔ ”امیر المومنین! اس سے فرما دیجیے کہ اب مزید جسارت نہ کرے، ورنہ میں اس کا منہ توڑ دوں گا۔ میں اس کی بکواس نہیں برداشت کر سکتا۔“

خلیفہ نے مجاہد الدین کو ڈانٹ دیا۔ ”مجاہد الدین! اگر تم سچے ہو تو ان دونوں خطوط کے سلسلے میں سچے ثبوت پیش کرو، ورنہ خاموش ہو جاؤ اور اپنے دل میں یہ عہد کر لو کہ آئندہ تم اس قسم کی سازش نہیں کرو گے۔“

مجاہد الدین نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! اس کی باتوں میں نہ آئیے گا، وزیر موصوف زبردست اداکار ہیں۔“ ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”اگر میں اداکار ہوں تو تم دونوں مجھ سے بڑے اداکار ہو، شرم کرو جو ایک شریف النفس اور دیندار باپ کی جان کے درے ہو رہے ہو۔“

مجاہد الدین نے جاتے جاتے کہا۔ ”تو ایک بار، دوبار، تین بار امیر المومنین کو باتوں میں لے لے گا لیکن یہ داؤ بار بار نہیں چلے گا۔ میں ایک نہ ایک دن اس طلسم کو توڑ کر رہوں گا۔“

مجاہد الدین چلا گیا تو ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! یہ شخص بہت زیادہ خطرناک ہے۔ یہ اور اس

”امیر المومنین! اگر میں جوش اور جذباتوں سے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہوں تو آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا کیونکہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سازش اور سازشیوں کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ اب میں وہ بھانڈا پھوڑنا چاہتا ہوں۔“

خلیفہ نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ کہا۔ ”ابن علقمی! تجھ کو اجازت ہے اور آزادی حاصل ہے جس طرح چاہے بات چیت کرے اور میں خود بھی یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ خط والی حرکت ہے کس کی؟“

ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! مجاہد الدین سے دریافت فرمائیں کہ انہیں یہ دونوں خط کس نے دیے ہیں؟ یہ دونوں خط شہزادہ ابو بکر نے دیے ہیں، ولی عہد بہادر نے۔“ ابن علقمی نے مجاہد الدین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میں سچ بول رہا ہوں؟“

مجاہد الدین نے جواب دیا۔ ”دونوں خط مجھے ملے تو شہزادے ہی سے ہیں لیکن یہ دونوں خط گوت نامی منگول کے گھر سے ملے ہیں۔“

ابن علقمی نے اور زیادہ تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ ”مجاہد الدین! اپنی اوقات میں رہ، تجھ سے جتنی بات پوچھی جا رہی ہے تو اسی کا جواب دے۔ میں امیر المومنین کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تیرے پاس یہ دونوں خط کہاں سے آئے؟“ خلیفہ حیران پریشان بھی ابن علقمی کی صورت دیکھتا اور کبھی مجاہد الدین کی۔

مجاہد الدین اپنی اہانت برداشت نہ کر سکا، ذرا زور سے بولا۔ ”ابن علقمی! تو غدار ہے۔ یہ دونوں خط تیرے ہیں۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”مجاہد الدین! میرا منہ نہ کھلوا، کیونکہ میں جس حقیقت سے واقف ہوں اگر وہ امیر المومنین پر واضح ہوگئی تو شاید ان کے لیے ناقابل برداشت ٹھہرے۔“ خلیفہ نے بے چینی سے کہا۔ ”نہیں ابن علقمی! تو مجھ سے کچھ بھی نہ چھپا۔ ہر بات میرے علم میں لے آ۔“

مجاہد الدین بھی جوش اور غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ زور زور سے کہہ رہا تھا۔ ”تو عباسی خلافت پر علوی خلافت قائم کرنا چاہتا ہے لیکن جب تک ہم لوگ موجود ہیں تیرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔“

ابن علقمی نے خلیفہ سے کہا۔ ”امیر المومنین! آپ اس کی باتوں پر نہ جاییے کیونکہ یہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے جھوٹ ہے، فریب ہے، ریاکاری ہے، سچ کیا ہے؟ وہ میں بتاؤں گا۔ امیر المومنین! بات صرف اتنی سی ہے کہ ولی عہد بہادر،

ساتھ کھائے گا۔ خلیفہ جس ہال میں کھانا کھاتا تھا اس کے در و دیوار رنگین پھولدار کپڑوں سے چھپے رہتے تھے۔ ہال کے درمیان میں انواع و اقسام کے کھانے لالا کر رکھے جاتے رہے۔ شاہی خدام صاف ستھرے لباس میں ادھر ادھر..... رواں دواں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تولیا نما رومال تھے۔ شاہی خاندان کی خواتین اور شہزادے کھانوں کے آس پاس آکر بیٹھنے لگے۔ خلیفہ سب سے آخر میں ہال میں داخل ہوا۔ حاضرین اس کو آتا دیکھ کر ازراہ احترام کھڑے ہو گئے۔ دسترخوان پر تیس بیٹیں قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ خلیفہ نے ایک نظر دسترخوان پر ڈالی اس کے بعد حاضرین کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ان میں شہزادہ ابوبکر کو تلاش کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”شہزادہ ابوبکر کہاں ہے؟“

ایک عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! وہ نہیں آئے گا۔ اس نے معذرت کہلا بھیجی ہے۔“

خلیفہ کو غصہ آ گیا۔ ”وہ کیوں نہیں آئے گا جبکہ میں نے اسے بطور خاص مدعو کیا تھا۔“

شہزادہ ابوبکر کی ماں نے کہا۔ ”امیر المومنین اپنے بیٹے پر شک کرنے لگے ہیں اس لیے مارے شرم کے وہ آپ کے سامنے نہیں آ رہا ہے۔“

خلیفہ نے حکم دیا۔ ”شہزادہ ابوبکر جہاں کہیں ہو اسے میرے سامنے لایا جائے۔“

دسترخوان پر جمع ہونے والوں میں تہلکہ مچ گیا۔ خلیفہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جس کو وہ بے دلی سے پڑھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد شہزادہ ابوبکر بھی آ گیا۔ وہ یہاں زبردستی لایا گیا تھا۔ خلیفہ دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ شہزادہ ابوبکر کو خلیفہ کے داہنی طرف بٹھا دیا گیا۔

کھانا کھانے کے دوران خلیفہ نے نظریں ملائے بغیر شہزادے سے پوچھا۔ ”کیا حکومت تمہیں بہت زیادہ پسند ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں مگر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“

خلیفہ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتیں اور لوگ بھی شیخ۔ اس لیے ہم دونوں آہستہ آہستہ بائیں کریں گے۔“

شہزادہ مچھلی کھانے میں مصروف تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے کہا۔ ”امیر المومنین! آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا حکومت مجھے پسند ہے میں یہ سوال کرنے کی جرأت

جیسے کچھ اور ہیں جو شہزادے کو شب و روز درغلالتے رہتے ہیں، امیر المومنین کو ان کا علاج کرنا چاہیے۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”ابن علقمی! مجاہد الدین کو میرے والد مرحوم نے سردوات دار (چیف سیکریٹری) مقرر کیا تھا۔ میں اس کو برطرف کر کے والد محترم کی روح کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ ورنہ یہ تمہارا یا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔“

ابن علقمی نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”امیر المومنین! میں تو سیدھی سچی بات جانتا ہوں۔ باغبان بارغ کے ان درختوں اور پودوں کو کاٹ کر یا اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے جو سڑنے گلنے لگتے ہیں اور ان سے یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے اچھے پھلے درختوں اور پودوں کو بھی خراب کر کے رکھ دیں گے۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”بہر حال اگر تیری یہی مرضی ہے کہ میں ان سازشیوں کا قلع قمع کروں تو میں ایسا کرنے کو بھی تیار ہوں۔“

ابن علقمی کے چہرے پر ایک تازگی سی آگئی۔ خلیفہ اس سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔

خلیفہ نے کہا۔ ”ابن علقمی! دونوں خط جس کسی نے بھی لکھے ہیں..... خوب لکھے ہیں۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”پتا نہیں یہ شہزادے کو کیا ہو گیا ہے جو امیر المومنین کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھ سے شہزادہ یوں ہی ناراض اور برہم رہتا ہے ورنہ میں اس کو ضرور سمجھاتا۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں شہزادے سے بات کروں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جس سے دین میں بھی اور دنیا میں بھی منہ کالا ہو۔“

ابن علقمی نے کہا۔ ”امیر المومنین! یقین فرمائیں ہلاکو خان کے پاس سے جو بھی آتا ہے یہی پیغام لے کر آتا ہے کہ ہلاکو خان مسلمان ہونے کے لیے بے چین ہے۔ منگول فاتح تو امیر المومنین اور مسلمانوں کے لیے جذبہ خیر سگالی رکھتا ہے اور یہ لوگ اس کے نام میری طرف سے جعلی خط لکھ لکھ کر امیر المومنین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہلاکو خان بغداد اور اسلام کی بربادی کے منصوبے بنا رہا ہے۔“

خلیفہ نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ ”افسوس کہ میں ان نالائقوں اور کور چشموں کو کس طرح سمجھاؤں؟“

دونوں دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ ابن علقمی خلیفہ کو بے وقوف بناتا رہا اور خلیفہ بے وقوف بنتا رہا۔

شب کو خلیفہ نے حکم دیا کہ شہزادہ ابوبکر کھانا اس کے

پہنچانا چاہتا بلکہ میں اپنی صف میں سے اس شخص کو نکال باہر کرنا چاہتا ہوں جو ہم میں نفاق و منافق کا سبب بنا ہوا ہے۔“
 خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا وہ منگول جو بغداد آچکے ہیں یا آنے والے ہیں اور اپنے آنے کی غایت یہ بتاتے ہیں کہ وہ اسلام سے متاثر ہو کر اس کو قریب سے دیکھیں گے پھر مسلمان ہو جائیں گے، جھوٹے ہیں، ہمیں دھوکا دے رہے ہیں؟“
 شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں ان سب کو جھوٹا نہیں کہہ رہا ہوں کیونکہ جس نے اسلام قبول کر لیا ہے وہ سچا ہے مگر جو اسلام کا مطالعہ کر رہا ہے وہ فریبی ہے اور دھوکے باز ہے اور دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو ہلاکو خان کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں، مخبری کر رہے ہیں۔ ابن علقمی کے پاس جو منگول رہ رہے ہیں، وہ بھی جاسوس ہیں۔“

ان دونوں کی باتیں دوسرے بھی سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ خلیفہ نے ایک دم اچانک گفتگو بند کر دی، بولا۔ ”میرا خیال ہے اب ہمیں پوری آزادی اور توجہ سے کھانا کھانا چاہیے۔ باتیں پھر کسی وقت ہو جائیں گی۔“
 کھانا کھا چکنے کے بعد خلیفہ، شہزادے کو پائیں باغ میں لے گیا۔ پورا باغ پھولوں کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ یہاں خلیفہ نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں شہزادے! اب بتا ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”ہمیں ہر وقت نازک اور خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اعتبار کسی پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔“
 خلیفہ نے کہا۔ ”میں تیری باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن میری ایک بات تجھ کو بھی ماننا ہوگی۔ مجاہد الدین سردوات دار اور اس جیسے بعض دوسرے لوگوں کی باتیں نہیں ماننا ہوں گی۔ یہ مصاحب قسم کے لوگ ہمیشہ شہزادوں اور بادشاہوں کو برا دہکتے رہے ہیں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! افسوس کہ آپ اپنے ہی جاں نثروں اور مجاہدوں پر شبہ کر رہے ہیں۔“
 خلیفہ کو غصہ آ گیا۔ ”وہ تیرے وفادار ہوں گے میرے نہیں، اپنے آدمیوں کو میں بہتر پہچانوں گا یا تو؟ اور دیکھ! میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ ان دونوں منگولوں کو چھوڑ دے، جنہیں تو نے بلا وجہ قید کر رکھا ہے۔ ان کی گرفتاری اور قید سے ہمارے ہلاکو خان سے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔“

شہزادے نے بے دلی سے کہا۔ ”امیر المومنین کا یہ حکم ہے تو میں ان دونوں کو رہا کر دوں گا لیکن میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ اگر اس طرح ہمارے آدمی

کروں گا کہ وہ کون ہے جس کو حکومت پسند نہ ہو۔ میں حکومت کا شیدائی ہوں۔“
 خلیفہ کے کانوں میں ابن علقمی کی باتیں گونجنے لگیں۔ جن میں خلیفہ کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح خلافت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ خلیفہ نے برہمی سے کہا۔ ”اگر حکومت تجھ کو پسند ہے تو میں تیرے لیے اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں لیکن خدا کے لیے تو حکومت کی خاطر گندے اور اوجھے ہتھیار نہ استعمال کر۔ تو نے ابن علقمی کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے اس کی طرف سے دو جلی خطوط بنام نصیر الدین طوسی اور ہلاکو خان لکھوائے۔ یقیناً اس سے تیرا یہ مقصد ہوگا کہ تو ابن علقمی کو میری نظروں سے گرا کر معزول کرادے اور پھر میرے دل و دماغ کو اپنے قابو میں کر کے اپنی من مانی شروع کر دے۔“

شہزادہ نے زہر خند کیا، بولا۔ ”امیر المومنین! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ابن علقمی غدار ہے اور وہ آپ کو شک و شبہ میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور میں اس کی یہ ساری باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ حکومت کو علو یوں میں مستقل کروانا چاہتا ہے۔ آپ عزت نشین ہیں آپ ابن علقمی کی باتوں پر زیادہ نہیں چوکیں گے، اس کی عزت کریں گے لیکن بادا جان! میں یہ بھی.....“

خلیفہ نے کہا۔ ”ہلاکو خان اسلام سے محبت کرتا ہے اور وہ ہمارے لیے جذبہ خیر سگالی رکھتا ہے اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ہلاکو خان اور میں، ہم دونوں آپس میں جنگ کریں تو ہمیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ ہم دونوں جنگ کیوں کریں؟“

شہزادے نے بڑی بے چینی سے خلیفہ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”امیر المومنین! آپ ہماری بات مانتے کیوں نہیں، ابن علقمی غدار ہے اور ہلاکو خان سے ملا ہوا ہے اور وہ اسلام سے زیادہ مسیحیت کی طرف مائل ہے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”شہزادے! اگر وہ غدار ہے تو وہ اپنی غلامی کی سزا خدا کی طرف سے پائے گا۔ ہم بلا وجہ اس پر شک کر کے کیوں گناہگار ہوں۔ اگر وہ ہم سے غداری کرے گا تو ہلاکو خان اس غدار کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا ملک، میرا شہر اور میرے لوگ اختلاف آرا کا شکار نہ ہوں۔ ہماری صفوں میں اتحاد اور اتفاق قائم رہے۔“

شہزادے کو اپنے باپ کی عقل پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”امیر المومنین! میں اتحاد اور اتفاق کو نقصان نہیں

مونا منگول آزاد ہو کر بغداد کے گلی کوچوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ شہزادے نے درداغ کو اس کے پیچھے لگایا کہ وہ کھل مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس کی بغداد آمد کا اصل مقصد کیا ہے؟

درداغ موٹے منگول کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا۔ درداغ نے اسے بغداد کے بازاروں کی سیر کرائی، نہروں اور باغوں میں گھمایا پھرایا۔ دجلہ کی سطح پر بجز ارواں دواں ہوا تو موٹے منگول کو بڑا مزہ آیا۔ مہینوں کی بھاگ دوڑ اور قربت اور صحبت سے بس اتنی سی بات معلوم ہو سکی کہ وہ اپنے طور پر بغداد آیا ہے۔ اس کو ہلا کو خان نے نہیں بھیجا۔ موٹے منگول کو گوت کی اسیری کا ملال تھا۔ اس نے کہا۔ ”درداغ! تو شہزادے کو متنبہ کر کہ وہ گوت کو قید کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”یہ بغداد ہے یہاں شہزادے کی حکومت ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو بغداد سے تعلق نہیں رکھتے انہیں قیام بغداد کے دوران یہاں کے قانون اور رسم و رواج کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی پابندی کرنا چاہیے۔“

موٹے منگول نے کہا۔ ”سالوں پہلے خان اعظم چنگیز خان کے چند قاصدوں کو اس وقت کے مسلمان بادشاہ علاؤ الدین خوارزم شاہ نے قتل کر دیا تھا۔ یہ قتل خوارزم شاہ کے اپنے ملک اور اپنے شہر میں ہوا تھا مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ آسمان اور زمین کے درمیان خوارزم شاہ کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ آخر کار دو گز زمین نے بادشاہ کو اپنی آغوش میں لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے چھپالیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں ایسا ہی دوبارہ نہ ہو اور ہلا کو خان کے بھیانک آدمی شہزادے اور خلیفہ کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگیں اور بالآخر یہ لوگ بالکل تباہ و برباد ہو کر زمینوں کے اندر جا چھپیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”عروج اور زوال قوموں اور انسانوں کا مقدر ہے۔ اس سے کوئی کس طرح بچ سکتا ہے؟“

موٹے منگول نے درداغ کو معنی خیز نظروں سے گھورا، پوچھا۔ ”درداغ! میں تیرے سلسلے میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔“

درداغ نے کہا۔ ”پوچھو! میں اس کا جواب دوں گا۔“
موٹے منگول نے پوچھا۔ ”یہ تو مسلمان کیوں ہو گیا؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”اسلام کی سادگی، مساوات اور فطری اصول اور قوانین نے مجھے اسلام قبول کرنے پر مائل کر دیا۔“

موٹے منگول نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر تم نے یہ اچھا

ہلا کو خان گرفتار کرتا تو وہ ان سے اپنے مطلب کی باتیں معلوم کر کے قتل کر دیتا۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں جو حکم دے رہا ہوں اس کی تعمیل ہونی چاہیے اور دیکھو وہ منگول درداغ، مجھے معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ استاد شمس الدین کی ایک کنیز علیہ کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہوا ہے، ایک عاشق کتنے خلوص سے مسلمان ہو سکتا ہے، میں جانتا ہوں تو استاد شمس الدین کو میری طرف سے یہ پیغام دے دے کہ وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتا رہے۔ سیاست اور ملوکیت اس کے بس کی نہیں ہیں۔“

شہزادہ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”بہت خوب! میں آپ کی ہدایات اور نصیحتیں متعلقہ حضرات تک پہنچا دوں گا۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”تو ولی عہد ہے لیکن تجھ کو میری یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ میں اس ولی عہدی کو بدل بھی سکتا ہوں۔“

شہزادے نے عرض کیا۔ ”میں ہر بات جانتا ہوں قبلہ عالم!“

وہ خلیفہ سے رخصت ہو کر سیدھا اپنے قصر میں پہنچا اور گوت اور موٹے منگول کو اسی وقت رہا کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”الہ العالمین! میں نے تو تجھ سے جو کچھ مانگا تھا وہ اسی طرح لوٹا رہا ہوں۔ میں نے خدایوں اور جاسوسوں کو چھوڑ دیا۔ اب تو ہی انہیں ہدایت دے۔“

شہزادے نے گوت اور موٹے منگول کو رہا کیا تو گوت نے شہزادے کا مذاق اڑایا۔ ”شہزادے! میں جانتا تھا کہ تم ایک نہ ایک دن مجھے ضرور رہا کر دو گے۔“

شہزادے کو غصہ آ گیا، پوچھا۔ ”گوت! کیا تو نہیں جانتا کہ جو ہاتھ تجھ کو رہائی دلا سکتے ہیں وہی دونوں ہاتھ تجھ کو دوبارہ قید خانے میں ڈال سکتے ہیں۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر ایسا کرو گے تو تم میری یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اس بار تو ہلا کو خان نے تم لوگوں سے کچھ نہیں کہا اور تم ہو کہ اکڑے ہی چلے جا رہے ہو۔“

شہزادے نے دوبارہ گوت کو قید کر دیا اور غصے میں کہا۔ ”میں تجھ کو قید کرتا ہوں گوت! اب میں دیکھوں گا کہ ہلا کو خان کا رعب مجھ سے یہ کام کس طرح کراتا ہے۔ میں تیرے غرور کو خاک میں ملا دوں گا۔“

☆☆☆

سے ضرور ملا دے۔“

درداغ نے وعدہ کر لیا اور خود اس سے بچھڑ کر اپنے گھر چل دیا۔ راستے میں برتنوں کا تاجر مل گیا۔ اس نے درداغ کا راستہ روک لیا، بولا۔ ”اے بھائی منگول! کہاں؟ بہت دن بعد نظر آئے۔“

درداغ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اپنی اہانت بھولا نہیں تھا۔ پوچھا۔ ”اوبد بخت تاجر! مجھ سے دور رہ، میں تجھ کو خوب پہچان چکا ہوں۔“

لیکن تاجر بھی بلا کا ڈھیٹ تھا، بولا۔ ”بھائی میرے! میں نے تجھ کو اپنے ساتھ رکھا، کھلایا پلایا اور تو مجھ کو اس کا یہ صلہ دے رہا ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا۔ لالچ میں کیا تھا اور پھر جب یہ دیکھا کہ میں تیرے کسی کام کا نہیں رہا تو مجھے گرفتار کر دیا۔ وہ تو میں قسمت کا دھنی تھا کہ بچ گیا ورنہ تو نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

درداغ نے تاجر سے بھی پیچھا چھڑایا اور اپنے گھر پہنچا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آرام کرنے کے لیے بستر پر گر گیا۔

درداغ کے دل پر موٹے منگول کی باتوں کا اثر اس وقت تو کچھ زیادہ نہیں ہوا تھا مگر جب وہ اپنے بستر پر لیٹ کر اس کی باتیں یاد کرنے لگا تو خاصا پریشان ہو گیا۔ گھڑی بھر کے لیے یہ سوال ابھرا کہ اگر موٹے منگول کی باتیں صحیح ہو گئیں تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ وہ کافی دنوں سے استاد شمس الدین سے نہیں ملا تھا۔ اس نے سوچا شام کو استاد کو پکڑ لیا جائے گا۔

وہ شام کو استاد شمس الدین سے ملنے گیا۔ اس وقت تک استاد گھر نہیں پہنچے تھے۔ ان کے ملازم نے درداغ کو پہچان لیا اور عزت و احترام سے اپنے پاس بٹھالیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ جب وہ ملازمین سے باتوں میں مشغول تھا، اسی وقت زمان خانے کا دروازہ ذرا سا کھلا اور بند ہو گیا۔ درداغ تڑپ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس حصے میں علیہ رہتی تھی۔ اب وہ دروازے کے دوبارہ کھلنے کا منتظر تھا لیکن جب دوبارہ دروازہ نہیں کھلا تو وہ بہت مایوس ہوا اور دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چل پڑا۔ استاد کے ملازمین نے اس کو روکنا بھی چاہا کہ استاد آنے ہی والے ہیں..... لیکن وہ نہیں رکا ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے درداغ کو روک کر کہا۔ ”جناب! بی بی نے

نہیں کیا۔ ہلا کو خان بہت برہم ہے تمہاری اس حرکت پر۔“ درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دے رہا۔ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور اب میرا جینا بھی انہی لوگوں میں ہوگا۔“

موٹے منگول نے ایک آنکھ دبا کر شریر لب و لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں جانتا ہوں کہ تو مسلمان کیوں ہو گیا؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”میں کیوں مسلمان ہو گیا؟“

موٹے منگول نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ایک لڑکی کی خاطر، ایک عورت کے لیے، حالانکہ تجھ کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میری قوم کے لیے عورت کوئی مسئلہ نہیں ہے، تجھ کو جو لڑکی پسند تھی، اس کو جبراً اپنے قابو میں کیا جاسکتا تھا اور پھر وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب ہلا کو خان بغداد کی اینٹ سے اینٹ بچا دے گا۔ اس وقت تو کیا کرے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں وہی کروں گا جو تمام مسلمان کریں گے۔“

موٹے منگول نے اسے مشورہ دیا۔ ”درداغ! میرا کہنا مان لو اور اسلام کو چھوڑ کر اپنوں میں واپس آجا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اور میرا مشورہ یہ ہے کہ تو بھی مسلمان ہو جا۔“

موٹے منگول نے کہا۔ ”افسوس تو یہ ہے کہ تو مسلمان بھی ہو گیا اور تجھ کو وہ لڑکی بھی نہیں ملی جس کی خاطر تو مسلمان ہوا تھا۔“

درداغ نے تھنیلہ کر جواب دیا۔ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور ذاتی مسئلہ۔“

موٹے منگول نے ہنس کر کہا۔ ”ذاتی مسئلہ یا ذاتی معاملہ کوئی چیز نہیں، یہ اجتماعی مسئلہ ہے۔ ہلا کو خان اپنے آدمیوں کو اتنی آزادی نہیں دے سکتا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں ایک بات پوچھوں تجھ سے؟“

موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”پوچھ، ضرور پوچھ۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”تو بغداد میں کیوں آیا؟“

موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”گھومنے پھرنے اور اسلام کی بابت معلومات حاصل کرنے۔“

درداغ نے کہا۔ ”اگر تو سچ بول رہا ہے تو میں تجھ کو یہ مشورہ دوں گا کہ تو بغداد کی سیر و تفریح کے ساتھ ساتھ یہاں کے عالموں کی صحبت اختیار کر، وہاں تجھ کو اتنی زیادہ علم کی دولت مل جائے گی کہ اللہ رے، کوئی حد و حساب نہیں۔“

موٹے منگول نے کہا۔ ”میں اس شخص سے ضرور ملوں گا جس نے لڑکی کی جھلک دکھلا کر تجھ کو لوٹ لیا۔ مجھ کو اس شخص

آپ کو یہ خط دیا ہے۔“

درداغ نے اس بچے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

اور پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بچے نے جواب
دیا۔ ”میں بی بی کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔“

درداغ نے پرچے کو پڑھا، اس میں لکھا تھا۔
”کیا روٹھ گئے؟ کیوں روٹھ گئے؟ میں آپ کا انتظار

ہی کرتی رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ آپ میرے پاس ضرور
آئیں گے۔ خیر! میں آپ کو یوں نہ بلاتی مگر رضی آیا ہوا

ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ بھی اس سے مل لیں۔ میں نے
اس سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ بھی آپ سے ملنے کے لیے

بے چین ہے۔“
درداغ تھملا گیا۔ اس کو علیہ پر غصہ آ رہا تھا۔ رضی کا

ذکر کر کے وہ درداغ کے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ اس نے
بچے سے کہہ دیا۔ ”بیٹے! تم اپنی بی بی جی سے کہہ دو جا کر کہ

میں اس وقت نہیں آسکوں گا۔“
لڑکے نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”مگر کیوں؟

اس وقت کیوں نہیں؟ بی بی جی تو انتظار کر رہی ہوں گی۔“
درداغ نے پوچھا۔ ”اس وقت تمہاری بی بی جی کے

پاس کون کون ہے؟“
لڑکے نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا پتا کہ ان کے پاس

اور کون ہے؟ جو کچھ جانتا، دیکھنا اور معلوم کرنا ہو، خود چل کر
دیکھ لیں۔“

درداغ مڑا مگر مڑتے مڑتے پھر اپنی راہ پر چل پڑا۔
اس بار بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بولا۔ ”آپ کو

میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا کیونکہ میں نے بی بی سے یہ وعدہ
کر لیا ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ اب میں

خالی تنہا کس طرح واپس جاؤں گا؟“
درداغ نے کہا۔ ”بچے! ضد نہ کر۔ تیری بی بی جی سے

پھر کسی وقت مل لوں گا۔“
لیکن اس بار لڑکے نے دونوں ٹانگوں کو اپنی گرفت

میں لے لیا۔ بولا۔ ”نہیں، بالکل نہیں، میں آپ کو نہیں
جانے دوں گا، آپ میرے ساتھ واپس چلیے۔“

درداغ مجبور ہو گیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”لڑکے! تو،
تو قیامت ہے۔ کہیں اس طرح کسی کو روکا جاتا ہے؟“

لڑکے نے کہا۔ ”میں نے وعدہ جو کر لیا ہے کہ ابھی بلا
کر لاتا ہوں۔“

درداغ علیہ کے در پر پہنچا تو اس کا دل زور زور سے

دھڑکنے لگا۔ اس کو اس گھر اور اس در سے وابستہ اور متعلقہ
باتیں یاد آنے لگیں۔

لڑکا اندر گیا اور کچھ دیر بعد علیہ بھی دروازے کے
پیچھے آگئی۔ دروازے کے پیچھے سے اس کا چہرہ نمودار ہوا۔

علیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا تو ناراض ہو کر جا رہا تھا؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، میں ناراض ہو کر

کیوں جاؤں گا؟“
علیہ نے کہا۔ ”اندر آ جا۔ شرفائیوں در پر کھڑے ہو کر

باتیں نہیں کرتے۔“
درداغ اندر چلا گیا۔ وہ وہاں رضی کو تلاش کرنے لگا

لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ درداغ کو بیٹھنے کا بھی احساس نہ رہا۔
علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے آج

تو کھویا کھویا سا کیوں ہے؟“
درداغ مٹھی میں دبے ہوئے علیہ کے خط کو کھول کر

پڑھنے لگا۔
علیہ نے پوچھا۔ ”کیا تو نے ابھی تک میرا خط نہیں

پڑھا تھا؟“
درداغ نے پوچھا۔ ”کیا تم اس گھر میں تنہا رہتی ہو؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں اس گھر میں تنہا رہتی
ہوں، کبھی کبھی استاد نس الدین آتے ہیں تو کئی کئی دن میرے

پاس ہی رہتے ہیں۔ اپنے گھر بھی نہیں جاتے۔ میرے
سامنے اپنے بال بچوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔“

درداغ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اس
وقت بھی تم تنہا ہوا اپنے گھر میں؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں اس وقت اپنے گھر
میں تنہا ہی ہوں۔“

درداغ نے علیہ کا خط اس کے سامنے رکھ دیا اور رضی
والے حصے پر انگلی رکھ کر بولا۔ ”یہ تو جوان کہاں چلا گیا؟“

علیہ اسے پڑھ کر بولی۔ ”وہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں
موجود تھا مگر تیرے آنے سے پہلے چلا گیا۔ ویسے وہ آتا بڑی

پابندی سے ہے میرے پاس۔“
درداغ نے پوچھا۔ ”تم نے مجھے کیوں بلا یا تھا؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ تو اس گھر اور اس
در کو بھول گیا تھا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ جس گھر میں میرا
انتظار نہ کیا جاتا ہو اور جس گھر کو میرے متبادل مل گئے ہوں

اس گھر کو میری اہمیت اور ضرورت کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟“
علیہ نے اچانک سنجیدگی اختیار کی۔ مسکراہٹ غائب

اور پوری یکسوئی اور دیانت داری سے میری باتوں کے جواب دو۔“

علیہ نے درداغ پر ایک اچھتی نظر ڈالی اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کون سی باتیں؟ کیسی باتیں؟“
درداغ نے کہا۔ ”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ استاد شمس الدین سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں استاد شمس الدین کی کنیز ہوں۔ دوران سفر انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ مجھے خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ سچ بچ مجھے خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے بلکہ اس طرح وہ شاہی حکام سے مجھے بچانا چاہتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کوئی بھی سرکاری افسر مجھ کو زبردستی چھین لیتا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”اور پھر جب وہ مجھ پر حد درجہ مہربان ہو گئے اور مجھ پر نوازشیں فرمانے لگے اور مجھ کو یہ اجازت بھی مل گئی کہ میں تمہارے پاس آ جا سکتا ہوں تو اس سے استاد شمس الدین کا کیا مقصد تھا؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”استاد شمس الدین تجھے واقعی بہت زیادہ چاہنے لگے تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تیرے مسلمان ہو جانے کے بعد وہ میری شادی تجھ سے کر دیں گے۔ لیکن جب ایک دن اچانک انہیں تیری ہی زبانی یہ معلوم ہوا کہ تو ہلا کو خان کا جاسوس ہے اور تو نے اس سے پہلے جو کچھ بھی کہا تھا، جھوٹ تھا تو ان کا دل ٹوٹ گیا۔ اس صدمے میں ان کا غصہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے تجھ کو اپنے پاس سے دور کر دیا اور مجھ سے کہا کہ علیہ! اس منگول نے میری عمر گھٹا دی، اب یہ اگر مسلمان ہو بھی جائے تب بھی میں اس پر اعتبار نہ کروں گا۔ میں اس کو کبھی معاف نہ کروں گا اور انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اب چونکہ ان کا ارادہ بدل چکا ہے اس لیے وہ مجھے اپنی کنیز کی طرح رکھنا چاہتے ہیں وہ مجھ سے تعلق قائم کر لیتا چاہتے تھے۔“

درداغ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”پھر..... پھر کیا ہوا؟“
علیہ کہتی رہی۔ ”لیکن میں نے استاد شمس الدین کو سمجھایا اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں اس وحشی منگول سے محبت کرنے لگی ہوں۔ استاد شمس الدین نے کہا۔ پھر میں کیا کروں، میں نے تو تجھ پر رقم خرچ کی ہے۔“

”درداغ تو یقین کر، استاد شمس الدین یکسر بدل چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ خود اس سلسلے میں تجھ سے کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے میں تجھ کو بتا دوں کہ

ہو گئی اور چہرے پر ایک قسم کا تناؤ آ گیا۔ بولی۔ ”درداغ! تو کہنا کیا چاہتا ہے تو حاسد معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تجھے چاہا، تجھ سے محبت کی اور ہر حال میں تیرا خیال رکھا۔ میں نے استاد شمس الدین کی بھی کوئی پروا نہ کی اور تجھ کو چھیڑنے اور تیرے دل میں اپنی محبت کا اندازہ لگانے کے لیے جلی کئی باتیں کیں۔ فرضی واقعہ بیان کیا۔ خیالی کردار کی بات کی اور تجھ پر میری باتوں کا یہ اثر ہوا کہ مجھے یکسر نظر انداز کر دیا۔ مجھ کو فراموش کر دینے کی کوشش کی۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیری ان باتوں نے مجھے خوش رکھا ہے۔ کیا میں یا میرے جیسی کوئی بھی عورت اپنے محبوب کی ان باتوں سے خوش ہو سکتی ہے؟“
علیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ رونے لگی۔ اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور پھر ایک دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”اب تو جا سکتا ہے اور آئندہ یہاں نہ آنا کیونکہ اب اس گھر کے دروازے تیرے لیے نہیں کھلیں گے۔“

درداغ کو چکر سا آ گیا۔ اس نے علیہ کے خط کو مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر علیہ کے پاس چلا گیا، بولا۔ ”میں اپنی حماقتوں اور غلط فہمیوں پر تادم ہوں، مجھے معاف کر دو۔“

علیہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ درداغ نے اس کے بالوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں، بولا۔ ”علیہ! میں وحشی منگول ہوں۔ میں نے پڑھ لکھ تو لیا ہے لیکن اس علم سے میری جبلت نہیں بدلی۔ میں نہیں جانتا کہ شہری اور متمدن لوگ کس طرح عشق کرتے ہیں۔ افسوس کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔“

علیہ نے اس کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ بس روتی رہی۔

درداغ نے اسے مزید تسلی دی، بولا۔ ”تم نے مجھے حاسد کہا ہے علیہ! میں واقعی حاسد ہوں۔ حاسد بھی اور اپنی محبت کا حد درجہ حریص بھی۔ میری محبت نے مجھ کو حد درجہ خود غرض بنا دیا ہے۔ اگر مجھ کو تجھ سے محبت نہ ہوتی تو میں تیرے قریب آنے والوں سے جلتا اور حسد کیوں کرتا؟ لیکن ایک بات، جسے میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ میں اس کو سمجھنا چاہتا ہوں، جاننا چاہتا ہوں۔ اگر مجھ کو میرے ایک سوال کا جواب مل جاتا تو میں تمہاری باپیت کچھ سوچتا بھی۔“
علیہ برابر روئے جا رہی تھی۔

درداغ نے اس کا چہرہ زبردستی اپنے سامنے کر لیا۔ بولا۔ ”جب بات یہاں تک پہنچ چکی ہے تو میں تم سے چند باتیں صاف صاف کرنا چاہتا ہوں۔ تم بھی رونادھونا بند کرو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اگر تو مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے تو، تو مجھے وہ قیمت ادا کر دے جو میں نے علیہ کے عوض ادا کی ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”اور تم نے یہ جو کہا تھا ابھی ابھی کہ استاد شمس الدین تمہارے پاس کئی کئی دن کے لیے آتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی بھول جاتے ہیں تو اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا انہوں نے تجھ سے تعلقات قائم کر لیے ہیں؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو جلانے اور تیری محبت کا امتحان لینے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”استاد شمس الدین نے تیری کیا قیمت مقرر کی ہے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھے تین ہزار دینار میں خرید لیا تھا۔“

درداغ نے حیرت سے کہا۔ ”تین ہزار دینار میں! خوب۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا قیمت زیادہ ہے؟ میں اتنی قیمت میں مہنگی ہوں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میرے خیال میں تین ہزار دینار کچھ بھی نہیں۔ میں تو تجھ کو دس ہزار دینار میں بھی خریدنے کو تیار ہوں۔“

علیہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، پوچھا۔ ”کیا اتنی رقم ہے تمہارے پاس؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس اتنی رقم ہے تو نہیں لیکن اس کا بندوبست ضرور کر سکتا ہوں۔“

علیہ ایک بار پھر مرجھا گئی، بولی۔ ”کس طرح اور کہاں سے انتظام کرو گے اتنی بڑی رقم کا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھ پر شہزادہ ابو بکر بہت زیادہ مہربان ہے کیا شہزادہ دس ہزار دینار نہیں دے سکتا مجھے؟“

علیہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ شہزادہ اتنی بڑی رقم آسانی سے تجھے دے دے۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”اگر میں تین ہزار دینار استاد شمس الدین کو پہنچا دوں تو کیا وہ تجھے میرے حوالے کر دیں گے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں استاد نے مجھ سے یہ وعدہ کر لیا ہے۔“

درداغ سوچنے لگا کہ تین ہزار دینار کا فوراً ہی بندوبست کہاں سے کرے، اس نے خیالوں ہی خیالوں میں شہزادے کو ٹٹولا تو یہ شبہ گزرا کہ جب وہ شہزادے سے یہ رقم مانگے گا تو شہزادہ اس سے یہ ضرور پوچھے گا کہ یہ تین ہزار دینار کی اچانک ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ اور جب وہ شہزادے کو یہ بتائے گا کہ وہ اس رقم سے استاد شمس الدین کی کنیز خریدے گا تو شہزادہ کیا سوچے گا شاید رقم دینے ہی سے انکار کر دے۔

علیہ اس سکوت سے یہ سمجھ بیٹھی کہ شاید درداغ تین ہزار دینار کا انتظام نہیں کر سکے گا اسی لیے یہ سکوت اختیار کر رکھا ہے۔ مایوسی سے پوچھا۔ ”تو شاید تو تین ہزار دینار فراہم نہ کر سکے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں نے تو یہ نہیں کہا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”پھر تو خاموش کیوں ہو گیا؟“

درداغ نے کہا۔ ”میں کسی اور وجہ سے خاموش تھا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں استاد شمس الدین سے اس موضوع پر بات کر لوں پہلے، اس کے بعد تو خود کر لیتا۔“

درداغ بہت خوش تھا۔ اس نے علیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا چاہا مگر علیہ اس پر تیار نہ ہوئی، بولی۔ ”درداغ! تو اس بات کو ابھی نہیں سمجھے گا۔ کچھ دن صبر سے کام لے اور تین ہزار دینار کا بندوبست کر۔“

درداغ نے استاد شمس الدین کی ہمدردی اور منکسر المزاجی کے پیچھے اس کا کاروباری چہرہ نہ تو کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی محسوس کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا، انسان کتنا پیچیدہ اور عجیب و غریب ہے، یہ کتنا اندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر کتنی نقائیں پڑی ہوتی ہیں؟

☆☆☆

کئی دن اسی سوچ اور تذبذب میں گزر گئے کہ وہ شہزادے سے تین ہزار دینار مانگے یا نہ مانگے۔ اگر مانگے تو کس طرح مانگے۔ ان دنوں بغداد میں یہ افواہ گرم تھی کہ ہلاکو خان بغداد کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ٹڈی دل لشکر اس کے ساتھ ہے اور وہ اپنے راستے کی آبادیاں خاک و خون میں ڈبو رہا ہے۔

درداغ نے پوچھا۔ ”اگر میں تین ہزار دینار استاد شمس الدین کو پہنچا دوں تو کیا وہ تجھے میرے حوالے کر دیں گے؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں استاد نے مجھ سے یہ وعدہ کر لیا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”تم نے یہ بات آج تک مجھ کو نہیں بتائی تھی... آخر کیوں؟“

علیہ نے جواب دیا۔ ”تو نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ پھر بتائی کس طرح؟“

فرار ہو رہا ہے۔ شاید درداغ کی نیت بھی خراب ہو گئی ہے۔“
شہزادے نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ درداغ ہمیں
دھوکا نہیں دے سکتا۔“

اسی دوران ان لوگوں نے دیکھا کہ درداغ نے
تیر اندازی شروع کر دی ہے اور وہ بھاگنے والے کا تعاقب
کر رہا ہے۔

یہاں تک کہ درداغ کے تیروں نے بھاگنے والے کو
زخمی کر کے گرا دیا۔ گرنے والا پھر سے اٹھا اور ایک طرف
بھاگنے لگا۔

درداغ نے ایک بار پھر چیخ کر کہا۔ ”رک جاؤ ورنہ
تیرا لاشہ خون میں لت پت پڑا دکھائی دے گا۔“

لیکن بھاگنے والے نے گویا یہ آواز بھی نہیں سنی اور وہ
بھاگتا رہا۔ آخر درداغ کے ایک تیر نے اس شخص کو گرا دیا۔
درداغ اپنا گھوڑا ابھگا کر زخمی کے قریب لے گیا اور گھوڑے
سے اتر کر زخمی کو پکڑ لیا۔ درداغ نے پوچھا۔ ”سچ بتا تیرے
پاس ایسی کوئی چیز ہے جس کو چھپانے کے لیے تو یوں بھاگ
رہا تھا؟“

لیکن زخمی کا اتنا برا حال تھا کہ وہ کوئی جواب نہیں
دے سکا۔ درداغ اس کی تلاشی لینے لگا۔ آخر پانی کی چھال
میں سے ایک خط برآمد کر لیا۔ اتنی دیر میں شہزادہ اپنے
ساتھیوں سمیت ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ شہزادے نے بے
تابی سے پوچھا۔ ”کچھ لکھا اس کے پاس سے؟“

درداغ شہزادے کو ایک طرف لے گیا اور چھال
سے نکلنے والا خط شہزادے کے حوالے کر دیا، بولا۔ ”یہ خط
پانی کی چھال میں تھا۔“

شہزادہ خوشی سے پھولا نہ سما، بولا۔ ”درداغ! میں
کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں۔“

شہزادے نے اس خط کو سرسری پڑھا۔ اس میں ہلاکو
خان سے استدعا کی گئی تھی۔ ”کسی بھی طرح جلد از جلد بغداد
میں قدم رنجہ فرمائیے اور ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔“
مزید یہ لکھا تھا۔ ”منگولوں کی آمد کیوں روک دی گئی ہے؟
حالانکہ ہم نے ہر منگول کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ خلیفہ
بغداد نے اپنے بیٹے شہزادہ ابوبکر کو ڈانٹ دیا ہے اور کہا کہ تو
خود میرا دشمن ہے اور اس طرح میں نے ایک بار پھر خلیفہ کی
نظر میں عزت اور بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔“

”منگول فاتح کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے ایک آدمی
درداغ نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے اور ہماری کوشش یہ
ہے کہ کسی دن اس کو ٹھکانے لگا دیں۔“

اس افواہ نے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا۔ ہلاکو خان کے
بغداد آنے کا یہ مطلب تھا کہ بغداد تباہ و برباد ہو جائے اور
خود اس کے لیے بھی بربادی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ انہی
مسائل پر سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنے در پر گھوڑے کے
رکنے کی آواز سنی اور چند لمحوں بعد کوئی دروازے پر دستک
دینے لگا۔

درداغ نے دروازہ جو کھولا تو اپنے سامنے شہزادے
کا قاصد دیکھا۔ قاصد نے کہا۔ ”حضور! آپ کو شہزادہ معظم
یاد فرماتے ہیں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”ابھی یا کچھ دیر بعد؟“
قاصد نے جواب دیا۔ ”ابھی اور اسی وقت۔“

درداغ نے شہزادے سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ
وہ کئی آدمیوں کے ساتھ باب الخراسان جا رہا ہے۔ راستے
میں شہزادے نے درداغ کو بتایا کہ وہ آدمی ابن علقمی یا کسی
دوسرے غدار کا خط لے کر ہلاکو خان کے پاس جا رہے ہیں،
انہیں روکنا ہے چنانچہ شہزادے نے باب الخراسان پر
موجود عملے کو ہدایت کی کہ کسی بھی شخص کو تلاشی کے بغیر نکلنے
نہیں دیا جائے۔

شہزادہ باب الخراسان کے باہر ایک درخت کے
سائے تلے بیٹھ گیا۔ اس کے آدمی بھی ادھر ادھر بیٹھ گئے یا
گھومنے پھرنے لگے۔

دوپہر کے بعد درداغ نے ایک شخص کو باب
الخراسان کی طرف اس طرح جاتے دیکھا کہ وہ بڑی بے
چینی اور پریشانی سے باب الخراسان کی طرف چلا جا رہا تھا۔
باب الخراسان پر متعین عملے نے رسماً اس کی تلاشی لی اور چھوڑ
دیا۔ درداغ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا لی اور اس شخص کا
پیچھا کیا۔ مشتبہ شخص نے درداغ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو
اس نے بھی اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ اس کا
گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

درداغ نے چلا کر اس اجنبی کو متنبہ کیا کہ رک جاؤ ورنہ
تیروں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔

شہزادے کے آدمیوں نے ان دونوں کو آگے پیچھے
بھاگتے دیکھا تو شہزادے کو خبردار کیا۔ ”شہزادہ محترم! آپ
کچھ سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

شہزادے نے کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟ میں تو یہ سمجھ رہا
ہوں کہ درداغ اس مشتبہ شخص کا پیچھا کر رہا ہے۔“

ایک مصاحب نے عرض کیا۔ ”جناب والا! میری
ناقص رائے میں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ درداغ بھی یہاں سے

شہزادے نے زخمی کو اپنی حراست میں لے لیا اور درداغ سے کہا۔ ”تو نے یہ خط پڑھا تھا؟“
 درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ خط نہیں پڑھا تھا مگر کیوں؟“

شہزادے نے کہا۔ ”بڑے مزے کا خط ہے۔ بغداد چلو، خط پڑھو ادول گا۔“ شہزادہ ان سب کو لے کر بغداد کی طرف چل پڑا۔

شہزادہ اپنے محل میں چلا گیا اور جو اس کے ساتھ تھے، وہ محل کے دروازے سے واپس چلے گئے۔

درداغ کو شہزادے کے دوست حسین و آفرین نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خود درداغ اپنے سینے میں ایک دل اور اس دل میں ایک آرزو رکھتا تھا۔ اس نے آج عرض مدعا کا بہترین موقع ضائع کر دیا تھا وہ اپنے انہی خیالوں میں غم اپنے گھر جا رہا تھا۔ جب وہ ایک محلے کے موڑ پر پہنچا تو اس جگہ سناٹا محسوس ہوا۔ کسی طرف سے ایک شخص آیا اور درداغ سے پوچھا۔ ”بھائی! شہزادہ ابو بکر کہاں ملے گا؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”شہزادے سے کیا کام ہے تیرا؟“ اس نے بگڑ کر پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”بھائی! میں شہزادہ ابو بکر سے ملنا چاہتا ہوں، وہ مجھے کہاں ملیں گے؟“
 درداغ نے کہا۔ ”تو پاگل ہو گیا ہے، شاید! ورنہ شہزادے کا پتا اس طرح نہ پوچھتا پھرتا۔“

وہ شخص ناراض ہو گیا۔ اس نے درداغ کو گھوڑے سے کھینچ کر پیچھے گرا دیا اور غصے میں بولا۔ ”میں پاگل ہوں؟ تجھ کو میں پاگل نظر آ رہا ہوں؟ تیرے چہرے پر آنکھیں بھی ہیں یا نہیں؟“

درداغ گھبرا گیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ”تو یہ کیا کر رہا ہے۔ چھوڑ دے مجھ کو ورنہ میں.....“

لیکن اس شخص نے درداغ کا فقرہ پورا نہیں ہونے دیا۔ خنجر نکال کر اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ درداغ پیچھے ہٹا مگر خنجر پیٹ میں اتر چکا تھا۔ اس کے منہ سے ایک خون ناک چھج نکل گئی۔ قاتل اس چھج سے خوف کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔
 چھج کی آواز نے بہتوں کو درداغ کی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ درداغ کو حصار میں لے کر کھڑے ہو گئے۔

ایک نے کہا۔ ”ارے! اس کا خون تو بند کرو کسی طرح۔“
 دوسرے نے زخم کو برابر دبائے رکھا۔ بیمارستان (ہسپتال) وہاں سے قریب ہی تھا۔ اسے بیمارستان میں داخل کر دیا۔ یہ خبر پورے بغداد میں افسوس اور دلچسپی سے سنی گئی اور لوگ بیمارستان میں عیادت کو پہنچنے لگے۔

شہزادے کو اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ کچھ دیر پہلے اس نے درداغ کو اچھا بھلا رخصت کیا تھا۔

جو لوگ درداغ کو بیمارستان دیکھنے پہنچے تھے ان میں گوت بھی شامل تھا۔ اس وقت تک درداغ کو اچھی طرح ہوش نہیں آیا تھا۔ گوت اس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ آخر میں آہستہ سے کہا۔ ”غداروں کی یہی سزا ہے۔“

جب شہزادہ اسے دیکھنے بیمارستان پہنچا تو اسے ہوش آچکا تھا۔

شہزادے نے اس سے پوچھا۔ ”اب کیا حال ہے درداغ؟“

درداغ نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ”اچھا ہوں۔“
 شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! تم مت گھبرانا۔ تم کو بچا لیا گیا ہے۔“

درداغ پھٹی پھٹی نظروں سے شہزادے کو دیکھ رہا تھا۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”درداغ! کیا تو اسے پہچان لے گا جس نے تجھ کو زخمی کیا ہے؟“

درداغ نے آہستہ سے گردن ہلا کر اشاروں میں جواب دیا کہ ہاں پہچان لوں گا۔

وہ پندرہ دن صاحب فراش رہا۔ اس کو افسوس تھا کہ استاد شمس الدین اسے دیکھنے نہیں آئے لیکن یہ خوشی تھی کہ شہزادہ ابو بکر تین بار آچکا تھا۔ جب وہ بیمارستان سے رخصت ہونے والا تھا تو اچانک استاد شمس الدین اس کو دیکھنے پہنچ گئے۔ انہوں نے معذرت میں یہ بتایا کہ درداغ کے زخمی ہونے کا علم انہیں آج ہی ہوا ہے لیکن ان کی باتوں میں پہلے جیسا جوش و خروش اور دلہانہ پن نہیں تھا۔ ان کی باتوں میں لگتا تھا جیسے وہ رسم دنیا نبھا رہے ہیں۔

درداغ اس لائق ہو چکا تھا کہ مرضی کے مطابق آزادی سے باتیں کر سکے۔ اسے علیہ یاد آ رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ علیہ کے بارے میں بات کر کے معاملہ صاف کر لے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ بات کہاں سے اور کس طرح شروع کرے؟

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا تو اس شخص کو پہچانتا ہے جس نے تجھ کو زخمی کیا تھا؟“

درداغ ابھی تک چت لیٹا تھا۔ اب اس نے استاد شمس الدین کی طرف کروٹ لی اور کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! اگر وہ دوبارہ کہیں نظر آ گیا تو ضرور پہچان لوں گا۔“

استاد نے پوچھا۔ ”مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ خاصیت کیا ہو سکتی ہے؟“

اپنا ولی نعمت بنائیں۔ آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔ اللہ نے چاہا تو بڑے فائدے میں رہیں گے۔“

استاد نے طنز کیا۔ ”ہاں بڑے فائدے میں رہوں گا۔ ایسے ہی بڑے فائدے میں، جو تو اٹھا رہا ہے۔ کیا مجھ کو بھی خنجر تھلوانا چاہتا ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”حق حق ہے اور باطل باطل۔ حق کا ساتھ دینے میں اگر مصیبت بھی اٹھانی پڑے تو بھی فائدہ ہے کیونکہ حق کی طرف خدا ہوتا ہے۔ آپ تو پڑھے لکھے ذی علم انسان ہیں۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”میں اس سے زیادہ جانتا ہوں، جتنا تو بتا رہا ہے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بغداد کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ میں نے مصر جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ صرف اس لیے کہ حق میری مدد نہیں کر سکتا اور باطل سے میں وہ مدد لے نہیں سکتا۔“

درداغ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”اور علیہ کی بابت آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”علیہ تو کب کی تیری ہو چکی ہوتی لیکن تو نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہی۔“

درداغ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یہ مشکل تمام کہا۔ ”میں تین ہزار دینار دے کر علیہ کو حاصل کر لیتا چاہتا ہوں۔“

استاد شمس الدین نے لاعلم بن کر پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ تین ہزار دینار؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس سلسلے میں میری علیہ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ آپ نے اس کو تین ہزار دینار میں خریدا تھا اور اس کو اسی قیمت پر میرے حوالے کر دیں گے۔“

استاد شمس الدین مسکرانے لگے۔ ”میں نے اس کو کتنے میں خریدا تھا۔ یہ میں جانتا ہوں اس کو کیا پتا؟ میں نے اس کو پانچ ہزار دینار میں خریدا تھا۔ میں نے علیہ سے اس کا ذکر کیا تھا کہ جتنے میں تجھ کو خریدا ہے، اتنے میں ہی کسی کو دے دوں گا۔ اس پر علیہ نے درخواست کی میں اسے تیرے ہاتھ بیچ دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔“

درداغ کے لیے تین ہزار دینار ہی بہت زیادہ تھے۔ اب اس میں دو ہزار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کو ایسا لگا گویا اس کی آغوش میں گرتی ہوئی علیہ کو قسمت اور حالات کی نامساعدت کا طوفانی جھونکا اچانک

درداغ نے جواب دیا۔ ”میری اس شخص سے دشمنی یا محاصرت نہیں ہوگی بلکہ وہ کسی کا آلہ کار معلوم ہوتا ہے۔“

استاد نے منہ بنا کر کہا۔ ”تو بغداد میں بہت زیادہ مشہور آدمی نہیں ہے اور تیرے پاس قابل ذکر مال و دولت بھی نہیں ہے پھر دشمنی یا مخالفت کسی سے کیوں ہوگی؟“

استاد شمس الدین کی باتیں درداغ کے دل پر چر کے لگا رہی تھیں۔ وہ ضبط و برداشت سے کام لیتا رہا۔ آہستہ سے کہا۔ ”استاد محترم میں شہزادہ ابو بکر کے ساتھ رہتا ہوں اور میں نے ہلاکو خان اور اس کے بغدادی ہم نواؤں کو خاصا پریشان کیا ہے۔ کیا میری ان باتوں نے میرے مخالف نہیں پیدا کر دیے ہوں گے؟“

استاد نے کہا۔ ”صاحبزادے! بات یہ ہے کہ انسان کی غلطیاں اور نادانیاں ہی اس کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔ تو بغداد جس طرح آیا تھا، اس سے کون خوش ہو سکتا ہے۔ میں کافی دنوں تک بے وقوف بنا رہا مگر جب اس کا انکشاف ہوا تو میں نے بڑی تکلیف محسوس کی۔ اب بھی یہ عالم ہے کہ اگر میں اپنے دل میں تیرا مقام تلاش کرتا ہوں تو وہ کہیں نہیں ملتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”لیکن استاد محترم! اپنی بابت میں نے آپ کو جو کچھ بھی بتایا وہ تو میری سچائی اور میرا بڑا پین تھا اور اب میں یکا مسلمان ہوں۔ کیا یہ باتیں اس لائق تھیں کہ آپ پہلے سے زیادہ میری قدر کریں؟“

استاد شمس الدین نے ایک سر د آہ بھری۔ ”تیری وجہ سے ابن علقمی میرا مستقل دشمن بن چکا ہے وہ نہیں چاہتا کہ میں تجھ سے راہ و رسم رکھوں۔ میں اس وقت بھی یہاں نہ آتا لیکن شرم دنیا نے مجھے مجبور کر دیا، آگیا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ ابن علقمی مجھ سے اس کا جواب ضرور طلب کرے گا۔“

درداغ نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو آپ ابن علقمی کے ساتھیوں میں شامل ہو چکے ہیں؟ غدار اور ملت فروش ابن علقمی سے دوستی کر چکے ہیں؟“

استاد شمس الدین برہم ہو کر کھڑے ہو گئے، بولے۔ ”اگر تو اس قسم کی باتیں کرے گا تو میں چلا جاؤں گا۔ کیونکہ تیری یہ باتیں مجھے نقصان پہنچا سکتی ہیں اور میں ابن علقمی کی دشمنی کی تاب نہیں لاسکتا۔“

درداغ نے استاد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ میں آپ کو کیا سمجھاؤں گا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حق اور انصاف ابن علقمی کی طرف نہیں ہے۔ وہ شہزادہ ابو بکر کی طرف ہے۔ آپ اس غدار کے بجائے شہزادے کو

اڑا لے گیا ہے۔ اس نے مردہ کی آواز میں پوچھا۔ ”تو استاد محترم! اب مجھ کو پانچ ہزار دینار کا انتظام کرنا ہوگا؟“
استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ”پانچ ہزار کا نہیں، آٹھ ہزار دینار کا۔“

درداغ نے حیرت سے پوچھا۔ ”آٹھ ہزار کا کیا مطلب؟“
استاد نے جواب دیا۔ ”آٹھ ہزار کا اس لیے کہ علیہ کا ایک طلب گار اور موجود ہے، گوشت۔ وہ اس کے آٹھ ہزار دینار دینے کو تیار ہے۔ ہر وقت۔ میں جب چاہوں اس سے علیہ کے آٹھ ہزار دینار وصول کر سکتا ہوں مگر میں نے گوشت سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ درداغ قابلِ ترجیح ہے۔ میں درداغ کو اس لیے ترجیح دوں گا کہ علیہ اور درداغ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

آٹھ ہزار دینار کے مطالبے نے درداغ کے رہے ہے حوصلے کو بھی ختم کر دیا۔ اتنی بڑی رقم کا حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔ ”استاد محترم! اس میں کوئی رعایت کوئی مروت نہیں ہو سکتی کیا؟“
استاد نے جواب دیا۔ ”ہو سکتی ہے رعایت۔ یہ رعایت ہی تو ہے کہ میں نقد سودے پر ادھار کو ترجیح دے رہا ہوں۔ گوشت مجھ کو آٹھ ہزار دینار نقد دے رہا تھا اور میں اس کو نظر انداز کر کے تیرے آٹھ ہزار مشعبہ کو ترجیح دے رہا ہوں۔“
درداغ نے اپنے وجود میں برسوں پرانا بخار سا محسوس کیا۔ جو اس کے گوشت پرست کے علاوہ ہڈیوں کو بھی گلے دے رہا تھا۔

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”تو نے بتایا نہیں کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟“
درداغ نے کہا۔ ”استاد محترم! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میں اس کا انتظام کہاں سے اور کس طرح کروں گا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”ابنِ علقمی کا دوست گوشت آٹھ ہزار دینار کا فوراً ہی بندوبست کر سکتا ہے مگر شہزادہ ابو بکر کا دوست درداغ وقت لے کر بھی یہ رقم فراہم نہیں کر سکتا، حیرت ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”ہاں! میں ایک دیانتدار انسان ہوں۔ میں اتنی بڑی رقم شہزادے سے نہیں مانگ سکتا۔“
استاد نے کہا۔ ”تب پھر اپنی قسمت پر توماتم کرنا رہ۔ میں یہاں سے جا کر گوشت سے بات پکی کر لوں گا۔“
درداغ نے التجا کی۔ ”استاد محترم! اتنی جلدی نہ کیجیے۔ کچھ وقت دیجیے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کا یہ

مطالبہ پورا کر دوں۔“

استاد شمس الدین نے درداغ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”درداغ! میرا دل بغداد سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ میں اپنی چیزیں بیچ کر اس کی نقد رقم بنا لیتا چاہتا ہوں۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے جلد از جلد کر لے کیونکہ میں بھی زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

درداغ نے حسرت بھری نگاہوں سے استاد شمس الدین کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

استاد نے پوچھا۔ ”پھر میں کب تک امید کروں؟“
درداغ نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“
استاد نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں تیری طرف سے مایوس ہو جاؤں؟“

درداغ نے بیزارگی سے جواب دیا۔ ”آپ جو چاہیں مطلب نکال لیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“
استاد شمس الدین چلے گئے۔ جاتے وقت دونوں میں علیک سلیک بھی نہیں ہوئی۔

اس غم نے ناکوں کے منہ کھول دیے اور وہ دس دن تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس نے یہ مدت زیادہ تر بے ہوشی ہی میں گزاری۔ گیارہویں دن جب وہ بالکل ہوش میں آ گیا تو بیمارستان کے ملازمین سے اس نے بہت سارے سوالات کر ڈالے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ میری مدہوشی کے دوران مجھے دیکھنے یا مجھ سے ملنے کون کون آیا؟

ایک طبیب نے جواب دیا۔ ”یوں تو کئی آدمی آئے مگر ان میں قابلِ ذکر ایک ہی ہستی تھی، شہزادہ ابو بکر۔ وہ دوبارہ آیا تھا اور اس نے بیمارستان والوں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ مریض درداغ کا خاص خیال رکھا جائے، چنانچہ بیمارستان والوں نے درداغ پر خاص توجہ دی تھی۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے کے نگراں سے پوچھا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان دس دنوں کے اندر میرے پاس کوئی استاد شمس الدین بھی آئے تھے؟“

نگراں نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ نہیں آئے تھے۔“
درداغ نے پوچھا۔ ”کوئی لڑکی، کوئی عورت؟“
نگراں نے پوچھا۔ ”کیا تم شادی شدہ ہو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں شادی شدہ نہیں ہوں۔“ مایوسی نے اسے چکنا چور کر دیا تھا۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”میں بیمارستان میں کتنے دن اور رہوں گا؟“

نگراں نے جواب دیا۔ ”شاید دو دن اور کیونکہ تو

درداغ کا حوصلہ بالکل ہی پست ہو گیا۔ ان حالات میں اب وہ شہزادے سے آٹھ ہزار دینار کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”شہزادے! مجھے آپ سے کوئی سوال کرنا تو نہیں چاہیے مگر پھر بھی استاد شمس الدین کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں نے ان کی ہمیشہ بے حد عزت کی لیکن وہ میرے معیار پر پورے نہیں اترے۔ سنا ہوں وہ ابن علقمی کے ساتھ مل گئے ہیں اور ان دونوں میں گہرے مراسم ہو چکے ہیں۔“

درداغ نے سرد آہ بھری۔ آہستہ سے کہا۔ ”ناشکرا انسان ہمیشہ اپنے محسنوں کو بھول جاتا ہے اور موقع پرستی پر اتر آتا ہے۔“

شہزادے نے کہا۔ ”پانچ چھ دن پہلے وہ میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ عجیب قسم کی باتیں کیں۔ ان کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔“

درداغ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ”کس قسم کی باتیں کیں انہوں نے؟ آپ مجھے بھی بتا سکتے ہیں وہ باتیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”اب میں کیا بیان کروں۔ وہ تیرا نام لے کر اپنی کسی کنیز علیہ کا ذکر کر رہے تھے۔ کہتے تھے ان کی کنیز علیہ تجھ کو بہت پسند ہے اور شاید علیہ بھی تجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ استاد محترم! تب پھر ویرکس بات کی۔ آپ علیہ کو آزاد کر کے اسے درداغ کے حوالے کر دیجیے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ میرا

درداغ سے سودا ہو گیا ہے اور تو علیہ کو آٹھ ہزار دینار میں خریدنے کا وعدہ کر چکا ہے۔ میں نے ان سے اس کی تفصیل نہیں پوچھی مگر یہ ضرور کہہ دیا کہ درداغ موجودہ حالات میں شاید ہی یہ سودا کرے کیونکہ آٹھ ہزار دینار اس کے پاس نہیں ہوں گے۔“

درداغ کا دل رور رہا تھا، بولا۔ ”ہاں میرا علیہ کے سلسلے میں آٹھ ہزار دینار کا سودا طے پا گیا تھا۔“

شہزادے نے پوچھا۔ ”کیا تیرے پاس آٹھ ہزار دینار ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بد قسمی سے نہیں۔“

شہزادے نے حیرت سے کہا۔ ”پھر تو نے یہ سودا کیوں کیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”پاگل پن میں اور یہ پاگل پن ہی تو ہے کہ میرے جیسا مفلس و قلاش آدی آٹھ ہزار

جن طبیعوں کے زیر علاج ہے ان کی بھی یہی رائے ہے۔“ اسی شام کو شہزادہ ابو بکر اس کو دیکھنے آ گیا۔ دیکھتے ہی شاکی لب و لہجے میں کہا۔ ”درداغ! میں تو تیری طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔“

درداغ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”مدہوشی کے عالم میں میں نے اپنے والدین سے ملاقات کی۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھے، میرے باپ نے مجھے دو طمانچے رسید کیے اور کہا۔۔۔ درداغ! کیا تو نے چنگیز خان کے وہ الفاظ نہیں سنے یا بھلا دیے۔ جب اس نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ لوگ جو اپنے آباؤ اجداد کے وطن کو چھوڑ کر دوسروں کے ملکوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ اس نے ان منگولوں سے کہا تھا کہ ان لوگوں کی مثال اس تیر جیسی ہے جو کمان سے نکل کر کسی سمندر کی تہ میں یا اونچی اونچی گھاس میں غائب ہو گیا ہو۔ میں اپنی قوم سے بچھڑ کر کچھ یوں ہی محسوس کرنے لگا ہوں۔“

شہزادے نے اسے تسلی دی۔ ”درداغ! مایوسی میں اس طرح مت سوچ۔ تو نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب تو میرا بھائی ہے۔ میں نے ابن علقمی کا خط امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ ابن علقمی اس بار بھی بچ کر نکل گیا۔ اس کے پاس ان باتوں کا ایک ہی عذر ہے۔ اس نے امیر المومنین کو یہی باور کرانا چاہا کہ یہ ساری شرارتیں شہزادہ ابو بکر کی ہیں کیونکہ شہزادہ امیر المومنین کو ہٹا کر خود حکمران بننا چاہتا ہے۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”پھر امیر المومنین نے اس کا کیا جواب دیا؟“

شہزادے نے کہا۔ ”انہوں نے ابن علقمی سے کہہ دیا کہ یہ عذر بہت پرانا ہو چکا ہے کوئی نیا عذر پیش کرو۔“

درداغ کو استاد شمس الدین اور علیہ ایک ساتھ یاد آئے۔ اس نے سوچا کہ وہ شہزادے سے آٹھ ہزار دینار کی بات کرے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ معلوم نہیں علیہ استاد کے پاس ہے بھی یا نہیں۔

شہزادے نے کہا۔ ”درداغ! امیر المومنین نے ایک حسین ترین شہزادی کا رشتہ میرے سامنے رکھا تھا۔ یہ شہزادی مصر کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ میں چاہتا۔۔۔ تو شادی کر لیتا لیکن میں نے کہہ دیا کہ امیر المومنین! جب تک منگولوں کا خطرہ ہم سب کے سروں پر منڈلا رہا ہے، میں یہ شادی نہیں کروں گا۔ باوا جان نے میرے اس جواب کو بہت پسند کیا۔“

دینار کی چیز کا سودا کرے۔“

گوت کہاں چلا گیا؟“

گوت کا ذکر کر کے وہ علیہ کی بابت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”میں بغداد میں اس لیے نظر آ رہا ہوں کہ ابھی تک شہزادہ مجھ سے ناخوش نہیں ہے۔ گوت کو بغداد سے نکال دیا گیا ہے شہزادہ ابو بکر اس سے بہت ناراض تھا اور شہزادے کو شبہ تھا کہ تیرے زخمی ہونے میں گوت کا ہاتھ تھا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”گوت اکیلا گیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

موٹے منگول نے جواب دیا۔ ”اس کا مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ میں بھی اس سے بے تعلق سا ہو گیا تھا۔“

درداغ نے موٹے منگول سے بات چیت اچانک بند کر دی اور دجلہ کی سطح پر رواں دواں بحروں کو دیکھنے لگا۔

جب یہاں سے جی اکتا گیا تو وہ مدرسہ مستنصریہ کے سامنے سے ہوتا ہوا ستاروں کے بازار کی طرف چلا گیا۔ وہ استاد شمس الدین کے پاس خود نہیں جانا چاہتا تھا مگر اس کی دلی آرزو تھی کہ وہ کہیں کسی بازار یا گلی کو بچے میں مل جائے۔

وہ علیہ کی بابت جاننا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ بالکل بے قابو ہو گیا، علیہ کے در پر پہنچ گیا۔ اس نے علیہ کے در پر دستک دی تو اندر سے ایک بڑی بی نمودار ہوئیں۔ انہوں نے درداغ کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”میں اس گھر کی مالک ہوں۔ تو کون ہے؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”علیہ کہاں چلی گئی؟“

بڑی بی نے پوچھا۔ ”یہ علیہ کون؟ اس گھر میں، میں رہتی ہوں میرا بیٹا استاد عمر مدرسہ مستنصریہ میں درس دیتا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”لیکن پہلے تو یہ مکان استاد شمس الدین کے تصرف میں تھا۔“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”استاد شمس الدین! وہ ملازمت چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔“

درداغ نے کسی پائل کی طرح کوئی اور بات کیے بغیر واپسی اختیار کی۔ وہ اپنے گھر آیا اور بستر پر گر کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس بے قراری کے دنوں میں اس نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی سیرت و سوانح بھی پڑھ اور سمجھ رہا تھا۔ ان دونوں چیزوں نے درداغ کی طبیعت میں

شہزادے نے موضوع بدل دیا۔ ”بہر حال دو تین دن کے اندر تو بیمارستان سے خارج کر دیا جائے گا۔ مجھ کو تیری ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں تو میری فوج کو منگولوں کے طریقہ جنگ سے آگاہ کرے۔ تیری ان خدمات کا تجھے گرانقدر معاوضہ دیا جائے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو آپ کا گرانقدر معاوضہ جس کے لیے درکار تھا اس کا باب بند ہو چکا۔ اب مجھے رقم نہیں چاہیے۔ اب میں رقم لے کر کیا کروں گا؟“

شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”رقم کی آج نہیں توکل ضرورت پیش آئے گی۔ اس دنیا میں علیاؤں کی کمی نہیں۔ اگر کسی علیہ کو پھر خریدنا پڑا تو کیا کرو گے؟ اس لیے تو ہم سے رقم ضرور لے گا۔“

درداغ لا جواب ہو گیا۔ شہزادے نے جاتے جاتے درداغ کو سمجھایا۔ ”درداغ! عشق کا آزار مت لگا۔ میں یہی نصیحت کر سکتا ہوں تجھ کو۔“

درداغ کو شہزادے پر غصہ آ رہا تھا، جو مدد کرنے کے بجائے نصیحتیں کر رہا تھا۔ اس نے گستاخی سے کام لیا اور شہزادے کی طرف سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ شہزادے نے کہا۔ ”میں پھر آؤں گا، شاید پرسوں ہی یا کل، بہر حال آؤں گا ضرور۔ تم پریشان مت ہونا۔“

شہزادہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی درداغ جی بھر کے رویا۔ اس کے معالجوں نے درداغ کو مشورہ دیا کہ اگر اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو وہ رونے دھونے سے گریز کرے لیکن درداغ بے بس تھا۔

☆☆☆

درداغ کو بیمارستان سے چھٹی مل گئی۔ شہزادے نے اس کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے اپنے دو غلام متعین کر دیے اور اس کو اتنا آرام پہنچایا کہ وہ ایک ہفتے میں اتنا اچھا ہو گیا کہ آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔ وہ گھوڑے کی سواری بھی کرنے لگا لیکن گھوڑے کو بھگاتا نہیں تھا۔ وہ ہر روز علی الصباح اور پھر شام سے پہلے دجلہ کے کنارے چلا جاتا اور وہاں ریت پر بیٹھ کر خیالوں میں گم ہو جاتا۔ یہاں ریت پر اس کی ایک دن موٹے منگول سے ملاقات ہو گئی۔

موٹے منگول نے اس سے کہا۔ ”تو نے اپنا دین بدل کے اچھا نہیں کیا اور اگر دین بدلنا ہی تھا تو ہلا کو خان کی بیوی دو قوز کا دین اختیار کرتا۔ مسیحی دین۔“

درداغ نے کہا۔ ”تو ابھی تک بغداد میں موجود ہے۔“

امیر المومنین کو ناراض کر دیا تو پھر پوری ملت اسلامیہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو تیری حمایت کر سکے۔“
درداغ نے کہا۔ ”تب پھر شہزادے آپ مجھ کو وہاں کیوں بھیج رہے ہیں؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”اس میں بھی ایک مصلحت ہے، میں بادا کے آس پاس اپنا ایک آدمی ضرور رکھنا چاہتا ہوں تاکہ مجھے ان باتوں کا بھی علم ہوتا رہے جن کا جاننا عام حالات میں ناممکن ہے۔“

درداغ نے بے بسی سے کہا۔ ”کیا میری نبھا ہو جائے گی؟ شاید نہیں لیکن آپ نے چونکہ مجھ پر احسانات کیے ہیں اس لیے میں یہ کام ضرور کروں گا۔“

جب درداغ قصر خلافت میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے دیواروں پر بہت سارے اشعار لکھے ہوئے دیکھے وہ انہیں پڑھنے لگا ان اشعار میں خلیفہ کو مطلع اور خبردار کیا گیا تھا۔

خلیفہ سے کہہ دو کہ ذرا شہر و تمہارے پاس وہ چیز آرہی ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ آگاہ رہو تم پر طرح طرح کی نامعلوم مصیبتیں آنے والی ہیں۔

میں کہتا ہوں اگر عزت آبرو چاہتے ہو تو پورے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو ورنہ تم پر بربادی اور جنگ چھا جائے گی۔

کلکت، ہنگ، قید، ضرب، لوٹ کھسوٹ سب کچھ ہوگا اور وہ بھی جس کا علم نہ تو تجھے ہے اور نہ ہی مجھے، بس خدا کو ہے۔

درداغ نے اپنے راہنما کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کس نے لکھ دیا ہے دیواروں پر؟“

راہنما کو شرم محسوس ہو رہی تھی، جواب دیا۔ ”کسی شاعر نے جل کر یہ سب کچھ لکھ مارا ہے کیونکہ ان اشعار میں صاف صاف اور کھری کھری باتیں کہہ دی گئی ہیں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا امیر المومنین کو ان اشعار کا علم ہے؟“

راہنما نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں، اگر امیر المومنین کو ان اشعار کا علم ہے تو ان کی بابت کوئی سوال نہ کرنا حیرت انگیز ہے اور اگر ان اشعار کا امیر المومنین کو سسرے سے علم ہی نہیں تو یہ اور حیرت انگیز ہے۔“ اس کے بعد راہنما نے کہا۔ ”نوجوان! تو نے مجھ سے جو کچھ پوچھ لیا، یہاں کسی اور سے اس قسم کے سوالات مت کرنا ورنہ مصیبت اٹھ کھڑی ہوگی تیرے خلاف۔“

درداغ ذرا دیر بعد قصر کے اس حصے میں پہنچ گیا۔

شہزادہ درداغ پر اتنا مہربان ہو گیا کہ اس کا ذکر بطور خاص خلیفہ مستعصم باللہ سے کر دیا۔ خلیفہ کو یہ شخص یاد آ گیا۔ اس نے شہزادے سے کہا۔ ”بیٹے! میں اس منگول سے دور رہنا چاہتا ہوں۔“

لیکن شہزادے نے اس کی پُراثر وکالت کی۔ ”امیر المومنین! وہ بہت پکا مسلمان ہے اس کی میں قسم کھا سکتا ہوں۔“

خلیفہ نے عذر پیش کیا۔ ”شہزادے! معلوم نہیں کیوں۔ میں درداغ سے مطمئن نہیں ہوں۔“ پھر پوچھا۔ ”اچھا یہ بتاؤ اس سے کیا کام لے رہا ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں اپنی سپاہ میں عزم و ہمت پیدا کرنا چاہتا ہوں اور انہیں منگولوں کے طریقہ جنگ کا علم دلوانا چاہتا ہوں۔“

شہزادے کی باتوں پر خلیفہ کو حیرت ہو رہی تھی، اس نے کہا۔ ”ابو بکر! تو منگولوں کے طریقہ جنگ کا درس ہمارے سپاہیوں کو کیوں دینا چاہتا ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوں تو ہمیں اپنے دشمن کی ساری چالیں معلوم ہوں مگر ہمارا دشمن ہماری چالوں سے نابلد ہو۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو اس کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس کو پختہ کر دوں۔“

شہزادہ بہت خوش ہوا اور اس نے درداغ کو یہ خوشخبری سنائی کہ اب وہ امیر المومنین کا قرب حاصل کر لے گا اور اس کا مستقبل روشن سے روشن تر ہوتا چلا جائے گا۔

شہزادہ درداغ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس وقت خلیفہ رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پہریداروں نے ان دونوں کو روک دیا اور کہا۔ ”امیر المومنین کا حکم نہیں ہے کہ ان کے تحلیے کے مشاغل میں کوئی دخل انداز ہو۔“

شہزادے نے کہا۔ ”اچھا امیر المومنین کو یہ تو بتا دے جا کر کہ آپ نے جس منگول کو میرے ذریعے بلوایا تھا وہ باریابی کا خواستگار ہے۔“

یہ پیغام امیر المومنین کے پاس جیسے ہی پہنچا اس نے حکم دیا کہ شہزادے کو رخصت کر دیا جائے اور نو مسلم منگول کو حاضر کر دیا جائے۔

جب درداغ امیر المومنین کے پاس جا رہا تھا تو شہزادہ اس کو سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھو درداغ! امیر المومنین کا ہر حکم تجھ پر واجب العمل ہے، تو ان کا ہر حکم مانے گا کیونکہ اگر

جہاں گھنکر وؤں اور سازوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

راہنما نے ایک مقام پر دردراغ کو ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دیا اور دردراغ سے کہا۔ ”نوجوان! میں اس کے آگے نہیں جاسکتا۔“

یہ دوسرا شخص دبلا پتلا کوئی مسخرہ معلوم ہوتا تھا۔ عورتوں کی طرح بڑے بڑے بال اس کی پشت پر پڑے ہوئے تھے۔ اگر اس کے چہرے پر ڈاڑھی مونچھ نہ ہوتی تو اس کی شناخت تک دشوار ہو جاتی۔ اس نے دردراغ کو ایک ایسے کمرے تک پہنچا دیا جس کے دوسری طرف محفل رقص و موسیقی برپا تھی۔ اس شخص نے دردراغ کو ایک تپائی پر بٹھا دیا۔ یہ تپائی آبنوس کی تھی اور اس کے اوپر نخل منڈھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دردراغ کو کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

رات کے پچھلے پہر خلیفہ نے دردراغ کو طلب کیا۔ یہ دردراغ کی دوسری ملاقات تھی۔ خلیفہ کا رعب دردراغ کے دل و دماغ پر وہ نہیں تھا جو عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ خلیفہ نے بھی یہ بات غمخس کی۔ اس نے دردراغ کے چہرے پر نظریں گاڑیں کیونکہ خلیفہ کا خیال تھا کہ وہ اس طرح دردراغ کو مرعوب کر لے گا لیکن دردراغ نے بھی خلیفہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے حیرت زدہ کر دیا۔

خلیفہ نے پوچھا۔ ”کیا تو وہی ہے جو بغداد میں ہلاکو خان کا خنجر اور کارندہ بن کر آیا تھا؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں وہی ہوں امیر المومنین!“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں تجھ سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ میں تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جب تو ہلاکو خان کا کارندہ بن کے آیا تھا، تو یہ اچانک تجھ میں تبدیلی کیونکر آگئی کہ تو واقعی مسلمان ہو گیا اور ہلاکو خان سے غداری کی؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”میں اسلام کی طرف پہلے ہی راغب تھا لیکن ہلاکو خان کے رعب و دبدبے نے مجھے اسلام سے کچھ کچھ منحرف کر دیا تھا جو آخر کار.....“

خلیفہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیا میں ایک غدار پر اعتماد کر سکتا ہوں؟“

دردراغ اس طرزِ خطاب کے لیے آمادہ نہیں تھا، بولا۔ ”کون غدار؟ کیسی غداری؟ میں امیر المومنین کا مطلب نہیں سمجھا۔“

خلیفہ نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”یہ تو نے جو کچھ کیا، کیا یہ ہلاکو سے غداری نہیں ہے؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”اگر میں غداری بھی کر رہا

ہوں تو اس سے امیر المومنین کو کیا نقصان پہنچے گا؟“ خلیفہ نے کہا۔ ”اس غداری سے مجھے نقصان پہنچے نہ پہنچے مگر یہ اصولی بات ہے کہ کسی غدار پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“

دردراغ کو غصہ آ رہا تھا، بولا۔ ”امیر المومنین! معلوم نہیں آپ دیلوں کی بات سمجھیں گے یا نہیں لیکن میں دیلوں کی بات کروں گا ضرور، آپ غداروں پر بھروسہ نہیں کر سکتے لیکن ہلاکو خان کی ساری لڑائی غداروں ہی کے ذریعے لڑی جا رہی ہے۔ ابن علقمی اور اس کے حواری کون ہیں، کیا ہیں؟ غدار اور ان غداروں نے خلافت اسلامیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ آپ کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آئیں گی شاید مگر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں واقعی، حقیقت ہے۔“

خلیفہ نے جزبہ ہو کر کمرے میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ ”تو نے ابن علقمی میرے وزیر کو غدار کہا۔ افسوس کہ تیری پشت پر شہزادہ ابوبکر ہے اور ابوبکر ابن علقمی سے خوش نہیں ہے اور وہ ابن علقمی کو غدار سمجھتا ہے ورنہ اس میں سچائی ذرا سی بھی نہیں۔ ابن علقمی لائق ترین اور سچا انسان ہے میں اسے غدار نہیں سمجھتا۔“

دردراغ نے کہا۔ ”آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں پھر میرا یہاں کیا کام مجھ کو اجازت دیجیے۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟ شاید دردراغ۔ تجھ کو میرے بیٹے ابوبکر نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تجھ کو یوں نہیں جانے دوں گا میں تجھ کو اپنے خدام میں شامل کر لینا چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے کچھ کام لوں گا اور یہ اندازہ لگاؤں گا کہ تو میرے لیے کتنا مفید ہے اور کہاں تک کام آسکتا ہے۔“

دردراغ نے سر جھکا دیا۔ ”اگر میرے سپرد کچھ کام کیے گئے تو میں انہیں اتنی خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی سے انجام دینے کی کوشش کروں گا کہ آئندہ امیر المومنین میری صلاحیت اور دیانت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکیں گے۔“

خلیفہ نے حکم دیا۔ ”کل ایک وفد موصل کے حکمران بدرالدین لولو کے پاس جا رہا ہے میں تجھ کو اس وفد کا سربراہ مقرر کرتا ہوں۔“

دردراغ خلیفہ کے اس حکم سے بے حد خوش ہوا کیونکہ اس حکم میں خلیفہ کا وہ اعتماد موجود تھا، جو اس نے اچانک دردراغ پر کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”مجھے موصل کے حکمران سے بات کیا کرنا ہوگی؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ موصل کے حکمران بدرالدین لولو کے پاس بہترین مغیباؤں اور رقاصاؤں کا ایک طائفہ موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ

چہرے پر موجود تھا حیرت انگیز تھا۔ اس سکون اور اطمینان نے درداغ کو بھی اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ اب تک وہ جن خدشات اور خطرات کا ذکر کرتا رہا ہے، شاید ان میں کوئی سچائی نہیں ہے لیکن یہ واہمہ ذرا سی دیر میں ہوا ہو گیا۔ خلیفہ کی سادہ لوحی اور عاقبت نااندیشی نے درداغ کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ دہل گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن جب شہزادے کو یہ معلوم ہوا کہ امیر المومنین نے درداغ سے ناچنے گانے والیوں کے طائفے کو موصل سے لانے کا کام لیا ہے تو بڑا افسوس ہوا اور انا اللہ پڑھنے لگا۔ درداغ نے کہا۔ ”شہزادے! میں امیر المومنین کے دل میں اعتماد پیدا کرنا چاہتا ہوں۔“

درداغ کو قصر خلافت طلب کیا گیا تو وہاں اس کی ملاقات ابن علفی سے بھی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ابن علفی نے کہا۔ ”تو نے اپنا مقام پالیا۔ میں تجھ کو کسی ایسے ہی منصب کا اہل سمجھتا تھا۔“

درداغ ابن علفی کے طنز کو محسوس کر رہا تھا مگر وہ اس کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا، خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

جب وہ اپنے وفد کے ساتھ بغداد کے مغربی دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے سے ایک وفد کو آتے دیکھا۔ یہ ہلاکو خان کا وفد تھا جو خلیفہ کے پاس کوئی پیغام لے کر جا رہا تھا۔ چونکہ درداغ نے اپنے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اس لیے منگولوں نے اس کو پہچان لیا۔ ہلاکو خان کے وفد کا سربراہ اس کے گھوڑے کے سامنے رک گیا۔ وہ کچھ دیر درداغ کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”درداغ! تو نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں اس وقت خلافت اسلامیہ کا فرستادہ ہوں اور ایک ضروری کام سے موصل جا رہا ہوں، خدا مجھے کامیاب کرے۔“

ہلاکو خان کے نمائندے نے کہا۔ ”بہر حال اب تو ہلاکو خان کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تجھ سے بے حد ناراض ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں کوئی پروا نہیں کرتا۔“

وہ ان سے جدا ہو کر موصل کی راہ پر ہولیا۔ وہاں بدرالدین لولو نے درداغ اور اس کے وفد کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے قیام اور طعام کا انتظام بھی کر دیا۔ بدرالدین لولو نے درداغ کو پیغام بھیجا کہ ذرا ہمت اور حوصلے کی ضرورت

طاائفہ میرے محل میں میرے پاس آجائے اور اس طرح میں تیری لیاقت اور صلاحیت کا اندازہ بھی لگا لوں گا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”امیر المومنین! کیا موصل کا حکمران آپ کا تابع نہیں ہے؟ کیا موصل خلافت عباسیہ کی حدود سے باہر واقع ہے؟ آپ موصل کے حکمران سے ناچنے گانے والیوں کا طائفہ طلب فرما رہے ہیں، اس کی خواہش کر رہے ہیں حالانکہ آپ اس طائفے کو حکماً حاصل فرما سکتے ہیں۔ آپ بدرالدین کو حکم دے دیجیے وہ طائفہ خود بخود حاضر ہو جائے گا۔“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”درداغ! بدرالدین نے ہلاکو خان سے بھی دوستی کر رکھی ہے بس اس دوستی اور ہلاکو خان کی طرفداری نے بدرالدین کو خود سر اور مطلق العنان بنا دیا ہے ورنہ عام حالات میں میرا حکم ہی کافی ہوتا۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین! میں ایک بات اور کرنا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو عرض کر دوں؟“

خلیفہ نے جواب دیا۔ ”کہو، اجازت ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”امیر المومنین! ان سنگین اور نازک حالات میں جبکہ ہلاکو خان بغداد پر فوج کشی کے منصوبے بنا رہا ہے اور بغداد کے دروازوں پر اس کے دشمن مسلسل دستک دے رہے ہیں آپ کا ناچنے گانے والیوں کا طائفہ طلب کرنا کچھ عجیب سا نہیں لگتا؟“

خلیفہ مسکرایا۔ ”بغداد پر فوج کشی؟ کون کرے گا فوج کشی؟ ہلاکو خان؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے ہمیں یہ یقین دلادیا ہے کہ وہ اسلام پر مائل ہے اور میرے ہاتھ پر مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اگر ہلاکو خان مسلمان ہو گیا تو پھر بغداد پر حملہ کون کرے گا؟ چنانچہ میں نے اس وہم کو اپنے دل سے نکال دیا ہے اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی کو حسین ترین یا کمال مغنیوں، رقاصوں کے درمیان گزار دوں۔“

درداغ نے عرض کیا۔ ”امیر المومنین کا حکم سر آنکھوں پر۔ گو کہ یہ کام میری حیثیت اور شان کے مطابق نہیں لیکن میں امیر المومنین کا اعتماد جیتنے کے لیے یہ کام ضرور کروں گا۔“

خلیفہ نے حکماً کہا۔ ”اب تو جاسکتا ہے کل کسی بھی وقت تجھ کو طلب کر لیا جائے گا۔“

درداغ کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ اس کو بہت افسوس تھا کہ اس نے قصر خلافت میں کہیں بھی ہلاکو خان کا خوف نہیں محسوس کیا۔ وہ اطمینان، وہ سکون جو خلیفہ کی باتوں اور

ہے اس لیے فوراً میرے پاس آ جا۔

چنانچہ دردراغ بدرالدین کے دربار میں پہنچ گیا۔ موصل کے حکمران نے کہا۔ ”افسوس کہ امیر المومنین نے مجھ سے چیز بھی کیا طلب کی۔“

دردراغ نے شکایت کیا۔ ”موصل کے حکمران! مجھ کو تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی اعلیٰ چیز آپ کے پاس موجود ہے اور آپ نے امیر المومنین کو اس سے محروم رکھا اور اس کا انتظار کرتے رہے کہ جب امیر المومنین اس چیز کو خود طلب فرمائیں تو آپ دے دیں۔“

بدرالدین نے جواب دیا۔ ”واللہ! یہ بات نہیں تھی۔ اگر آپ شام کو میرے پاس آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو میں ایک خاص منظر آپ کو دکھاؤں۔“

دردراغ نے دل میں سوچا، وہ کون سا خاص منظر ہوگا جو بدرالدین دکھانا چاہتا ہے۔ اس نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

پہلی اور دوسری ملاقات کا درمیانی وقفہ اس نے بڑی بے چینی میں گزارا اور شام کو جب وہ بدرالدین کے دربار میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے اپنے ساتھ ہی ایک دوسرے وفد کو بھی دربار میں داخل ہوتے دیکھا۔ جانوروں کی کھال میں چھپے ہوئے جسم اور سروں پر اونٹنی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے یہ ہلاکو خان کا وفد تھا۔ اس وفد کے ارکان نے بھی دردراغ کو پہچان لیا لیکن اس سے بات نہیں کی۔ وہ بالکل اجنبی بن گئے۔

بدرالدین لولو نے خلافت عباسیہ کے وفد کو بائیں جانب اور ہلاکو خان کے وفد کو دائیں جانب جگہ دی۔

اس کے بعد ہلاکو خان کے وفد کا سربراہ بدرالدین سے مخاطب ہوا۔ ”موصل کے حکمران کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں منگول فاتح کا ادنیٰ چاکر ہوں مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ موصل سے منجیق حاصل کروں۔“

بدرالدین نے پوچھا۔ ”اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ منجیق میرے پاس نہیں ہے تو؟“

منگول سردار نے جواب دیا۔ ”پھر میں تیرا یہ جواب اپنے آقا اور فاتح ہلاکو خان کے گوش گزار کر دوں گا۔“

منگولوں کا وفد بدرالدین کے روبرو اس شان اور دب دے سے بیٹھا تھا کہ دردراغ اور اس کے ساتھیوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ بدرالدین نے پوچھا۔ ”میں یہ منجیقیں فراہم کر دوں گا لیکن یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میری دی ہوئی منجیقیں کہاں اور کس کے خلاف استعمال کی جائیں گی؟“

منگول سردار نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے یہ منجیقیں

تیرے خلاف ہی استعمال ہو جائیں۔“

بدرالدین اس جواب سے کھسیا گیا، مسکراتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ ”لیکن میں تو ہلاکو خان کے دوستوں میں شامل ہوں، مجھے تو میرے تحفظ کا یقین دلایا گیا ہے۔ اہل موصل کو منگول فاتح نے کبھی بھی دھمکی نہیں دی اور مجھ کو ہلاکو خان کی دوستی پر فخر ہے۔“ بدرالدین خواجواہ ہلاکو خان کی مدح سرائی کر رہا تھا۔

منگول سردار نے کہا۔ ”میں ان منجیقوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اس لیے انہیں فوراً فراہم کر دیا جائے۔“ بدرالدین نے جواب دیا۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“ منگول سردار اس کے بعد بدرالدین دردراغ سے مخاطب ہوا۔ ”اور تم بھی ناچنے گانے والیوں کا طائفہ جب چاہو اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔“

منگول سردار نے بدرالدین سے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”موصل کا فرمانروا مجھ سے تو یہ پوچھ سکتا ہے کہ مطلوبہ منجیقیں کہاں اور کس کے خلاف استعمال ہوں گی مگر میرے ہمسائے وفد کے سردار سے یہ سوال نہیں کیا گیا کہ ان کے مطلوبہ آلات اور ہتھیار کہاں اور کس کے خلاف کام میں لائے جائیں گے۔“

اس سوال نے بھی کوہنسنے پر مجبور کر دیا۔ کسی درباری مسخرے نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ آلات اور ہتھیار امیر المومنین خود اپنے خلاف استعمال میں لائیں گے۔“

بدرالدین نے قہر کی نظروں سے اس مسخرے کو دیکھا اور اسے دربار سے نکلوا دیا۔

کچھ دیر بعد ہلاکو خان کے وفد کو دربار سے رخصت کر دیا گیا اور دردراغ کو اپنے قریب بلالیا۔ بدرالدین نے پوچھا۔ ”تم بھی تو منگول ہی ہو؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں منگول ہوں لیکن میں مسلمان ہو چکا ہوں۔“

بدرالدین نے کہا۔ ”امیر المومنین نے تم سے شایان شان کام نہیں لیا اور تم کیسے تھے جو یہ ذمہ داری قبول کر لی؟“

دردراغ نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں ہلاکو خان کے پاس واپس نہیں جاسکتا تھا اس وقت میں امیر المومنین کے اختیار میں ہوں اور امیر المومنین اپنے اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر خود بیٹھیں یا اس پر مویشیوں کا چارالادیں۔“

بدرالدین نے کہا۔ ”میں تجھ کو مشورہ دوں گا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر۔“

درداغ ایسی باتیں نہیں سنتا چاہتا تھا کیونکہ یہ باتیں دربارِ خلافت تک پہنچ سکتی تھیں۔

رات کو درداغ کی قیام گاہ پر ہلاکو خان کا نمائندہ سردارِ خلافت توقع پہنچ گیا۔ اس نے درداغ کو حیرت اور افسوس سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”درداغ! یہ میں تجھ کو کہاں دیکھ رہا ہوں؟“

درداغ کئی شمعوں کی روشنی میں سر جھکائے بیٹھا تھا، بولا۔ ”سردار! مسلمانوں میں تقدیر نامی ایک عقیدہ پایا جاتا ہے میں اسی تقدیر کا شکار ہو گیا ہوں۔“

منگول سردار نے کہا۔ ”اگر تم چاہو اور مجھ سے کہو تو میں ہلاکو خان سے تمہاری سفارش کروں۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

منگول سردار نے درداغ کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ ”وہاں تو یہ خبر مشہور ہے کہ درداغ نے ایک خیر و مسلمان لڑکی کے عشق میں اسلام قبول کر لیا ہے معلوم نہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ایک مسلمان لڑکی سے عشق تو ضرور ہو گیا تھا مگر میں اسے حاصل نہیں کر سکا۔ میرا اسلام ایک الگ ہی معاملہ ہے۔“

منگول سردار نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم میرے ساتھ ہلاکو خان کے پاس چلے چلتے۔ شاید میں تمہیں معافی دلوا سکتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”معزز سردار! اب اس کی ضرورت نہیں رہی، میں جہاں ہوں، جس حال میں ہوں، خوش ہوں۔“

منگول سردار وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھا، جاتے جاتے کہتا گیا۔ ”اب ہم دونوں کی ملاقات بغداد میں ہوگی۔ قلعہ اور مفتوح جیسی ملاقات اور اس وقت تم کسی بھی رعایت کے مستحق نہیں ٹھہرو گے۔“

درداغ منگول سردار کو چھوڑنے کے لیے باہر تک گیا، بولا۔ ”میں رعایت اور مروت کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا اور رہ گئی قلعہ اور مفتوح کی ملاقات، تو یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔ میں تم سے ملاقات کروں گا تو قاتحانہ شان سے، ورنہ ملاقات ہی نہیں کروں گا۔“

منگول سردار نے ازراہ مذاق اور طعن وطنز کہا۔ ”ناچنے گانے والیوں کا طائفہ اور قاتحانہ شان۔ خوب۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر غور بھی کر رہے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری عقل تو

ماری ہی گئی ہے۔“

درداغ نے التجا کی۔ ”اب تم یہاں سے چلے جاؤ میں تم سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

منگول سردار زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”مزید بات کی گنجائش بھی نہیں رہ گئی۔“ اور وہ چلا گیا۔

درداغ کے دل و دماغ بوجھل ہو رہے تھے۔ ادھر کچھ عرصے سے اس کو جس قسم کی باتیں سنتا پڑ رہی تھیں وہ بڑی شرمناک اور تکلیف دہ تھیں۔ وہ دل میں سوچتا کہ معلوم نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب اس نے بغداد جانے کا قصد کیا تھا۔ وہ ایک دلدل میں پھنس گیا تھا۔ وہ اس دلدل سے نکلنے کی کوشش اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ اس طرح وہ اور زیادہ قعرِ مذلت میں ڈوب جاتا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ کیا مسلمان ہو جانے کی وجہ سے یہ مصیبتیں اس پر نازل ہوئی ہیں تو حالات اور واقعات ان پر تجزیہ اور تبصرہ اس کے خلاف تھے۔ اس نے اسلام میں انسان کے لیے جو کچھ دیکھا یا پایا تھا وہ کہیں اور نہیں مل سکتا تھا اس لیے اسلام کی اس کے دل میں بڑی عزت تھی۔

☆☆☆

رقاصاؤں اور مغنیوں کا طائفہ مستعصم باللہ کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ خلیفہ اس سے بہت زیادہ خوش ہوا، درداغ نے خلیفہ کو بتایا کہ جب میں بدرالدین کے دربار میں پہنچا تو میں نے وہاں دربار میں منگول قلعہ ہلاکو خان کے وفد کو جنتیں مانگتے دیکھا۔ ہلاکو خان ان منجنيقوں کو بغداد کی تسخیر میں استعمال کرے گا۔

خلیفہ برہم ہو گیا۔ ”تم لوگوں نے شاید یہ طے کر لیا ہے کہ بغداد کو تباہ و برباد کرادو۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”لاحول ولا قوۃ۔ میں ایسی بے ہودہ بات کیوں سوچوں؟“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”تو نے یہ لاحول کس پر پڑھی ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اپنی بدقسمتی پر، اپنے حالات پر۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”درداغ! میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ بغداد کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہلاکو خان اسلام قبول کر کے مذکورہ منجنيقیں دشمنانِ اسلام کے خلاف استعمال کرے گا۔“

درداغ نے بے بسی سے عرض کیا۔ ”شاید ایسا ہی ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

خلیفہ نے اس طائفے کو مشغول کر دیا اور خود بھی اس کو دیکھنے اور سننے میں مشغول ہو گیا۔

گھر کی تنہائی اس کو کھانے لگی۔ وہ اس تنہائی کے بھوت کو شکست دینے کے لیے گنگنا نے لگا۔ اس روز اسے علیہ بہت زیادہ یاد آئی۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ تو کہاں چلی گئی؟ میں تجھ کو کہاں تلاش کروں؟ زمین میں یا آسمان میں۔

اے روشنی طبع! تو میرے حق میں بربادی اور تنہائی کا پیغام ہی لاتی ہے یا کچھ اور بھی؟ میں نے حق کو تلاش کیا اور آخر کار پالیا۔ مگر یہ کیا جب میں حق سے دور تھا، آفات ارضی و سماوی سے دور تھا۔

لیکن حق کے پاتے ہی میں ان میں گھر گیا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آسمان سے آنے والی جملہ آفات میرا پتا پوچھتی آتی ہیں۔ اے خدا یا اپنے بندے پر رحم فرما اور مجھ کو دل برداشتہ نہ کر۔

☆☆☆

لوگوں نے دردراغ کو خلیفہ کے پاس آتے جاتے جو دیکھا تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اب انہوں نے دردراغ کا وسیلہ پکڑ لیا تھا۔

شہزادے نے دردراغ کو سمجھایا کہ ”دردراغ! خدا کے لیے ڈتے داریاں بہت زیادہ نہ بڑھالینا۔ یہ درخواستوں والے لوگ الٹی سیدھی درخواستیں پیش کر کے تم کو خوار کر دیں گے۔“

لیکن دردراغ نے شہزادے کی نصیحتوں پر عمل نہیں کیا، اس نے لوگوں کی بہت ساری درخواستیں ایک رومال میں بستے کی طرح باندھ کر دربار کا رخ کیا۔

دربار میں پہنچ کر خلیفہ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔ ”دردراغ! میں نے سنا ہے موصل میں تجھ سے ہلاکو خان کا نمائندہ ملاقات کرنے آیا تھا اور اس نے تجھ سے کچھ باتیں بھی کی تھیں؟“

دردراغ نے عرض کیا۔ ”جی امیر المومنین! ایسا ہوا تھا۔“ خلیفہ نے پوچھا۔ ”اس نے تجھ سے کیا باتیں کی تھیں؟“ دردراغ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! میں نے وہ ساری بات چیت وہ ساری گفتگو لکھ لی تھی، اگر اجازت ہو تو میں وہ نوشتہ اس وقت لا کر امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دوں؟“

خلیفہ نے کہا۔ ”ہاں اس نوشتے کو اسی وقت لے آ۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔“

دردراغ سیدھا شہزادے کے پاس پہنچا اور اس کو سب کچھ بتا کے درخواست کی۔ ”شہزادے! میں بغداد چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میرا بغداد سے جی بھر گیا، یہاں کے لوگوں سے میں عاجز آچکا ہوں۔“ شہزادے نے کہا۔ ”میں تجھ کو جانے ہی کب دوں گا۔“

دردراغ شہزادے کے پاس سے اٹھ کر بازار چلا گیا۔ وہاں ایک جگہ چند شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ دردراغ بھی ان کے پاس جا کھڑا ہوا، دردراغ کے لباس سے ہر کوئی چونک جاتا تھا۔ لوگوں نے دردراغ کو میر مجلس کی طرح سب سے نمایاں جگہ پر بٹھا دیا اور شعرا سے کہا۔ ”حضرات اب آپ اپنا کلام سنائیں۔“

کئی شعرا یکے بعد دیگرے اپنا کلام سنا کر چلے گئے۔ ایک شاعر سب سے آخر میں اپنا کلام سنانے آیا، اس نے آتے ہی سامعین سے کہا۔ ”حضرات! آپ نے حسن و عشق کی داستانیں سنیں، آپ نے شعرا کا ہیکلو پین بھی سن لیا، اب میری سنیں۔ میرے اشعار میں آپ کو سچائیاں ملیں گی کیونکہ.....“

مجمع میں کسی نے پھبتی کسی۔ ”کیونکہ ہم سچائیاں پسند نہیں کرتے۔“

شاعر نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور اپنا کلام سنانے لگا۔

”اے سوال کرنے والے! میں جانتا ہوں کہ حق کی تلاش میں ہے۔“

تو نے جو کچھ پوچھا ہے، اس کا جواب میرے پاس ہے۔

تو جاننا چاہتا ہے کہ انسانوں اور دین حنیف کے ماننے والوں پر کیا گزرنے والی ہے؟

اوہ، کیا یہ کوئی معمولی سا نسخہ ہے کہ دین حنیف مٹ جائے اور بغداد برباد ہو جائے۔

”لوگو! میں دیکھ رہا ہوں، میری آنکھیں جو آنے والے کل کو دیکھ سکتی ہیں، خوب دیکھ رہی ہیں۔ تو پوچھے گا،

کیا؟ تو سن، بے آبروئی، قتل، سزا، زنجیریں اور وہ حوادث، جو بچے کے بالوں کو بھی سفید کر دیں۔“ سامعین

میں سے بعض کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اکثر شاعر کا مذاق اڑانے لگے۔

دردراغ کے دل پر بھی بڑا اثر ہوا۔ وہ اپنے دل پر ایک بوجھ لیے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔

درداغ کو چکر سا آنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔

خلیفہ نے ایک درخواست اپنی مٹھی میں دبا رکھی تھی، اپنی مٹھی کو کھول کر وہ درخواست درداغ کو دے دی، یہ علیہ کی درخواست تھی، وہ علیہ کی تحریر پہچانتا تھا۔

خلیفہ نے پوچھا۔ ”یہ درخواست کس نے دی تھی تجھے؟“
درداغ نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! کچھ بتا نہیں، یہ درخواست کس نے دی تھی مجھے، بہر حال میں نے اس پر لکھ دیا ہے کہ وہ آٹھ ہزار دینار خزانہ عامرہ سے ادا کر دیے جائیں اور علیہ کو درداغ کے حوالے کر دیا جائے۔“
درداغ مارے خوشی کے پاگل سا ہو گیا۔

وہ ساری درخواستیں لے کر چلنے لگا تو خلیفہ نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھ یہ درخواستوں والے تیرے پاس آئیں گے تو ان سب میں اس آدمی کو یہ آسانی پہچان لے گا جو علیہ کی درخواست لے کر آیا تھا۔ بس اس کو کسی طرح پکڑ لے۔ تیرا کام ہو جائے گا۔“

درداغ نے علیہ کی درخواست ساری درخواستوں سے الگ رکھی اور تقریباً دھوٹی کے عالم میں باہر چلا آیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر درخواستیں لے کر بیٹھ گیا۔ علیہ کی درخواست سیدھے ہاتھ کی مٹھی میں بندھی ہوئی تھی۔ اب وہ ساری درخواستیں سنبھالے ہوئے یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان میں ایک درخواست بھی مسترد نہیں کی گئی تھی۔ ساری کی ساری منظور کر لی گئی تھیں۔ اس نے سوچا کیا خلیفہ عقل و خرد سے بالکل ہی محروم ہے؟ کیا قوت فیصلہ نام کی کوئی شے خلیفہ کے پاس ہے ہی نہیں، اگر ہوتی تو ہر درخواست پر فیصلہ مختلف ہوتا، کسی پر منظور، کسی پر مسترد کے الفاظ ضرور ہوتے۔ جب وہ خلیفہ کو بالکل نا اہل اور نالائق قرار دے چکا تھا، اس کی نظر اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر پڑی۔ اس کا دل شدت جذبات سے بھر آیا۔ اس نے سوچا، خلیفہ جو کچھ بھی ہو، حد درجہ شریف انسان ضرور ہے۔

اب اس کے سامنے وہ لوگ تھے جن کی درخواستیں اس کے سامنے رکھی تھیں۔ اس نے دیکھا غرض مند چہرے امید اور ناامیدی کی پرچھائیاں لیے اس کے آس پاس جمع ہو رہے ہیں۔

درداغ نے درخواستوں والا بستہ ایک طرف رکھ دیا اور خود اپنا نوشتہ لینے گھر چلا گیا۔

دیر بعد جب وہ واپس آیا تو خلیفہ اندر جانے ہی والا تھا۔ درداغ نے اپنا نوشتہ خلیفہ کو دے دیا اور خود درخواستوں والا بستہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خلیفہ کے سامنے یہ ساری درخواستیں پیش کرنا چاہتا تھا مگر خلیفہ کو پاہ رکاب دیکھ رہا تھا۔

خلیفہ اس کی پریشانی کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”درداغ! اب میں اندر جانا چاہتا ہوں، مجھ سے کوئی کام؟“
درداغ نے درخواستوں کا پلندہ خلیفہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”امیر المومنین! یہ درخواستیں آپ کی توجہ چاہتی ہیں۔“
خلیفہ نے کہا۔ ”لیکن اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں، تو نے پہلے ہی دے دی ہوتیں۔“
درداغ نے عرض کیا۔ ”وہ تو میں گھر چلا گیا تھا ورنہ ایسا نہ ہوتا۔“

خلیفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو حد درجہ شریف انسان ہے، درخواستوں کا پلندہ کھول اور دیکھ کہ ان سب پر کارروائی ہو چکی ہے۔“

درداغ نے جلدی جلدی پلندہ کھولا اور اس پر خلیفہ کے مندرجہ احکام دیکھ کر رنگ رہ گیا۔ خلیفہ نے کہا۔ ”میں نے تیری عدم موجودگی میں سوچا تیرا یہ کام کیوں نہ کر دوں؟ چنانچہ میں نے کر دیا۔“

خلیفہ نے پوچھا۔ ”مگر درداغ! ایک بات تو بتا۔“
درداغ خلیفہ کی صورت دیکھنا چاہتا تھا مگر نہیں دیکھ سکا، بولا۔ ”ارشاد فرمائیے۔“
خلیفہ نے پوچھا۔ ”یہ علیہ نامی لڑکی کو تو کس طرح جانتا ہے؟“

درداغ دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار پوچھا۔ ”علیہ! کہاں ہے علیہ؟“

خلیفہ نے کہا۔ ”ان درخواستوں میں ایک درخواست علیہ کی بھی ہے اور اس نے لکھا ہے کہ اس کو کسی نے آٹھ ہزار دینار میں استاد شمس الدین سے خرید لیا تھا اور اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ علیہ کو آخر کار درداغ کے حوالے کر دے گا۔“

ماخذات

تاریخ تمدن اسلام، جوجی زیدان، الفہرست، ابن ندیم، طبقات ناصری، منهاج سراج، الفخوری، ابن طباطبائی، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ الخلفاء، مولانا جلال الدین سیوطی

گا؟“ ثانیہ کو اپنی آواز آنسوؤں اور کرب میں ڈوبی ہوئی اور کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔
ندیم مزید پھر کر بولا۔ ”میری تو تمہارے پاس ایک حربہ ہے۔ بچوں کی بیڑیاں میرے پاؤں میں ڈال کر میری پوری

وہ ایک بہت تلخ رات تھی۔“ دیکھو ثانیہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔“ ندیم کے چہرے پر ایک فیصلہ کن کیفیت تھی۔
”ندیم! خدا کے واسطے ایسا مت کہیں۔ بچوں کا کیا ہے

پھر یاد آئی

طاہر حباوید محل

وقت کا احساس بغیر کسی وجود کے بھی ہمیشہ انسانی دماغ کو اپنے شکنجے میں کسے رکھتا ہے۔ یہی اس کی طاقت ہے اور اگر ماضی اچھا ہو تو اکثر آنکھوں میں آنسو بھی لا تا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا۔ یہی وقت جب کسی پر مہربان تو تمام انسان مہربان اور جب وقت اپنی سنگدلی پر اترے تو ساری مہربانیاں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ جس کو ٹھوکر مار کر اس نے بھی گھر کے دروازے سے دور کیا تھا اسی کے قدموں میں وقت اسے پھر لے آیا مگر... اس کی نفرت کی انتہا کہ اس نے ٹھوکر میں رہنے کا بھی موقع نہ دیا... یہ وقت کی ظالم صورت نہیں تو اور کیا ہے۔

رشتوں کو قدموں تلے روندنے والے ایک قاتل
کی بے بسی کا احوال



میں تمہیں۔“

زندگی جہنم بنانا چاہ رہی ہو۔ میری آنے والی نسل کو برباد کر رہی ہو۔“ ندیم کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ وہ ایسی باتیں بھی کہہ رہا تھا جو شاید وہ فی الحال کہنا نہیں چاہ رہا تھا۔

”ثانیہ! میری اور تمہاری شادی درحقیقت شادی نہیں تھی۔ یہ صرف تمہارے ماں باپ کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ ایک دھوکا تھا اور میری زندگی کے ساتھ ایک کھلوڑ تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی کی خاطر میری زندگی میں زہر گھول دیا۔ ایک پیدائشی بیمار کو میرے پلے باندھ دیا۔“ اس نے غصے میں اپنی وارڈروب پر مکا ماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یاد رکھو، میں تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو اپنی زندگی کے ساتھ مزید کھیلنے نہیں دوں گا۔ یہ سب کچھ اب میری برداشت سے باہر ہے۔“

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی اور بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور اس کے آنسو لگا تار اس کے چہرے پر بہہ کر اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ ندیم ایک بار پھر گرجا۔ ”ہاں، یہ سب میری برداشت سے باہر ہے اور شاید اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہمارے راستے جدا ہو جانے چاہئیں اور..... تمہیں تمہارے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔“

ندیم کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ ان کی بیٹی شمرین جو تقریباً تین سال کی تھی، وارڈروب کے نچلے خانے سے کھلونے نکالنے میں مصروف تھی۔ بہ ظاہر اس نے خود کو کھلونوں میں مصروف کیا ہوا تھا لیکن پریشانی اور کرب کے آثار نمایاں طور پر اس کے معصوم چہرے پر نظر آرہے تھے، جو اس بات کی دلیل تھے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے پوری طرح متاثر ہے۔ بیٹا آیاں صرف دو ماہ کا تھا۔ وہ بستر پر پڑا بے چینی سے رو رہا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ اس کے تحیف بازو اور ٹانگیں مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

ندیم ثانیہ کے پاس بیٹھا اس کو شانوں سے پکڑا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ ”اب جب تم ان بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھو گی تاہم تو انہیں پتا چلے گا کہ بیٹیوں کے گھر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے آباد نہیں ہوتے۔ جھوٹ برباد کرتا ہے، صرف برباد کرتا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں.....“

ثانیہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خدا کے لیے ندیم ایسا مت کہیں.....“

ثانیہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ندیم نے اسے زور سے پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”طلاق دیتا ہوں

ثانیہ جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح وہیں قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی ہچکیوں کی آواز اب باقاعدہ رونے میں بدل گئی۔ اس کے رونے میں کرب تھا، بے بسی تھی، دہائی تھی اور خوف تھا۔ آیاں کے رونے میں بھی اب شدت آ گئی تھی۔

ندیم نے اپنا لپ ٹاپ بیگ پکڑا اور روتے ہوئے بچے کو نظر انداز کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسلسل رونے سے بچے کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔ ثانیہ اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کو وقتی طور پر بھول گئی۔ فوراً انھی اور اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ندیم پاؤں پٹختا ہوا دروازے تک جا چکا تھا۔ جاتے جاتے رک گیا۔ واپس آیا اور ثانیہ کی طرف انگلی اٹھا کر غضب ناک آواز میں گرجا۔ ”اور کان کھول کر سن لو، تمہارے پاس صرف اور صرف کل کا دن ہے جو کچھ اس گھر سے لینا ہے لے لو اور دفع ہو جاؤ۔ پرسوں میں جب یہاں آؤں تو مجھے تمہاری منحوس صورت یہاں دکھانی نہیں دینی چاہیے اور دوسری بات..... ان بچوں کو ابھی لے جاؤ مگر یہ بات اپنے کھوپڑے میں بڑی اچھی طرح بٹھا لو۔ یہ میرے بچے ہیں، صرف میرے بچے۔ وقت آنے پر میں نے ان کو لے جاتا ہے.....“

اس کی آواز جیسے ایک زہریلی چنگھاڑ تھی جو پورے گھر میں گونج رہی تھی پھر وہ تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

اور یہ وداع کی رات تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور تیز ہوا سے کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے۔ وہ شمرین اور آیاں کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھی، جیسے کسی پرندے نے اپنے بچوں کو پروں میں چھپا رکھا ہو، اس نے اپنا سامان سمیٹ لیا تھا اور سامان تھا ہی کتنا؟ اپنے اور بچوں کے کپڑوں کے چند جوڑے۔ شمرین کی دو چار کتابیں اور کاپیاں، وہ چھوٹے چھوٹے تحفے جو گزری ”ترجہ ڈیز“ پر ندیم نے اسے اور شمرین کو دیے تھے۔ ایک بڑا فوٹو البم جس میں پچھلے تین چار سال کی سنہری یادیں تھیں اور بس۔ اس نے باقی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دل ہی دل میں کہا تھا..... ندیم! یہ تمہارا گھر ہے، یہ تمہاری چیزیں ہیں۔ میں تو ایک ”چند روزہ مہمان“ کی طرح یہاں آئی تھی اور جا رہی ہوں۔

بادل زور سے گرجا۔ شمرین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ماما..... بڑی دیر ہو گئی ہے، پاپا کب آئیں گے؟ کیا وہ آج بھی نہیں آئیں گے؟“

”ہاں شاید وہ آج بھی نہیں آئیں گے۔ وہ دور گئے

ہیں۔" وہ اٹھک بار آواز میں بولی۔

"وہ کیوں دور گئے ہیں؟" اس نے توتلی زبان میں دریافت کیا۔

"یہ تو اپنے اللہ میاں سے پوچھو نا کہ کبھی پاپا..... اور کبھی ماما... اپنے بچوں سے اتنی دور کیوں چلے جاتے ہیں؟" ثانیہ نے سسک کر کہا اور ٹمرین کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ ثانیہ کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کھڑکی کھل گئی۔ یادوں کے سلسلے دراز ہونے لگے..... ثانیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی پیدائش پر اس کے والدین بہت خوش تھے لیکن بہت کچھ بدلنے والا تھا اور بہت جلد بدلنے والا تھا۔ ثانیہ اپنی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد سے ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ مختلف ڈاکٹرز سے اسے چیک کرایا گیا۔ بالآخر اس کے والد سرد صاحب جب ایک معروف لیبارٹری سے اس کی ٹیسٹ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے پیشہ وارانہ لہجے میں انہیں بتایا کہ ان کی بچی خون کی بیماری کا شکار ہے اور یہ سیکلیسیا کی ہی ایک قسم ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے ان سے تسلی بخشی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر باقاعدہ علاج ہو اور کچھ پرہیز کا خیال رکھا جائے تو کافی حد تک اور کافی دیر تک اس بیماری کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ آگے جا کر یہ بیماری مکمل طور پر ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کی طرف سرکتا رہا۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق ثانیہ کی ٹریسٹ ہوتی رہی۔ گاہے بگاہے اسے خون بھی لگتا رہا۔ ثانیہ کی والدہ شروع شروع میں تو بہت رنجیدہ رہیں لیکن پھر انہوں نے خود کو پوری طرح ثانیہ کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ ثانیہ اپنے والدین کے گھرانے کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد ان کی مزید کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ثانیہ اپنے والدین کی زندگی کا مرکز و محور تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ثانیہ نے اپنے والدین کی توجہ و محبت، ڈاکٹرز کی محنت اور سب سے بڑھ کر اللہ کی مرضی اور منشا کے طفیل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس کی بیماری کافی حد تک کنٹرول میں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسے دو تین ماہ تک خون کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی اور وہ جیسے بھول ہی جاتی تھی کہ وہ بیمار بھی ہے۔ ثانیہ اب سیکنڈ ایئر میں تھی۔

ایک خیال تھا، ایک سوچ تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرد صاحب اور ان کی بیوی آسیہ کے ذہن میں

جڑ پکڑ رہی تھی اور وہ سوچ تھی ثانیہ کی شادی۔ اس کی معاشی و معاشرتی ضرورت کی۔ ثانیہ کے لیے ایک ایسے ناتے کی جو ان کے جانے کے بعد ثانیہ کو سہارا دے۔ اس کے لیے سائبان بنے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں اپنی پریشانی خوشی اور امید میں بدلتی دکھائی دی۔

ایک دن شام کو سرد صاحب بستر پر لیٹے تو ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ "سرد! آج آپ سے ایک بڑی اہم بات کرنی ہے۔"

"ہاں بولو۔" سرد صاحب تھوڑا سا اٹھ کر ٹیک لگانے والے انداز میں نیم دراز ہو گئے۔

"آج میں اور ثانیہ پر اسٹور گئے تھے کچھ چیزیں لینے۔ وہاں ہمیں ایک عورت ملی۔ وہ دیکھنے میں ہی بہت بھلی اور ملسار لگتی تھیں۔"

"ہاں ہاں۔ آگے بھی بولو۔"

"انہیں ثانیہ بہت پسند آئی ہے۔ وہ رشتے کے سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں۔" آسیہ بیگم بڑے غور سے اپنے شوہر کے تاثرات دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے پر پہلے امید کی کرن سی چمکی لیکن پھر چہرہ پاٹ ہو گیا۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کوئی فائدہ نہیں آسیہ بیگم۔ اگر وہ ہمیں اور ہم انہیں پسند آ بھی جائیں تو جب انہیں ثانیہ کی تکلیف کا پتا چلے گا تو وہ پیچھے ہٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔"

"پتا نہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ خاتون کوئی فرشتہ ہی تھیں اور جس طرح انہوں نے اپنی چاہت کا اظہار کیا ہے، میرا دل ان کی طرف کھینچتا ہے۔"

سرد صاحب خاموش رہے۔ آسیہ بیگم نے ذرا توقف کر کے کہا۔ "چلیں، انہیں آنے تو دیتے ہیں۔ ملنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ پھر ہم نے کون سا خود انہیں مدعو کیا ہے۔ وہ اپنی چاہت سے ملنا چاہتے ہیں۔"

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن کسی شدید خواہش یا اندیشے کی زد میں یوں آتا ہے کہ اس خواہش کی تکمیل یا اس اندیشے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ذہن میں وہ اخلاقیات اور اصول و ضوابط کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

ثانیہ کے والدین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ انہیں وہ لوگ بہت بھلے محسوس ہوئے اور وہ رشتہ اپنی بیٹی کے لیے ہر لحاظ سے موزوں نظر آیا اور وہ چاہنے کے باوجود ان لوگوں کو اپنی بیٹی کی بیماری کے متعلق نہ بتا پائے۔ شاید ذہن

سے جڑی ہر ذرے داری کو اپنے اوپر لے لیا۔ چند اور دن نارمل انداز میں گزر گئے..... لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں رہنے والا تھا۔ وہ وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا جب ثانیہ کی بیماری والی بات راز نہیں رہنا تھی۔ اس کی طبیعت بتدریج یو جھل ہو رہی تھی۔ اگلے مہینے کی پانچ چھ تاریخ تک اسے خون لگنا ضروری تھا۔

ایک روز جب وہ خود کو بہت زیادہ مضطرب محسوس کر رہی تھی، اس نے فون پر والدہ سے بات کی اور دیر تک آنسو بہائے۔ مشورہ یہی ہوا کہ اب ندیم کو اس بارے میں بتا دیا جائے۔

ندیم کو اس بارے میں بتانا ثانیہ کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح یہ سب کر گزری۔ ندیم کا رد عمل خاصا گمبھیر تھا۔ وہ کبھی بھی تھا اور ناراض بھی۔ ثانیہ نے اسے بتایا کہ وہ جب شادی سے پہلے اسے ریسٹورنٹ میں ملی تھی تو مقصد یہی تھا کہ اسے اس بارے میں آگاہ کرے لیکن وہ کسی صورت اسے کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے کمزور پڑ گئی اور جب اس نے اسے ماضی کے متعلق بات کرنے سے بالکل روک دیا تو وہ رک گئی۔

ندیم کے علاوہ اس کے والدین کو بھی اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ گھر میں عجیب کشیدگی کی سی کیفیت ہو گئی۔ سب سے پہلا تاثر یہی تھا کہ ثانیہ کے گھر والوں نے اور ثانیہ نے ندیم سمیت سب کو دھوکے میں رکھا ہے۔ ثانیہ کی سراس نے کافی سخت باتیں کہیں۔ جس کے بعد ثانیہ روتی دھوتی اپنے میکے آ گئی۔ اس تناؤ کے سبب اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ وقت پر خون لگنا بھی ضروری تھا۔ اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا۔ وہ قریب دو ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس دوران میں سسرال کی طرف سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ فقط ایک مرتبہ ندیم کا مختصر سا فون آیا۔

ثانیہ کی حالت نارمل ہو گئی اور ٹریینٹ مکمل ہو گئی تو والدین اسے گھر لے آئے۔ گھر آنے کے قریب دو ہفتے بعد ثانیہ کے سسر نے سرد صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کافی سخت باتیں کہیں۔ سرد صاحب نے اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جس کو انہوں نے بالکل اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ”دیکھیں وقت کیا فیصلہ کرتا ہے۔“

کچھ دنوں بعد ثانیہ کو پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ اپنے ارد گرد کے اتھاہ اندھیرے میں جیسے اسے امید کی ایک کرن سی چمکتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا دھیان اپنے ناگفتہ بہ حالات

میں نہیں تھا کہ ثانیہ بتدریج ٹھیک ہو رہی ہے اور کیا پتا کہ شادی کے بعد یہ روگ ویسے ہی اس کی زندگی سے جدا ہو جائے۔

رشتہ طے ہونے کے موقع پر لڑکے والوں کو کچھ بتایا نہیں گیا تھا مگر ثانیہ کے ذہن میں جیسے ایک پھانس سی چھپی ہوئی تھی..... ایک دن والدہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے ایک ریسٹورنٹ میں اپنے ہونے والے شوہر ندیم سے ملاقات کی۔ وہ اسے اپنی بیماری کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ”ہاں ثانیہ جی، اب بتائیں، وہ کیا خاص بات ہے جس کی بدولت مجھے آج آپ سے اس طرح ملنے کا شرف حاصل ہوا؟“ کھانے سے فارغ ہو کر، ندیم نے نشوونما سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

ثانیہ کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور اس کے ہونٹ بار بار سوکھ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ”ندیم..... دراصل..... میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے آپ میرے بارے میں سب جانتے ہوں۔“

ندیم کے چہرے پر یکدم سنجیدگی اٹھ آئی۔ ”دیکھو ثانیہ، میں ذرا مختلف قسم کی سوچ رکھتا ہوں، ماضی بس ماضی ہوتا ہے۔ اسے پیچھے چھوڑ دو۔ انسان کے چہرے پر اس کی آنکھیں آگے کی جانب اس لیے ہیں تاکہ وہ آگے دیکھے۔ پچھلی باتوں اور واقعات کو ڈسکس کرنے کا میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں۔ ماضی کے متعلق نہ میں تم سے کبھی کچھ پوچھوں گا اور نہ تم پوچھو گی۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی.....“ ندیم نے آخری الفاظ مسکراتے ہوئے کہے تھے تاکہ ماحول کی سنجیدگی کم ہو۔

ثانیہ نے پھر بولنا چاہا لیکن ندیم نے باقاعدہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بات کا رخ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ ثانیہ پختہ ارادہ لے کر آئی تھی کہ ندیم کو اپنی تکلیف کے نشیب و فراز کے بارے میں بتا دے گی لیکن آج اس سے مل کر، اس کی باتیں سن کر اس کو جان کر نہ جلنے کیوں وہ ایک دم کمزور ہو گئی۔ حالات اپنی بے پناہ کشش اور خوش آئند تصورات کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے بھی سب کچھ ”وقت“ پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

دسمبر کی ایک سرد شام میں ثانیہ اور ندیم کی شادی ہو گئی اور وہ دلہن بن کر ندیم کے گھر آ گئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے گھر کا کچن سنبھال لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ندیم

سے ہٹانے کی کوشش کی اور ایک ٹمھی سی جان کی خاطر خود کو زندگی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔

ثانیہ کے سسرال کی طرف سے مزید کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا لیکن اب ایک حوصلہ سا تھا، امید کی ایک کرن سی ٹمھی جو ثانیہ اور اس کے والدین کو نظر آ رہی تھی..... اور پھر وہ وقت آ گیا جس کا انہیں انتظار تھا۔ ثانیہ نے ایک بہت ہی پیاری بچی کو جنم دیا۔ بچی ہر لحاظ سے تندرست اور صحت مند تھی۔ بچی کا رنگ روپ ثانیہ پر تھا تاہم اس کے نین نقش میں ندیم کی نمایاں جھلک تھی۔ یہ خوب صورت پھول سرمد صاحب کے گھر میں امید کا یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ شاید اب ان کی بیٹی کا گھر پھر سے آباد ہو جائے اور اس کی زندگی پھر سے رواں دواں ہو جائے۔

ایک دن ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم نے بچی کو گود میں لیتے ہوئے ثانیہ سے پوچھا۔ ”بچی مہینے کی ہونے والی ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا۔ اتنی دیر تو ٹھیک نہیں۔“

”ای! میرا دل چاہتا ہے کہ ندیم خود اس کا نام رکھیں۔“ ثانیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ماں نے ثانیہ کا ماتھا چوما۔ ”تم پریشان نہ ہو، تم دیکھنا اب اولاد کی محبت اسے خود کھینچ کر ادھر لائے گی۔“ ان کی آواز میں امید کے دیے روشن تھے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ برف پگھلنے لگی۔ ایک دن ثانیہ کے سر نے سرمد صاحب کو فون کیا اور پھر چند دن بعد ندیم اور دیگر گھروالے ثانیہ اور بچی کو اپنے گھر لے گئے۔ گلے شکوے دور ہوئے اور ندیم اپنی پھول سی بچی کو دیر تک سینے سے لگائے اس کا سر چومتا رہا۔

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر چل نکلی۔ اب وہ دونوں تین تھے اور یہ جو تیسرا تھا وہ ان کو باندھ کر رکھے ہوئے تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں پھر سے ان کی زندگی میں داخل ہونے لگیں..... لیکن جو کچھ بھی تھا ثانیہ صاف محسوس کرتی تھی کہ اس گھر میں اس کے رتبے میں کمی واقع ہو چکی ہے اور تو اور ندیم بھی کسی وقت بیگانے سے لکٹنے لگتے تھے۔ وہ اکثر اس وقت کو کوستی تھی جب شادی سے پہلے وہ ندیم کو بچہ بتاتے بتاتے رہ گئی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ ندیم کمپیوٹر پروگرامر تھا۔ اب اسے ایک بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ وہ اپنے کام میں زیادہ مگن ہو گیا۔ گھر آ کر بھی رات گئے تک لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کرتا رہتا۔ ایک دن ثانیہ نے کہا۔ ”ندیم! آپ گھر آ کر بھی اکثر کام کرتے رہتے ہیں۔ آفس

والے اتنا کام کیوں لیتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”لے لیتے نہیں ہیں کرنا پڑتا ہے۔ جب گھر کے خرچے ہوں، مستقل علاج معالجے ہوں تو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔“

ندیم کا اشارہ اس ماہانہ خرچے کی طرف تھا جو ثانیہ کی ٹریڈنٹ پر اٹھتا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔ بہر حال ایک بات ثانیہ کے لیے امید افزا تھی۔ وہ اب خود کو ہڈ رتج بہتر محسوس کرتی تھی۔ عام حالات میں بالکل صحت مند لگتی تھی۔ تین چار ہفتوں کے بعد ”بوجھل طبیعت“ والے مختصر دورانیے آتے تھے جو ”ٹریڈنٹ“ کے بعد اوجھل ہو جاتے تھے۔

ندیم جب بھی گھر آتا، فریش ہونے کے بعد ٹمرین کو گود میں اٹھاتا اور اس سے باتیں کرتا لیکن ثانیہ نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ندیم کے تاثرات اور انداز میں ٹمرین کے لیے کبھی بھی بہت زیادہ پیار اور بے تابی نہیں جھلکی۔ اسے ایک اور بچے کی خواہش تھی، ایک بیٹے کی، تندرست و توانا بیٹے کی۔

ایک روز شام کی چائے پیتے ہوئے وہ قدرے اداس لہجے میں بولا۔ ”ثانیہ! مجھے ایک بیٹا چاہیے۔ ایک وارث..... جو ہماری نسل کو آگے بڑھائے۔“

”کیوں نہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔“ ثانیہ نے شرما کر مختصر سا جواب دیا۔

ندیم بولا۔ ”ویسے میں نے ایک دو ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ خصلتیں میا کے مریضوں کی اولاد کا زندگی پانا ایک کرشمہ ہے مگر یہ شرح بہت زیادہ نہیں۔ اگر آپ کا پہلا بچہ صحت مند ہے تو زیادہ چانسز ہیں کہ آپ کا لگایا بچہ بھی صحت مند ہو۔“

اس حوالے سے ثانیہ اور ندیم دونوں کے ذہنوں میں اندیشے موجود تھے اور وہ اس بارے میں ڈسکس کرتے رہتے تھے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے ٹمرین کی پیدائش کے قریباً تین سال بعد ثانیہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ندیم اور ثانیہ کو بہت امید تھی کہ ان کا بیٹا بھی ان کی بیٹی کی طرح صحت مند اور تندرست ہوگا مگر افسوس..... یہ ساری امیدیں اور دعائیں پوری نہیں ہوئیں۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی یہ انکشاف ہو گیا کہ نو مولود اپنی ماں سے وہی بیماری اپنے وجود میں لے آیا ہے جس نے پہلے ہی اس گھرانے کی زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ بچہ یہ بیماری تو اپنے ساتھ لایا ہی تھا وہ ویسے بھی بے حد لاغر تھا۔ دبلی پتلی ٹانگیں، سیاہی مائل زرد رنگت، تپتی بچی آنکھیں۔ زندگی کے آغاز میں ہی اسے سانس کی تکلیف نے بھی گھیرا ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبداللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ندیم پر تو جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس نے کئی دن ٹانیہ سے بات تک نہیں کی۔ نہ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا، نہ اس کا ماتھا چوما، نہ اس کے معصوم کس کو محسوس کیا۔ اس کے گھر والوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ سب کے سب جیسے اس سلسلے میں ٹانیہ کو ہی قصور وار سمجھتے تھے۔

تین چار ہفتوں میں ہی حالات بہت بگڑ گئے۔ ندیم کا رویہ تلخ تر ہوتا چلا گیا..... اور پھر ایک دن وہ حشر برپا ہو گیا جس نے ٹانیہ اور اس کے دونوں بچوں کی زندگی کو تہ وبالا کر ڈالا۔ طلاق..... طلاق..... اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ زندگی کا درخت جیسے جڑوں سے اکھڑ گیا اور خاک پر ڈھیر ہو گیا۔

..... اور آج..... آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔ باہر بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے بارش کے تریڑے بھی کھڑکیوں پر دستک دینے لگتے تھے۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ننھی شمرین اس کی گود میں سوئی ہوئی تھی اور دو ماہ کا آیان ”بے بی کارٹ“ میں سو رہا تھا۔ ہاں، صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی لیکن اس صبح میں سیاہ رات کی سی تاثیر تھی۔ یہ وداع کی صبح تھی اور جو گزری تھی وہ وداع کی رات تھی۔

☆☆☆

دن اور رات کے سیاہ اور سفید پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے کھیلے رہے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کی جانب سرکتی رہیں، وقت گزرتا رہا، ٹانیہ کو طلاق دینے کے بعد ندیم لاہور سے کوئٹہ شفٹ ہو گیا۔ اس کے والدین بھی ساتھ تھے۔ یہاں اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے وہاں اپنا گھر بھی بنالیا۔ پھر اس کی زندگی میں نائلہ آگئی۔ یہ نائلہ یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی پڑھتی رہی تھی۔ ان دنوں نائلہ کے ساتھ اس کی کافی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں شادی کا سوچنے لگے تھے مگر پھر نائلہ کے والدین کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اب نائلہ کے والد وفات پا چکے تھے اور صورت حال کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ نائلہ بھی کوئٹہ میں ہی تھی اور ایک پرائیویٹ کالج میں انتظامی امور سرانجام دے رہی تھی۔ دونوں میں ایک بار پھر میل ملاقات شروع ہو گیا۔ دراصل ندیم کا یہی وہ ماضی تھا جسے ندیم نے شادی سے پہلے والی ملاقات میں ٹانیہ سے چھپایا تھا..... اور ٹانیہ سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے ماضی کا ذکر نہ کرے۔

ایک سال بعد کوئٹہ میں ہی ندیم اور نائلہ کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد تین چار ماہ تو اچھے گزرے، پھر آہستہ

آہستہ نائلہ کا اصل روپ سامنے آنا شروع ہو گیا۔ ایک ورکنگ وومن کی حیثیت سے وہ بہت حد تک حاکمانہ مزاج رکھتی تھی۔ اس نے ندیم کو بھی اپنے مطابق چلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ جس فیملی سے آئی تھی وہ معاشی اعتبار سے ندیم کی فیملی کی ہم پلہ نہیں تھی۔ نائلہ کے اندر روپے پیسے کی اضافی طلب بھی تھی۔ اسے ندیم کے گھر میں ہر طرح کی سہولت اور آسائش مہیا تھی مگر اس کی نگاہ آگے..... مزید آگے کی طرف رہتی تھی۔ ندیم کے والدین کو اس نے بالکل کھڈے لائن لگا دیا اور ندیم کو بھی ہر طرح جکڑنا شروع کر دیا۔ آئے دن گھر میں جھگڑے رہنے لگے..... دو ڈھائی سال میں ہی ندیم ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا۔ اس کی جاب بھی متاثر ہونے لگی۔ کسی وقت وہ نائلہ سے لڑ جھگڑ کر لیٹا ہوتا تو اسے چار برس پہلے کے شب و روز یاد آتے..... لاہور کا گھر اور اس گھر میں مسکرائی ہوئی سی ایک صورت..... اسے ٹانیہ یاد آتی، اس کی خدمت اور محبت یاد آتی اور وہ بے ساختہ اس ”جدا ہو جانے والی“ کا موازنہ اس عورت سے کرنے لگتا جواب بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں موجود تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل کر رہ جاتی۔ وہ سوچتا کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا۔

اب اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ٹانیہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ جب اس نے ٹانیہ کو طلاق دی تھی تو واضح طور پر کہا تھا کہ یہ اس کے بچے ہیں اور وہ ایک دن انہیں اپنے پاس لے آئے گا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ جہاں اور بہت کچھ بدلا تھا، یہ سوچ بھی بدل گئی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اسے اب بچوں کی کوئی خاص طلب نہیں رہی تھی۔ خاص طور سے بیٹے کی یاد تو اسے کبھی بھول کر بھی نہ آئی تھی۔ وہ جب بھی اس کے بارے میں سوچتا اس کے ذہن میں گوشت کا ایک بیمار لوٹھڑا آتا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد رنگ..... دواؤں کی بو..... لیبارٹریوں کی ٹیسٹ رپورٹیں..... خون کی بوتلیں اور وہ سب کچھ جو دائمی مریضوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ بیٹی کی یاد بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ ندیم کے والد تو دو سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔ والدہ روز روز کے گھریلو جھگڑوں کے سبب بیمار رہتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پوتی کو یاد کرتی رہی تھیں مگر اب انہیں اپنی بیماری سے لڑائی کے سوا باقی باتیں کم ہی یاد رہتی تھیں۔

یہ زبردست ذہنی تناؤ اور انتشار کی وجہ ہی تھی کہ ایک روز آفس سے گھر آتے ہوئے ندیم اپنی مہران کار کا ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ ایکسیڈنٹ شدید تھا۔ اس کی دونوں پنڈلیاں ٹوٹ گئیں اور وہ اسپتال میں جا پڑا۔ گھریلو جھگڑے اور معاشی

ہو جاتا تھا اور کسی وقت اسے ”ہاسپٹل سٹو“ بھی ہونا پڑتا تھا۔ زندگی کے ماہ و سال اڑتے چلے جا رہے تھے۔ دور و نزدیک ندیم کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ حلقہ احباب بھی بہت محدود تھا۔ وہ بس اپنی چھوٹی سی دکان یا پھر اسپتال تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ نانکھ اور اس کا لالچی بھائی اپنے والدین، اپنی پہلی بیوی ثانیہ، ننھی شمرین اور بیمار گوشت کا وہ لوتھڑا جسے اس کے دادا نے آیان کا نام دیا تھا۔ ہاں وہ سب کچھ بھول چکا تھا لیکن کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کیا وہ ثانیہ کی جھیل سی آنکھوں میں چھپی ہوئی محبت کو بھی بھول چکا ہے۔

☆☆☆

وہ اگست ستمبر کے دن تھے۔ ندیم شدید بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق گردوں کا باقاعدگی سے ڈائلاسیس ہو رہا تھا، پھر بھی اس کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس نے ابھی عمر کی 55 بہاریں ہی دیکھی تھیں لیکن وہ ستر برس کا لاغر بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ایک قریبی دکاندار دوست ٹار نے اسے بڑی افراتفری میں اسپتال پہنچایا۔ وہ اس وقت تقریباً بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو سرکاری اسپتال کا ڈاکٹر اس کے سامنے کھڑا تھا اور ذرا سخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ”باباجی! آپ بول سکتے ہو۔ بولنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ آپ کے ساتھ کون ہے یہاں؟“

ندیم نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی نہیں تھا..... دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”باباجی! آپ کی تکلیف بہت بڑھ چکی ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ آپ کو گردہ لگایا جائے۔ کیا آپ کے قریبی رشتے داروں میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو گردہ دے سکے؟“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی دوران میں کہیں سے اس کا دکاندار دوست ٹار بھی آ گیا۔ اس نے ندیم کا کمزور شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ندیم! ڈاکٹر صاحب تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔“

ندیم نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ دراز قد ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک اور ڈاکٹر ہاتھ میں فائل لیے اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے دراز قد ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈاکٹر احمد! پچھلی مرتبہ بھی جب یہ ایڈمٹ ہوئے تھے تو ان کے ساتھ ان کے اس دوست کے سوا اور کوئی بھی

حالات پہلے ہی ناک میں دم کیے ہوئے تھے، اب یہ حادثہ ”مرے کو مارے شاہ مدار“ کی مثل تھا۔ خرائٹ نانکھ نے جب یہ دیکھا کہ شوہر بستر پر ہے تو اس نے مزید پر پرزے نکالے۔ ایک پلاٹ تو وہ لڑ بھگڑ کر پہلے ہی اپنے نام کرا چکی تھی۔ ایک کا اس نے مختار نامہ لے لیا تاکہ اسے بیچ کر ندیم کا علاج معالجہ کرایا جاسکے۔ بعد میں پتا چلا کہ جو علاج معالجہ ہو رہا ہے، وہ گروی کے پیسوں سے ہو رہا ہے اور پلاٹ کی رقم ہڑپ ہو چکی ہے۔ نانکھ نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کسی طرح ندیم کے مکان کو گروی رکھ دیا تھا اور اس کے عوض کافی ساری رقم اکٹھی کر لی تھی۔ خود وہ ندیم کی بیمار والدہ کے ساتھ اپنے ہی گھر کے نچلے پورشن کے ایک کمرے میں بطور کرایہ دار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

اسپتال میں جب ندیم پر یہ راز فاش ہوا تو خوب جھگڑا ہوا۔ دو تین ہفتوں میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ غلامی کی بات ہونے لگی۔ اسی دوران میں ندیم کی والدہ بھی راسی عدم ہوئیں۔ نانکھ نے یہ مشکل ڈیڑھ مہینہ انتظار کیا اور پھر ندیم سے صلح لے کر اپنے بھائی کے ساتھ دہی سدھار گئی۔ ندیم کی زندگی کا ایک اور باب ختم ہو گیا۔

☆☆☆

ندیم کی ٹانگوں کے دھم بگڑ چکے تھے۔ آرتھرو پیڈک مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ دو ہفتے گھر میں رہتا تو چار ہفتے اسپتال میں گزارنا پڑتے۔ پہلے وہ مکان کی گروی چھڑانا چاہتا تھا مگر اب یہ سوچ پنپ رہی تھی کہ مکان بیچ ہی ڈالے اور جو مزید رقم ملے اس سے اپنی زندگی کی گاڑی چلانے اور اپنا علاج کرانے کی کوشش کرے۔

بالآخر مکان بھی بک گیا۔ اسے قریباً تیس لاکھ روپیا ملا۔ شروع میں تو یہ معقول رقم لگتی تھی لیکن اسپتالوں میں جو لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے بھی اکثر نے بہت کد چھریاں پکڑ رکھی ہیں۔ بے رحمی سے ذبح کر ڈالتے ہیں۔ ایک سال کے اندر اندر ندیم کی آدھی سے زائد رقم ٹھکانے لگ گئی۔ اس نے مکمل تباہی سے بچنے کے لیے ایک اندرونی مارکیٹ میں ایک چھوٹی دکان کرائے پر لے لی اور وہاں ”کمپیوٹر ایسیریز“ رکھ لیں۔ اس کی ٹانگوں کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی اور وہ بیساکھی کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا مگر بلڈ پریشر کی جو تکلیف اسے نانکھ سے گھریلو جھگڑوں کے دوران میں شروع ہوئی تھی وہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف اس کی آنکھوں اور گردوں پر بھی اثر کر رہی تھی۔ اسے گرمیوں میں اکثر و بیشتر گردوں کا ”پرابلم“

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

نہیں تھا۔ اس وقت بھی ہم نے ان کو بتایا تھا کہ ان کا معاملہ اب کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کی طرف جارہا ہے۔“
ڈاکٹر احمد نے فائل کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پستہ قد ڈاکٹر..... سینئر ڈاکٹر احمد کو مؤدب انداز میں بریفنگ دیتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک لائق سی مایوسی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر احمد دیگر ڈاکٹرز کے ساتھ دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ندیم کی موٹی ٹکڑی میڈیکل فائل بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ٹارڈ کی چہرہ لے اپنے شدید بیمار دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر احمد اس وقت گردے کے علاج میں چوٹی کا ڈاکٹر ہے۔ پچھلی مرتبہ بھی اس نے کہا تھا کہ اگر تمہارا کوئی عزیز تمہیں گردہ دے سکے تو وہ تمہیں دوبارہ سے کھڑا کر دے گا۔

ندیم کراہ کر بولا۔ ”تم تو میری ہی طرح بوڑھے ہو۔ مجھے اور کون گردہ دے گا اور مجھے اب گردے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تو اب سو جانا چاہتا ہوں..... بہت لمبی ٹینڈ..... بہت دیر تک کے لیے۔“

ٹار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایسی باتیں مت کرو یار! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے.....“

ندیم کی کمر کی دونوں جانب شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زہر اس کے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔ پھر وہ اپنے واحد سہارے (ٹار) کا ہاتھ پکڑے پکڑے بے ہوش ہو گیا۔

یہ ایک طویل بے ہوشی تھی جس میں کبھی کبھی نیم بے ہوشی اور بیداری کے وقفے بھی آتے تھے۔ کسی وقت وہ اپنے نٹھنوں میں تیز دواؤں کی بو محسوس کرتا، کسی وقت اسے اپنے جسم میں انجکشن لگنے کا احساس ہوتا۔ کسی وقت وہ دھندلی نظروں سے دیکھتا کہ ٹار یا پھر سرخ و سپید چہرے والا ڈاکٹر احمد اس پر جھکا ہوا ہے۔ کسی وقت اسے ان کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ کسی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ ڈو بتا چلا جا رہا تھا۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا..... اس کا اپنا کوئی نہیں تھا.....

☆☆☆

وہ ایک خوشگوار سی شام تھی۔ پتا نہیں کتنے گھنٹوں یا دنوں بعد ندیم مکمل ہوش میں آیا تھا۔ وہ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر قوس قزح نظر آرہی تھی۔ شاید اگست کی تیز بارش کے بعد ابھی

ابھی چنگلی دھوپ نکلتی تھی۔ اسے ڈرپس لگی ہوئی تھیں اور کمرے گرد بھی کوئی بھاری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا وہ زندہ ہے یا پھر جاگتی آنکھوں سے زندگی کا خواب دیکھ رہا ہے؟ اس نے سامنے لگا کیلنڈر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں سکڑیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کم و بیش آٹھ روز کے بعد مکمل ہوش میں آیا ہے۔ آٹھ روز..... ان آٹھ روز میں اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا تھا؟

اسی دوران میں اسے کمرے کے دروازے پر ثار اور دراز قد ڈاکٹر احمد کی شکل نظر آئی۔ ڈاکٹر احمد تو اسے دور ہی سے دیکھ کر واپس چلا گیا اور ثار اندر آ گیا۔ ثار کے ساتھ بازار کی چھوٹی سی یونین کے صدر افتخار بھائی بھی تھے۔ وہ دونوں ندیم کے سرہانے آن بیٹھے اور اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ افتخار بھائی کی زبانی یہ جان کر ندیم حیرت کے سمندر میں غرق ہو گیا کہ اس کے جسم میں سرجری کے بعد گردہ لگا یا جا چکا ہے اور اب اس کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔

”یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا گردہ؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے خاموش بیٹھے ثار کی طرف دیکھا۔ ثار نے کہا۔ ”اللہ کے بعد یہ سب کچھ ڈاکٹر احمد کی مہربانی سے ہوا ہے۔ انہوں نے تم پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ہر مرحلے میں تمہارے ساتھ رہے۔ تمہارے آپریشن میں شامل ہوئے اور آپریشن کے بعد بھی دن رات تمہارا خیال رکھا.....“ ندیم نے کراہ کر کہا۔ ”یہ ان کی بہت بڑی مہربانی ہے..... لیکن میرے لیے گردہ دیا کس نے؟“

افتخار بھائی بولے۔ ”اس سوال کا جواب بہت حیران کرنے والا ہے۔ یہ تو ہم نے سنا ہے کہ کسی سرجن نے بہت محنت اور توجہ سے کسی مریض کا علاج کیا۔ اپنی ساری صلاحیتیں اس کی سرجری پر صرف کر دیں، لیکن یہ کم ہی سنا ہوگا کہ اپنے مریض کا گردہ بدلنے والے سرجن نے اسے اپنا گردہ بھی خود ہی دے دیا.....“

ندیم مجسم حیرت افتخار بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”گردہ..... بھی..... خود ہی..... دے دیا؟“ اس نے افتخار بھائی کے الفاظ دہرائے۔

”ہاں ندیم! ڈاکٹر احمد نے نہ صرف تمہارا علاج کیا بلکہ اپنا گردہ بھی دیا۔ تمہارے آپریشن کے وقت ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ خود آپریٹ کر سکتے، پھر بھی وہ سرجنوں کی اس چار کئی ٹیم میں شامل رہے جو تمہیں آپریٹ کر رہی تھی.....“ ”یہ..... میں کیساں رہا ہوں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

اس سے پہلے کہ ثار یا افتخار بھائی جواب میں کچھ کہتے، خوب دراز قد ڈاکٹر احمد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قدرے مضطرب نظر آ رہا تھا مگر چہرے پر ایک نورانی سی مسکراہٹ موجود تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر ثار اور افتخار باہر نکل گئے..... ڈاکٹر احمد، ندیم کے بالکل پاس آن بیٹھا۔ اس نے ندیم کا ہاتھ اپنے دونوں ملائم ہاتھوں میں لیا اور غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کتنے ہی لمحے اسی جذب کی کیفیت میں گزر گئے۔ آخر ڈاکٹر احمد نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے آپ کا سوال سن لیا ہے۔ آپ جانتا چاہتے ہیں تاکہ میں نے یہ سب کیوں کیا..... میں نے یہ اس لیے کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں آپ کا لہو دوڑتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر احمد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے..... لیکن میرا پورا نام آیان احمد ہے..... اور یہ نام میری ماماں نے اور دادا نے مل کر رکھا تھا.....“

الفاظ دھماکوں کی طرح ندیم کے کاسنہ سر میں گونجے۔ اس کی نگاہ تو ڈاکٹر احمد کے خوب رو چہرے پر مرکوز رہی مگر ذہن برسوں اور زمانوں کا قاصد طے کرتا ہوا بیمار گوشت کے اس لوتھرے تک پہنچ گیا جو کبھی کبھی اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر اپنے کمزور بازو چلاتا تھا..... اور کبھی بڑی بے چارگی سے اس کا دامن پکڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہی کمزور ناتواں سا بیمار جسم اب ایک جوان، قد آور شخص بن چکا تھا۔ ایک وجیہہ ڈاکٹر..... ایک ایسا مسیحا جو مایوس مریضوں کے لیے نئی زندگی کا پیغام تھا۔ وہ نہ صرف خود اپنی ناتوانی اور بیماری سے ابھرا تھا بلکہ اب پڑھ لکھ کر ایک نہایت قابل کڈنی سرجن بن چکا تھا اور یہ ایک ایسا کڈنی سرجن تھا جس نے اپنا ہنر ہی اسے نہیں دیا بلکہ اپنا گردہ بھی اس کے جسم کا حصہ بنا دیا تھا۔

یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا لیکن یہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر احمد اس کے ہاتھ تھام کر عجب اشک بار لہجے میں بولا۔ ”آپ میرے باپ ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں تو آپ کا تھا اب! بے شک کمزور اور بیمار تھا لیکن تھا تو آپ کا..... ہم سب آپ کے تھے۔ باجی ثمرین، ماما..... ہم سب آپ کے تھے..... آپ ہمیں کیوں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کو کیا پتا ہم نے آپ کو کتنا یاد کیا۔ آپ کے لیے کتنا روئے.....“

وہ بولتا چلا جا رہا تھا اور ندیم حیرت سے گنگ یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور قریباً تیس سال کی ایک جوان سال عورت اندر داخل ہوئی۔ سرخ و سپید گول چہرہ، دکھتی پیشانی۔ اس کے ساتھ دو پیارے

یہ تھا کہ اس نے ایک بیمار کمزور اور مدقوق بچے کو اپنے خون پسینے سے بچھ کر پالا۔ اسے ٹھیک ٹھیک جیسی بیماری سے ابھارا اور اسے ایک نہایت کامیاب و نیک نام انسان بنایا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ایک ایسا بیٹا بنایا جو وقت پڑنے پر باپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

ثانیہ کی قبر پر پہنچ کر ندیم کا سارا جسم لرزنے لگا۔ وہ اس کا کتبہ دیکھنے لگا۔ وہ آج سے تقریباً تین سال پہلے منوں سنی کے بچے جاسوئی تھی۔ وہ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ وہ لاکھ پکارتا رہتا لیکن اب اس نے جواب نہیں دینا تھا۔ کچھ بھولی بھری آوازیں ندیم کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

”اللہ کا واسطہ ہے ندیم، ایسی باتیں مت کریں۔ بچوں کا کیا بنے گا؟“

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں.....“

”خدا کے لیے ندیم! آگے مت بولیں۔“

”دفع ہو جاؤ..... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“

وہ قبر پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا..... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پتا نہیں کہ وہ کتنی دیر اسی حالت میں رہا۔ شاید ایک گھنٹا..... شاید دو گھنٹے..... یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ اسے لگا کہ اس کے جسم کا سارا پانی آنسو بن کر آنکھوں کے راستے بہہ گیا ہے۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اسی طرح رہا..... پھر وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔

اگلے روز جب اس نے اپنے بیٹے کے گھر کے ایک کمرے میں آنکھ کھولی تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ارد گرد کافی لوگ جمع تھے۔ اس کی بیٹی ثمرین، اس کے تین بچے، اس کا بیٹا ڈاکٹر احمد اور اس کے دو بچے، اس کی نیک صورت بہو..... اگر کوئی نہیں تھا تو وہی نہیں تھی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی..... ایک دم اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ اب اسے بھی نہ دیکھ پائے گا؟ تاہم اپنے ان سب بچوں کے درمیان چند گھنٹے گزارنے کے بعد اسے یہ لگا کہ وہ بھی یہیں موجود ہے۔ کسی بچے کے چہرے پر اس کے ہونٹ تھے، کسی کی آنکھوں میں اس کی گہری سیاہ پتلیاں تھیں، کسی کے سر پر اس کے لہریے دار بال تھے، کسی کی پیشانی میں اس کی جھلک تھی اور کسی کے گلے میں اس کی ہنسی جلترنگ بجاتی تھی۔ ہاں وہ اپنے ان سارے بچوں میں تھی اور اس کے آس پاس تھی، وہ اسے محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے ایک عجیب آسودہ کیفیت کے زیر اثر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دن اور جیا جاسکتا ہے۔

پیارے بچے تھے۔ ایک قریباً پانچ سال کا دوسرا تین سال کے لگ بھگ۔ ندیم کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا..... یہ اس کی ننھی ثمرین تھی۔ آخری مرتبہ اسی ننھوں اندھیری رات میں ندیم نے اسے دیکھا تھا، جب اس نے اپنے منہ سے ”طلاق“ کے زہریلے بے رحم الفاظ نکالے تھے، وہ وارڈ روم کے قریب اپنے کھلونوں میں مگن رہنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر اس کا معصوم چہرہ بے پناہ غم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کم و بیش چھبیس ستائیس سال بعد پھر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ روتی ہوئی آگے بڑھی ندیم نے اسے لیٹے لیٹے اپنے ساتھ لپٹا لیا..... ”میری ثمر!“ وہ سسک اٹھا۔ ”میری ثمر!“

..... اگلے تین چار گھنٹوں میں ندیم پر کئی انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر آیان احمد کو ندیم کے بارے میں شک اس وقت ہوا تھا جب اس نے ندیم کی فائل تفصیل سے دیکھی تھی اور اس کی میڈیکل ہسٹری پڑھی تھی۔ اپنے دادا یعنی والد کے والد کا نام اور والد کے پیشے کے بارے میں پڑھ کر آیان احمد کی چھٹی حس نے اسے کچھ اہم سنگل دیے تھے۔ اس نے اگلے دو تین دن میں تیزی سے معلومات حاصل کی تھیں اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس سرکاری اسپتال کے کڈنی وارڈ میں جو لاغر و لاوارث بوڑھا پڑا ہے، وہ اس کا باپ ہے۔ وہی شخص جس کی یادیں اس نے اس کی بڑی بہن نے اور ماں نے سچے موتیوں کی طرح سنبھال رکھی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہر دیکھنے سننے والے کو حیران و ششدر کر گیا۔ ایک جواں سال معروف کڈنی سرجن خود اپنا ایک کڈنی ایک مریض کو دے رہا تھا اور وہ مریض اس کا باپ تھا۔

☆☆☆

یہ چند دن بعد کی بات ہے ندیم اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ اپنی چھڑی ہوئی شریک حیات ثانیہ سے ملنے روانہ ہوا۔ ڈاکٹر احمد نے اپنی ہنڈا اکارڈ گاڑی قبرستان کے مین گیٹ کے سامنے روکی۔ وہ تینوں زخمی دلوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ شہر غموشاں میں داخل ہوئے۔ یہاں وہ ہستی سو رہی تھی جس نے حالات کی ستم ظریفی سے طلاق جیسا خوفناک گھاؤ اپنے سینے پر سہا۔ اپنے بچوں کو لے کر دردر کی ٹھوکریں کھائیں۔ اپنی بیماری سے جنگ کھرتی رہی اپنے بچے کی بیماری سے مقابلہ کیا..... اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مصیبتیں سہا، اپنی جان کو رولا..... بے رحم وقت کا ہر وار اپنے سینے پر سہا اور والدین کی وفات کے بعد حالات کے کوہِ گراں سے تنہا ٹکراتی رہی۔

اس نے بہت اہم کام کیے اور اس کا ایک اہم ترین کام

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

شیش محل

اسماء تادری

قسط: 13

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ نہین و قطن نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امید کی خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے منہمک زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امید کی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا قریب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و خیر کے پردوں میں ملوث سطر سطر رنگ بدلتی و اوقات تلی کی عکاسی و ٹچپ داستان

ستمبر 2016ء

72

سپینس ڈائجسٹ



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلانی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کوئی ایک ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شاہجی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے مکمل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کا گھریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیمانہ اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حویوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شاہجی کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروادیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوق کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور وحند لائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک انجینیئر کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنر کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھائی سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھائی کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائی کی بیٹی بھلا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بھلا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر تلوانف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، بھلا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ ربن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ مجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے ربن کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے ربن کو اب مجو کی تلاش ہوتی ہے۔ ربن جولیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جن سے اسے جولیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ بھلا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسٹنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمر دبا کی جان سے جاتی ہے فاروق بھلا سے حساب لینے کا سوچتا ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکنا کرنے کے لیے ولیم کو اغوا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ تاہم ربن اڈے سے نکل کر پنجاب روانہ ہو جاتا ہے تاکہ دلدار آغا سے جولیٹ کے زخموں کا حساب لے سکے۔ ادھر فاروق پر بمبئی واپسی کے دوران ٹرین میں ماحول حملہ کرتا ہے اور اسی لڑائی کے دوران ماحول چلتی ٹرین سے گر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ پولیس کارروائی کے لیے انہیں ایک چھوٹے شہر میں رکنا پڑتا ہے۔ وہاں گھومنے پھرنے کے دوران انہیں ایک لڑکا اکبر ملتا ہے جس پر ایک ہندو خاندان تشدد کر رہا ہوتا ہے۔ فاروق اسے وہاں سے بچا کر اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ دراصل اکبر ایک ہندو لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ دوسرے دن ٹرین کی روانگی کے وقت اکبر کی محبوبہ نہیں پہنچتی تاہم فاروق کی نظریں اس کے باپ اور بھائیوں کو دیکھ لیتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس جھیلے سے فوری طور پر اپنی جان چھڑا کر کسی بھی لمحے چلنے کے لیے تیار ترین میں سوار نہیں ہو سکیں گے چنانچہ منو تو فوراً ہی ان لوگوں کی مدد کے خیال سے باہر کود پڑا جبکہ گولو اور کیتھرائن نے بھی سامان اٹھا کر نیچے اترنے میں دیر نہیں لگائی۔ اگلے ہی لمحے ٹرین نے دھیرے دھیرے ٹھکنا شروع کر دیا لیکن اب ان لوگوں کو جاتی ٹرین سے زیادہ اس جھگڑے پر تشویش تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں سے صرف اکیلا منو اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے درمیان میں کودا تھا لیکن پارو کے باپ بھائیوں کی مدد کے لیے متعدد لوگ آگئے تھے۔ ظاہر ہے وہ اس شہر کے باسی تھے اور اسٹیشن پر موجود لوگوں میں سے بیشتر ان کے آشنا ہوں گے۔ تھا تو اکبر بھی اسی شہر کا رہنے والا لیکن وہ ایک یتیم اور بے حیثیت لڑکا تھا جس کے سگے ماموں بھی اسے خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایسے شخص کی مدد کے لیے کسی کے درمیان میں کودنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور اتنے سارے لوگوں سے ان تینوں کو ہی اکیلے نمٹنا پڑ رہا تھا بلکہ تینوں بھی کہاں..... صرف منو اور فاروق تھے جو مقابلہ کر رہے تھے، اکبر تو ہنوز پارو کے باپ کی خوشامدیں کرنے اور اس سے التجائیں کرنے میں مصروف تھا کہ وہ یہ سب نہ کرے اور اس پر ایسا الزام نہ لگائے۔

وہ بڑا بکا عاشق صادق تھا جو مار کھاتا جا رہا تھا لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ اپنی محبوبہ کے باپ بھائیوں پر ہاتھ اٹھانے کی بے ادبی کرے۔ فاروق اور منو دونوں کا تعلق اڈے کی دنیا سے تھا اور دونوں لڑائی بھڑائی کے فن میں مہارت رکھتے تھے لیکن اس وقت ان کا کوئی درجن بھر لوگوں سے مقابلہ تھا اور وہ اتنی پبلک میں چاقو نکالنے کی غلطی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چاقو نکالنے کی صورت میں ان کی پوزیشن زیادہ خراب ہو جاتی اور سارا الزام ان کے سر آ جاتا۔ کسی کو کوئی جان لیوا زخم لگ جاتا تو مزید مصیبت آ جاتی پہلے ہی وہ ماجد علی کی حادثاتی موت کے نتیجے میں یہاں اترنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہاں کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا تو وہ کہاں جاتے۔ جس ٹرین میں انہیں بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا، وہ تو پلیٹ فارم چھوڑ بھی چکی تھی۔ وہ نہتے ہی مار کھاتے اور اپنے دفاع میں ہاتھ پیر چلاتے رہے۔ گولو اور کیتھرائن اس سارے جھگڑے سے الگ ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ کیتھرائن کا تو اس جھگڑے میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور گولو لڑنے جھگڑنے والا لڑکا نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ اور ذہنی طور پر تھوڑا کم لڑکا

”کیا ہوا جنتی! پارو کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟“ فاروق کی نظریں پارو کے باپ اور بھائیوں پر جمی تھیں اور کان وہ سوالات سن رہے تھے جو اکبر نہایت بے تاب کیساتھ چادر پوش لڑکی سے پوچھ رہا تھا۔

”وہ نہیں آئی اکبر بھائی! اس نے آپ کے لیے یہ چٹھی بھیجی ہے۔“ چادر پوش لڑکی نے اپنا ہاتھ چادر سے باہر نکال کر اکبر کی طرف ایک لفافہ بڑھایا اور غلت سے بولی۔ ”اچھا، میں چلتی ہوں۔ میرے پتی وہاں میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس کا اشارہ جائے کے اسٹال پر کھڑے آدمیوں میں سے کسی کی طرف تھا لیکن نہ تو اچانک تم صم ہو جانے والے اکبر نے توجہ دی اور نہ ہی لمحہ بہ لمحہ قریب آتے پارو کے باپ بھائیوں کی طرف متوجہ فاروق نے اس طرف دیکھا۔ جنتی خود بھی جلدی میں تھی اس لیے فوراً قدم اٹھا کر چل پڑی۔ عین اسی وقت پارو کا شام نامی بھائی ہاتھ میں پکڑے چھوٹے ساڑے کے مضبوط ڈنڈے سے اکبر پر حملہ آور ہوا۔ اکبر کو اس حملے کی ذرہ برابر بھی خبر نہیں تھی اور وہ ایک ٹک اپنے ہاتھ میں موجود اس سفید لفافے کو دیکھ رہا تھا جو پارو کی جگہ اس تک پہنچا تھا۔ پوری طرح چوکنہ فاروق اگر شام کے ہاتھ کو درمیان میں ہی تھام کر جھٹکا نہ دیتا تو یقیناً اکبر کی کھوپڑی کھل گئی ہوتی۔ شام کی کلائی کو اپنی گرفت میں لیے لیے ہی فاروق نے اپنی طرف بڑھتے دوسرے بھائی رام کو ایک لات رسید کی۔ اب اکبر بھی اپنی کیفیت سے باہر آچکا تھا۔ اس نے پارو کے خط کو نہایت پھرتی سے اپنی جیب میں منتقل کیا اور خود پارو کے باپ کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ خود کو آزاد کروانے کے لیے زور لگانے لگا لیکن اکبر کے جوان بازوؤں کی گرفت اس کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھی۔ اکبر چاہتا تو اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور گڑگڑاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولا۔

”نہ کرو چا چا جی۔ یہ سب کیوں کرتے ہیں آپ لوگ۔ ایسے تو اس کی بہت بدنامی ہو جائے گی.....“ اس سے اس کی مراد پارو کی تھی۔

”میں تجھے چھوڑوں گا نہیں، تو چور ہے۔ کل رات تو میرے گھر میں چوری کرنے گھسا تھا۔ تو نے میری پتی کے کہنے چرائے ہیں۔“ اکبر کی نیچی آواز کے مقابلے میں بڑھے کی آواز بہت بلند تھی اور ارد گرد موجود کئی لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ادھر ٹرین دسل پر دسل دے رہی تھی۔ اندر سوار فاروق کے ساتھیوں نے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا تو انہیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ فاروق اور اکبر

جانتی تھی اور اتنا شعور رکھتی تھی کہ کب کیا کرنا ہے؟

☆☆☆

”حیدر آباد جاتے ہوئے میں جن حالات کا شکار تھی، مجھے لگتا تھا کہ مجھ سے بڑھ کر دکھی اور مصیبت زدہ کوئی نہیں ہوگا اور میں اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی ہوں لیکن واپسی کے سفر میں جو کیفیت تھی، اس نے پچھلے غموں اور پریشانیوں کو بھلا دیا۔ میں ملازمت سے برخاست کر دی گئی تھی۔ مجھ پر چوری کا الزام تھا میں نواب زادہ اسد اللہ سے دور کر دی گئی تھی اور حد یہ تھی کہ مجھ پر اسٹیٹ کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ میں وہاں رک کر نواب زادہ صاحب کا انتظار تک نہیں کر سکتی تھی پھر سب سے بڑھ کر میری کوکھ میں سانس لیتی ان کی محبت کی نشانی کی فکر تھی مجھے۔ انہیں کم از کم اس کے بارے میں تو علم ہونا چاہیے تھا لیکن میں انہیں یہ اطلاع بھی نہیں دے سکی تھی۔ صبیحہ خالہ کے مشورے پر میں نے نواب زادہ صاحب کے نام ایک خط لکھ کر خالہ جان کے حوالے کر دیا تھا جس میں سارے حالات و واقعات بیان کرنے کے ساتھ یہ اطلاع اور اپنا بمبئی کا پتا بھی لکھ ڈالا تھا۔ اس خط کے سہارے ہی مجھے امید تھی کہ نواب زادہ صاحب حالات سے آگاہ ہوتے ہی مجھے تلاش کرتے ہوئے بمبئی پہنچ جائیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ میں بمبئی واپس آئی لیکن نواب زادہ اسد اللہ کا کچھ اتنا پتا نہیں تھا۔ انہوں نے نہ تو مجھے کوئی جوابی خط بھیجا تھا اور نہ ہی خود آئے تھے۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر میں ایک ایک پل کاٹوں پر لوٹی ان کے ری ایکشن کا انتظار کر رہی تھی۔ جوزف اور دیگر محلے والوں کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں کچھ دن کی چھٹیاں لے کر آئی ہوں۔ جوزف میری واپسی پر بے تحاشا خوش تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ آنکھوں میں تشویش لیے میرا چہرہ ملوثی نظروں سے جانچتا رہتا تھا۔ کئی بار اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا مجھے کوئی پریشانی ہے تو میں نے ہنس کر اسے ٹال دیا لیکن ایسا آخر تک ہو سکتا تھا۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی کہ نواب زادہ کے انتظار میں وقت گزار سکوں۔ مجبوراً میں نے جوزف کے ساتھ صبیحہ خالہ جان کی بیٹی رئیسہ کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ پتا میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ جوزف نے اس پتے کے سہارے مجھے رئیسہ کے گھر تک پہنچا دیا لیکن اس کے گھر پر تالا پڑا تھا۔ پڑوسیوں سے معلوم کرنے پر علم ہوا کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ حیدر آباد گئی ہے۔ وہاں سے اسے اپنی والدہ کی شدید علالت کی خبر ملی تھی۔ میں خالہ جان کی صحت اور زندگی کی دعائیں مانگتی واپسی گھر آئی لیکن میری پریشانی میں

بس اس ساری صورت حال پر آنسو ہی بہا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ جذبات میں فاروق سے جا پٹتا لیکن کیہ تھراؤن نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر روکے رکھا۔ پریشان اور ہراساں وہ بھی تھی لیکن اس کی عقل کہتی تھی کہ ان دونوں کا الگ رہنا لڑنے والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ وہ دونوں شامل ہو کر نظروں میں آتے تو فاروق اور منو کی مشکل میں اضافے کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔

”جانے مت دینا ان مسلوں کو۔ غدار الگ دیش بنانے کے چکر میں ہیں اور جاتے جاتے ہم کو لوٹ کر جانا چاہتے ہیں۔“ ہجوم میں پتا نہیں کون تھا جس نے یہ چنگاری بھڑکائی تھی لیکن اس کا اثر زبردست ہوا تھا اور یکدم ہی لڑائی میں تیزی آگئی تھی۔ تماش بینوں میں شامل مسلمان جواب تک اس جھگڑے سے الگ تھے، اس جملے کو سن کر غیرت میں آگئے اور صورت حال بہت تیزی سے مزید بگڑتی چلی گئی لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ پولیس جلد چلی آئی اور اسٹیشن پر ان کی تیز سیٹیوں اور تحکمانہ آوازوں کا شور مچیل گیا۔ پولیس والوں نے مشتعل ہجوم پر لٹھیاں چلائیں، دو ہوائی فائر کیے، لوگوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی تب کہیں جا کر صورت حال پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکے۔ کفایت شروع ہوئی تو فاروق اور منو کے علاوہ پارو کے باپ اور بھائی بھی گرفت میں آئے اور صحیح غلط کا فیصلہ تھانے میں جا کر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے پولیس والے پانچوں افراد کو اپنے ساتھ ہنکاتے ہوئے لے گئے۔

ان سب کو ہی جسم کے مختلف حصوں میں چوٹیں آئی ہوئی تھیں لیکن فاروق کو جسمانی چوٹوں سے زیادہ اس احساس نے نڈھال کیا ہوا تھا کہ بمبئی سے اس کی دوری ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بمبئی اس کی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس شہر میں اس نے زندگی کو ایک نئے ڈھنگ سے جینا سیکھا تھا۔ وہاں رہن دادا تھا اور سانہوں میں خوشبو کی طرح بسنے والی جولیٹ تھی۔ بمبئی سے جدائی اسے شاق گزر رہی تھی لیکن قدرت کا جانے کون سا رمز تھا کہ اس کے بمبئی واپس لوٹنے کی راہ میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ ہی جاتی تھی۔ اب بھی وہ ٹرین میں سوار ہوتے ہوتے رکنے پر مجبور ہو گئے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کتنی مدت کے لیے رکنا پڑے گا۔ اسے تھوڑی سی فکر اسٹیٹشن پر سامان سمیت رہ جانے والے گولو اور کیہ تھراؤن کی بھی تھی لیکن امید تھی کہ کیتھی حالات کے مطابق سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ہونٹ واپس جانے کا فیصلہ کر لے گی۔ وہ اگرچہ کم عمر تھی لیکن زندگی بتانے کا ہنر

بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ جوزف نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بہت زور دے کر مجھ سے بچ بتانے پر اصرار کیا۔ میں تنہا اندر ہی اندر گھٹ کر تھک چکی تھی چنانچہ جوزف کے اصرار پر زیادہ مزاحمت نہیں کر سکی اور اسے سب کچھ بتا دیا۔ سب سن کر پہلے تو وہ حیران ہوا لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ خود حیدر آباد جا کر نواب زادہ صاحب سے ملاقات کرے گا۔ کچھ دن بعد وہ حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گیا اور پیچھے میں بے قراری سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ میرا یہ انتظار ختم ہوا اور جوزف لوٹ کر واپس آیا تو اس کے چہرے کو دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس کے پاس میرے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میرا یہ اندازہ ٹھیک نکلا اور اس نے مجھے جو اطلاعات دیں، وہ بہت شاکنگ تھیں۔ پہلی نیوز صبیحہ خالہ جان کے متعلق ملی۔ وہ مختصر علالت کے بعد فوت ہو چکی تھیں۔ شاید سرسام وغیرہ کا شکار ہو گئی تھیں۔ بیماری کا تار ملنے پر ان کی عیادت کے لیے جانے والی بیٹی کو بھی ان سے ملنا نصیب نہیں ہو سکا تھا اور وہ وہاں پہنچ کر بس ان کا کفن میں لپٹا وجود ہی دیکھ سکی تھی۔ نواب فراست بیگ کے خاندان نے وضع داری نبھاتے ہوئے ماں کے چہلم تک اسے وہیں روک لیا تھا اور بعد از مرگ ہونے والی ساری رسومات کے اخراجات نواب فراست بیگ کا خاندان ہی اٹھا رہا تھا۔ رئیسہ کو ماں کے پاس امانت رکھے کسی خط کا علم نہیں تھا لیکن جوزف کی ریکویسٹ پر اس نے ان کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں سے وہ خط مل گیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ نواب زادہ اسد اللہ کو حالات کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔ جوزف نے چاہا کہ وہ خط خود نواب زادہ تک پہنچا دے لیکن جب وہ ان کی حویلی پہنچا تو اطلاع ملی کہ نواب زادہ اسد اللہ گزشتہ روز ہی لندن کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے اور دو سال سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان اطلاعات نے میرے ہوش اڑا دیے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ ایک طرف نواب زادہ سے جدائی کا صدمہ تھا تو دوسری طرف اپنے وجود میں سانس لیتی دوسری زندگی کی فکر..... ان حالات میں جوزف نے مجھے سہارا دیا اور مجھ سے شادی کر کے میری اولاد یعنی تمہیں اپنا نام دے کر دنیا میں رسوا ہونے سے بچالیا۔ جوزف کے اس عمل نے مجھے حقیقت میں اس کی محبت کی گہرائی کا احساس دلایا اور اس کی بے تحاشا محبت کی قائل ہو کر میں خود بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس سے شادی کے بعد ہم نے کیسی زندگی بتائی، اس کی تم خود بھی گواہ

ہو۔ اس نے ہمیشہ تمہیں اپنی سگی اولاد جیسا پیار دیا اور مجھے کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا لیکن میں چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنے حقیقی باپ کے بارے میں علم ہو اور اس کے بعد تم جو چاہو اپنے لیے فیصلہ کرو۔ میں نے اپنی زندگی کی ساری داستان تمہاری خاطر اس ڈائری میں تحریر کر ڈالی ہے اور مناسب وقت آنے پر یہ ڈائری تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس آگہی سے تمہیں دکھ بھی پہنچے گا جس کے لیے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔

فقط تمہاری ماں
جوزفین جوزف

یہ جوزفین کی ڈائری کا آخری باب تھا جسے پڑھنے کے بعد جولیٹ بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ جوزفین کے کیے انکشافات نے اس کے اندر کی دنیا کو تہہ بالا کر ڈالا تھا۔ عمر کے اتنے برس گزرنے کے بعد اسے اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ جس شخص کی گھنی چھاؤں میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی، جس نے اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اور جو اس پر اپنی جان چھڑکتا تھا، وہ تو اس کا کچھ تھا ہی نہیں اور اس کا اصل باپ نہیں اور کسی دوسری جگہ رہتا تھا۔ ایک ایسی جگہ جو یقیناً یہاں سے بہت مختلف تھی۔ جہاں عیش و عشرت اور پیسے کی فراوانی تھی اور ایسے شخص کی بیٹی ہو کر اس نے زندگی کے ماہ و سال بے بسی کے تنگ و تاریک محلے میں ایک چھوٹے سے گھر میں گزارے تھے۔ جوزف اور جوزفین نے اگرچہ اپنے طور پر اسے زندگی کی ہر سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے علم تھا کہ اس کی ذرا ذرا سی خواہشات پوری کرنے کے لیے انہیں کتنی جدوجہد کرنی پڑتی تھی اس لیے اس نے بہت کم عمری میں ہی اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے دل میں دبا کر رکھنا سیکھ لیا تھا حالانکہ وہ ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جو انگلی کے اشارے سے اس کے آگے دنیا کی ہر نعمت ڈھیر کر سکتا تھا لیکن یہ سب تو جب ہوتا جب وہ اس کی ماں کو اپنا نام دیتا۔ وہ تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کے بعد عین اس وقت پر منظر سے غائب ہو گیا تھا جب وہ اس کے گھر والوں کی سازش کا شکار ہو کر اپنے لیے جائے پناہ ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ اپنی کوکھ میں ہلتی زندگی کے لیے بھی متفکر تھی۔ ایسے وقت میں اگر جوزف اس کا ہاتھ تمام کر اپنی محبت کا ثبوت نہ دیتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ہو سکتا تھا کہ اس کی ماں ذلت سے بچنے کے لیے خودکشی کر لیتی اور وہ اس دنیا میں وارد ہی نہ ہو پاتی یا پھر ہوتی تو اپنے ماتھے پر ”ناجائز“ کا ذلت بھرا ٹیگ لگا کر۔ اس صورت حال کے

ایک عزم سالیے بڑ بڑائی اور ڈاڑھی بند کر کے رکھنے کے بعد
نئے درپیش سفر کی تیاری کا آغاز کرنے کی ٹھان لی۔

☆☆☆

ربن کا سفر یہ خیریت گزر گیا تھا۔ ٹرین سے اترنے
کے بعد اس نے اپنا سادھو والا حلیہ بھی بدل لیا تھا اور اب
ایک پرانی سی دھونی اور پیوند زدہ میلے کرتے میں ملبوس
دلدار آغا کی محل نما رہائش گاہ کے بڑے سے گیٹ کے
سامنے کھڑا تھا۔ گیٹ کو کنڈی سے بجانے پر اندر سے ایک
باوردی چوکیدار برآمد ہوا۔ چوکیدار کے کندھے پر ایک
دونالی بندوق بھی لٹکی ہوئی تھی۔

”کی گل اے؟“ اس نے خوشخوار نظروں سے ربن کو
گھورتے ہوئے خوشخوار لہجے میں ہی دریافت کیا۔ دلدار آغا
کے محل کے چوکیدار کو ابتر حلیے والے کسی شخص سے ایسے ہی
انداز میں بات کرنی چاہیے تھی اس لیے ربن نے اثر نہیں لیا
اور لہجے میں لجاجت سمو کر بڑے مسکین سے لہجے میں بولا۔
”اسیں آغا صاحب نال ملنا چاہندا اسی بھرا، تو اسیں
ان نال ملوادے۔“

”کیوں؟ تو آغا صاحب دا چا چا لگدا ہے۔“ چوکیدار
کے تیور مزید کڑے ہو گئے۔

”نہ نہ پر اسیں وڈی آس لے کر ان نال آیا سی۔
اسیں ضرورت مند ہے ہور سنا ہے آغا صاحب وڈے دیا لو
بندے ہیں۔“ برسوں بمبئی کا پانی پینے والے ربن کو پنجابی
لب و لہجہ اختیار کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

”تے فیر؟“ چوکیدار نے شان بے نیازی اختیار کی۔
”اسان دی کڑی دایا ہون والا اسیں ہور اسان
دے وچ کچھ نہیں ہے۔ اسیں آغا صاحب نوں مدد مانگنے آیا
سی۔“ ربن نے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ذرا
بھی نہیں پسچا اور سخت لہجے میں اسے جھڑک کر بولا۔

”اوچل نکل ادھر سے۔ ادھر ایسا کچھ نہیں ہوندا
اے۔ ویسے بھی آغا صاحب ملک وچ نہیں ہیں۔ وہ ولایت
گئے ہیں۔“ چوکیدار کی دی اطلاع نے ربن کو چونکا دیا۔ اس
نے تو سوچا تھا کہ پہلے بہانے سے آغا سے ملاقات کرے گا
اور اسے ٹھول کر اس کا اندر دیکھے گا پھر اس سے جوئیٹ کے
ساتھ کی گئی زیادتی کا حساب لے گا۔ یقین کی حد تک شبہ
ہونے کے باوجود بہر حال ابھی یہ طے ہونا باقی تھا کہ آغا ہی
جوئیٹ کا مجرم ہے لیکن یہاں تو آغا ہی موجود نہیں تھا تو وہ
کس سے تحقیق و تفتیش کرتا۔

”تو مینو بیگم صاحب نو ملوادے۔ اسیں من نال

تصور ہی سے جوئیٹ کو جھرجھری آگئی اور دل میں جوزف
کے لیے محبت کا ایسا شدید طوفان اٹھا کہ آنکھیں نمکین پانی
اگلنے لگیں۔ اس کی ماں سے دوسروں نے محبت کا دعویٰ کیا
تھا لیکن دونوں کی محبت میں بہت فرق تھا۔ نواب زادہ اسد
اللہ جوزفین کے کورے جذبات اور کنوارے جسم کا مالک
بننے کے بعد اسے تنہا اور بے آسرا چھوڑ گیا تھا جبکہ جوزف
نے اس کے خستہ حال وجود کو سنبھال کر اپنی محبت کی پناہ میں
ایک بار پھر زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا تھا۔

”نو آرسو گریٹ ڈیڈ۔“ اس کے تصور نے اسے اپنی
دھندلائی آنکھوں کے سامنے جوزف کی شبیہ دکھائی اور وہ
بے ساختہ ہی بول پڑی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا
کہ آج تک وہ جوزف کی جن محبتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول
کرتی رہی تھی، وہ اس کی ذات پر ایسا قرض تھیں جسے وہ کبھی
اتار بھی نہیں سکتی تھی۔ ہاں لیکن اپنی ماں کا ایک قرض تھا جسے
وہ اتار سکتی تھی۔ وہ نواب زادہ اسد اللہ کا گریبان پکڑ کر اس
سے اپنی ماں کے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ لے سکتی تھی۔
جوزفین نے تو شاید ایسی کوئی کوشش اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ
جوزف کی محبت کی پناہ میں آکر سب فراموش کر دینے کی
خود وجد کرنے لگی ہوگی اور چاہتی ہوگی کہ اپنی بیٹی اور شوہر
کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا میں گن رہے لیکن جوئیٹ کے
پاس تو ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی دنیا تو پہلے ہی اجڑ
چکی تھی اور صرف جذبہ انتقام تھا جس نے اب تک اسے
زندہ رکھا ہوا تھا۔ وہ دلدار آغا سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی
کا بدلہ لینے تک زندہ رہنا چاہتی تھی اور اب نواب زادہ اسد
اللہ سے بھی حساب لینے کے لیے تیار تھی۔ اس کے نزدیک
دلدار آغا اور اسد اللہ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک نے
اگر اپنی طاقت اور اختیار کے زور پر اس کے وجود کو پامال کیا
تھا تو دوسرے نے کم عمر اور بے سہارا جوزفین کے نازک
جذبات سے کھلوڑ کر کے بے رحم دنیا کے رحم و کرم پر بے
آسرا چھوڑ دیا تھا اور دنیا کبھی کسی بے آسرا پر رحم نہیں کرتی۔
وہ تو جوزفین خوش قسمت تھی کہ اسے جوزف مل گیا۔ اگر وہ
بھی عارف کی طرح مشکل میں منہ موڑ کر چلا جانے والا ہوتا
تو جوزفین اور خود وہ جانے کس حال میں ہوتی۔

”میں آپ سے آپ کے کیے کا بدلہ لینے آرہی ہوں
نواب زادہ صاحب! دلدار آغا سے میں اب آپ کے بعد
ہی ٹٹوں گی۔ قدرت بھی اب تک شاید اسی لیے اسے
میرے ہاتھوں سے بچاتی رہی ہے کہ پہلے میں آپ سے
آپ کی گئی زیادتیوں کا حساب لے سکوں۔“ وہ دل میں

ساڈی مصیبت کہہ دوں گا۔“ ذہن میں خیال آنے پر اس نے چوکیدار سے مطالبہ کیا۔

”تیری بدھی میں گل نہیں آتی وے۔ جا ادھر سے۔ کوئی صاحب، بیگم صاحب نہیں ملن وارے تجھ سے۔“ چوکیدار نے پہلے سے زیادہ سخت جھڑکی دی۔

”میں تو نہیں جانے والا۔ تو نہیں ملواتا تو میں ادھر ہی بیٹھا ہوں۔“ ربن پھسکڑا مار کر وہیں گیٹ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔“ چوکیدار نے اسے ڈپٹا لیا ربن اسے کوئی جواب دیے بغیر اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔

”نہیں جاتا تو میں تجھے گولی مار دوں گا۔“ چوکیدار نے اپنی بندوق کندھے سے اتار کر ربن کی طرف تان دی لیکن اس پر ہنوز کوئی اثر نہیں ہوا۔ چوکیدار ظاہر ہے گولی تو نہیں چلا سکتا تھا چنانچہ دانت کچکا کچکا اسے ایک لات رسید کی۔

”کریب نو مار دے ہو۔ بھگوان تسی نئی چھڈے گا۔“ ربن دہائیاں دینے لگا۔

”کیا ہو رہا ہے چاچا..... یہ کیا ہنگامہ ہے؟“ اسی وقت اندر سے ایک شخص برآمد ہوا اور چوکیدار سے پوچھنے لگا۔ چوکیدار نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

”چل بھی چل نکل ادھر سے۔ ادھر تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔“ نو وارد نے جو حیلے سے خود بھی ملازم ہی لگتا تھا، ربن کو گھر کا۔

”تسی مینو بیگم صاحب نال ملا دو۔ آگے اس میں خود ساڈی پتا سنا دیں گے۔“ ربن نے اس کی منت کی لیکن وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھا بلکہ چوکیدار سے بھی کم وقت میں تشدد پر اتر آیا تھا۔ ربن نے اس کے ایک دو ہاتھ کھائے اور پھر ذرا بے ڈھنگے انداز میں اسے دھکا دے ڈالا۔ چوکیدار فوراً اپنے ساتھی کی مدد کو لپکا لیکن ربن کے مقابل ٹکنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ یہ اور بات کہ فی الحال وہ کسی مشاق لڑاکے کے بجائے ایک جھنجھلائے ہوئے جنونی شخص کی طرح ان سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے اس رد عمل پر انہوں نے گھبرا کر آواز دے کر کچھ اور لوگوں کو بھی پکار لیا۔ دو بندے اور آگے لیکن ربن کا پلڑا پھر بھی بھاری رہا البتہ خود اسے بھی خاصی چوٹیں آئیں۔ وہ بے ڈھنگے پن کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنی مہارت کا استعمال کرتا تو یہ چوٹیں نہ لگتیں لیکن اسے اپنے بہرہ پر کچھ بھی رکھنا تھا۔

”بند کر دیو ہنگامہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ جھگڑے کی وجہ سے وہاں خاصا شور مچ گیا تھا اور اس شور کو سن کر ہی

یقیناً وہ سوئڈ بوئڈ آدمی باہر نکلا تھا۔ اس کے حکم پر سب نے اپنے ہاتھ روک لیے پھر اسے بھی ساری داستان سنائی گئی۔ اس بار ربن اس کے قدموں سے لپٹ گیا کہ اسے بیگم صاحب سے ملوادیا جائے۔ اس کی دروناک دہائیوں نے اثر دکھایا اور وہ شخص جو اصل میں آغا تھا، اسے ثنا سے ملوانے پر آمادہ ہو گیا۔ ربن اگر ضرورت مند کے روپ میں نہ آیا ہوتا تو شاید ثنا سے ملاقات کے لیے کوئی اور طریقہ استعمال کرتا لیکن آغا کی غیر موجودگی کی وجہ سے اسے فوری طور پر یہ لائحہ عمل اختیار کرنا پڑا تھا اور آخر اسے کامیابی مل ہی گئی تھی۔

”کون ہو تم اور مدد مانگنے آنے کا یہ کیا طریقہ تھا؟“ اسے ثنا سے ملاقات کے لیے کچھ دیر برآمدے میں انتظار کرنا پڑا تھا پھر اس کی پرنخوت آواز سنائی دی تھی۔ اسے یقیناً پہلے سے ہی تفصیل سے آگاہ کر دیا گیا تھا اس لیے وہ کچھ طیش میں دکھائی دیتی تھی۔ ربن نے سراٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ قیمتی لباس اور زیورات میں تیوریاں چڑھائے کھڑی وہ وہی روایتی امیرزادی تھی جسے غریبوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت دینے کی عادت نہیں تھی۔

”سیدھے طریقے سے کون آپ سے ملنے دیتا۔“ ربن نے اس بار صاف لہجہ اختیار کیا۔ ثنا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ربن کے لہجے کے علاوہ اسے اس کے چہرے کے تاثرات بھی عجیب لگے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا کہ یہ شخص وہ نہیں جو اس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

”کون ہو تم.....؟“ اس بار سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نخوت سے زیادہ تشویش تھی اور اس نے یوں رخ موڑ کر پیچھے دیکھا تھا جیسے کسی کو بلانا چاہتی ہو۔ ”ابھی اکیلے میں ہی بات کر دو تو اچھا ہے بیگم صاحبہ۔ اپن آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا، پر کسی اور نے اپنی بات سن لی تو آپ لوگوں کی بدنامی ہو سکتی ہے۔“ ربن نے تیز سرگوشی میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔

”کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟“ ثنا نے الجھن اور پریشانی سے پوچھا۔

”مطلب کچھ نہیں ہے۔ اپن یہاں آغا سے ملنے کے واسطے آیا تھا۔ اس سے حساب لینے کا تھا، پروہ ملا نہیں تو سوچا آپ سے ہی دو باتیں کر لوں۔“

”تم یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو ایڈیٹ؟ آغا صاحب کے سامنے اس لہجے میں بولتے تو وہ تمہاری بوٹیاں

”رکو..... یہ کچھ رقم رکھ لو اور میری مانو تو آغا کا خیال دل سے نکال دو۔“ ثنائے پیچھے سے اسے آواز دے کر روکا اور ہاتھ میں پکڑے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر مشورہ دیا۔

”اپنے روپے اپنے پاس رکھو بیگم صاحبہ۔ اپن باپ ہے دلال نہیں جو اپنی بیٹی کی عزت کا سودا کر لے۔“ غصے سے ربن کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ثنائے کے لیے اپنے شوہر کی ایسی حرکتیں نئی نہیں ہیں اور شاید اسے ان حرکتوں پر بہت زیادہ اعتراض بھی نہیں ہے اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہتی ہے۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ اس کے غصے سے متاثر ہوئے بغیر ثنائے نے اچکائے اور اچانک ہی پوچھا۔ ”تم بمبئی میں کہاں کے رہنے والے ہو؟“ ربن نے بلا جھجک اپنے علاقے کا نام بتا دیا۔ علاقے کا نام سن کر ثنائے بری طرح چونکی۔

”کیوں، آپ کا کوئی جاننے والا ادھر رہتا ہے کیا؟“ اس کے چونکنے کو محسوس کر کے ربن نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔ میرے جاننے والے ایسے گھٹیا علاقوں میں نہیں رہتے۔“ ثنائے نخوت اور بے اعتنائی سے جواب دیا اور رخ موڑ کر اندر جانے والے راستے پر چل پڑی۔ ربن بھی واپسی کی راہ پر ہولیا۔ اسے ثنائے کے انکار نے ابھمن میں ڈال دیا تھا، وہ جو لیٹ کی سہیلی تھی اور یقیناً جانتی تھی کہ جو لیٹ کہاں رہتی ہے پھر بھی اس نے اس علاقے میں اپنے کسی جاننے والے کی رہائش سے صاف انکار کر دیا تھا اور اس انکار میں اپنے اسٹیشن کے خیال سے زیادہ بے نیازی کا اظہار تھا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ جانتی تھی کہ جو لیٹ اس کے شوہر کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہے یا پھر کوئی اور بات تھی؟ وہ دل و دماغ میں عجیب سی ابھمن لیے وہاں سے روانہ ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ سب حوالات میں بند تھے۔ فاروق اور اس کے ساتھیوں کو ایک جگہ رکھا گیا تھا جبکہ پارو کے باپ اور بھائی ان سے علیحدہ تھے۔ تھانیدار کو ڈر ہوگا کہ وہ لوگ دوبارہ آپس میں الجھ نہ پڑیں، اس لیے یہ احتیاط برتی گئی تھی۔ فاروق، اکبر اور منوالگ الگ احساسات میں گھرے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اکبر کو غم رہا ہوگا کہ پارو وعدہ کرنے کے باوجود عین وقت پر اسٹیشن کیوں نہیں پہنچی۔ فاروق کو اپنے بمبئی واپس پہنچنے کی راہ میں بار بار آڑے

کروا کر کتوں کے آگے ڈلوادیتے۔“ ثنائے غصے کا اظہار کیا۔ ”وہ خود کتے کی خصلت کا ہے۔ گھر میں آپ جیسی سندر جتنی رکھ کر ادھر ادھر منہ مارتا پھرتا ہے اور سمجھتا ہے کبھی کسی مظلوم کے ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچیں گے۔“ ربن نے نفرت زدہ لہجے میں آغا کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

”کون ہو تم.....؟“ ثنائے تیسری بار اس سے یہ سوال کیا تو اس کے لہجے میں خوف کی ہلکی سی آمیزش تھی۔

”ایک مظلوم بیٹی کا باپ۔ جس کی زندگی تیرے پتی نے برباد کر دی اور ہستی کھلیتی لڑکی کو زندہ لاش بنا ڈالا۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لینے بمبئی سے یہاں آیا ہوں پر آغا کی قسمت اچھی ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔“ وہ بولنے کے ساتھ ساتھ ثنائے کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔

”کیا نام ہے تمہاری بیٹی کا؟“ اس نے سرسراتی آواز میں ربن سے دریافت کیا۔

”نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سہیلی ہو یا سیتا یا پھر میری یار جتنی..... عزت تو سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔“ ربن کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

”تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ ثنائے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”آپ اس کی جیون ساھی ہو۔ حق تو آپ کا بھی بنتا ہے کہ اس سے ان حرکتوں کا حساب لو۔“ ربن نے جیسے اسے اسکیا۔

”میرے پاس ایسا کوئی حق نہیں ہے۔“ ثنائے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے پھر یکدم ہی تیور بدل کر بولی۔ ”تم نے جو کہنا تھا کہہ دیا اب جاؤ یہاں سے اور میری مانو تو آغا سے بدلہ لینے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اس سے بدلہ لینا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔“

”وہ ولایت سے کب تک لوٹے گا؟“ اس کے مشورے پر کان دھرے بغیر ربن نے سب سے اہم سوال کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ وہ دو دن پہلے ہی اچانک گئے ہیں۔ وہاں وہ اپنا کاروبار جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ ثنائے اسے جواب دیا۔ یہ ربن کی شخصیت کا اثر تھا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دیتی جا رہی تھی ورنہ اس جیسی خریلی امیرزادی کب کسی کم حیثیت شخص کو منہ لگانے والی تھی۔

”ٹھیک ہے، ابھی اپن چلتا ہے پر پھر دوبارہ لوٹ کر آئے گا۔“ ربن نے واپسی کی راہ اختیار کی۔

گئے۔ ہماری آنکھوں نے سنگ سنگ ہی سارے سنے دیکھے تھے لیکن آج مجبوری نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہے۔ میں نے کل رات پتاجی کا جو روپ دیکھا، وہ پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سچ مچ تمہارے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں اکبر اور اپنی اس پیاس کو بجھانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ تمہیں چوری کے الزام میں پھنسا کر بڑا جھگڑا کھڑا کرنے کے چکر میں ہیں۔ یہ لڑائی ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی بھی بن سکتی ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ اگر ایسا ہوا تو کتنا خون خرابا ہوگا۔ میں اتنے لوگوں کے خون پر پریم کی دنیا کیسے بساؤں اکبر! میں کیسے تمہاری بیکار پر تمہارے پاس اسٹیشن پر آؤں اکبر کہ اگر کسی نے مجھے وہاں تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو بات بہت بڑھ جائے گی۔ میری یہ غلطی ہمارے شہر کو خون میں ڈبو دے گی اور یہ تو تم بھی نہیں چاہو گے کہ ان گنت انسانی جانوں کا خون ہماری گردن پر ہو۔ تو بس میرے پیارے اکبر! تم جلد سے جلد یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ تم مجھ سے دور پر سرکشت (محفوظ) رہو گے۔ میرے جینے کے لیے ایک یہی آس کافی ہوگی۔ ہم ساتھ جیون نہیں بتا سکیں گے پر دور رہ کر بھی رہیں گے تو ایک دوجے کے ہی۔ سماج کی رکاوٹیں ہمارے شریر ایک دوجے سے جدا کر سکتی ہیں پر ہمارے من اور ہماری آتما تو سدا ایک ہی رہے گی۔ تم یہاں سے جا کر اپنا ایک پیارا سا گھر بسانا۔ نہ نہ..... انکار نہ کرنا۔ تم اپنا گھر بساؤ گے تو یہ مجھ سے بے وفائی نہیں ہوگی۔ میں تمہارے من میں رہ کر چپکے سے تمہارے اس گھر میں بس جاؤں گی۔ تم اپنی پتی میں مجھے بھی پاؤ گے اور میری آتما تمہاری پتی کے شریر میں رہ کر تمہارے بچوں کو ممتا کا پیار دے گی۔ تمہیں میری سوگند اکبر..... میری سب باتیں مان لینا اور یہاں اس سنسار میں مجھے نہ پا کر نراش مت ہونا۔ ہم یہاں نہیں تو اوپر آکاش میں ایک دوجے سے ضرور ملیں گے کہ مجھے دشواں ہے وہاں اس سنسار کی طرح کوئی ظالم سماج نہ ہوگا اور پریم کرنے والوں کے ملن کا سپنا پورا ہو کر رہے گا۔ بس اب مجھے اجازت دو۔ صرف تمہاری پارو۔“

اس خط کے ہر لفظ میں محبت کی شدت اور درد بسا ہوا تھا۔ فاروق کو خود اپنا دل موم کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اکبر نے یہ تحریر کس اذیت سے پڑھی ہوگی اور اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اسے پارو نامی اس چھوٹی سی لڑکی پر بھی بڑا پیار آیا تھا جس کی عمر کم تھی لیکن وہ محبت میں بڑی قربانی دینے پر راضی تھی۔ اس عمر میں انسان

آجانے والی رکاوٹوں پر تشویش تھی۔ اس کی محبت بہت زیادہ کی طالب نہیں تھی۔ وہ تو ایک نظر کی دید میں ہی بہل جانے والا آدمی تھا لیکن یہ ایک نظر کی دید کی طلب ہی اس کی آزمائش بن گئی تھی اور وہ محرومی کا عذاب سہہ رہا تھا۔ جدائی اور محرومی اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن اس وقت تو ہمسلا سے حساب لینے کا معاملہ بھی درپیش تھا۔ بے داغ حسن کی مالکہ چاند بانو کا آدھا منہ شدہ چہرہ اس کے دل پر ایسا زخم لگا گیا تھا جو ہمسلا سے حساب لینے بغیر بھر ہی نہیں سکتا تھا لیکن اس معاملے میں بھی اس کی خواہش کے خلاف دیر ہوتی جا رہی تھی۔

بہنئی دیکھنے اور ربن سے نئے گر سیکھنے کی خواہش لے کر آنے والا منو بھی چپ تھا۔ وہ ناامیدی یا بہت زیادہ تشویش کا شکار نہیں تھا۔ اسے تو بس اپنے ساتھیوں کی خاموشی نے خاموشی اور اداس کر دیا تھا اور یوں حوالات میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود بے حد خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں کاغذ کی معمولی کھڑکھڑاہٹ نے ارتعاش پیدا کیا۔ فاروق اور منو نے بے ساختہ گردن موڑ کر دیکھا۔ اکبر اپنی جیب سے وہی لافانہ نکال کر اسے کھول رہا تھا جو پارو کی سہیلی وینٹی نے اسے اسٹیشن پر لا کر دیا تھا لیکن فوراً ہی پارو کے باپ اور بھائیوں کی آمد کی وجہ سے وہ لفافے میں موجود خط کو پڑھ نہیں سکا تھا۔ اکبر کو وہ خط پڑھتے دیکھ کر انہوں نے یوں نظریں واپس پلٹا لیں جیسے اسے اس آدمی ملاقات کے لیے تخیل فراہم کر رہے ہوں۔ سات آٹھ منٹ کا دورانیہ گزرا تو فاروق نے اپنے شانے پر اکبر کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے پلٹ کر اکبر کی جانب دیکھا تو اس نے اپنے ہاتھ میں لرزتا خط اس کی جانب بڑھا دیا۔ فاروق نے خط کی تحریر پر نظر ڈالی۔ وہ ہندی زبان میں لکھا گیا تھا اور کچھ یوں تھا۔

”میرے پیارے اکبر!

سدا جیوت رہو۔

میں یہ چٹھی وینٹی سے لکھوا رہی ہوں اور وہ ہی اسے تم تک پہنچائے گی۔ وینٹی میری سب سے پیاری سکھی ہے اور اس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ وہ تمہارا پیغام لے کر میرے پاس آئی ہے کہ تم نے مجھے اسٹیشن پر بلا پایا ہے تاکہ ہم یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں اپنا سنسار بسا سکیں۔

میرے پیارے اکبر! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے تمہیں وچن دیا تھا کہ میں تمہاری خاطر تمہارا دھرم اپنا لوں گی اور ہم یہاں سے کہیں دور اپنی چھوٹی سی دنیا بسائیں

کو بھلا اپنے جذبات کے سوا کہاں کچھ بھائی دیتا ہے لیکن اسے ہر بات کی پروا تھی۔ اس نے لکھا نہیں تھا لیکن فاروق کو لگ رہا تھا کہ اسے اور سب باتوں کے علاوہ ماں باپ کی عزت کا بھی خیال رہا ہوگا اور اس نے ضرور سوچا ہوگا کہ یوں چپکے سے اکبر کے ساتھ چلے جانے پر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ جسے اپنے شہر کے لوگوں کی زندگیوں کی اتنی پروا تھی، اسے بھلا ماں باپ کا خیال کیسے نہیں ہوگا لیکن اس نے اکبر کو بتانے سے اس لیے اجتناب کیا ہوگا کہ ماں باپ کے سائے سے محروم اکبر اپنے احساس کمتری میں کہیں اس ایک وجہ ہی کو سب سے بڑھ کر نہ سمجھ لے۔ چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی ایسی کمزوریوں کا خوب ادراک ہوتا ہے اور یارو تو بڑی سوجھ والی اور باظرف لڑکی لگتی تھی۔ اس نے اکبر کو اپنی محبت کی قید میں جکڑ کر زندگی کی خوشیوں سے محروم رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ شدت سے اصرار کیا تھا کہ وہ اپنا گھر ضرور بسائے۔ ایسی خواہش وہی لڑکی کر سکتی تھی جس کی محبت میں گہرائی ہو اور پارو کی محبت کی اس گہرائی نے فاروق کے دل کو چھو لیا تھا۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اکبر کے شانے کو تھپکا اور بڑے احترام سے پارو کا خط اسے لوٹا دیا۔

”پولیس کو بیان دیتے ہوئے ”اس“ کا کوئی ذکر مت کیجیے گا بھائی جان! میں نہیں چاہتا کہ پولیس تصدیق کے لیے اس کے پاس جائے اور شہر میں اس کی بدنامی ہو۔ اسے اس شہر میں رہنا ہے تو بہتر ہے کہ عزت سے سہراٹھا کر جائے۔ وہ بہت نازک ہے، بدنامی کی تپش کو سہہ نہیں سکے گی۔“ اکبر کا رخ فاروق کی طرف نہیں تھا۔ وہ سامنے والی دیوار کو ایک ٹک گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں اس سے الٹھا کر رہا تھا۔ فاروق نے محسوس کیا کہ ضبط گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کی عمر کم تھی اور دل پر چوٹ گہری لگی تھی۔ ایسے میں ضبط کی کوشش یقیناً دشوار تھی لیکن وہ اپنی عمر سے بڑھ کر ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ فاروق نے ایک بار پھر اس کا شانہ تھپکا اور نرمی سے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

”تم فکر مت کرو اکبر۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہم کسی عورت، بیٹی کا نام تھانے کچھری میں لیں اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کسی اور طریقے سے اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔“ اس کے بعد وہ آپس میں طے کرنے لگے کہ تھانے میں کیا بیان دیں گے۔ منو اور فاروق کو بس اتنا بیان دینا تھا کہ کل شب جب وہ شہر کی سیر کرنے کے بعد

اپنے ہوٹل کی طرف واپس جا رہے تھے تو انہوں نے ایک جگہ اکبر کو زخمی حالت میں نیم بے ہوش پایا اور انسانی ہمدردی کے ناطے اسے اپنے ساتھ ہوٹل لے گئے۔ جہاں اکبر نے انہیں بتایا کہ وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکا ہے جسے اس شہر میں خواہ مخواہ کی دشمنیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لوگ اسے کمزور جان کر جھوٹے الزامات میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکبر کی اس مظلومیت پر افسوس کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہمیشگی چلنے کی پیشکش کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہاں اس کے لیے کسی معقول روزگار کا بندوبست کر دیں گے۔ بس اسی لیے اسٹیشن پر اکبر ان کے ساتھ تھا لیکن عین ٹرین کی روانگی کے وقت کچھ لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا اور نتیجے میں وہ تھانے پہنچ گئے۔

اکبر اپنے بیان میں پولیس کو بتاتا کہ رام اور شام اسکول کے زمانے سے اس کے ساتھی تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ اس کے ساتھ تنگ آمیز سلوک کیا۔ یہاں تک کہ وہ اسکول سے فارغ ہو کر دکان پر ملازمت کرنے لگا تب بھی ان کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی اور آنے بھانے اسے تنگ کرتے رہے۔ کل بھی انہوں نے اسے اس بات پر مارا تھا کہ اس نے ان کے گھر آنے والے راشن کے حساب میں گڑ بڑ کی ہے۔ اکبر نے اگرچہ زیادہ مار کھائی تھی لیکن پہلی بار خود بھی ان پر ہاتھ اٹھایا تھا اور وہ اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکے تھے اس لیے ایک نئے الزام کے ساتھ اس کے پیچھے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ اس بیان کا ابتدائی حصہ بالکل سچ پر مبنی تھا اور حقیقت یہی تھی کہ رام اور شام زمانہ اسکول میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے رہے تھے اس لیے پولیس تصدیق کے لیے نکلتی تو اسے اکبر کے بیان کو ماننے میں زیادہ تامل نہ ہوتا۔ اکبر اس لیے بھی سچ جانتا کہ اس پر جن زیورات کی چوری کا الزام لگایا جا رہا تھا، وہ اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوئے تھے۔

”اوائے چلو! تمہیں صاحب بلاتے ہیں۔“ اپنے طور پر سب کچھ طے کر لینے کے بعد وہ تینوں ایک بار پھر اپنی اپنی دنیا میں گمن ہو کر بیٹھے تھے کہ ایک سنتری نے آکر ہانک لگائی۔ وہ تینوں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں جس ”صاحب“ کے سامنے پیش کیا گیا، اس سے پہلے بھی ان کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ ماجد علی کے ٹرین سے گرنے والے حادثے کی ان سے اسی نے تحقیق کی تھی۔ وہ تینوں اس کے سامنے حاضر کیے گئے تو اس نے پہلے غور سے ان کی صورتیں دیکھیں اور پھر ایک ہنکارا بھر کر فاروق سے مخاطب ہوا۔

سے بھی وہ گہنے نہیں نکلے ہیں جن کی چوری کا الزام اس لڑکے اکبر پر لگایا جا رہا ہے۔ دیکھا جائے تو اب تک جو انویسٹیشن ہوئی ہے، اس کے بعد اس لڑکے کی پوزیشن خاصی کلیئر ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ دوسری پارٹی پر پریشر ڈال کر اس جھگڑے کو ختم کروا دوں۔ یہ جھگڑا یہیں نمٹ گیا تو حالات کو کنٹرول میں رکھنا تھوڑا ایزی رہے گا۔“ پولیس افسر کے ان الفاظ نے ان تینوں کے چہروں پر رونق دوڑا دی اور وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگے کہ ان کا واسطہ کسی متعصب شخص سے نہیں پڑا اور نہ وہ ایک مسلمان ملزم کے مقابلے میں ہندو درخواست گزار کو ترجیح دے سکتا تھا۔

”تھینک یو سوچ آفیسر! آپ کی اس مہربانی کے لیے میں پرسنل تھینک فل ہوں۔“ فاروق نے فوراً اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ خفیف سا مسکرایا اور پھر سنتری کو آواز لگا کر انہیں واپس لے جانے کی ہدایت کی لیکن یہ ہدایت صرف منو اور اکبر کے لیے تھی۔ فاروق کو اس نے وہیں روک لیا تھا۔ فاروق کو اپنے اس طرح روکے جانے پر حیرت ہوئی اور وہ سوالیہ نظروں سے پولیس آفیسر کو دیکھنے لگا۔

”میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں نے جو اسٹینٹ دیا، وہ جھوٹا ہے۔“ فاروق کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے جو کہا، وہ اسے ڈنک مارنے جیسا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے تو وہ اپنی جگہ گڑبڑا کر رہ گیا پھر تیزی سے اس کے ذہن نے حالات کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ تھانے میں ان کو بند کرنے کے بعد ان کا بیان بہت دیر سے لیا گیا تھا اور اس سے پہلے بہت سی کارروائی نمٹالی گئی تھی جس میں ہوٹل جا کر کیتھرائن اور گولو کے پاس موجود سامان کی تلاشی لینے کا فعل بھی شامل تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ لوگ اسٹینٹ سے جا کر دوبارہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے جہاں ان کا قیام تھا کیونکہ ایک تو وہ ہوٹل معقول تھا اور دوسرے انہیں یہ خیال بھی ہوگا کہ تھانے سے نکلنے کے بعد فاروق وغیرہ کو انہیں تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔ پولیس والے جب سامان کی تلاشی لینے ہوٹل گئے تو انہوں نے کیتھرائن اور گولو سے یقینی طور پر تفتیش بھی کی ہوگی اور انہوں نے سادگی اور لاعلمی میں وہ سب کہہ ڈالا ہوگا جو سچ تھا۔ اس کے بعد تو اس ذہین افسر کو بانی باتیں جاننے میں کوئی مشکل ہی نہیں ہوئی ہوگی۔

”تمہاری ساتھی لڑکی سے اکبر اور پاروتی کے بارے میں جاننے میں مجھے زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ پھر کچھ لوگوں نے پاروتی کی سہیلی وجنتی کو اسٹینٹ پر اکبر سے

”یہ سب کیا ہے مسٹر فاروق! آپ پہلے ہی ایک برے واقعے سے متعلق ہونے کے باعث زیر تفتیش تھے اور میں نے آپ کی معقولیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے آپ کو اس چکر سے الگ کر دیا تھا لیکن اب آپ پھر اس سے بھی زیادہ بری پوزیشن میں انوالوڈ پائے گئے ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ جو کچھ اسٹینٹ پر ہوا، اس کے بعد شہر میں ہندو مسلم فسادات پھیلنے کے چانسز کتنے بڑھ گئے ہیں۔ اگر یہ فسادات بھڑک اٹھے تو جانے کتنی انسانی جانیں چلی جائیں گی۔“ وہ ہندو افسر خاصا معقول آدمی تھا اور اس کی آنکھوں میں حقیقتا تشویش کے رنگ تھے۔

”سوری آفیسر لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس میں ہم سے زیادہ قصور ان لیڈرز کا ہوگا جو اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر اندلیتے رہتے ہیں۔“ فاروق نے بغیر لگی لپٹی کے خیال آرائی کی جس پر افسر کے چہرے کے تاثرات بدلے اور پھر وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

”میں آپ کو یہی احساس دلارہا ہوں کہ آج جو واقعہ ہوا ہے، وہ بارود کو آگ دکھانے کا کام بھی کر سکتا ہے۔ ہم بہت مشکل سے اس شہر کی پوزیشن کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں ورنہ اب تک ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی فسادات شروع ہو چکے ہوتے۔“

”اللہ کرے آپ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں لیکن جہاں اتنا بارود ہو وہاں کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ اتفاق سے ہی ہو۔ جنہوں نے یہ بارود بھرا ہے، وہ خود ہی اس میں آگ لگانے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔ آپ مجھے غریب پر خواخواہ برس رہے ہیں۔ میں تو صرف ایک مظلوم لڑکے کو اس کے مصائب سے نکال کر نئی زندگی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہاں لوگوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا اور پھر اکبر کے حوالے سے وہی سب کہہ ڈالا جو وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ ہندو افسر غور سے یہ سارا بیان سن رہا۔ اس نے اکبر سے بھی چند سوالات کیے اور پھر آخر میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”ویل مسٹر فاروق! آپ نے جو کچھ کہا اس میں سے کافی باتوں کی میں پہلے ہی کنفرمیشن کروا چکا ہوں۔ آپ کے دو ساتھی جو اسٹینٹ پر پولیس کی کسٹڈی میں آنے سے رہ گئے تھے، مجھے ان کے بارے میں بھی خبر ہے۔ ہم نے ان کے پاس موجود سامان کی بھی تلاشی لی ہے اور اس سامان میں

کو نہیں ختم کر دیا جائے گا اور اکبر کو فاروق کے ساتھ شہر چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ آج کے دن بمبئی جانے والی کوئی ٹرین نہیں آنے والی تھی چنانچہ انہیں کل تک یہیں رہنا تھا۔ پولیس افسر نے دونوں ہی فریقین کو آزاد کرنے کے بجائے کل تک تھانے میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ ہو سکے۔ ہوٹل میں مقیم کیتھرائن اور گولو کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اس نے پولیس کی قرار دی تھی۔ یوں وہ لوگ ایک معقول شخص سے واسطہ پڑنے کے باعث اتنی مشکل صورت حال سے بہ آسانی نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

رامو کو رہن کی ہدایت یاد تھی۔ رہن نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ انسپٹر وکرم سے مجوکا ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کرے لیکن اس کے ارد گرد جو حالات تھے، ان میں انسپٹر پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ پولیس والے سارا وقت اڈے کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ اڈے کا کوئی آدمی علاقے سے باہر نکلتا تھا تو اس کا تعاقب کیا جاتا تھا۔ ایسے میں وہ انسپٹر وکرم پر ہاتھ ڈالتے تو خود ان کے پکڑے جانے کا امکان تھا۔ وکیل اشوک پنچن نے بھی اسے احتیاط کا مشورہ دیا تھا۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اگرچہ اس نے قانون کا سہارا لے کر وقتی طور پر پولیس کو اڈے سے دور رہنے اور کسی شخص کو گرفتار نہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن انگریز افسر ولیم کے اغوا اور اس پر تشدد کا الزام بہت بھاری ہے۔ پولیس کے پاس ثبوت ہوتا تو وہ ذرا بھی رعایت نہیں کرتی لیکن اس کا شک کرنا بھی معمولی بات نہیں تھی۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے اور یہ ”کچھ“ آخر کار رامو کے سامنے آ ہی گیا۔ رہن کی غیر موجودگی میں اس کی ذمہ داری بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اسے دونوں اڈوں کا انتظام دیکھنا ہوتا تھا۔ خصوصاً مجودا والے اڈے پر ابھی تک خصوصی توجہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اڈے کے افراد کی طرف سے تعاون اور فرمانبرداری کے وعدے کے باوجود ڈر رہتا تھا کہ ان میں کوئی غدار موجود ہو سکتا ہے اس لیے رامو کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ وقت وہیں رہ کر ان پر نظر رکھے۔ اب بھی وہ تقریباً سارا دن اور شام وہاں گزار کر مغرب کے بعد وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پرانے اڈے پر واپس جا کر خاص خاص ساتھیوں سے انسپٹر وکرم کو گھیرنے کے سلسلے میں مشورہ کرے گا۔ اپنے ساتھ موجود جانی سے بھی وہ اسی سلسلے میں گفتگو کرتا جا رہا تھا

بات کرتے دیکھا تھا۔ میں نے جنتی سے ملاقات کی تو پوری کہانی سامنے آ گئی اور سمجھ آ گیا کہ پاروتی کا باپ اکبر کو اپنی بیٹی سے پریم کرنے کی سزا تو دینا چاہتا ہے لیکن بیٹی کے نام پر دھبہ نہیں لگانا چاہتا اس لیے اس طریقے سے اکبر کو جھوٹے الزام میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادھر تم لوگوں نے بھی مجھ سے جھوٹ بولا یعنی پولیس کا دو جھوٹی پارٹیوں سے واسطہ پڑ گیا ہے اور اب سوچنا ہے کہ اتنے سارے جھوٹوں سے کیسے نمٹا جائے۔“ بظاہر وہ سخت لہجے میں بول رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود نرمی کی جھلک کو فاروق نے پالیا اور انکساری سے بولا۔

”ہم نے جھوٹ اختیار کیا، وہ صرف اس لیے کہ پاروتی کی بدنامی نہ ہو اور اس کا نام سامنے آنے کی صورت میں مزید فساد نہ پھیلے لیکن جو جھوٹ ہے، اس کی بنیاد بھی سچ پر ہی رکھی گئی ہے۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں بھائی سچ اکبر کو ماضی میں تنگ کرتے رہے ہیں۔“

”میں سب معلوم کروا چکا ہوں اور اب اسی کی بنیاد پر اس کیس کو نمٹاؤں گا۔“ اس نے فاروق کو جواب دیا اور پھر سنتری کو بلا کر اسے پارو کے باپ کو وہاں لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں بڑھا ان کے سامنے تھا اور فاروق کو کینہ تو زنگیوں سے گھور رہا تھا۔ فاروق نے اس کی نظروں کی پروا نہیں کی۔ یہاں اس کے بجائے پولیس افسر کو سارے معاملات نمٹانے تھے اور وہ اس کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے پوری رام کہانی پارو کے باپ کے سامنے رکھ دی۔ وہ بڑا جزیب ہوا اور پیش میں آیا کہ اس کی بیٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن آفیسر اس کے دباؤ میں نہیں آیا اور اس نے واضح کر دیا کہ اس کے پاس ایسے گواہان ہیں جو کیس عدالت میں جانے کی صورت میں پارو اور اکبر کے تعلق کی تصدیق کر دیں گے۔ فاروق نے چپکے سے اکبر کے پاس موجود پارو کے خط کو بھی بطور ثبوت پیش کرنے کی دھمکی دے ڈالی جس پر اس کے غبارے میں سے مزید ہوا نکل گئی۔ اس کا اور کچھ بس نہیں چلا تو افسر کی قومی غیرت کو لاکارنے لگا کہ وہ ایک ہندو ہو کر اپنی قوم کا ساتھ دینے کے بجائے مسلمان کا ساتھ دے رہا ہے۔ افسر نے اس پر واضح کیا کہ وہ اس وردی کو پہن کر ہندو اور مسلمان کچھ نہیں بن سکتا۔ یہ وردی اسے قانون نے پہنائی ہے اور وہ قانون اور انصاف کا رکھوالا ہے۔ وہ واقعی ایک متاثر کن کردار کا مالک تھا جو ان حالات میں بھی تعصب سے پاک تھا۔ اس کی کوشش سے ہی یہ طے پا گیا کہ اس معاملے

انہیں وکرم کے سامنے پیش کرنے والے سپاہی ہی ہاٹکتے ہوئے تھانے کے اس خاص کمرے میں لے گئے جسے عرف عام میں مہمان خانہ کہا جاتا تھا لیکن اصل میں وہ تھانوں میں قائم کردہ وہ عقوبت خانے تھے جہاں ملزمان کو تفتیش کے لیے کڑے مراحل سے گزارا جاتا تھا۔ رامو اور جانی کو بھی مہمان خانے کی اس حقیقت کا علم تھا اور وہ ذہنی طور پر تشدد سہنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اندر پہنچتے ہی سپاہیوں نے انہیں جکڑ لیا پھر ان کے اوپری جسم پر ہتھ کر کے انہیں رسیوں کی مدد سے ایک ہی ستون سے باندھ دیا گیا۔ مقابلے میں قانون کے رکھوالوں کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو وہ دونوں اتنی آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں تھے لیکن یہاں انہیں احتیاط برتنا بھی اتنا وہ بھی جانتے تھے کہ پولیس سے بھڑنا ریاست سے تصادم تصور کیا جاتا اور اگر حکومت ان کے خلاف بھرپور ایکشن لے لیتی تو وہ لاکھ منظم ہونے کے باوجود مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پولیس سے بنا کر رکھنے کی صورت میں ہی پھل پھول رہے تھے۔ پولیس سے عناد کی صورت میں خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رکھ دیے جاتے۔ یوں بھی گورے افسر ولیم کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا شک ان پر ہونے کی وجہ سے پہلے ہی پولیس ان کے خلاف ہو گئی تھی۔ پولیس کی عداوت کے باعث ہی وہ یہاں ستون سے بندھے تھے۔ ہاندھنے والوں نے صرف ہاندھنے پر اکتفا نہیں کیا اور ایک جلا وطن سپاہی ہاتھ میں کوڑا لے کر بے دردی سے ان پر برسائے لگا۔ اسے ہاتھ میں موجود ہیل کھاتے لمبے سے کوڑے کو استعمال کرنے میں ایسا کمال حاصل تھا کہ وہ ایک ہی وار میں دونوں کے جسموں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ذرا سی دیر میں ان کے پرہیز جسموں پر سرخ سرخ لکیریں نظر آنے لگیں۔ وہ ہونٹ بچھینے بدن میں انگارے سے بھر دینے والی تکلیف کو برداشت کرتے رہے۔ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ ایک طے شدہ پروگرام ہے اور کوڑے برسائے والا جلا وطن کو دیے گئے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے یا رحم کی اپیل کرتے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا چنانچہ چپ چاپ پٹتے رہے۔ کبھی کبھی کوئی ہلکی سی سسکاری ان کے ہونٹوں سے نکل جاتی تو نکل جاتی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل خاموش تھے۔ تھوڑی دیر میں اس ”مہمان خانے“ کا دروازہ کھلا اور انسپٹر وکرم کسی بڑے افسر کی سی شان سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔

کہ بالکل اچانک چھ سات پولیس والوں نے انہیں گھیر لیا۔ پولیس والوں نے انہیں گھیرنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو نہ تو موجود ادا لے اڈے کی حدود میں آتی تھی اور نہ ہی رین کے اڈے کی۔ یہاں وہ وکیل اشوک بچن کو بھی مدد کے لیے نہیں بلا سکتے تھے۔

”کیا بات ہے؟ کیوں اپنی لوگوں کو روکا ہے؟“ اندر سے گھبرا جانے کے باوجود اس نے اعتماد سے پولیس والوں سے دریافت کیا۔

”تم کو تھانے لے کر جانے کا ہے۔“ ان میں سے

ایک سینئر سپاہی نے جواب دیا۔

”کس واسطے؟ کوئی کالج (کاغذ) نکلا ہے کیا اپنے

نام کا؟“ اس نے وارنٹ کے بارے میں دریافت کیا۔

”وہ سب صاحب سے پوچھنا۔ اپنے کو بس تمہیں

ساتھ لانے کا آرڈر ہے۔“ اسی سپاہی نے درستی سے رامو

کی بات کا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اپنی چلتا ہے۔ تو جا جانی! آرڈر تو صرف

اپنے واسطے ہے نا۔“ وہ سمجھ گیا تھا کہ پولیس والوں نے اسے

ایسی جگہ اس لیے گھیرا ہے کہ وہ مزاحمت نہ کر سکے اس لیے

زیادہ اڑنا مناسب نہیں سمجھا اور جانی کو وہاں سے رخصت

کرنے کی کوشش کی۔

”اسے کدھر بھیجتے ہو دادا۔ یہ بھی اپنے ساتھ ہی

جائے گا۔ صاحب کا آرڈر تھا کہ تمہارے ساتھ جو ہوا اسے

بھی ساتھ ہی لے کر آنے کا ہے۔“ پولیس والے نے اس پر

واضح کر دیا کہ وہ جانی کی گلو خلاصی نہیں کر داسکتا۔ مجبوراً ان

دونوں کو پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ تھانے میں

انسپٹر وکرم ان کا منتظر تھا۔ وہی انسپٹر وکرم جو اڈے کا وظیفہ

خوار تھا اور ماہانہ بھتے کے علاوہ محض تحائف اور خاطر

مدارت سے اپنا منہ بند رکھتا تھا، اس وقت آنکھیں بالکل

ماتھے پر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے قبل رین یا رامو اگر کسی

کام سے تھانے آتے تھے تو وہ ان کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا

کر بات کرتا تھا۔ آج کرسی پر بٹھانا تو دور کی بات اس نے

نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا اور سخت لہجے میں بولا۔

”سالوں کو مہمان خانے میں پہنچاؤ۔ وہیں ان سے

بات ہوگی۔“ اس کے اس طرز خطاب اور حکم پر رامو اپنی

جگہ ہل کھا کر رہ گیا لیکن یہ موقع نہیں تھا کہ وہ اپنے غصے کا

اظہار کر سکتا۔ اسے وکرم کی بدلی ہوئی نگاہوں پر بھی حیرت

نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ روپے پیسے سے خریدی گئی

وفاداریاں کبھی بھی بدل سکتی ہیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

سے جواب دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہاتھ میں تھامی چھڑی بھی اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے ہٹا کر بازو پر دے ماری۔

”بہت سے شکاری شیر کے شکار کا شوق سن میں لیے مچان باندھتے ہیں پر پھل (کامیاب) کم ہی ہوتے ہیں۔

بہتے تو شیر کی دھاڑ سن کر ہی مچان سے نیچے جا گرتے ہیں۔ نیم (نائم) آنے پر تمہارا بھی پتا لگ جائے گا۔“ رامو نے اپنے

لہجے کو ہموار ہی رکھا اور چھڑی کی مار کو یوں سہہ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن وکرم اس کے جواب پر خود کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور مشتعل ہو کر اس پر پل پڑا اور اس وقت تک چھڑی برساتا رہا

جب تک وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور نہ جا گری۔ ایک ماتحت نے دوڑ کر گرنے والی چھڑی کو اٹھایا جبکہ دوسرے نے

نورا پانی کا گلاس پیش کیا۔ وکرم نے اپنی ہانپتی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پورا گلاس ایک ہی سانس

میں چڑھا لیا اور پھر غراتے ہوئے رامو سے مخاطب ہوا۔

”میرے کو تیری بک بک نہیں سننے کی ہے۔ ابھی میرے کو صاف بول کہ تیرا دادا کدھر چھپ کر بیٹھا ہے؟“

”اپن بھی صاف ہی بولا ہے کہ دادا چھپ کر نہیں بیٹھا ہے۔ ہاں کدھری ہے، یہ اپنے کو خبر نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے کو

بول کر نہیں جاتا۔“ رامو نے وکرم کے برعکس بالکل پرسکون لہجے میں جواب دیا حالانکہ جس طرح وکرم نے اس پر بنا کسی

لحاظ کے چھڑی برسائی تھی، اس سلوک نے اس کے ساتھ ہی بندھے جانی کا چہرہ غصے سے سرخ کر دیا تھا اور اس کا بس

نہیں چلتا تھا کہ وہ وکرم کو کھری کھری سا ڈالے لیکن وہ چپ تھا کہ رامو کی موجودگی میں اس سے بڑھ کر بولنا بے ادبی

ہوتی۔ اڈے کے اپنے کچھ اصول تھے اور وہ لوگ حتی الامکان اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ جانی بھی رہن کے

دست راست رامو کی مرضی کے خلاف کچھ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

”تو بڑا لال پیلا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے خون زیادہ جوش مار رہا ہے۔ لا تو ہی بتا کدھر ہے تیرا دادا؟“ اس بار انسپٹر

وکرم جانی پر پل پڑا۔

”کاہے کو اپنا نیم برباد کرتے ہو انسپٹر۔ اپن دادا کا رائٹ ہینڈ ہے۔ جب اپنے کو نہیں پتا تو اس گریب کو کدھر

سے خبر ہوگی۔“ رامو نے اسے ٹوکا۔

”چھڑی ادھیڑ کر اندر چڑھی چربی باہر نکالوں گا تو سب یاد آ جائے گا تم ماں کے..... کو۔“ وکرم نے ایک بڑی سی گالی دی جس پر جانی کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا اور وہ بگڑ کر بولا۔

”تیری جورو کے ساتھ ہے دادا۔ جا، جا کر پکڑ لے

”ہاں بھئی۔ خاطر واطر کی مہمانوں کی یا ابھی تک ایسے ہی سوکھا رکھا ہوا ہے؟“ کوڑے برسانے والے کا ہاتھ

اس کے اندر داخل ہونے کے بعد رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس نے تجاہل عارفانہ برتا۔

”پیٹ بھر کر کھلایا ہے سر! آپ بولو تو حلق تک بھر دیں۔“ ماتحت نے چپک کر جواب دیا۔

”ایسی کیا جلدی ہے یار! ابھی تو یہ اپنے مہمان ہیں لہجے سے تک۔ پہلے ان سے دو باتیں کرنے دو پھر دیکھیں

مے کہ کتنی خاطر اور کرنی ہے۔“ وکرم نے معنی خیز لہجے میں کہا اور رامو کے عین مقابل آن کھڑا ہوا۔

”چہ چہ..... سالے نے ذرا بھی ہاتھ ہلکا نہیں رکھا اور کیسے آدمی کے جنے کی کھال کو چیتے کی کھال کے مافق

دھاری دار کر ڈالا۔“ رامو کے جسم پر کوڑے کی مار سے پڑ جانے والی سرخ سرخ لکیروں کو دیکھتے ہوئے اس نے

مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔ مارنے والے نے واقعی اسے اس بے دردی سے مارا تھا کہ بعض جگہ سے تو خون تک رسے

لگا تھا۔

”تیرے لیے اچھا تھا انسپٹر کہ تو اپنے کو آدمی کا جتنا یاد رکھتا یا نہ رکھتا، پر یہ ضرور یاد رکھتا کہ اپن رہن دادا کا

آدمی ہے اور دادا اپنے آدمیوں کو جان سے پیارا رکھتا ہے۔ اس کو اپنی یہ ادھڑی چھڑی بہت دکھ دے گی۔“ رامو نے

سرد لہجے میں اس کے مذاق کا جواب دیا۔

”اپن اس کی چھڑی کو بھی ایسا ہی کر دے گا بس تو اپنے کو یہ بتا کہ کس بل میں چھپ کر بیٹھا ہے وہ تیرا رہن دادا

جس کی تو دھمکی دیتا ہے۔“ وکرم نے ہاتھ میں موجود چھڑی کو رامو کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس پر دباؤ ڈالا تو رامو نے

اچھی خاصی تکلیف محسوس کی لیکن وہ تکلیفوں سے گھبرانے یا ڈرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسی طمطراق سے بے باکی کے

ساتھ بولا۔

”بل میں بزدل چوہے چھپ کر بیٹھتے ہیں جیسا کہ آج کل مجبور دادا پولیس کے بل میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اپنا دادا تو

شیر ہے اور سارا جنگل شیر کا گھر ہوتا ہے۔ شیر کدھر بھی ہو جنگل کا بادشاہ ہی کہلاتا ہے۔ اپنے راجے میں اس کی سب طرف نظر

ہوتی ہے اور وہ کدھری سے بھی نکل کر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔ تیرے کو چاہیے کہ اس سے کو بھی دھیان میں رکھ۔“

”ہا ہا..... پولیس کو دھمکی دیتا ہے پر یاد رکھ اس جنگل میں پولیس وہ شکاری ہے جو شیر کا شکار سب سے جاذبی شوق سے ہیلیتی ہے۔“ وکرم نے قہقہہ لگاتے ہوئے اسے محض زبان

اسے۔“ اس نے اسی پر بس نہیں کیا اور رہن کی موجودگی کے وہ وہ پتے گنونا شروع کیے کہ وکرم کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ طیش میں آکر اس نے اپنے ماتحت کے ہاتھ سے کوڑا لیا اور ایک ساتھ ان دونوں پر پل پڑا لیکن اس کا زیادہ زور جانی پر تھا جس کی زبان مار کھانے کے باوجود رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یہاں تک کہ وکرم کا سانس ایک بار پھر پھولنے لگا۔ اپنے افسر کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ماتحت بھی مدد کے لیے میدان میں اتر گئے اور ان دو بندھے ہوئے آدمیوں کو اتنا مارا کہ وہ اپنی برداشت کی بے پناہ صلاحیت کے باوجود سمہ نہ سکے اور آخر کار ان کی گردنیں ڈھلک گئیں۔ ان کے بے ہوش ہونے پر ہی ان سورماؤں کا غصہ ذرا کم ہوا۔ پہلے وکرم نے ہاتھ روکے پھر اپنے ماتحتوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

”بہت موٹی کھال ہے کمینوں کی۔ ان کی زبان کھلوانے کے لیے کوئی اور ترکیب لڑانی ہوگی۔ اس رامو..... کو ضرور پتا ہوگا کہ رہن کہاں ہے، بس کسی طرح اس کا منہ کھلوانا ہوگا۔“ اپنی پہلی بھرپور کوشش کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنے والے وکرم کی آس نے ابھی دم نہیں توڑا تھا اور وہ پھولی ہوئی سانسوں کو قابو کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ شاید اس کا دماغ بھی نئی حکمت عملی وضع کرنے میں مصروف تھا۔

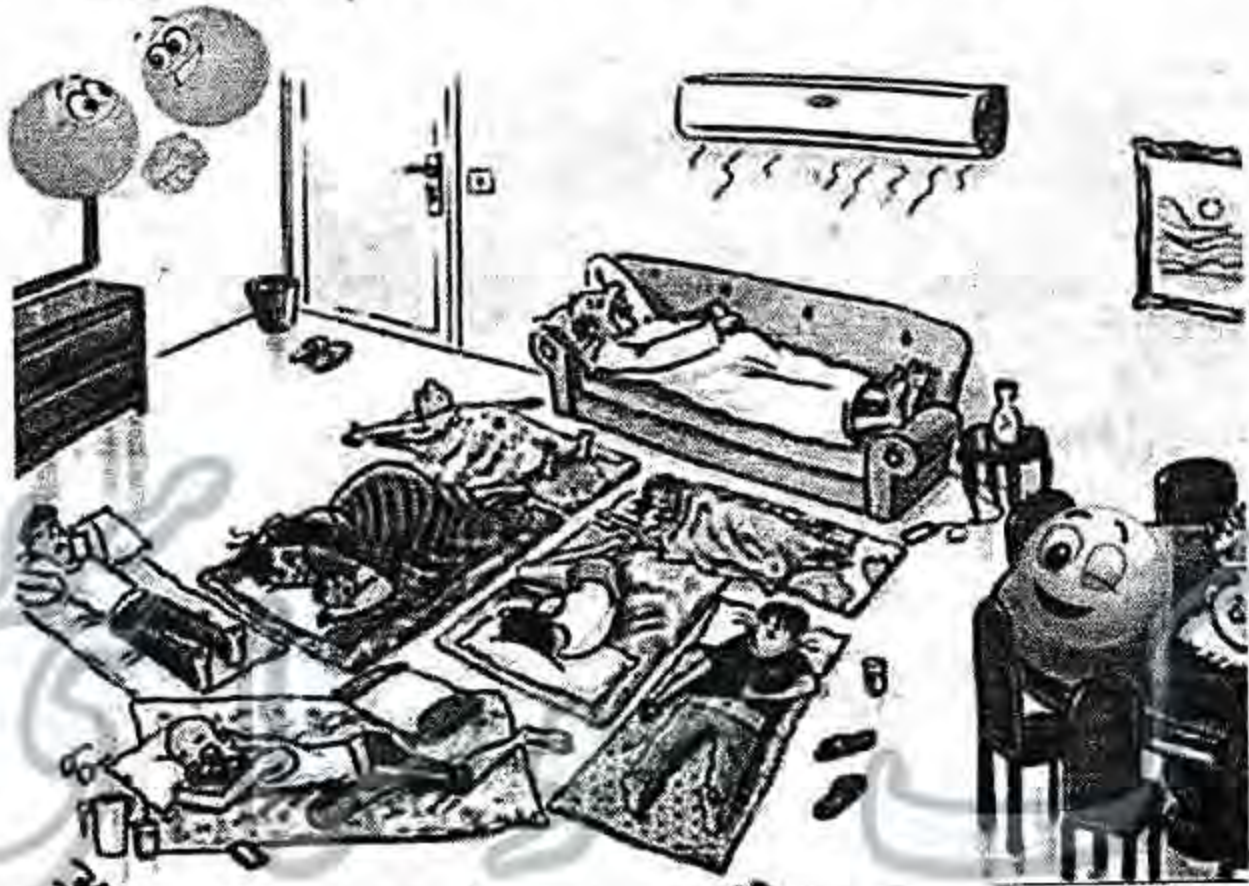
☆☆☆

سرتا پاسبان لباس میں جولیٹ قبرستان میں کھڑی تھی۔ اس کی نظریں پہلو بہ پہلو بنی دو قبروں پر تھیں۔ ان میں سے ایک قبر جوزف کی اور دوسری جوزفین کی تھی۔ دونوں قبریں عمدہ پتھر سے پکی کردائی گئی تھیں اور ان پر صلیب کے علاوہ نام کے کتبے بھی لگے تھے۔ یہ کام بھی اڈے والوں نے کروایا تھا اور وہ معاشرے کے رواج کے مطابق انہیں حقیر سمجھنے کے باوجود ان کا احسان ماننے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ محلے کا حصہ نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن ہر اہم موقع پر محلے والوں کا ساتھ دے کر حق محلہ داری نبھانے میں سب سے آگے رہتے تھے۔ دل میں ان کے احسانات کے لیے ممنون جولیٹ اس وقت جوزف اور جوزفین کی قبروں کے سامنے کھڑی عجیب سے جذبات کا شکار تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی اور گلابی ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ قبروں میں لیٹے یہ دو افراد اس کی زندگی کا محور و مرکز تھے اور زمانے نے نہایت سفاکی سے ان دونوں کو اس سے چھین کر اسے تنہا کر دیا تھا۔

ان کی قبروں کے پاس کھڑے ہو کر اسے ان کی محبت اور مہربانی کا ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔ خصوصاً جوزف تو اس سے بے تحاشا محبت کرتا تھا۔ جوزفین کبھی کسی غلطی پر اسے ڈانٹنے بھی لگتی تو وہ اس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا اور جب وہ مہربان شخص اسے چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو اس کا باپ تھا ہی نہیں اور اس نے محض جوزفین سے اپنی محبت نبھانے کی خاطر اسے یوں اپنایا تھا کہ اسے کبھی معمولی سا بھی شک نہیں گزرا تھا کہ اس سے یوں پیار کرنے والا اور اس کے لاڈ اٹھانے والا شخص اس کا باپ نہیں ہے۔ اس کا باپ تو نواب زادہ اسد اللہ تھا جو یقیناً اپنی زندگی میں آنے والی جوزفین کو جوانی کی ایک بھول سمجھ کر کب کا فراموش کر چکا تھا اور بے خبر تھا کہ اس بھول کی نشانی جولیٹ کی صورت میں موجود ہے۔ جولیٹ آج صرف جوزف اور جوزفین سے ملاقات کے لیے قبرستان نہیں آئی تھی بلکہ صرف جوزف کو خراج عقیدت بھی پیش کرنے آئی تھی۔ جس نے محبت کی تھی تو آخری سانس تک نبھائی تھی اور مر کر بھی جوزفین کے پہلو میں ہی رہنا قبول کیا تھا۔ بہت معمولی تعلیم رکھنے والے، کم حیثیت جوزف نے جذبہ محبت کو یوں نبھایا تھا کہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ نواب زادہ اسد اللہ کہیں بہت پستی میں گرے دکھائی دیتے تھے۔ کم از کم جولیٹ کے دل میں ان کا مقام بہت پست تھا اور وہ اس پست آدمی سے اس کے کیے کا حساب لینے آج حیدر آباد کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔ اس کا سامان باہر ٹیکسی میں رکھا تھا اور ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے اس نے بس کچھ دیر کے لیے ٹیکسی کو قبرستان کے باہر رکوا دیا تھا۔ باہر کھڑی ٹیکسی کی وجہ سے اس کے پاس زیادہ دیر وہاں رکنے کا وقت نہیں تھا چنانچہ نم آنکھوں سے زیر لب ان دونوں کو الوداع کہا اور قبرستان سے باہر نکل گئی۔ مٹی کے وہ ڈھیر اس کے اس عمل اور جذبات کو محسوس کر سکتے تھے یا نہیں، یہ سوچنے کی اسے فرصت نہیں تھی کیونکہ وہ بھی قبرستان جانے والے ہر شخص کی طرح حقیقتاً اپنے دل کی تسلی اور سکون کے لیے وہاں گئی تھی۔ ٹیکسی کے اسٹیشن پہنچنے تک اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پایا اور نہایت اعتماد سے اس راہ پر گامزن ہو گئی جس پر برسوں پہلے اس کی ماں نے سفر کیا تھا اور دامن میں نہ جانے کتنے دکھ سمیٹ لائی تھی۔ آج وہ ان دکھوں کا حساب لینے کے لیے اپنے حقیقی باپ نواب زادہ اسد اللہ سے ملنے حیدر آباد جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس AC کے سائے تلے ہم ایک ہیں



کرتا چنانچہ اپنے ساتھیوں سے معذرت کرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ نانا نے بھی چند قدم آگے بڑھائے۔ اس کے ساتھ بھی اس کے دو آدمی موجود تھے۔

”آداب نانا!“ فاروق نے اس کے قریب پہنچ کر سر کو ذرا سا خم کر کے کہا۔

”جیتا رہے فاروق استاد! تو ادھر کدھر؟ شملہ سے کب واپس آیا؟“ نانا کے چہرے اور لہجے دونوں سے حیرت نیک رہی تھی۔

”ابھی ابھی آیا ہوں۔ ٹرین سے اتر کر اڑے جانے کے لیے ٹیکسی ہی دیکھ رہا تھا کہ آپ لوگوں پر نظر پڑ گئی۔ میرے ساتھ میرے مہمان بھی ہیں۔ یہ اکبر ہے اور یہ موہن داس۔ اسے تو شاید آپ پہچانتے ہی ہوں۔ چند ہی گڑھ کے دادا کپل داس کا بھی بیٹا ہے۔“ فاروق نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کا بھی تعارف کروایا۔

”ارے ہاں، یہ تو اپنا منو ہے۔ اپنے کو دور سے دیکھی ہوئی صورت تو لگ رہی تھی پر خیال نہیں تھا کہ یہ ادھر بمبئی میں دکھائی دے گا۔“ نانا نے منو کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے اسے جھکنے سے روکا۔ منو جو احتراماً اس

فاروق نے بمبئی کی سرزمین پر قدم رکھا تو جو ایٹ اس وقت تک وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ بڑی چاہ سے اور بہت جدوجہد کے بعد دوبارہ بمبئی لوٹنے والے فاروق نے بمبئی کی فضا میں پہلی سانس لی تو جیسے ہوانے اسے بتا دیا کہ یہاں کوئی کمی سی ہے۔ اسے بمبئی وہ بمبئی نہیں لگا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بمبئی کی دھوئیں اور آلودگی سے پھری فضا میں بھی اسے جو ایک مسحور کن سی مہک محسوس ہوتی تھی، آج وہ مہک ناپید تھی۔ اپنے اس احساس کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھ کر وہ نہایت پھرتی سے اپنی ذمے داریاں نبھانے لگا۔ سب سے پہلے اس نے ایک ٹیکسی کیتھرائن کے لیے بک کی۔ اس کا ان لوگوں کے ساتھ اڑے جانا مناسب تھا نہ ضروری۔ اس لیے اس نے اسے اسٹیشن سے ہی براہ راست اس کے ہاسٹل روانہ کر دینا مناسب سمجھا اور کیتھرائن کے انکار کے باوجود ہمارے لیے گولو کو بھی ساتھ روانہ کر دیا۔ گولو سیدھا سادہ اور تھوڑا کم عقل ضرور تھا لیکن اس لائق بہر حال تھا کہ کیتھرائن کو اس کے ہاسٹل چھوڑنے کے بعد خود واپس اڑے تک پہنچ سکتا۔ ان دونوں کی روانگی کے بعد وہ دوسری ٹیکسی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ نانا پر نظر پڑ گئی۔ نانا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اب ادب کا تقاضا تھا کہ وہ نانا سے سلام دعا

کے الفاظ چونکا دیئے والے تھے۔ فاروق کو لگا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے نانا کی طرف غور سے دیکھا۔

”ایسے ادھر اسٹیشن پر تیرا زیادہ دیر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تو اپنے ساتھ چل پھر ساری تفصیل بھی ہو جائے گی۔“ نانا کے کچھ میں شدید اصرار تھا۔ دل میں تشویش محسوس کرتا وہ مزید انکار نہیں کر سکا۔ نانا کے گرگے اس عرصے میں ٹیکسیاں رکوا چکے تھے۔ ایک ٹیکسی میں اکبر، منو اور نانا کا ایک ساتھی سوار ہوئے، دوسری میں فاروق، نانا اور نانا کا دوسرا گرگا بیٹھا اور سفر شروع ہوا۔ نانا اسے بتانے لگا کہ وہ اپنے کسی مہمان کو رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ پھر اس نے فاروق سے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرنے کے ساتھ ہی شملہ میں اس کے قیام کے حوالے سے بھی سوال جواب شروع کر دیے۔ فاروق بے دلی سے ان سوالات کے جواب دیتا رہا۔ اسے اس بات کو جاننے کی بے چینی تھی جس کی وجہ سے نانا نے اسے اس کے اڈے کی طرف نہیں جانے دیا تھا اور اصرار کر کے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کروا رہا تھا لیکن نانا شاید ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں کوئی بات زبان سے نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ ان ڈرائیوروں وغیرہ کا کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض پولیس کے مخبر بھی نکل آتے تھے اس لیے احتیاط ہی بہتر تھی۔

اڈے پہنچ کر بھی نانا نے کوئی بات کرنے کے بجائے ان لوگوں کو نہادھو کر لے بے سفر کی گرداتارنے کا مشورہ دیا اور خود کہیں اور مصروف ہو گیا۔ ناچار فاروق کو اس کے مشورے پر عمل کرنا پڑا۔ نہا کر لباس تبدیل کرنے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑا اور جسم کھلتا ہوا محسوس ہوا لیکن دل پر عجیب بے چینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ نانا کا رویہ غیر معمولی تھا۔ اس کا فاروق اور اس کے ساتھیوں کو اسٹیشن سے براہ راست اپنے پاڑے پر لے آنا بے وجہ نہیں تھا۔ فاروق اس کے اور رہن کے درمیان موجود اعتماد اور اعتبار سے واقف تھا۔ اس لیے اس کی مان کر یہاں تک آنے میں زیادہ تاثر بھی نہیں کیا تھا اور اب بھی اس کی ہر بات مانتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ نہادھو کر تازہ دم ہوئے تو انہیں سچے ہوئے دسترخوان پر لا بٹھایا گیا۔ مختصر سی مدت میں بھی خاصا اہتمام کر دیا گیا تھا اور خیال رکھا گیا تھا کہ سبزی خوروں کے علاوہ گوشت خور افراد بھی اپنی پسند کے مطابق بھوجن کر سکیں۔ نانا کے پاڑے کی انتظامی خوبی کو فاروق پہلے بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ جن دنوں میں ان کا مجوداد سے اختلاف شروع ہوا تھا اور کشیدگی خاصی بڑھ گئی تھی، تب نانا نے

کے پاؤں چھونے جا رہا تھا، دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد خاموش کھڑا ہو گیا۔ چندی گڑھ میں اگرچہ اس کے نام کا سکھ چلتا تھا اور عام لوگ منو پہلوان کے نام سے کاہتے تھے لیکن فاروق نے دیکھا تھا کہ وہ بزرگوں کا احترام کرنے والا جوان ہے۔ جب وہ لوگ چندی گڑھ میں اس کے اڈے پر گئے تھے تو اس نے رہن کو بھی بڑی عزت دی تھی اور نانا تو تھا ہی اس کے چاچا کپل داس کا قریبی دوست۔ اس کے احترام میں تو وہ بالکل بھی کی نہیں کر سکتا تھا اسی لیے فاروق کے پیچھے خود سے اس کے قریب چلا آیا تھا۔

”لگتا ہے تیرے چاچا نے تیری بمبئی دیکھنے کی اچھا پوری کرنے کے لیے تجھے یہاں بھیجا ہے۔“ نانا نے منو کو چھیڑنے کے انداز میں اس سے کہا۔

”سب فاروق بھائی کی کرپا ہے۔ یہ بولے تو چاچا روک نہیں سکا۔ ورنہ تسی جاندے ہو کہ چاچا مینو ایسے چھڈنے والا نہیں تھا۔“ منو نے دانت نکال کر اس کی بات کا جواب دیا۔

”کیسا ہے تیرا چاچا۔ اب تو اور بھی پتلا ہو گیا ہوگا۔ پہلے ہی ٹڈی پہلوان تھا۔“ نانا نے بے تکلف دوست کے انداز میں کپل داس کی خیریت دریافت کی تو منو کے دانت ایک بار پھر باہر آ گئے۔

”مراد..... دو ٹیکسیاں کر لے۔ یہ لوگ بھی اپنے ساتھ اپنے اڈے چلیں گے۔“ نانا نے اچانک ہی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ موجود گرگوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

”ارے نہیں نانا۔ ابھی ہم لوگوں کو ہمارے اڈے جانے دو۔ میں نے وہاں اپنے آنے کی خبر نہیں دی تھی لیکن آپ کو دادا کا معلوم ہے، اس کو فافٹ ساری خبریں مل جاتی ہیں۔ پہلے ہی میں اس کو خبر دیے بغیر واپس لوٹا ہوں۔ اب جو سیدھا اس کے پاس نہیں پہنچوں گا تو خفا ہوگا۔“ فاروق نے فوراً ہی اس سے معذرت کرتے ہوئے ساتھ جانے سے انکار کیا۔

”نہیں ہوتا تیرا دادا نراج (ناراض)۔ وہ بمبئی میں ہے ہی نہیں تو نراج کدھر سے ہوگا۔“ نانا کی فراہم کردہ اطلاع نے فاروق کو چونکا دیا۔

”دادا بمبئی میں نہیں تو کہاں گیا ہے؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اب یہ تو اپنے کو کھیر (خبر) نہیں ہے۔ تو اپنے ساتھ اپن کے اڈے چل پھر کھل کر بات کریں گے۔“ نانا

نانا کا رویہ اس کے لیے باعث تشویش تھا اور وہ اس پر تکلف دسترخوان پر بیٹھا بھی بس وضع داری نبھانے کے لیے تھوڑا بہت ٹونگ رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اکبر کی بھی تھی۔ اس نو عمر لڑکے نے پارو کے ساتھ زندگی بتانے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ دونوں سب سے دور جا کر اپنی ایک الگ دنیا بنانے کے خواب دیکھتے تھے لیکن حالات کے جبر نے پارو سے وہ فیصلہ کروا دیا جس کا نتیجہ جدائی تھا۔ ہمیشہ کی جدائی..... اور اکبر اس تازہ زخم کی تکلیف سے نڈھال... یہ مشکل جیتا تھا۔ ایسے میں بھلا اسے اس بات سے کہاں دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کے آگے کیا کیا نعمتیں کھانے کے لیے سجی ہیں۔ ہاں منوالبتہ خوب انصاف کر رہا تھا۔ وہ پہلوانوں کے خاندان کا سپوت تھا اور اچھا کھانا اس کی کمزوری تھی۔ دسترخوان پر اگرچہ نانا نے اپنے تینوں ہی مہمانوں پر یکساں توجہ مرکوز کر رکھی تھی لیکن اس کی میزبانی سے اصل لطف منو ہی اٹھا رہا تھا۔ بہر حال کھانے کا مرحلہ بھی گزر ہی گیا اور دسترخوان سمیٹتے ہی خوشبودار سبز قبوے کی پیالیاں بھی آگئیں۔ منو اور اکبر نے قبوہ پینے سے انکار کر دیا چنانچہ نانا نے انہیں آرام کا مشورہ دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں بھجوا دیا البتہ فاروق اس کے سامنے ہی براجمان رہا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

”اپن جانتا ہے تیرے من میں کیسی کھد بد چچی ہے اوز تو جاننے کو بے چین ہے کہ اپن نے تجھے تیرے اڈے پر کیوں نہیں جانے دیا۔ اس کا کارن تھانچے۔ اپن نے کچھ جان کر تجھے وہاں نہیں جانے دیا تھا۔“ آخر کار نانا اس موضوع پر آگیا جس پر بات کرنے کے لیے فاروق بے چین تھا۔

”من وہی تو جانا چاہتا ہوں نانا! آخر ایسی کیا بات ہے کہ تم نے مجھے وہاں نہیں جانے دیا۔ وہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟“ وہ جواب تک مصلحتاً خاموش تھا، مزید چپ نہیں رہ سکا۔

”سب ٹھیک ہوتا تو کاہے کو تجھے راہ سے ہٹا کر ادھر لاتے۔ تیری طرف بڑی گڑبڑ چچی ہے۔ پولیس ہاتھ دھو کر تیرے لوگوں کے پیچھے پڑی ہے۔ ربن غائب ہے۔ رامو اور جانی کو پولیس اٹھا کر لے گئی ہے اور اڈے کی نگرانی چل رہی ہے۔ اس لیے اپن سوچا کہ تجھے اس طرف نہ ہی جانے دے تو اچھا ہے۔“ نانا نے جو اطلاعات فراہم کیں، وہ بے حد چونکا دینے والی اور تشویش ناک تھیں۔ فاروق ان اطلاعات پر اندر سے مل کر رہ گیا۔

”پر ایسا کیوں ہے؟ دادا نے تو ہمیشہ پولیس والوں

کوشش کی تھی کہ دونوں طرف کے لوگوں میں بات چیت کے ذریعے مصالحت کروادے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے پاڑے پر ایک بہت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس کی وہ دعوت حقیقتاً یاد رکھے جانے والی تھی۔ وہیں فاروق نے پہلی بار چاند بانو کے حسن کی تجلی دیکھی تھی لیکن نانا کی اتنے اہتمام سے کی گئی دعوت مجھ کے رویے کے باعث بے کار چلی گئی تھی اور نانا اپنی تمام تر کوشش کے باوجود دونوں فریقین کے درمیان مصالحت نہیں کروا سکا تھا اور پھر دشمنی کا یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تھا۔ اسی دشمنی کے باعث مجھ زمر دبائی کے کوٹھے پر فاروق کو چاند بانو کے ساتھ دیکھ کر سب سے بے ہوش ہوا تھا اور معاملہ یہاں تک بڑھا تھا کہ فاروق کو مجھ کے انگریز دوست ولیم کویر غمال بنا کر وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ گورے ولیم نے اس کی یہ حرکت معاف نہیں کی اور اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے فاروق کو تھانے میں بند کروا دیا جہاں اسے تشدد کے دوران سر پر وہ شدید چوٹ لگائی گئی جس نے ربن جیسے مضبوط اعصاب کے آدمی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ شکر یہ ہوا کہ ڈاکٹر نے صرف دواؤں سے علاج کی نوید سنا دی اور آپریشن کی نوعیت نہیں آئی۔

علاج کی غرض سے ربن نے اسے اڈے کے جھیلیوں سے دور شملہ جیسے پُر فضا مقام پر بھیج دیا جہاں خدمت کے لیے گولو اور کیتھرائن اس کے ساتھ تھے۔ فاروق کو شملہ کی خوب صورتی سے انکار نہیں تھا لیکن بمبئی سے دوری اس کے دل پر گراں بار تھی۔ وہیں اس کی بھلا سے ملاقات ہوئی۔ ابتدا میں اس نے بھلا کو اس کی معلومات اور ذہانت کی وجہ سے پسند کیا لیکن بھلا کے جذبات میں اس کے لیے بدلاؤ آگیا اور وہ امیر زادی فاروق پر اس درجے اپنا حق سمجھنے لگی کہ اس سے فلم کی شوٹنگ کے لیے وہاں آئی ہوئی چاند بانو کو فاروق کے ارد گرد دیکھنا بھی دشوار ہو گیا اور وہ دشمنی میں یہاں تک بڑھی کہ اس نے اپنے باپ کے ایک کارندے کے ذریعے چاند بانو کو ہلاک کروانے کی کوشش کی۔ کار کے حادثے میں چاند بانو کی جان تو بچ گئی لیکن اس کے چاند چہرے پر گہن لگ گیا اور زمر دبائی بھی جان سے چلی گئی۔ یہ وہ حادثہ تھا جس نے فاروق کو ربن سے باقاعدہ اجازت لیے بغیر بمبئی واپس آنے پر مجبور کر دیا اور وہ چاند بانو کو چند ہی گڑھ کے ایک اسپتال میں زیر علاج چھوڑ کر اس پر ستم ڈھانے والوں سے حساب لینے کا ارادہ دل میں لیے یہاں آ پہنچا لیکن آتے ہی اسٹیشن پر نانا سے مڈبھیڑ ہو گئی اور نانا اسے زبردستی اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔

طرح پولیس والوں کو بھی پتا ہوگا کہ تو اور گولور بن کے چبیتے ہیں۔ ربن کو اس کی کھوہ سے باہر نکالنے کے لیے پولیس تم دونوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔“ نانا نے اسے اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو کیا اس ڈر سے میں یہاں منہ چھپا کر بیٹھا رہوں اور وہاں میرے ساتھیوں کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔“ فاروق اس لیے بھی زیادہ بلبلا رہا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اس سارے ہنگامے کا سبب اس کی ذات ہے۔ اس کا انتقام لینے کے لیے ہی ربن نے اتنا خطرناک قدم اٹھایا تھا کہ سارے اڈے کی سلامتی داؤ پر لگ گئی تھی۔

”جوش سے نہیں ہوش سے کام لے فاروق استاد۔ اپنا تیرے کو منہ چھپانے کا نہیں بولتا ہے۔ اپن بس اتنا بول رہا ہے کہ تو یہاں رہ کر تھوڑا سکون سے سوچ اور پھر جو کرنا ہے کر۔ اپن ربن کی دوستی کی خاطر ہر طرح سے تیرا ساتھ دے گا۔“ نانا نے اس بار قدرے درشت لہجے میں اسے سمجھایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے رویے سے مسلسل نانا کے خلوص کی توہین کر رہا ہے۔ نانا نے جو کچھ کیا تھا، اس کے بھلے کے لیے کیا تھا۔ اگر وہ اسٹیشن سے اسے پاڑے پر نہ لے آتا تو وہ لاعلمی میں سیدھا اڈے پہنچ کر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ وہ بھی اس حال میں کہ اس کے ساتھ اس کے دو مہمان بھی تھے۔ پولیس کا کیا بھروسہ تھا کہ وہ اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے ان مہمانوں کو بھی گرفتار کر لیتی۔

”معاف کرنا نانا۔ میں تھوڑا جذباتی ہو گیا تھا۔ تم نے واقعی بڑی مہربانی کی کہ ہمیں سیدھا اڈے پر نہیں جانے دیا۔“ غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی اور فوراً نانا سے معذرت کر لی۔

”کوئی بات نہیں ہے بچے۔ مافی وافی کیسی۔ اپنی بات تیرے متھے میں آگئی ہے بس اتنا کافی ہے۔“ نانا مسکرایا اور اس کے شانے پر چھکی دیتے ہوئے بولا۔ ”جا اب تو بھی جا کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔ پھر سوچنا کہ کیا کرنا ہے۔ اپن تیرا ساتھ دینے کو یہاں بیٹھا ہے۔“ فاروق نے اس کے اس تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک آدمی کی راہنمائی میں اس کمرے میں پہنچا جہاں ان لوگوں کے رکنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ منو اور اکبر پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ منو تو شکم سیری کے بعد گہری نیند سو رہا تھا البتہ اکبر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ فاروق کے اندر داخل ہونے پر اس نے آنکھیں کھول کر ذرا سی دیر اس کی طرف دیکھا اور پھر بنا کوئی سوال کیے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اصل

سے بہت بنا کر رکھی ہے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اڈا جلانے کے لیے پولیس والوں سے بنا کر ہی رکھنی پڑتی ہے لیکن ابھی چکر کچھ اور ہے۔ سنا ہے پولیس کی ڈوریں بھی بہت اوپر سے ہلائی جا رہی ہیں۔ کسی انگریز افسر کا لفظ سننے میں آیا ہے۔ تھوڑے دن پیچھے وہ افسر ایک اسپتال کے سامنے زخمی اور بے ہوش حالت میں پڑا ملا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی جان تو بچائی لیکن سر کی چوٹ کے کارن اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔ اپنے کو نہیں معلوم کہ کیسے؟ پر پولیس کو شک ہے کہ انگریز افسر کو ربن دادا نے اغوا کر کے تشدد کیا تھا۔ اب وہ ربن کو مانگتی ہے پر ربن غائب ہے اور دوسروں کی کجی آئی ہوئی ہے۔“ نانا نے اپنے پاس موجود معلومات سے اسے آگاہ کیا جس پر فاروق دنگ رہ گیا۔ نانا نے انگریز افسر کا نام نہیں لیا تھا لیکن خود اسے حساب کتاب جوڑنے میں ذرا دشواری پیش نہیں آئی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ ربن کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بننے والا گورا افسر ولیم ہوگا۔ ولیم کی وجہ سے اسے ایک خطرناک چوٹ آئی تھی اور ربن اپنے لاڈلے کو ایسی تکلیف دینے والے کو معاف کرنے والا نہیں تھا لیکن اس کے اس جذباتی عمل نے خاصی پاپل مچادی تھی اور سب سے بڑھ کر حیران کن بات تو یہ تھی کہ وہ خود منظر سے غائب تھا۔ ربن جسے اپنے ایک ایک آدمی کا بے حد خیال رہتا تھا ان حالات میں خود اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا ہو، یہ بات حلق سے اترتی نہیں تھی لیکن وہ غائب تھا اور یہ بات فاروق کے لیے سب سے زیادہ پریشانی والی تھی۔ رامو کی گرفتاری پر بھی اسے تشویش تھی۔ ربن نہ ہو تو پیچھے وہ سارے معاملات سنبھال لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں تھا تو جانے اڈے پر سب کا کیا حال ہوگا۔ وہ سارے کے سارے تو اندر سے بکھر کر رہ گئے ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کا خیال آنے پر وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

”مجھے فوراً اڈے پہنچنا چاہیے۔ میرے وہاں پہنچنے سے ان لوگوں کو ڈھارس ملے گی۔“

”ذرا سنبھل کر لونڈے۔ آرام سے ادھر بیٹھ اور جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر کر۔“ نانا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور دوبارہ اپنے ساتھ بیٹھا لیا۔

”اڈے جاؤں گا تو ہی کچھ کروں گا نا؟“ فاروق جیسے جھنجھلا گیا۔

”اپن تیرے کو بولا نا کہ ادھر پولیس نگرانی کر رہی ہے۔ تو جائے گا تو وہ فوراً تجھے چھاپ لے گی۔ بہتوں کی

ہیں جس سے باندھ کر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جانی کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ رامو نے ذرا تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کی چٹنا نہیں کرو۔ یہ بھی تھوڑے سے بعد ہوش میں آجائے گا۔ تم پہلے میری بات سنو۔“ سپاہی نے اس کی نگاہوں کی تشویش بھانپ لی۔

”کیا بات ہے۔ کیا بولنے کا ہے تیرے کو اپن سے؟“ رامو نے تیوری چڑھا کر اس سے پوچھا لیکن آواز بلند نہیں تھی۔

”ادھر کھیل بہت بگڑ گیا ہے دادا۔ وکرم صاحب اڈے کے نمک کو بھول کر گوروں کو خوش کرنے کے چکر میں ہے۔ گوروں نے اسے پر مشن کا لالچ دیا ہے اس لیے وہ کسی بھی حال میں رین دادا کو گرفتار کرنے کو مانگتا ہے۔ ابھی اس نے تم کو شیشے میں اتار کر دادا کا پتا جاننے کا سوچا ہے۔ اپن نے اڈے کا نمک کھایا ہے اور اپنے پردادا کا بڑا احسان ہے اس لیے تم کو یہ سب بتا رہا ہے، پر ابھی اپن کو سرکاری نوکری بھی نبھانے کی ہے۔ وکرم صاحب نے اپنے کو بولا ہے کہ تمہارا مرہم پٹی کر کے ایک دم فرسٹ کلاس کھانا کھلاؤ پھر اس کے سامنے لے کر آؤ تو اپن ابھی یہ کرنے کا ہے۔ آگے تم کو جو کرنا ہے تمہاری مرضی۔ اپن اپنا فرض ادا کرو یا۔“

وہ سپاہی رامو کی رسیاں کھولتے ہوئے مسلسل دھبی آواز میں اس سے کہتا جا رہا تھا۔ رامو نے اس کی بات توجہ سے سنی اور پھر ستون سے بندھے جانی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”اسے کاہے کو نہیں کھولتا ہے؟“

”اس کے لیے آرڈر نہیں ہے دادا!“ سپاہی نے انکساری سے اطلاع دی۔

”اس کے لیے آرڈر نہیں ہے تو پھر اپنے کو بھی دوبارہ باندھ دے۔ نہیں چاہیے کوئی مرہم پٹی اور کھانا پیتا۔“ رامو نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تو سپاہی مزید کوئی بات کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تک رامو، جانی کو ہلا جلا کر اور آواز دے کر ہوش میں لا چکا تھا۔

”خوش ہو جاؤ دادا! وکرم صاحب نے اس کے لیے بھی پر مشن دے دیا ہے۔“ وہ جانی کی رسیاں بھی کھولنے لگا۔ ساتھ ساتھ تبصرہ کیا۔ ”اپن نے تم کو بولا ہے تاکہ وکرم کو کسی بھی حال میں دادا کا پتا جانتا ہے۔ ابھی وہ تمہاری مان کر اپنی منوانے کی سوچ رہا ہے۔“ رامو نے اس کی بات سنی لیکن تبصرہ نہیں کیا۔ جانی کو کھولنے کے بعد اس نے اپنے کسی

میں وہ ابھی تک شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ پارو کی جدائی اس کے لیے ایسا صدمہ ثابت ہوئی تھی کہ وہ ساری دنیا یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی لاتعلقی نظر آ رہا تھا۔ آدمی کا انگلیوں بھر اڈل خالی ہو جائے تو وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ عام حالات ہوتے تو فاروق اس دھکی لڑکے کو اس کے دکھ سے نکالنے کے لیے اقدامات کی کوشش کرتا لیکن ابھی تو اسے سب سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی پڑی تھی اور وہ اس معاملے سے ہٹ کر کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ رین کا غیاب، رامو کی گرفتاری اور اڈے کی نگرانی معمولی باتیں نہیں تھیں اور ان برے حالات میں بس ایک ہی حوصلہ افزا بات تھی کہ نانا ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا لیکن یہ عمل خود نانا کے لیے بھی تو نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔ پولیس اپنے مجرموں سے تعاون کے الزام میں نانا کو بھی عذاب کا شکار بنا سکتی تھی۔ فاروق جوں جوں اس حوالے سے سوچتا گیا، اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ اسے جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ ٹھکانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اڈے کے علاوہ بھی کسی دوسری پناہ گاہ میں رہ سکتا تھا۔ نانا کا پاڑا چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنے کے بعد اس نے دوسرا فیصلہ وکیل اشوک بچن سے ملنے کا کیا۔ اب اشوک بچن ہی تھا جو رامو اور جانی کی رہائی کی کوئی راہ نکال سکتا تھا۔

☆☆☆

رامو کو ہوش آیا تو اسے اپنے چہرے پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس نے زور لگا کر اپنی بوچھل آنکھوں کو کھولا۔ آنکھیں کھل جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک اسے اپنے سامنے کا منظر واضح نظر نہ آیا اور دھندلاہٹ چھائی رہی لیکن پھر یہ دھندلاہٹ چھٹنے لگی اور اس نے ایک باوردی سپاہی کو ہاتھ میں گلاس لیے اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ سمجھ گیا کہ چہرے پر گیلے پن کا احساس اس پانی کی وجہ سے ہے جو سپاہی نے اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے اوپر انڈیلا ہوگا۔ ذہن پر ذرا سا زور دینے پر وہ سپاہی کو شناخت کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی سپاہی تھا جس نے پولیس کے اڈے پر ریڈ کرنے سے قبل بہت بروقت انہیں اطلاع دے دی تھی۔

”ہوش میں آؤ رامو دادا! تمہیں ایک ضروری بات بتانی ہے۔“ رامو کو آنکھیں پھاڑے اپنی جانب دیکھتا پا کر سپاہی نے سرگوشی میں اسے پکارا۔ رامو نے اس کی پکار پر اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے تو حواس مزید بہتر کام کرنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ وہ اور جانی ابھی تک اسی ستون سے بندھے کھڑے

ہوش آگیا ہے اس لیے اپنی تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ بولو بنو گے اپنے متر؟“ سپاہی کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست تھی۔ وکرم بڑی چالاکی سے اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے دھرم کا سہارا لیا تھا کیونکہ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں زیادہ تر لوگ جذباتی ہوتے ہیں اور فوراً بہکاوے میں آجاتے ہیں۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے اسپیکٹر صاحب پر اپنا دادا ان سارے لغزشوں میں نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے اور اس کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اپنا الگ دیش بناتے ہیں یا نہیں۔ اس کے اڈے پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب برابر ہیں۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔“ رامو نے ربن کی حمایت کی۔ سپاہی کی فراہم کردہ معلومات کے بعد وہ مکمل ذہنی تیاری کے ساتھ وکرم کے سامنے آیا تھا اس لیے ایک طے شدہ حکمت عملی کے مطابق اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔

”یہ سب ڈھکوسلا اس وقت تک ہے جب تک ہم سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ اگر یہ مسئلے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے میں پھسل (کامیاب) ہو گئے تو پھر تم دیکھنا کہ تمہارا ربن دادا کیسے پیتر ابدلتا ہے۔ ابھی تو سب کو ایک نظر سے دیکھنا اس کی مجبوری ہے۔ الگ دیش بن گیا تو وہ صرف اپنے دھرم کے لوگوں کو پوچھے گا۔ اپنے کو ان مسلوں کا اچھی طرح پتا ہے۔ یہ سب اپنے دھرم اور قوم کے ہوتے ہیں۔“ وکرم اپنے دل میں موجود مسلمانوں کے لیے زہر کو اگلے ہوئے رامو کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور رامویوں اس کی باتوں کو سن رہا تھا جیسے وہ اس پر اثر انداز ہو رہی ہوں۔ وکرم کو لگا کہ لوہا گرم ہے اس لیے اس نے ایک اور چوٹ لگانے کی کوشش کی اور لہجے میں بڑی نرمی اور محبت سمو کر بولا۔

”دیکھ بھائی رام داس! اپنے کو بھی ان مسلوں سے شکشا لینی چاہیے اور سب چھوڑ کر اپنے دھرم اور جاتی کے لوگوں کا بھلا سوچنا چاہیے جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں تیرا بھلا۔ سچ بولو تو ربن دادا کو پکڑوانے میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ ذرا سوچ، دادا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا تو اس کی جگہ تیرے سوا گدی پر بیٹھنے والا کون ہوگا۔ اپنے کو پتا ہے کہ اب بھی ساری دیکھ ریکھ تو کرتا ہے اور سکر ربن دادا کے نام کا چلتا ہے۔ تو نکل اس مسئلے کی غلامی سے اور سنبھال لے اڈا چوکی۔“ اس نے رامو کو لالچ دیا تو رامو بھی اپنی

ساتھی کو آواز دے کر اندر بلایا۔ ان دونوں نے مل کر رامو اور جانی کی مرہم پٹی کی۔ اس کے بعد واقعی انہیں عمدہ کھانا کھلایا گیا۔ کھانے کے بعد جانی تو وہیں رہا البتہ رامو کو وہ لوگ وکرم کے سامنے لے گئے۔

”آؤ آؤ رام داس! بیٹھو، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ وکرم نے بڑے جوش سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے اس کے پورے نام سے پکارا جو رامو کو خاصا اجنبی لگا۔

”کھانا دانا تو ٹھیک سے کھا لیا؟ میں نے سنتری کو بولا تھا کہ ایک دم فرسٹ کلاس کھانا کھلانے کا ہے اپنے رام داس کو۔“ وکرم کے لہجے میں ضرورت سے زیادہ جاشی تھی۔ ”ایک دم فرسٹ کلاس کھانا وہ بھی حلق تک ٹھنسیا ہے سالے نے اپنی کو۔ اپنی بولا بھی کہ یہ کیا قربانی کے جناور (جانور) کے مافق ٹھنساتا ہے اپنے کو۔ کہیں گردن کاٹنے کو تو نہیں لے جانے کا ہے اپنے کو۔ سالا ہنسنے لگا۔ بولا صاحب نے حکم دیا ہے۔ اب وہ تمہارا کیا کرتا ہے اس سے پوچھو۔“ رامو نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا جسے سن کر وکرم زور سے ہنس پڑا اور پھر بولا۔

”یہ قربانی و قربانی تو سالے مسلوں (مسلمانوں) کا کام ہے۔ اپنی ہندو جاتی میں یہ ریت کدھر ہے۔ اپنی تو شا کاہاری ہے اور معصوم جانوروں کی جان لے کر اپنا پیٹ بھرنے کا پاپ نہیں کرتا۔“ وکرم کے الفاظ پر رامو منہ چلا کر رہ گیا۔ اس کے دانتوں میں غذا کا ایک آدھ ذرہ پھنسا رہا تھا جو اس نے بائیں جانب منہ کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

”میری بات ذرا ٹھنڈے من سے سننا رام داس! اپنے کو پتا ہے کہ تمہارا اور ربن دادا کا ساتھ بہت پرانا ہے اور تمہارے من میں ربن دادا کی بڑی عزت ہے، پر اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ اب اپنے کو کسی بھی رشتے ناتے سے بڑھ کر بھارت ماتا کا سپوت بن کر سوچنے کا ہے۔ سالے مسلوں نے اتنے برس ساتھ رہنے کے بعد اپنا راستہ الگ کرنے کا سوچ لیا ہے۔ یہ اپنی بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کا طے کر چکے ہیں اور ان حالات میں ہندو جاتی کے لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ ان مسلوں کا ساتھ چھوڑ کر خود ایک ہو جائیں۔ تمہیں بھی ان حالات میں ربن کا نہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میں اور تم ایک جاتی کے لوگ ہیں اور ہمارا کام ہے کہ ایک دوسرے کا خیال کریں۔ پہلے اپنا دماغ ذرا گرم ہو گیا تھا اس لیے اپنی نے بے سوچے سمجھے تم کو اور تمہارے ساتھی کو ذرا زیادہ دھوڑالا، پرا بھی اپنی کو

آنکھوں اور چہرے پر ایسے تاثرات لے آیا جیسے وکرم کی بات اپنے دل کو لگی ہو۔

”بات تو تمہاری ایک دم ٹھیک ہے وکرم صاحب۔ اپنے منج (مغز) میں بھی آگئی ہے۔ تم ٹھیک بولتے ہو کہ انہی اپنی ہندو جاتی کے لوگوں کے لیے سوچنے کا سہ ہے۔ تم اپنے لیے سوچتا، اپنے کو بہت اچھا لگا پر تمہارا کیا فائدہ ہوگا یہ سب کر کے؟“ اس نے بڑے طریقے سے وکرم کے فائدے کا پوچھ کر خود کو ملنے والی اطلاع کی تصدیق کرنے کی کوشش کی۔

”اپنا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ اڈے کی چوکی پر اپنی جاتی (ذات) کا بندہ بیٹھ جائے گا، اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ پر موش وغیرہ مل جائے۔ انگریز اب ادھر ہندوستان سے نکلنے کو ہے۔ جاتے جاتے خوش ہو کر اپنے کو بڑا افسر بنا جائے گا تو اس میں بھی اپنی ہندو جاتی کا فائدہ ہوگا۔ اپن اپنے لوگوں کا پورا خیال رکھے گا۔“ وکرم نے تسلیم کر لیا کہ ربن کی گرفتاری میں اس کا بھی فائدہ ہے لیکن اس نے یہ بات بہت گھما پھرا کر مانی تھی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ذاتی مفاد سے زیادہ قومی مفاد میں سوچ رہا ہے۔

”تم بالکل برابر بولا انسپکٹر صاحب! اپنا من کرتا ہے کہ کسی بھی طرح ربن دادا کو پکڑ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرے پر ابھی اپن کچھ نہیں کر سکتا.....“ رامو نے یوں اپنی ہتھیلی پر مکا مارا جیسے وہ بڑی بے بسی اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو۔

”کیا مطلب؟ تو کیوں کچھ نہیں کر سکتا؟“ وکرم اس کے الفاظ پر چونکا اور تیوری چڑھا کر در یافت کیا۔

”تم مانو گے نہیں پر سچ یہی ہے کہ دادا کدھری گیا ہے، اپنے کو بول کر نہیں گیا۔ اس روز تم لوگوں نے اڈے پر چھاپا مارا تھا تو وہ جلدی میں بنا کچھ بولے بھاگ نکلا تھا اور ابھی تک اس نے اپنے سے کونٹیکٹ نہیں کیا ہے، پر یہ بات طے ہے کہ کتنی بھی دیری لگائے اس کو مڑ کر اپنے پاس ہی آنے کا ہے۔ وہ اپنے پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتا ہے اور اپن اس بات کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“ رامو بڑے طریقے سے وکرم کو ٹالنے کے ساتھ ساتھ اپنے حق میں بھی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ آیا تیرے پاس تو کیا کرے گا تو؟“ وکرم نے دریافت کیا۔

”تمہارے کو اطلاع کرے گا اور کیا کرے گا، پر وہ اپنے پاس آئے گا کیسے؟ اپن تو ادھر لاک اپ میں بند ہے

اور وہ پھنسنے کو ادھر لاک اپ میں تو آ کر نہیں ملے گا اپنے سے۔“ رامو نے موقع دیکھتے ہی مطلب کی بات کر ڈالی۔

”اسے پتا چلے کہ تو ادھر بند ہے تو تیرے کو چھڑانے کے لیے نہیں آئے گا کیا؟“ وکرم نے معنی خیز انداز میں پوچھا جس پر رامو نے دل ہی دل میں اس کی مکاری پر اسے گالی دیتے ہوئے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

”وہ ایسے بنا دیکھے بھالے آگ میں کودنے والا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے اپنے کو چھڑانے کا سوچا بھی تو چاروں کھونٹ دیکھ کر آگے بڑھے گا اور ایسے اپن کو نکال کر لے جائے گا کہ تم اپنا تھوڑا ہی دیکھتے رہ جاؤ گے۔ ابھی تو اپنے کو لگتا ہے کہ وہ بمبئی میں ہے ہی نہیں ورنہ اب تک کچھ نہ کچھ کر گزرا ہوتا۔“

”اس کا بمبئی سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ پولیس کے آدمی ہر اسٹیشن پر نگرانی کر رہے ہیں۔ اس نے ادھر کا رخ کیا تو پکڑا جائے گا۔“ وکرم نے یقین سے کہا جس پر رامو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

”تم ربن دادا کو جانتے ہی نہیں ہوا انسپکٹر۔ وہ کب کونسا بہروپ بدل کر تمہارے آدمیوں کے سامنے سے نکل گیا ہوگا، انہیں پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔“

”اوہ.....“ رامو کی بات سن کر وکرم کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے، اپن تیرے کو اس ڈیل کے ساتھ ادھر سے جانے دیتے ہیں کہ جیسے ہی ربن دادا تیرے سے کونٹیکٹ کرے گا تو اپنے کو بولے گا۔ تو اپنے سے کو آپریٹ کر کے دیکھ پھر دیکھنا کیسے اپن تیرے کو اکھا بمبئی پر راج کرواتا ہے۔ ربن کے پاس تو بس دو اڈے ہیں نا۔ اپن سے ہاتھ ملا کر تو پورے بمبئی کے اڈوں پاڑوں پر راج کرے گا..... اور ہاں، یاد رکھنا اگر دھوکا دیا تو کدھر پانی پینے کا بھی سے نہیں ملے گا ایسا ڈسے گا اپن تیرے کو۔“ اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرنے والا انسپکٹر وکرم لالچ اور دھمکی دونوں سے کام لے رہا تھا۔ اس کی چالاکی پر رامو دانت پیس کر رہ گیا لیکن بولا تو لہجے میں شیرینی تھی۔

”دھوکا کیسے دے گا اپن تمہارے کو۔ اپنے کو بھی معلوم ہے کہ پولیس سے بگاڑ کر اڈا نہیں چلتا ہے اور پھر تم تو اپنے فائدے کی ہی بات کرتے ہو اپنی کھوپڑی میں بھی منج (مغز) ہے کوئی گوبر نہیں بھرا کہ اپن اپنا پرائنٹ اور لاس کو

”اس کو ادھر ہی رہنے دو۔ اس کا تمہیں کیا کرنے کا ہے۔“
 ”نہیں انسپکٹر صاحب! اپن اسے چھوڑ کر نہیں
 جاسکتا۔ اکیلے باہر گیا تو وہ سارے حرام کے پلے جان کو
 آجائیں گے۔ اپن کی عبت (عزت) خاک میں مل جائے
 گی کہ رامو استاد اکیلا باہر آ گیا اور جانی کو چھوڑ دیا۔ اپن اس
 کے بنا باہر جانے کو نہیں مانگتا ہے۔“ وکرم کے انکار پر اس
 نے دو ٹوک لہجے میں فیصلہ سنایا تو وکرم نے کسی قدر تذبذب
 کے ساتھ جانی کی رہائی کا مژدہ بھی سنا دیا۔ جانی اور رامو
 تھانے سے باہر نکلے تو جانی تو تھوڑا حیران اور تھوڑا خوش تھا
 لیکن رامو کا ذہن تفکرات میں الجھا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا
 کہ جانے کب ربن واپس لوٹے گا اور اس سارے معاملے
 کو نمٹائے گا۔ خود اس سے جو ہو سکتا تھا، کر گزارا تھا لیکن آگے
 کے لیے اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

گندی تنگ اور پریچ گلیوں میں چلتے ہوئے فاروق کا
 دھیان اپنے اطراف کے ماحول سے زیادہ موجودہ حالات
 میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اتنے برسوں سے ربن کے ساتھ تھا۔ ان
 برسوں میں اس نے کئی بار پولیس کو اڈے پر آتے ہوئے تو
 دیکھا تھا لیکن وہ ایسے معاملات ہوتے تھے جو عموماً اڈے پر
 بیٹھے بیٹھے ہی نمٹ جاتے تھے۔ بہت ہوتا تھا تو اڈے کے
 دو چار لوگوں کی گرفتاری عمل میں آ جاتی تھی اور دو چار دن میں
 ہی ان کی واپسی بھی ہو جاتی تھی۔ ربن بہت ہاتھ پیر بجا کر کام
 کرنے والا آدمی تھا اور پولیس والوں سے بنا کر بھی رکھتا تھا
 اس لیے ان لوگوں کے لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا لیکن
 اب حالات بہت سنگین تھے۔ انسپکٹر وکرم ربن کی گرفتاری پر
 تلا بیٹھا تھا، وہ بھی اقدام قتل کے الزام میں اور اس سے بھی
 بڑی بات یہ تھی کہ ربن غائب تھا۔ فاروق نے اتنے عرصے
 کے ساتھ میں اسے کبھی خوف زدہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا
 تھا۔ وہ ہر مصیبت کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتا
 تھا پھر اب کیا ہوا تھا کہ وہ سامنے نہیں آ رہا تھا؟ یہاں تک کہ
 پولیس رامو کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ ان حالات میں وہ خود
 فوری طور پر اڈے جانا چاہتا تھا لیکن پھر تانا کی رائے صحیح لگی
 تھی کہ اڈے جا کر پھنسنے سے بہتر ہے کہ پہلے وہ دور رہ کر
 حالات کا جائزہ لے اور پھر کوئی قدم اٹھائے۔ اڈے سے
 دور رہ کر اڈے کے حالات جاننے کے لیے اس نے مناسب
 سمجھا کہ پہلے خود کسی خفیہ ٹھکانے پر جا بیٹھے اور پھر اپنے
 آدمیوں سے رابطہ کرے۔ تانا کے پاڑے پر رہ کر اس
 بیچارے کو پولیس کے عتاب کا نشانہ بنانا ٹھیک نہیں تھا۔ اکبر

نہیں سمجھے گا۔“ اس نے وکرم کو یقین دہانی کروائی کہ وہ پوری
 طرح اس کے بچھائے لالچ کے جال میں پھنس چکا ہے اور
 اب ہر حال میں اس کا ساتھ دے گا۔

”یہ تو بالکل سولہ آنے ٹھیک بات بولا ہے۔ چل
 اسی بات پر ہاتھ ملا۔“ وکرم نے رامو کی طرف اپنا ہاتھ
 بڑھایا جسے اس نے مجبوراً اٹھام لیا اور جوش کا مظاہرہ کرنے
 کے علاوہ باچھیں بھی پھیلا دیں۔

”اس دوستانے کی خوشی میں یہ تو کفرم کر دے کہ گورا
 صاحب ولیم کو ربن دادا نے ہی اغوا کر کے اس حال کو پہنچایا
 ہے۔“ وکرم نے اچانک ہی اس سے ایک نازک سوال
 کر لیا۔ یہ سوال اب تک اس کے لبوں پر نہیں آیا تھا اور
 دوران تشدد بھی وہ صرف اس سے ربن کے بارے میں
 پوچھتا رہا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ولیم کے اغوا میں ربن کا
 ہاتھ ہونے کے معاملے میں پریقین ہے اور بس اس کی
 گرفتاری چاہتا ہے۔ رامو جو اچانک سوال پر گڑبڑا گیا تھا، یہ
 نکتہ ذہن میں آنے پر سنبھل گیا اور خوشامد اندیشے میں بولا۔
 ”تم خود سمجھدار ہو صاحب! تمہارے کو کچھ نہ کچھ سن
 گن ہوگی جب ہی اتنی پچھل چائے ہو۔ اپن اپنا منہ اس
 سے کھولے گا جب تم اپنے کو کورٹ میں وعدہ معاف گواہ بنا
 کر پیش کرو گے ورنہ تو یہ منہ بند ہی اچھا ہے۔“ اس کا جواب
 سن کر وکرم ہنس پڑا اور محنت خیزی سے بولا۔

”چالاک تو تم بھی کم نہیں ہو رامو استاد۔“
 ”اتنے سال ربن دادا کے ساتھ رہ کر اتنا تو سیکھنے کا تھا
 نا۔“ رامو نے بھی ہنس کر اسے جواب دیا۔

”اچھی بات ہے، پر اس سیکھے پڑھے کو اپنے ساتھ
 استاد دیکھانے کے لیے مت استعمال کرنا۔“ وکرم کے
 انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے اپنی ضرورت کے تحت رامو
 سے سودے بازی کر تو لی ہے لیکن اس کے دل میں شکوک
 و شبہات ہیں۔ رامو نے بھی اس بات کو بھانپ لیا اور
 ناراضی سے بولا۔

”اگر وشواس نہیں ہے تو جانے دو انسپکٹر صاحب۔
 ابھی اپن تمہاری کسٹڈی میں ہی ہے۔ چاہو تو ایک بار پھر
 باندھ کر کوڑے برسا دو۔“

”ارے نہیں یار۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بس تم جاؤ۔
 اپنی طرف سے تم آزاد ہو۔“ وکرم اسے ناراض ہوتے دیکھ
 کر تھوڑا اٹیٹا یا۔

”اور وہ جو اپنے ساتھ لونڈا تھا وہ.....؟“ رامو نے
 جانی کے بارے میں دریافت کیا۔

”فاروق استاد! سدا جیتا رہے۔ کیسی طبیعت ہے اب تیری۔ مجھے بڑی دیر میں پتا چلا تیرے بارے میں ورنہ میں خیریت پوچھنے اسپتال آجاتا۔“ اچھو اسے دیکھ کر کھل اٹھا اور محبت سے بولنے لگا۔

”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں چاچا! آپ خود دیکھ لو۔“ فاروق اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔
”اللہ سدا جیتا اور ہنسا کھیلا رکھے۔ دادا کو بڑی فکر تھی تمہاری۔“ اچھو کے جواب پر وہ چونکا اور پوچھنے لگا۔
”دادا کب آیا تھا یہاں؟“

”ابھی تھوڑے دن پیچھے کی ہی بات ہے۔ مجھے زیادہ تو نہیں پتا بس اتنی خبر ہے کہ ادھر اڈے پر کچھ گڑبڑ تھی اور پولیس دادا کے پیچھے لگی تھی۔ دادا ادھر سے اپنا حلیہ بدل کر پنجاب کے لیے نکل گیا تھا۔ دادا یہاں تھا تو رامواستاد اس سے ملنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا اس لیے مجھے آگے کا کچھ پتا نہیں۔ تم شملہ سے کب لوٹے؟ کیا لوٹنے کے بعد اڈے نہیں گئے تھے؟“
اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اچھو نے بھی الجھ کر پوچھا۔

”نہیں، میں وہاں نہیں گیا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہاں گڑبڑ ہے اس لیے سیدھا وہاں جانے کے بجائے تمہاری طرف آ گیا۔ ارادہ تھا کہ انور کو اڈے بھیج کر وہاں سے کسی کو بلواؤں گا تا کہ سارے حالات کا پتا چل سکے۔ اطلاع ملی ہے کہ رامواستاد گرفتار ہو گیا ہے۔“ درمیان کی تفصیلات بتاتے بغیر اس نے اچھو کو مختصر جواب دیا جسے سن کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔

”میں ابھی انور کو بلاتا ہوں۔ پہلے تم اسے جو سمجھانا بتانا ہے بول کر اڈے بھجوادو۔ باقی کام دھام وہ واپس آ کر کر لے گا۔“ اپنی بات کہنے کے ساتھ ہی وہ ملازم لڑکے کو آوازیں دینے لگا۔

”کیا ہے چاچا۔ ابھی پراٹھے پک رہے ہیں۔ پک جائیں گے تو میں لا کر تمہیں دے دوں گا۔ اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟“ انور جو فاروق کے اس کمرے میں آنے کے بعد خود باورچی خانے میں چلا گیا تھا، ہاتھ میں نیلن پکڑے ہی وہاں چلا آیا اور جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے لگا۔

”بھاڑ میں ڈال پراٹھوں کو..... پہلے سن لے کہ اپنا فاروق استاد کیا کام بول رہا ہے؟“ اچھو نے لہجے میں رعب لانے کی کوشش کرتے ہوئے انور سے کہا تو وہ فاروق کی طرف رخ کر کے ہمتن گوش ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ فاروق

اور رامو کو البتہ اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مارے مارے پھرنے کے بجائے وہاں سکون سے رہیں۔ وہ گولو کی طرف سے بھی فکر مند تھا۔ کیہترائن کو اس کے ہاسٹل چھوڑنے کے بعد وہ اڈے پہنچا ہوگا تو فاروق اور اس کے ساتھیوں کے وہاں نہ پہنچنے پر حیران ہوا ہوگا۔ کچھ دیر وہ لوگ اس کا انتظار کرتے رہے ہوں گے پھر وہاں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہوگی کہ فاروق اور اس کے ساتھی آخر اتنی دیر ہونے کے باوجود اسٹیشن سے اڈے پر کیوں نہیں پہنچ سکے۔ وہ لوگ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں گے اور ناکامی کے بعد مزید پریشان ہوں گے۔ گولو اور جو کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہو کر انہوں نے باقاعدہ رونا دھونا مچا رکھا ہوگا۔ وہ نانا کو اس سارے چکر سے دور رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس کے اڈے سے کوئی آدمی اپنی طرف نہیں بھجوا یا تھا اور ارادہ تھا کہ اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے ہی وہاں سے بندہ بھج کر اڈے سے کسی کو بلوالے گا۔ سوچوں میں غلطیاں و پریشاں آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک لڑکا برآمد ہوا۔

”ارے فاروق بھائی تم! کیسے ہو؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی۔“ اس پر نظر پڑتے ہی لڑکا کھل اٹھا۔
”میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔“ پریشانی کے باوجود فاروق جواباً مسکرایا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”اپن بھی ایک دم فٹ کلاس ہے۔ آپ بڑے ٹائم پر آئے ہو۔ اپن آلو بھرے پراٹھے پکانے جا رہا تھا۔ ساتھ اٹی اور پودینے کی چٹنی بھی ہے۔“ اس نے فاروق کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے جوش بھرے لہجے میں بتایا۔
”تم تو کافی سکھڑ ہو جواتنا ٹیکنیکل کام بھی کر لیتے ہو۔ میرے خیال میں تو یہ پراٹھے بنانا بڑی مہارت کا کام ہے۔“ فاروق نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بس بڑے میاں کی زبان کے چٹناروں نے سکھا دیا سب کچھ۔ بیٹھے بیٹھے کچھ بھی کھانے کو من کر جاتا ہے بڑے میاں کا۔“ اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں جواب دیا اور منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

”کون ہے انور؟ کس سے باتیں کر رہا ہے تو؟“ اسی وقت اندر سے کسی نے بوڑھی، لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”میں ہوں اچھو چاچا..... آداب! طبیعت کیسی ہے؟“ فاروق فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

کچھ بولتا، بیرونی دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔
”میں دیکھتا ہوں۔“ انور ہاتھ میں ٹیلن پکڑے
پکڑے ہی باہر نکل گیا۔

”اس وقت کون آگیا؟“ اچھو بڑبڑایا۔ جواب ظاہر
ہے فاروق کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس نے سماعتیں باہر سے
آنے والی آوازوں پر مرکوز کر لیں۔ انور نے باہر
دروازے پر کیا گفتگو کی؟ یہ تو سنائی نہیں دیا لیکن اندر کی
طرف آتے قدموں کی آوازوں سے اندازہ ہو گیا کہ انور
کے ساتھ کوئی اور بھی اندر آ رہا ہے۔ آنے والے کے
بارے میں کوئی اندازہ لگایا جاسکے اس سے قبل ہی وہ ان
کے سامنے پہنچ گیا۔ سفید کرتہ شلوار میں ملبوس کھجڑی بالوں
والا وہ بارش آدمی ان کے لیے اجنبی تھا لیکن پھر بھی فاروق
نے اس کے لیے شناسائی محسوس کی اور یکدم ہی اپنی جگہ سے
کھڑا ہو گیا۔ نو وارد نے بھی فوراً اپنے بازو وا کر دیے۔
فاروق لپک کر اس کی کھلی بانہوں میں سما گیا۔ اس نے ربن
دادا کو شناخت کر لیا تھا۔

”تو نے اپنی نہیں سنی نارے! اپن کو بولے بنا ہی
واپس آگیا۔“ بڑجوش انداز میں اس نے اپنے ساتھ بھینچتے
ہوئے ربن نے خفگی کا اظہار کیا لیکن اس خفگی میں بھی شفقت
بھری ہوئی تھی۔

”مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔ آخر کب تک تم سب سے
دور رہتا۔ اب اور وہاں رہنا پڑتا تو ٹھیک ہونے کے بجائے
مزید بیمار ہو جاتا۔“ فاروق اس کے شکوے کے جواب میں
بولتا وہ ہنس دیا اور پھر ذرا چونک کر اسے خود سے الگ
کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”تو ادھر کیا کر رہا ہے؟ تیرے ساتھ کوئی دوسرا بھی
دکھائی نہیں دے رہا؟“

”تم آرام سے بیٹھو تو پھر بتاتا ہوں۔ لگتا ہے لمبے سفر
سے لوٹے ہو۔“ فاروق نے اندازہ لگایا۔

”جو بھی ہے جلدی بول۔ یہ سفر و فر اپنا کچھ نہیں
لگاڑتا۔“ ربن کھٹک گیا تھا اس لیے اس کے کہنے پر بیٹھ تو گیا
لیکن موضوع سے نہیں ہٹا ناچار فاروق نے اب تک خود کو
ملنے والی اطلاعات اس کے گوش گزار کر دیں۔ رامو کی
گرفتاری کا سن کر ربن کا چہرہ بھی سرخ پڑ گیا۔ اس نے اپنے
چہرے پر چمکی ڈاڑھی بھیج کر نکال دی اور غصے سے بولا۔
”حرام کے جنے و کرم کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔
اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔“

”آرام سے دادا۔ پہلے ہی جذبات میں بڑا نقصان

ہو گیا ہے۔“ فاروق نے اسے ٹوکا۔
”وہ بالکل الگ بات تھی۔ اس سفید چوہے نے
تیرے کو نقصان پہنچایا تھا اور اپن فائدے نقصان کا سوچنے
بیٹھ کر اس کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔“ ربن فوراً سمجھ گیا کہ فاروق
ولیم کے اغوا والے معاملے کی بات کر رہا ہے اس لیے ترنت
اس کی بات کا جواب دیا۔ فاروق آگے سے کچھ کہنے کی
ہمت نہ کر سکا۔ وہ ربن کی اپنے لیے بے تحاشا محبت سے
خوب واقف تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ آدمی چاہے کتنا ہی عقل
مند اور زیرک ہو اس کی زندگی میں کوئی ایک مقام ایسا ضرور
آتا ہے جب وہ ساری عقل و دانش بھول کر اپنے جذبات
کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر ربن نے بھی ایسا کچھ کر دیا تھا تو
یہ اتنی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ بھی ایک انسان ہی تھا اور
اسے انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں ہم وکیل اشوک بچن سے
ملاقات کریں۔ وہ رامو استاد کی رہائی کے لیے کوئی نہ کوئی
راہ ضرور نکال لے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ شخصی ضمانت سے ہی
کام چل جائے گا کیونکہ خود رامو استاد پر تو کوئی الزام ہے ہی
نہیں۔ پولیس نے صرف تمہاری بازیابی کے لیے اسے
گرفتار کیا ہے اور قانوناً اس کی کوئی تک نہیں بنتی ہے۔“
فاروق نے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے اصل موضوع پر
گفتگو کرنا مناسب سمجھا اور تجویز پیش کی۔

”ایسا کر کے دیکھ لیتے ہیں اگر پھر بھی کام نہ بنا تو اپن
اپنی گرفتاری بھی دے سکتا ہے۔ اپنے کو یہ برداشت نہیں کہ
اپنی وجہ سے کوئی دوسرا تکلیف اٹھائے۔“ ربن نے جواباً کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ ایسا کچھ کرنے کی نوبت نہیں آئے
گی۔ آدمی کے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں، اصل
بات کوشش کرنے کی ہوتی ہے۔ تم جذباتیت میں اب ایسا
کچھ اناسیدھا مت کرنا۔ وہ لوگ تمہارے خون کے پیاسے
ہو رہے ہیں۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ وکرم ایک طرف
انگریز سرکار کو خوش کرنے کی کوشش میں ہوگا تو دوسری طرف
تمہارے مسلمان ہونے کی بھی چڑ ہوگی اسے۔ اب
ہندوستان کے حالات بہت بدل گئے ہیں۔ ہندو، مسلمانوں
سے باقاعدہ دشمنی اور نفرت پر اتر آئے ہیں۔ تم انسپٹر وکرم
کو وہ آدمی نہ سمجھو جو نذرانے لے کر تمہارے پیچھے دم ہلاتا
پھرتا تھا۔“ فاروق نے ربن کے ارادے کی مخالفت کرتے
ہوئے حالات کا تجزیہ کیا۔ مطالعے اور مشاہدے نے اسے
بہت سے حقائق سے آگاہ کر دیا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا
کہ مسلمانوں کی طرف سے علیحدہ وطن کے مطالبے کے بعد

متعصب ہندوؤں کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آگئی ہے اور وہ کہیں بھی مسلمانوں کو رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔
 ”چل ٹھیک ہے۔ اب تو ہی بڑا بن کر بیٹھ جا اور سارے فیصلے کر۔ اپنی یہاں بیٹھ کر دیکھتا ہے کہ تو کیا تیر مارتا ہے۔“ ربن نے ذرا غصی کے ساتھ اس سے اتفاق کر لیا۔
 ”فاروق استاد ٹھیک بولتا ہے دادا! ابھی تم اس کی بات مان لو تو اچھا ہے۔“ اب تک خاموش بیٹھے اچھو نے بھی فاروق کی حمایت کی۔

”مان تو رہا ہوں اور کیا کروں۔“ ربن نے چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر فاروق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اچھو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور موضوع بدلے ہوئے بولا۔
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ کسی کو اڈے بھیج کر کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع بھجوا دوں۔ وہ لوگ بے چارے کم از کم اس پریشانی سے تو نکل جائیں۔“
 ”انور کا کام نمٹ گیا ہوگا۔ اسے بھیج دو۔“ اچھو نے تجویز دی۔

”ادھر پولیس کی نگرانی ہے۔ انور بدھو پولیس کو اپنے بیچھے لگا کر یہاں تک لے آئے گا۔“ ربن نے فوراً اعتراض کیا۔
 ”میں انور کو نانا کے پاڈے بھجواتا ہوں۔ وہ وہاں سے رامو کو اڈے بھجوا دے گا بلکہ اڈے بھی نہیں، غفور چاچا کے گھر چلا جائے گا رامو اور چاچا اڈے پر اطلاع کر دے گا۔ رامو پولیس والوں کے لیے انجان ہے۔ اس پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ بس اسے دور سے اپنا محلہ دکھانا ہوگا۔“
 فاروق نے حل پیش کیا۔

”یہ ٹھیک ہے، پر ایسا کر رامو کے بجائے وہ جو تو دوسرا لڑکا اپنے ساتھ لے کر آیا ہے اس سے یہ کام کروالے۔ رامو اپنے ڈیل ڈول اور چلنے سے ذرا الگ دکھائی پڑتا ہے۔ کوئی عام سائبندہ جائے گا تو پولیس کی نظر میں نہیں آئے گا۔“ ربن نے مشورہ دیا جو بالکل مناسب تھا۔ اسی وقت انور نے آکر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔
 طے پایا کہ انور بھی ان کے ساتھ ہی کھانا کھالے پھر اسے نانا کی طرف روانہ کر دیں گے۔

☆☆☆

رامو اور جانی اڈے واپس پہنچے تو سارے حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے اور چیخے چلاتے ان سے چٹ گئے لیکن رامو نے محسوس کر لیا کہ خوشی کا اظہار کرنے کے باوجود وہ اندر سے بچھے ہوئے ہیں۔

”کیا بات ہے رے! ایسے صورت کیوں لگی ہے تم

لوگوں کی؟ اپنے بیچھے کوئی اور بھی گڑبڑ ہوئی ہے کیا؟“ اس نے سب کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا، اس کی نظر گولو کے چہرے پر پڑی۔ ایک تو اس کی اڈے پر موجودگی دوسرے روز وکر متورم ہو جانے والی آنکھیں..... وہ بری طرح چونک گیا اور اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز میں ”گولو تو.....“ کے فقط دو لفظ ہی نکل سکے۔ گولو جواب تک جانے کیسے خود پر جبر کیے کھڑا تھا، رامو کے متوجہ ہوتے ہی تیر کی طرح اس کے سینے سے آکر لگا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”کیا بات رے! کیوں روتا ہے؟ شملہ سے کب واپس آیا؟ فاروق استاد کدھر ہے؟“ رامو اس کی پیٹھ سہلا کر اسے خاموش کروانے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ بے درپے سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ گولو کو اچانک اور ایسی کیفیت میں دیکھ کر وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اڈے پر آنے والی مصیبتوں میں کسی نئی مصیبت کا اضافہ ہو گیا ہے۔

”فاروق بھائی نہیں ہیں۔ ہائے میرے فاروق بھائی.....“ رونے کے دوران یہ مشکل ادا کیے گئے گولو کے ان چند الفاظ پر رامو کا کلیجا کٹنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ گولو کیا کہنا چاہتا ہے اور فاروق کا نام لے کر اتنی بری طرح کیوں رو رہا ہے۔

”پوری بات بول گولو۔ کیا ہوا ہے فاروق استاد کو۔ کدھر ہے وہ؟“ اس نے پریشانی میں گولو کو جھنجھوڑ ڈالا۔
 ”اپن بتاتا ہے استاد! تو ادھر آ گولو۔ تھوڑا پانی پلا اسے سو۔ کاہے کو اتنا پریشان ہوتا ہے۔ ابھی رامو استاد آ گیا ہے نا۔ پتا لگ جائے گا فاروق استاد کا۔“ رامون عرف مو کہلانے والے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر گولو کو سنبھالنے کی کوشش کی تو دوسرے بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ مورا مو کو بتانے لگا۔

”فاروق بھائی اپنے دو مہمانوں کے ساتھ کل بمبئی پہنچا تھا۔ اسٹیشن سے خود اڈے پہنچنے کا بول کر اس نے گولو کو سسٹر کیتی کو اس کے ہاسٹل چھوڑنے کو بھیج دیا۔ گولو سسٹر کو چھوڑ کر اڈے پہنچا تو اس نے اپن لوگ کو فاروق بھائی کا بولا۔ پہلے تھوڑی دیر اپن انتظار کیا کہ آتا ہوگا۔ رستے میں کہیں رگ گیا ہوگا پر جب نہیں آیا تو اپن تلاش شروع کر دیا۔ اسٹیشن بھی گیا۔ دوسری بھی بہت ساری جگہ دیکھا پر کچھ پتا نہیں لگا۔ تم بھی نہیں، دادا بھی نہیں۔ ابھی اپن کے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اور کیا کرے اور فاروق استاد کو

سے کوئی نہیں تھا جو رامو کے اس فیصلے سے اختلاف کرتا۔ سب نے ہی دل سے لیک کہہ دیا۔

”چل جانی! تو بھی چل اپنے ساتھ۔“ رامو جو ابھی تھانے سے آیا تھا اور جس کا جسم تھانے میں گزرے تکلیف دہ وقت کی نشانیوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی جنت میں پہنچ کر حلق میں پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں ڈال سکا تھا اور اب جانی سمیت ایک بار پھر اسی جہنم میں جانے کے لیے تیار تھا۔ ابھی وہ اڈے کے دروازے پر نہیں پہنچا تھا کہ دستک کی آواز پر سب چونک پڑے۔ سجونے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں غفور چاچا کھڑا تھا۔

”پھر بھی آنا غفور بھائی۔ ابھی اپن ایک ضروری کام سے جاتا ہے۔“ رامو نے اسے دیکھ لیا اور خلاف روایت وہیں سے اسے رخصت کرنے کی کوشش کی۔

”میں ایک ضروری اطلاع آپ لوگوں تک پہنچانے آیا ہوں۔“ غفور چاچا نے نیچی آواز میں کہا تو رامو ٹھنک گیا۔ غفور چاچا کے انداز میں کوئی خاص بات تھی اور اس نے اپنی آواز یقیناً اس لیے نیچی رکھی تھی کہ اڈے کے ارد گرد سن گن لینے کے لیے پھرتے پولیس والوں کے کان میں کچھ نہ پڑ جائے۔ عجلت میں ہونے کے باوجود رامو نے اس سے ملاقات کر لینا مناسب سمجھا اور پلٹ کر فرشی نشست سنبھال لی۔ غفور چاچا بھی اس کی دعوت پر اس کے مقابل آ بیٹھا۔ باقیوں میں سے کچھ وہیں ٹھہر گئے اور کچھ تتر بتر ہو گئے۔

”کچھ دیر ٹھہر میرے گھر اکبر نام کا ایک لڑکا ملاقات کے لیے آیا تھا۔ میں اس لڑکے کو نہیں جانتا مگر اس نے مجھے بتایا کہ فاروق استاد کا واقف کار ہے اور ان کے ساتھ ہی بمبئی آیا ہے۔ وہ فاروق استاد کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں اور ربن دادا کے ساتھ ہیں اس لیے اڈے پر کوئی ان کے لیے پریشان نہ ہو۔ وہ اور دادا مل کر حالات کو سنبھال لیں گے۔“ غفور چاچا کی اطلاع تھی کہ مژدہ جاں فزا..... وہاں موجود ہر فرد کے جسم میں گویا نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک طرف فاروق کے بخیریت ہونے کی خوش خبری تھی تو دوسری طرف اس کے دادا کے ساتھ ہونے کی خبر سن کر سب کو یہ اطمینان ہو چلا تھا کہ اب یہ بگڑے ہوئے حالات سنور جائیں گے اور اڈے کی پہلی سی بہاریں لوٹ آئیں گی۔

”کیا خبر سنائی ہے غفور بھائی۔ من کرتا ہے تمہارا منہ موتی چور کے لڈوؤں سے بھر دوں۔“

رامو جو طوعاً و کرہاً ہی اس ملاقات پر راضی ہوا تھا،

ڈھونڈنے کدھری جائے۔“ موکی اپنی آواز یہ سب بتاتے ہوئے بھرانے لگی۔ رامو کا اپنا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ فاروق کل سے بمبئی پہنچا ہوا تھا اور ابھی تک اڈے نہیں پہنچا تھا۔ آخر وہ اپنے دو عدد مہمانوں سمیت کہاں غائب ہو گیا تھا؟ یہ ایسا سوال تھا جس نے دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ رامو کا شک سب سے پہلے پولیس پر گیا۔ انسپکٹر وکرم نے اسے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر پولیس کے آدمی نگرانی کے لیے موجود ہیں۔ ایسے میں بہت ممکن تھا کہ فاروق اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اسٹیشن سے ہی پولیس اپنے ساتھ لے گئی ہو اور اس کے بعد ہی انسپکٹر وکرم نے اس سے معاملات طے کیے ہوں۔ وکرم کی فطرت کی کمیٹکی جس طرح سامنے آنے لگی تھی، اس سے کوئی بھی امید کی جاسکتی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ اس نے رامو کے ساتھ معاملات طے کرنے کے ساتھ ساتھ فاروق کو تروپ کے پتے کے طور پر سنبھال رکھا ہو کہ اگر رامو بدلنا بھی چاہے تو بدل نہ سکے۔ برق کی طرح یہ سارے خیالات ذہن سے گزرنے پر رامو کا جسم اینٹھ سا گیا اور وہ دونوں مٹھیاں پہنچ کر بولا۔

”اپنے چاتو اور دوسرے ہتھیار تیار کر لو۔ طمچوں کو بھی خفیہ خانوں سے نکال لو۔ اپن انسپکٹر وکرم سے مل کر آتا ہے۔ وہ سیدھی طرح فاروق استاد کا پتا بول دیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اپن تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“ اس کے الفاظ نے وہاں موجود ہر شخص کے جسم میں پھریری دوڑا دی۔ وہ سب بہادر اور جی دار تھے۔ لڑنا جھگڑنا، مارم باری اور مخالفین پر چڑھائی سمیت کوئی بھی کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن وہ بھی براہ راست قانون کے رکھوالوں سے متصادم نہیں ہوئے تھے۔ پولیس کے ساتھ ان کے معاملات زیادہ تر افہام و تفہیم کے ساتھ چلتے رہتے تھے۔ حوالات کی ہوا کھانے کی نوبت بھی آ جاتی تھی اور جو پکڑا جاتا تھا، وہ اپنا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں چپ چاپ سزا بھگت کر واپس آ جاتا تھا۔ جیل یا تارا کو ان کے ہاں بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی کبھی ربن نے اس سلسلے میں پولیس والوں پر بے جا دباؤ ڈالا تھا۔ ہاں، جیل میں اپنے آدمیوں کو بہترین سہولیات پہنچانے کا بندوبست وہ ضرور کروا دیتا تھا لیکن ابھی تو کوئی انہونی سی ہو گئی تھی۔ فاروق کے غائب ہونے کی خبر سنتے ہی رامو نے تا صرف یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ پولیس کی کھڈی میں ہے بلکہ تھانے پر حملے جیسے خطرناک فعل کا عندیہ بھی دے دیا تھا لیکن ان میں

ہوئی یہ اطلاع خاصی تشویش ناک تھی۔ جولیٹ چاہے اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی یا کسی نے زبردستی اسے گھر واپس آنے سے روک لیا تھا، دونوں صورتوں میں صورت حال کبھی تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ فاروق بمبئی واپس آچکا تھا۔

”تو کیا بولتا ہے جانی! تجھے کچھ اندازہ ہے کہ وہ کدھر ہوگی؟“ اڈے پر سب کو معلوم تھا کہ جولیٹ جانی کو برادر بولتی ہے اور جانی ہی تھا جو جولیٹ کی دیکھ بھال کرتا رہتا تھا اس لیے رامونے اس سے سوال کیا۔

”ابھی اپن کیا بول سکتا ہے استاد! اپن تو خود تمہارے ساتھ تھانے میں تھا۔“ جانی نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ دادا کو کیا جواب دے گا اپن کہ اس کے پیچھے سب الٹ کر رہ گیا۔“ رامو تشویش سے بڑبڑایا۔ حقیقتاً اسے ربن کو جواب دہی سے زیادہ فاروق کی فکر تھی۔ اب تک جولیٹ پر جو کچھ گزری تھی، اس سے فاروق کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اسے ان حالات کی خبر ہوئی اور ساتھ ہی جولیٹ کے غیاب کی اطلاع ملتی تو اس پر نہ جانے کیا گزرتی۔ اس کی صحت کی طرف سے مثبت اطلاعات ملنے کے باوجود وہ لوگ اب بھی اس کی طرف سے ذرا فکر مند ہی تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس کے ذہن پر کوئی دباؤ پڑے۔

”دادا اور آپ لوگوں سے جتنا بن پڑا، آپ لوگوں نے جولی کا خیال رکھا۔ آج کل آپ لوگ جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کوئی آپ سے شکوہ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ دادا بھی یقیناً آپ سے ناراض نہیں ہوں گے، آپ تسلی رکھیں۔“ غفور چاچا نے اسے تشویش میں مبتلا دیکھ کر دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”تم ٹھیک بولتے ہو غفورے بھائی۔ لو تم چائے تو پیو۔“ رامونے بے دلی سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اسے چائے کی طرف متوجہ کیا۔ چائے اور کچھ لوازمات سے سب ٹرے کچھ لمحوں پہلے سب جو خاموشی سے آکر ان کے درمیان رکھ گیا تھا۔ حالات جیسے بھی تھے، اڈے کی مہمان نوازی کی روایت قائم تھی اور اس میں بڑا ہاتھ جو کا تھا۔

”اگر جولی کے بارے میں کوئی خبر ملے تو اپنے کو ضرور بولنا۔“ غفور چاچا پر تکلف چائے پی کر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو رامو اسے ہدایت دینا نہیں بھولا۔

”ٹھیک ہے استاد۔ میں خیال رکھوں گا۔“ غفور چاچا نے اسے یقین دہانی کروائی۔ پیچھے رامو تھکا تھکا سادو بارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور سوچنے لگا، جانے کیا ہونے والا ہے جو

کھل اٹھا۔ جواب میں غفور چاچا دھیرے سے مسکرا دیا اور بولا۔ ”آپ لوگ ان مشکل حالات سے نکل آئیں، میرے اور دیگر محلے والوں کے لیے یہی کافی ہے۔ یہاں کے بگڑے ہوئے حالات پر پورے محلے کو ہی تشویش ہے۔ پہلے ہم اپنے محلے میں اڈے کی موجودگی پر گھبراتے تھے لیکن اب ہم آپ لوگوں کو اپنا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جیسے آپ ہمارے دکھ درد میں ہمارے ساتھی بنے رہے، ہم بھی ان مشکل حالات میں اپنی بساط کے مطابق آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔“ غفور چاچا اسی صاف سھرے لہجے میں رامو سے مخاطب تھے جو بمبئی کی بول چال سے میل نہیں کھاتا تھا لیکن سب چاچا کی یہ زبان سننے کے عادی تھے۔

”تم سب لوگوں کا بہت بہت دھنیو اد۔ ادھر دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے، پر یہ جو ابھی تم خبر لائے ہو یہ بھی اپنی بہت بڑی مدد کی ہے۔ اگر تم تھوڑا سا بھی لیٹ ہو جاتے تو جانے کیا کچھ ہو جاتا۔ تم بڑے سے پر آئے غفور بھائی۔“ رامونے دل سے احسان مندی کا اظہار کیا۔

”اتنا تو ہمارا فرض بنتا ہی ہے۔“ غفور چاچا ایک بار پھر مسکرایا اور بولا۔ ”مجھے تو آپ کو دیکھ کر بھی بہت خوشی ہو رہی ہے۔ خبر ملی تھی کہ پولیس آپ کو اور جانی کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی ہے۔“

”پولیس کا اور اپنا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم بولو محلے میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“ رامونے موضوع کو تالا اور بات بدلنے کے لیے سوال کیا۔

”آپ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے پر جولی کی طرف سے ذرا فکر ہو رہی ہے۔“ غفور چاچا کے جواب پر رامو چونک گیا۔

”کیوں کیا ہوا؟ کیا پھر کوئی تنگ کر رہا ہے اسے؟“ ”یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں دو دن سے اس کے گھر

کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ آخری بار للیتا موسیٰ نے اسے صبح کے وقت دفتر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ موسیٰ کا کہنا ہے کہ جولی کے کندھے پر بڑا سا پرس لٹکا ہوا تھا جس کے بارے میں اس نے موسیٰ کے پوچھنے پر یہ بتایا تھا کہ اس میں دفتر کی فائلیں اور کچھ اخبارات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں لیکن دو دن سے دروازے پر لگا تالا دیکھ کر شک ہو رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ کیوں اور کس لیے؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ شاید جولی نے سچ بولا ہو اور اس کے پرس میں واقعی دفتر کا سامان ہو اور ہمارے شک کے برعکس وہ پھر کسی مشکل میں پھنس گئی ہو۔“ غفور چاچا کی دی

فاروق اور ربن وکیل اشوک بچن کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اشوک ان کے معاملات سے اچھا خاصا باخبر ہی رہتا تھا۔ باقی جو کچھ اس کے علم میں لانا ضروری تھا، وہ ربن نے اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ خصوصاً مجودا سے اپنی دشمنی کی وجہ اور اس کے بعد کے حالات سے۔ سب باتیں سن کر اشوک نے بھی ان سے اتفاق کیا کہ پولیس کو ان کے پیچھے لگانے میں مجوکا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یقیناً مجو بمبئی ہی میں کہیں پولیس کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً پولیس کو ایسی معلومات فراہم کر رہا تھا جس کے بعد ربن کی گرفتاری کو ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ وجہ بہر حال جو بھی تھی، ربن کے لیے حالات مشکل ہو گئے تھے اور یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ کھلے عام بمبئی میں رہ سکے اور پہلے کی طرح اڑا چلا سکے۔ اسے دوبارہ اڈے پر بیٹھنا تھا تو اس مصیبت میں سے نکلتا تھا اور وہ لوگ ایسا ہی کوئی حل ڈھونڈنے وکیل اشوک بچن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اشوک تھوڑی دیر اس سارے معاملے پر غور کرتا رہا پھر ربن کی طرف رخ کر کے پوچھنے لگا۔

”یہ بتاؤ دادا! جن دنوں ولیم والا قصہ پیش آیا، تم ان دنوں بمبئی سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکتے ہو؟“

”یہ تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ کلکتہ، پونا، لکھنؤ بہت جگہیں ہیں جہاں اپنے یار رہتے ہیں، جس کو پولیس گئے وہ گواہی دینے آجائے گا۔“ ربن نے اعتماد سے جواب دیا۔

”بس تو پھر تم خود طے کر لو کہ تمہیں کہاں پر اپنی موجودگی ثابت کرنی ہے۔ جدہ تمہارا زیادہ بھروسہ ہے وہاں ابھی اپنا کوئی سمجھ دار بندہ بھیج کر ساری بات اچھی طرح سمجھا دو اور کہلوادو کہ ادھر سے بندہ بلاوا آنے پر فوراً کورٹ میں گواہی دینے کے لیے پہنچ جائے۔ بندہ آئے گا تو اسے کورٹ میں پیش کرنے سے پہلے میں خود بھی سب اونچ نیچ اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ ایک بار ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم واقعے کے وقت بمبئی میں تھے ہی نہیں تو پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس کیس کو جہاں تک میں سمجھا ہوں، اس سے یہی پتا لگ رہا ہے کہ پولیس کے پاس کوئی آئی ڈنس یا ثبوت وغیرہ نہیں ہے۔ وہ بس مخبری اور حالات کی وجہ سے پیدا ہونے والے شک کو لے کر تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ پولیس کے پاس تمہارے اوپر شک کرنے کے لیے صرف ایک پوائنٹ ہے کہ کیونکہ ولیم کے حکم پر فاروق کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اس لیے تم نے بدلہ لینے کے لیے ولیم

کو شکار بنایا لیکن یہ پوائنٹ ایسا ہے کہ میں عدالت میں الٹا پولیس کی وجہاں اڑا کر رکھ دوں گا۔ پولیس والوں کو جواب دینا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی لمٹ سے نکل کر کسی افسر کے کہنے پر فاروق کو غیر انسانی تشدد کا نشانہ کیوں بنایا ہے۔ آئی ایم شیور کہ جس تھانے میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہاں کا انچارج ہی ایسے کسی واقعے سے انکار کر دے گا۔ وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ اس کے تھانے میں کوئی ایسی غیر قانونی کارروائی ہوئی تھی اور جب پولیس اپنا قصور نہیں مانے گی تو تم پر شک کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔ اس سارے کھیل کو شروع کرنے اور انت (انجام) تک پہنچانے کے لیے بس تمہیں اتنا کرنا ہوگا کہ کورٹ کے سامنے پیش ہو جاؤ۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔“ اشوک بچن نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے سارے معاملے کا یوں تجزیہ کیا کہ فاروق اور ربن دونوں کو ہی احساس ہونے لگا کہ وہ پولیس کی جارحیت سے خواہ مخواہ ہی اتنے زیادہ وباؤ میں آ گئے تھے حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ ان سے زیادہ خود پولیس والوں کی پوزیشن کمزور تھی۔

”آپ کی بات سمجھ میں آئی ہے وکیل صاحب لیکن یہ جو آج کل پولیس والوں نے دادا کو مفروضہ قتلہ دے کر ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے اس کا کیا ہوگا؟ یہی کہا جائے گا کہ دال میں کچھ کالا تھا جب ہی دادا منظر سے غائب ہو گیا تھا۔“ فاروق جس کی آنکھیں اشوک کی باتیں سن کر چمکنے لگی تھیں، ذرا سے توقف کے بعد ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دادا بول سکتا ہے کہ وہ پولیس کے اڈے پر ریڈ کرنے سے پہلے ہی کہیں اور گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر اسے جیسے ہی حالات کا پتا چلا، وہ خود اپنی صفائی پیش کرنے عدالت پہنچ گیا۔“ اشوک نے چٹکی بجاتے حل پیش کر دیا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اپن بول دے گا کہ اپن چندری گڑھ گیا ہوا تھا۔ ادھر تو بھی تھا اور چاند بانو کو بھی دیکھنے کا تھا۔“ ربن نے فوراً اشوک بچن سے اتفاق کرتے ہوئے فاروق سے کہا۔

”پولیس کا وکیل اعتراض اٹھائے گا کہ اگر تم چندری گڑھ گئے تھے تو یہ بات اڈے کے لوگوں کو معلوم ہونی چاہیے تھی پھر انہوں نے پولیس کے پوچھنے پر کیوں نہیں بتائی؟“ فاروق اس معاملے کی ہر بار کی گودیکھ رہا تھا۔

”تو بول دیں گے کہ پولیس کے سلوک سے اڈے کے لوگ ڈر گئے تھے کہ جانے پولیس دادا کے ساتھ کیا کرنے والی ہے اس لیے کوئی ڈر کے مارے سچ نہیں بولا۔“

آکر چھوٹی تھی۔ اس سے محبوب کے بدن کی خوشبو نہیں محسوس ہوتی تھی۔ نہ ہی اسے اس کوپے میں جانا نصیب ہو رہا تھا جہاں اس کے محبوب سمیت وہ سب بستے تھے جو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ پھر بملا والا معاملہ بھی تھا۔ وہ بھائیہ سیٹھ کے پالتو غنڈے کنیش سے مل کر ایک بار اپنے اس شک کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ چاند بانو پر قاتلانہ حملے کا حکم دینے والی بملا ہی تھی۔ تصدیق ہو جاتی تو وہ بملا کا احتیاب کرتا لیکن ان معاملات کو چھیڑنے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی اور وہ دوسرے چکروں میں الجھ گیا تھا اور اب اسے بمبئی میں قدم رکھے پورے دو دن نہیں گزرے تھے کہ ربن نے ایک بار پھر اسے یہاں سے روانہ کرنے کی بات کر دی تھی۔

ربن اس کا حسن اور مربی تھا جسے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ حقیقتاً اس کے لیے سب سے زیادہ اہم بات ربن کا تحفظ اور اس کا خیال ہی تھا باقی سب کچھ اس کے بعد ہی آتا تھا۔ ادھر ربن کو بھی خود سے زیادہ اس کی فکر تھی۔ بھجوانے کو وہ کسی اور کو بھی کلکتہ بھجوا دیتا لیکن اسے فاروق کو کچھ دن اور بمبئی سے دور رکھنے کا بہانہ مل رہا تھا تو اسے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ اسے یہاں سے بھیج دیا جائے۔ وہ اپنے معاملات نمٹا لیتا تو فاروق کو گزرنے والے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے اور اس کے رد عمل سے نمٹنے میں آسانی رہتی۔ یہاں جو کارروائی ہوتا تھی، اس دوران میں فاروق کی موجودگی کی ضرورت نہیں تھی۔ عدالت کے معاملات تھے جنہیں اشوک بچن خود سنبھال سکتا تھا۔ اگر کسی مرحلے پر فاروق کی ضرورت محسوس بھی ہوتی تو اسے ایک تار بھیج کر بلوایا جاسکتا تھا۔

”تو نے اپنی بات کا جواب نہیں دیا۔“ ربن جو خود بھی اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا، فاروق کی خاموشی پر اسے ٹوکنے لگا۔

”جواب کیا دیتا ہے۔ تم نے کہہ دیا ہے تو میں کلکتہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔ چاہو تو ابھی نکل کھڑا ہوتا ہوں۔“ فاروق نے اسے جواب دیا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی ٹھکن تھی۔

”کیا بات ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ اگر گڑبڑ ہے تو بول۔ اپنی تیرے کو سفر پر نہیں بھجوائے گا۔“ ربن نے فوراً اس کے لہجے کو محسوس کیا۔

”یہ بات نہیں ہے دادا۔ بس بمبئی آکر بھی کسی سے ملاقات نہیں ہو سکی اور اڈے جانے کا موقع نہیں مل سکا تو دل ذرا اداس ہے۔“ فاروق نے فوراً اسے مطمئن کرنے کی

اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ اڈے کا ہر بندہ اپن پر جان چھڑکتا ہے۔“ ربن حالات کی وجہ سے وقتی طور پر دباؤ میں آ گیا تھا۔ بچنے کی راہ دکھائی دیتے ہی ایک بار پھر اس کی صلاحیتیں جاگنے لگیں۔ اشوک بچن کے اتفاق نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بالکل صحیح رخ پر سوچ رہا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ تینوں کافی دیر تک بیٹھے اس کیس کے ایک ایک پہلو پر غور کرتے رہے۔ جب ہر پہلو سے مطمئن ہو گئے تو ان کی یہ نشست برخواست ہوئی اور ربن اور فاروق نے اشوک بچن سے اجازت لی۔ وہ دونوں ہی اس وقت کسی قدر بد لے ہوئے حلیے میں تھے اور سرسری دیکھنے پر کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ربن دادا اور فاروق ہیں۔ اچھو والے ٹھکانے سے یہاں تک آنے کے لیے یوں بھی انہوں نے نیکی کا استعمال کیا تھا اس لیے کسی سے سامنا ہونے کا زیادہ امکان نہیں رہا تھا۔ واپسی کے لیے بھی انہوں نے یہی ذریعہ استعمال کیا اور راستے میں کوئی بات کرنے سے گریز کرتے رہے۔ واپس پہنچے تو انور بھی تانا کے پاڑے سے واپس آچکا تھا۔ اس نے اکبر کے ذریعے فاروق کی خیریت کی اطلاع اڈے پر پہنچانے کا کام ہو جانے کے ساتھ ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ رامو اور جانی تھانے سے آچکے ہیں۔ وہ لوگ اس سلسلے میں بھی اشوک سے بات کر کے آئے تھے اور اس نے یقین دہانی کروائی تھی کہ جب ربن عدالت کے روبرو پیش ہوگا تو رامو کی رہائی کا بھی انتظام کر لیا جائے گا۔ اب یہ مسئلہ پہلے ہی حل ہو گیا تھا تو یہ ایک مثبت اشارہ تھا اور وہ لوگ خود کو آہستہ آہستہ دباؤ سے آزاد ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ اشوک نے ربن سے کل عدالت میں پیش ہونے کی بات کی تھی۔ اس دوران میں وہ خود اپنی تیاری کر لیتا اور سارے قانونی تقاضے پورے کرنے کا انتظام کر لیتا۔

”اپن سوچ رہا ہے کہ تجھے کلکتہ بھجوا دے۔ تجھ سے زیادہ سمجھ دار اور بھروسے کے لائق اپنے نزدیک کوئی اور نہیں ہے۔ ادھر جا کر تو اڈے والوں سے معاملہ طے کر لینا اور ثریا بانو کے سسرال جا کر اس کی بھی خیر خیریت لے آنا۔ اسے بیاہنے کے بعد سے مہلت ہی نہیں ملی ہے کہ اس کا حال چال پوچھنے کے واسطے جایاتے۔“ انور نے انہیں چائے پیش کی تھی، اس چائے کو نوش کرتے ہوئے ربن نے فاروق سے یہ بات کہی تو وہ انکار نہیں کر سکا۔ اس کے ساتھ عجیب معاملہ تھا۔ اتنی مشکل سے وہ دوبارہ بمبئی واپس آنے میں کامیاب ہوا تھا لیکن آکر بھی جیسے واپس نہیں آسکا تھا۔ یہاں کی فضاؤں میں سے جیسے یکدم ہی اپنایت کا احساس اٹھ گیا تھا۔ ہوا جو اسے

لیے فاروق نے اپنے حالات کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ رامو بتاتا رہا کہ ربن کے پیچھے کیا گزری اور کس طرح اسے تھانے سے نکلنا نصیب ہوا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ پولیس والے ہنوز اڈے کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے انہیں جل دے کر یہاں آنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ باتوں باتوں میں رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے بعد ربن نے سفر کا بہانہ بنا کر فاروق کو آرام کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے جلد اپنے درمیان سے اٹھا دیا۔ انور کو اس نے کیتھی کی طرف بھیج دیا تھا کہ وہ بھی کل کے لیے تیار ہو جائے۔ اچھو کا ان کے معاملات سے تعلق نہیں تھا سو وہ بھی کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا۔ تنہائی ملی تو ربن نے رامو کو اپنے سفر کی روداد سنائی اور بتایا کہ دلدار آغا کے ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کا وہاں جانا تقریباً بے کار ہی رہا ہے۔ رامو نے اسے جولیٹ کے غائب ہونے کی اطلاع دی۔ فاروق کی موجودگی کے باعث وہ ابھی تک یہ خبر دبا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ربن نے خبر سنی تو اس کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہو گیا اور اس نے دل میں سوچا کہ اس نے فاروق کو کبھی سے باہر بھیجنے کا فیصلہ بالکل درست اور بروقت کیا تھا۔

☆☆☆

سیاہ لانگ اسکرٹ پر سیاہ سفید امتزاج کا بلاؤز پہنے، گلے میں سیاہ رنگ کا اسکارف ڈالے جولیٹ حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر اتری تو اسے دیکھ کر کوئی بھی قیاس کر سکتا تھا کہ وہ عالم سوگ میں ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی، چہرے کا حزن اور چال کی ٹھکن اس کی دلی کیفیت کی عکاس تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنا سب کچھ کھودیا تھا۔ کسی نے اپنے اختیار و طاقت کے نشے میں اس کی ہستی کو پامال کر دیا تھا اور ایسے کڑے وقت میں وہ ان دو انسانوں کے سائے سے محروم ہو گئی تھی جنہوں نے ہمیشہ اسے اپنی محبتوں کے سائے میں پناہ دی تھی۔ اتنے نازک حالات میں اس پر یہ بھیا تک انکشاف ہوا تھا کہ وہ اصل میں جوزف کی بیٹی نہیں بلکہ اپنی ماں کی ناکام محبت کی نشانی ہے۔ بے درپے خود پر بیتنے والے ان سانحات نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ حرمات نصیب ماں کی بیٹی بھی حرمات نصیب لنگی تھی اور اسے چاہئے کہ دعویٰ کرنے والا عارف مشکل وقت میں اسے سب سے پہلے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان حالات میں اس کے دل میں مایوسی، دکھ اور انتقام کے جذبات نہ پختہ تو اور کیا ہوتا۔ پہلے اسے صرف دلدار آغا سے انتقام لینا تھا،

”جیتے رہے تو ملنے کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ لوٹ کر تو آخر تجھے اڈے ہی آنا ہے۔ ہاں طبیعت گزبڑ ہو تو تکلف نہ کر۔ اپنے کو بھی خیال ہے کہ تو ابھی سفر سے لوٹا ہے اور اپن پھر دو بارہ تجھے جانے کو بولتا ہے۔“

”سفر کا کیا ہے۔ مجھے کون سا ٹیل گاڑی یا اونٹوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے جانا ہے۔ ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں چڑھوں گا اور مزے سے سوتا ہوا کلکتہ جا کر اتر دوں گا۔ اس میں بھلا کیا تکلیف ہوتی ہے۔“ فاروق نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا۔

”پھر بھی اپن کیتھی کو تیرے ساتھ بھیج دے گا۔ وہ تیرا خیال رکھے گی۔“ ربن اسے بھیج تو رہا تھا لیکن دل میں اس کی طرف سے فکر مند بھی تھا۔

”ایسا بھی کیا دادا! اگر تم کسی کو ساتھ لے جانے پر اتنا زور دے رہے ہو تو میرے ساتھ وہ جو لڑکا اکبر آیا ہے، اسے لے جاتا ہوں۔ بہت اچھا لڑکا ہے، میرا خیال رکھے گا۔“ فاروق نے متبادل تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے، اسے بھی لے جانا پر کیتھی ساتھ رہے یہ زیادہ اچھا ہے۔ وہ نرس ہے اور تیری طبیعت کو سمجھتی ہے۔“ ربن بھی کیتھی کو اس کے ساتھ بھیجنے کے خیال پر جم گیا تھا۔ ”تم تو میرے ساتھ بالکل بچوں کی طرح پیش آنے لگے ہو۔“ فاروق ناراض ہوا۔

”اپنے لیے تو بچہ ہی ہے۔ بس اپن نے کہہ دیا کہ کیتھی تیرے ساتھ جائے گی ورنہ تو یہیں بیٹھ اپن کوئی اور انتظام کر لے گا۔“ ربن نے فیصلہ سنایا۔ اسے معلوم تھا کہ فاروق ہر گز بھی پیچھے نہیں ہٹے گا اس لیے یہ دھمکی دی تھی۔

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ میں کچھ بھی بولوں تمہیں چلائی تو اپنی ہی ہے۔“ فاروق نے قدرے خشکی سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو ربن زیر لب مسکرائے لگا۔

”پھر کب نکلوں؟“ فاروق نے اس سے پوچھا۔

”آج کی رات آرام کر لے پھر چلے جانا۔“ ربن نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان مزید گفتگو نہیں ہوئی اور دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔ ایسے میں رامو کی آمد نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ وہ ربن اور فاروق دونوں ہی سے بے پناہ گرم جوشی سے ملا۔ فاروق سے ملنے ہوئے تو عالم ہی جدا تھا۔ جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو وہ آپس میں حال احوال کہنے لگے۔ فی الحال بمبئی کے حالات زیادہ اہم تھے اس

اب اس فہرست میں نواب زادہ اسد اللہ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ انتقام کا جذبہ لے کر ہی اس شہر میں وارد ہوئی تھی لیکن اسٹیشن پر اترتے ہی اس پر اداسی نے غلبہ پالیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر جوزفین کی روح حلول کر گئی ہو۔ وہ بھی تو برسوں پہلے اس شہر میں آئی تھی۔ ایک بہت کم عمر اور نا تجربہ کاری لڑکی جو دنیا میں تنہا اور حالات سے خوف زدہ تھی لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں امید بھی تھی کہ اگر اس ریاست میں اسے پناہ مل گئی تو اس کی پریشانی ختم ہو جائے گی لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا۔ وہ یہاں سے واپس گئی تھی تو پہلے سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔

جولیت محسوس کر سکتی تھی کہ جب اس کی ماں یہاں سے لوٹ رہی ہوگی تو اس ریلوے اسٹیشن کے چپے چپے نے اس کی بے قراری محسوس کی ہوگی۔ وہ یہاں سے جاتی ہوگی لیکن دل میں کہیں یہ امید چھپی بیٹھی ہوگی کہ شاید اچانک کہیں سے نواب زادہ اسد اللہ نمودار ہو جائیں اور اسے جانے سے روک لیں لیکن اس امید کے بدلے میں اس کے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں آیا ہوگا۔ بمبئی جا کر بھی اس نے اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ نواب زادہ کا انتظار کیا ہوگا لیکن وہ تو شاید بھول ہی گئے تھے کہ انہوں نے ایک نرم و نازک سی لڑکی کے دل میں اپنی محبت کا بیج بویا تھا اور اس لڑکی نے بڑی محبت سے اس بیج سے پھوٹنے والی کونپلوں کی آبیاری کی تھی۔ وہ تو اپنی محبت میں اتنی سچی تھی کہ محبت کے نام پر ہونے والے دھوکے کی نشانی کو بھی ساری زندگی اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ اگر اس کی محبت سچی نہ ہوتی تو وہ دنیا میں آنے سے قبل ہی جولیت کے وجود سے جان چھڑا سکتی تھی۔ اس نے ناصرف ایسا نہیں کیا تھا بلکہ جولیت کے لیے اپنے حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے بھی کہیں نواب زادہ کو برا نہیں کہا تھا۔ اسے کوئی الزام نہیں دیا تھا اور سارے فیصلے جولیت پر چھوڑ دیے تھے۔ یہ جولیت تھی جس نے اپنی سادہ لوح ماں کے ساتھ ہونے والے دھوکے کو محسوس کر کے اپنے دھوکے باز باپ کو اس کے کیے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے یہاں تک چلی آئی تھی۔ یہ روح کو جھلسا دینے والی آتش انتقام ہی تھی کہ جس نے زیادہ دیر تک اس کی اداسی کو اس پر حاوی نہیں ہونے دیا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نواب سلیم اللہ کی حویلی کی طرف عازم سفر ہوئی۔

تائنگے میں سوار وہ جب اس عالی شان حویلی کے پھانک کے سامنے اتری تو اسے بمبئی کے ایک تنگ محلے میں

موجود اپنا چھوٹا سا مکان یاد آیا۔ اس کو اس دنیا میں لانے کا ذمے دار شخص خود ایسی شاندار جگہ پر رہتا تھا اور وہ ایک معمولی مکان میں مل کر جوان ہوئی تھی۔ جوزف اور جوزفین کی محبت نے اگرچہ اسے کبھی اپنی کم حیثیتی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن اب تقابل کی نوبت آئی تھی تو وہ یہ سب باتیں سوچ رہی تھی۔ تائنگے سے اترنے کے بعد اس نے پھانک پر موجود دربان سے نواب سلیم اللہ یا اسد اللہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ نواب صاحبان سے ملاقات کی ہر کس و نا کس کو اجازت نہیں ملتی تھی لیکن اس لڑکی کے انداز میں کچھ ایسی تمکنت تھی کہ وہ عام لباس میں بھی خاص محسوس ہوتی تھی۔ دربان نے ذرا سے تذبذب کے بعد اندر مٹی کو اس کے بارے میں اطلاع بھجوا دی لیکن اس سے پہلے ہی وہ جولیت کو حویلی کے پھانک سے اندر بلوا چکا تھا۔ نواب صاحب تک پہنچنے سے قبل جولیت کو مٹی سے ملاقات کرنا پڑی اور اس نے اسے بھی قائل کر لیا کہ وہ نواب صاحب سے ملاقات کر سکتی ہے۔ مٹی کی اطلاع کے مطابق وہ خوش قسمت تھی کہ آج نواب صاحب کی کوئی مصروفیت نہیں تھی اور انہوں نے مٹی کے کہنے پر اسے ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔ ان سارے مراحل سے گزر کر وہ جب نواب سلیم اللہ کے روبرو پہنچنے میں کامیاب ہوئی تو اس کی آنکھوں نے بھی وہ شان و شوکت دیکھی جس سے اس کی ماں ماضی میں مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ بھی مرعوب ہو جاتی اگر اس کی رگوں میں اسی خاندان کا لہو نہ دوڑ رہا ہوتا۔ ابھی تو دل میں یہ احساس تھا کہ وہ بھی اس شان و شوکت اور مال و زر کی ایک حق دار تھی لیکن اپنا یہ حق اس لیے نہ پاسکی تھی کہ اس کا باپ اس کی ماں سے کیا گیا وعدہ وفا نہ کر سکا تھا اور یوں اس کی ولایت کے خانے میں نواب زادہ اسد اللہ کے بجائے جوزف مسیح کا نام لکھ دیا گیا تھا۔

”جی فرمائیے۔ کون ہیں آپ اور آپ کا کیا تعارف ہے؟“ بہت بوڑھے ہو چکے نواب سلیم اللہ کے روبرو کھڑی ہو کر بھی جب وہ کچھ نہ بولی تو انہوں نے خود ہی دھیرے سے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا۔ ان کے سوال کرنے پر وہ چونکی اور پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میں نواب زادہ“

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**



آخری گلاس

تویر ریاض

بہت سی مثالیں ملتی ہیں میاں بیوی کی آپس میں محبت، ذہنی ہم آہنگی اور پسند و ناپسند میں یکسانیت کی... مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ قدم قدم پر مرد کی ہرجائی فطرت دھوکا دیتی رہے اور محبتوں کا یقین بھی دلاتی رہے... فریب کا یہ شفاف منظر اس کی آنکھوں نے بھی دیکھا لیکن دل کا پاگل پن... اسے جان بوجھ کر دھوکے میں رہنے پر مائل کر رہا۔

کانچ کے گلاس اور دل ٹوٹنے کی آخری صدا کی گونج

نا کافی ہوں گے۔ اس کے والدین نے شادی کے موقع پر ایشین لیس اسٹیل کے برتنوں کا سیٹ دیا تھا جبکہ فرینک کی ماں نے آٹھ انتہائی خوب صورت ڈنر سیٹس تحفے میں دیے لیکن کسی نے بھی گلاسوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ کیتھی

وہ چھ گلاسوں کا سیٹ تھا جو انہوں نے شادی کے فوراً بعد خریدا تھا اپنی سون سے واپس آنے کے بعد پہلی ڈنر پارٹی کی تیاری کے دوران کیتھی کو خیال آیا کہ ان کے گھر میں صرف تین گلاس ہیں جو مہمانوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے

ستمبر 2016ء

107

سپینس ڈائجسٹ

کیونکہ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

”اس کی بات مت سنو جولیا۔“ فرینک نے ہلکے سے اس کا ہاتھ چھوتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو یہ واقعی خوش قسمتی کی نشانی ہے۔“

”میں ایک مرتبہ یہودیوں کے یہاں شادی میں گیا تھا۔“ برائن نے کہا۔ وہ جولیا کا شوہر اور فرینک کا برسوں پرانا دوست تھا۔ ”اسے میں کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ گلاس اس لیے توڑا جاتا ہے کہ رومیوں نے ان کی عبادت گاہیں تباہ کر دی تھیں اور انہیں یروشلم سے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس واقعے کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ یہاں تک کہ شادی کے موقع پر بھی نہیں لیکن اس نے یہ نہیں کہا کہ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

جولیا نے فرینک کو محکمائی باندھ کر دیکھا اور بولی۔

”بالکل نہیں ہوتی کیونکہ یہ درست نہیں ہے۔ بہر حال کیتھی، چکن بہت مزے دار ہے۔“

نوسال بعد ایک بار پھر کیتھی چکن میں کھڑی ڈنر کی تیاری کر رہی تھی لیکن یہ اس کے اپارٹمنٹ کا چکن نہیں تھا بلکہ اب وہ بروکلین میں ایک مشترکہ رہائش گاہ میں رہ رہی تھی۔ ایک بار پھر مسز موریل، ول، جولیا اور برائن ڈنر پر آئے تھے لیکن اب فرینک نہیں رہا تھا اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شراپ کے نشے میں دھت کار چلا رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے خودکشی سمجھتی تھی لیکن حقیقت میں وہ ایک قتل تھا۔ ایسی علامات موجود تھیں جن کی بنا پر اسے قتل کہا جاسکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو کیا وہ اس حادثے کو روک سکتی تھی۔ شاید نہیں۔

اس نے کپ بورڈ میں رکھے ہوئے آخری نیلے گلاس کو دیکھا اور اپنی جیب میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی شیشی کو ہاتھ سے چھوا اور دل ہی دل میں بولی۔ ”آج رات میں کسی کے لیے یہ خاص مشروب تیار کر کے اسی گلاس میں پیش کروں گی جو ہم دونوں نے اکٹھے خریدا تھا۔ اب میں تمہارے لیے یہی کر سکتی ہوں۔“

چکن بھونٹے ہوئے اسے یاد آیا کہ جب وہ ورجینیا جا رہے تھے تو برائن اور جولیا نے سامان پیک کرنے میں ان کی مدد کی تھی لیکن وہ دونوں بڑے بے پروا تھے۔ کیتھی دیکھ رہی تھی کہ جولیا کس طرح گلاس رکھ رہی ہے لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ جب انہوں نے منزل پر پہنچ کر سامان کھولا تو اس میں ایک نیلا گلاس ٹوٹا ہوا تھا۔

شادی کا تیسرا سال ان کے لیے بہت سخت رہا۔ مارچ میں کیتھی کے باپ کو فالج ہوا اور وہ مر گیا۔ چھ ہفتے بعد

نے فرینک سے کہا کہ وہ ڈنر کی تیاری کر رہی ہے لہذا وہ اسٹور جا کر گلاس خرید لے لیکن فرینک کا اصرار تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے تئے گھر کے لیے پہلی چیز خرید رہے ہیں لہذا وہ بھی ساتھ چلے۔ مجبوراً کیتھی کو اپنی تیاری ادھوری چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔

کیتھی نے آٹھ گلاسوں کے سیٹ کا انتخاب کیا لیکن فرینک کی نظر نیلے رنگ کے گلاسوں پر ٹھہر گئی جو بے چوکور اور نیم شفاف تھے۔

”بہت نازک ہیں۔“ کیتھی نے کہا۔

”لیکن کتنے نفیس ہیں۔“ فرینک نے کہا۔ ”میں یہی گلاس خریدنا چاہتا ہوں۔“

ڈنر کے دوران فرینک کی ماں نمک کی شیشی اٹھانا چاہ رہی تھی کہ اس کا ہاتھ گلاس سے ٹکرایا اور وہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اتنے نازک گلاس کیوں خریدے۔“ فرینک کی ماں نے اپنی پلیٹ میں نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ یہ بہت خوب صورت ہیں۔“ کیتھی گلاس کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے بولی۔ ایک کمرچی کتنے سے اس کی انگلی زخمی ہو گئی۔ اس نے خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ گلاس پسند ہیں۔“ پھر وہ کچن میں آئی اور ٹھنڈے پانی کی دھار سے خون روکنے کی کوشش کرنے لگی پھر اس نے ایک پلاسٹک کے گلاس میں پانی اور برف ڈال کر مسز موریل کے آگے رکھ دیا۔

”ممکن ہے کہ یہ ایک ٹیک شگون ہو۔“ جولیا نے کہا۔

وہ ایک پبلک ریلیشن فرم میں گرافک ڈیزائنر تھی۔ سنہرے بال، دہلی پتلی، صاف رنگت اور گہری نیلی آنکھیں۔ حسب معمول اس نے بغیر آستین اور کھلے گلے کا لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کے سڈول بازو اور جسم کے دیگر اعضا نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تمہاری حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور یونان کے لوگ شادی کے موقع پر جان بوجھ کر گلاس توڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خوش قسمتی کی علامت ہے۔“

فرینک کے بڑے بھائی نے سچ کرتے ہوئے کہا۔ ”یونانی نہیں بلکہ یہودی۔ میں نے ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ صرف ایک گلاس زمین پر گرا کر اپنے پاؤں سے کھلتا ہے لیکن خوش قسمتی کے لیے نہیں بلکہ ایک گہاوت ہے کہ تمہیں بہت زیادہ پر جوش نہیں ہونا چاہیے

تک وہاں رہے پھر موٹل واپس آ گئے۔ کچھ پُر مسرت لمحات گزارنے کے بعد فرینک گہری نیند سو گیا اور وہ باہر کھلی فضا میں آگئی۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو سگریٹ پیے اور کچھ سوچنے لگی۔

انہوں نے پہاڑ پر دو خوب صورت دن گزارے اور واپسی میں ایک بار پھر اسی موٹل میں قیام کیا۔ اس رات بوڑھے بڑے بھی ٹپس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ اوسط درجے کا گلوکار تھا لیکن گٹار بہت اچھا بجاتا تھا۔ اس رات فرینک نے کیتھی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہ بات عجیب لگے گی لیکن کیوں نہ ہم یہاں آجائیں اور یہ جگہ خرید لیں۔ تم اپنے باس کو پسند نہیں کرتیں اور میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ساری عمر بیمہ پالیسی بیچتا رہوں گا۔ ظاہر ہے کہ تمہیں ورثے میں ملنے والی دولت کو کہیں نہ کہیں استعمال کروں اور مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ تمہاری دولت کو خرچ کرنے کے بارے میں تمہیں کہوں۔“

”یہ میرا پیسا نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ہماری مشترکہ دولت ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اپنے باس کو برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی ایسے کام میں گزار دوں جسے تم پسند نہیں کرتے۔“

ایک بار پھر اس نے فرینک کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے کام سے نفرت نہیں ہے لیکن اگر ہم ٹپس کو خرید لیں تو یہ ہمارا اپنا کاروبار ہوگا اور میں بھی پر فارم کر سکوں گا۔ جانتا ہوں کہ میں کوئی راک اسٹار نہیں ہوں اور نہ ہی اچھا نغمہ نگار ہوں لیکن دوسروں کے لکھے ہوئے گانے گا کر لوگوں کو خوش تو کر سکتا ہوں۔“

وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں، یہاں کا موسم بھی اتنا سرد نہیں۔ اس لیے میں تم سے ملنے آتی رہوں گی۔“

”نہیں۔ ہم مل کر کام کریں گے۔ میں بار کا انتظام سنبھال لوں گا۔ تم کھانا پکاتا اور عملے کی نگرانی کرنا۔“

”میں کھانا نہیں بنا سکتی۔ تمہاری بات دوسری ہے۔ میں جو کچھ بنا کر میز پر رکھ دوں وہی کھا لیتے ہو لیکن تم جانتے ہو کہ میں اچھی باورچن نہیں ہوں۔“

”ہم فرانسیسی کھانوں کی بات نہیں کر رہے بلکہ جس طرح کے کھانے ایسی جگہوں پر ملتے ہیں مثلاً آلو کے چپس، بھنی ہوئی اشیا اور چکن وغیرہ۔ ویسے بھی یہ ہر لحاظ سے ایک محفوظ جگہ ہے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر

اس کی ماں پر قتل کا شدید حملہ ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔ کیتھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی مگر وہ اس کے لیے اتنا چھوڑ گئے تھے کہ وہ اور فرینک سنجیدگی سے سرمایہ کاری اور ریٹائرمنٹ اکاؤنٹس کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔ فرینک نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ اپنی مصروف زندگی میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر تھوڑی سی تفریح کی جائے۔ وہ ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا جبکہ وہ خود بھی پیشہ ور معالج تھی لیکن اب انہیں بچے کی خواہش ہو رہی تھی اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ہوائی میں تعطیلات گزار سکیں۔ بہر حال وہ اس پر متفق ہو گئے کہ کار کے ذریعے ورجینیا اور چند تاریخی مقامات کی سیر کی جائے۔

انہوں نے ایک رات موٹل میں قیام کیا اور ڈرنک کے لیے ٹپس نامی بار میں چلے گئے۔ وہاں کا ماحول بالکل دیہاتی تھا لیکن اس میں روایت پسندی نظر آرہی تھی۔ کچھ گا ہک ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر میں ہوں جبکہ قریبی کالوں اور یونیورسٹی سے آئے ہوئے طالب علم بھی اپنے فیکلٹی لائونج کے مانند آرام وہ محسوس کر رہے تھے۔ بار کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر ایک جوڑا اینجو اور وائلن پر دھنیں بکھیر رہا تھا۔ فرینک اور کیتھی نے بیئر کے ساتھ کئی کاہنا ہوا ایک منگوا یا اور فرینک ٹانگیں پھیلا کر موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اسی وقت ایک ستر سالہ شخص ان کے پاس آکر رکا اور پوچھنے لگا کہ وہ اس جگہ پر کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

”زبردست!“ فرینک نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کاش میرے پاس بوشن میں ایسی جگہ ہوتی۔“

”شاید بوشن میں تمہیں ایسی جگہ نہ ملے۔“ وہ شخص بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہم نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ تقریباً بیس سال ہو گئے ہیں۔ اب اس کام کو چھوڑتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ میں خود ہفتے میں دو بار پر فارم کرتا ہوں اور مجھے یہ پسند ہے لیکن بیوی کا کہنا ہے کہ یہ ریٹائرمنٹ کا وقت ہے۔ اب اپنے پوتوں اور نواسوں سے دل بہلاؤ۔ اگر تمہارا کوئی دوست یا رشتے دار ہے جس کے پاس سرمایہ کاری کرنے کے لیے معقول رقم ہو تو اسے فون کر دو۔“

کیتھی نے فرینک کی آنکھوں میں ایک نئی چمک دیکھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بار بند ہونے

ہے۔ چیزیں سستی اور اچھے اسکول ہیں۔ ہم ایک مکان کرائے پر لے لیں گے جس میں اتنی جگہ ہو کہ تم ایک کتا پال سکو جو تمہاری پرانی خواہش ہے۔“

انہوں نے اپنی چھٹیاں بڑھالیں۔ بڑے بات کی۔ اس کے ایجنٹ سے ملے۔ یہاں تک کہ کرائے پر رہنے کے لیے ایک مکان بھی دیکھ لیا، جس کے عقب میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں ایک کتا چھل قدمی کر سکے۔ ماسٹر بیڈ روم کے برابر میں ایک چھوٹا کمر تھا جسے ضرورت پڑنے پر بچوں کی نرسری میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

بوسن میں سب لوگوں کا خیال تھا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ ”یہ کوئی اچھا آئیڈیا نہیں ہے۔“ برائن نے کہا وہ بھی کسی دوسری کمپنی میں بیرم ایجنٹ تھا۔ ”تم بہت اچھا کمار ہے ہو اور میں چاہتا ہوں کہ میری آمدنی بھی تمہارے برابر ہو جائے۔ تم یہ سب چھوڑ کر ایک دور افتادہ بار کو خریدنے کا جو اکیس کھیل رہے ہو؟“

”تم ہمیں بہت یاد آؤ گے فرینک۔“ جولیا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ”اور کیتھی، تم تو ایک پروفیشنل ہو۔ پاور چن بن کر کیسا محسوس کرو گی؟“

”کھانا بنانا بھی ایک پیشہ ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ ”مجھے صرف اس میں بہتری لانا ہے۔“

”اوہ تو تم کھانا بناؤ گی۔“ برائن نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ کیا تم سارا دن یہ کام کر سکو گی؟“

”تم نے ساری زندگی بوسن میں گزاری ہے فرینک۔“ جولیا نے کہا۔ ”اب تم ایک چھوٹے شہر میں جا رہے ہو جو بالکل مختلف حصے میں واقع ہے۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کا رویہ کیسا ہو؟ کیا تم نئے دوست بنا سکو گے؟“

فرینک نے اپنے بھائی ول کی طرف دیکھا تو وہ

بولتا۔ ”چھوٹے بھائی۔ کوشش کر کے دیکھ لو۔ بار چلانا بہت مشکل کام ہے اور تمہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”فرینک بہت محنتی ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ ”رہنے دو کیتھی۔“ فرینک بولا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن ہم اسے شروع کرنے کے بارے میں پُر عزم ہیں۔“

”تم تو بچے پیدا کرنے کے لیے بھی پُر عزم تھے۔“ مسز موریل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ تم کبھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں تھے اور نہ ہی اب سنجیدہ ہو لیکن میں تمہیں متنبہ کر رہی ہوں کہ دوبارہ مالی مدد نہیں کروں گی۔ لہذا جب کیتھی کے پیسے ختم ہو جائیں اور تم قرضوں کے بوجھ تلے دب جاؤ تو میرے پاس روتے ہوئے مت آنا۔“

”یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے۔“ کیتھی نے گھر واپس آتے ہوئے راستے میں کہا۔ ”ول کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم محنتی نہیں ہو۔ تم نے تو کالج کے زمانے میں ہی پارٹ ٹائم ملازمت شروع کر دی تھی اور اب بھی تم اپنی کمپنی میں ٹاپ ایجنٹ ہو۔“

”جانے دو۔“ فرینک نے ونڈ اسکرین پر نظریں جہاتے ہوئے کہا۔ ”یہ محض اس کی خواہش بھی ہو سکتی ہے۔“

”نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود محنتی نہیں ہے۔ اسی لیے اپنی تعلیم پوری نہ کر سکا اور اب تک پانچ یا چھ جگہ کام کر چکا ہے۔ وہ تم سے حسد کرتا ہے۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ فرینک نے کہا۔ ”بہر حال میں اس کی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔“

”اور تمہاری ماں۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آتی۔ وہ کون سا کام ہے جو تم نے شروع کر کے مکمل نہ کیا ہو اور تم نے اس سے کب پیسے مانگے۔ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے۔“

”بچپن میں وہ یہ بات کہا کرتی تھی۔ شاید وہ مجھ سے کچھ زیادہ توقع کر رہی تھی لیکن اب مجھے ان باتوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔“

وہ لائبریریوں میں گئے اور ٹیلی ویژن شوز دیکھے تاکہ ریسٹوران کی آرٹس اور ترقیوں کے بارے میں جان سکیں۔ کیتھی نے کھانا پکانے کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ بڑی بیوی نے اسے کچھ ترکیبیں بتائی تھیں لیکن کیتھی کو کوئی ایسی خاص ڈش تیار کرنا چاہ رہی تھی جس کے لیے قرب و جوار کے قصبوں سے بھی گاہک دوڑے چلے آئیں۔

ورجینیا جانے سے پہلے اس نے کئی ترکیبیں آزمائیں اور کم

حالات بہتر ہوں اور آمدنی بڑھ جائے تو وہ ایک منیجر اور بچن میں کام کرنے کے لیے مددگار باورچی رکھ لے گی پھر انہیں اتنا زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔

فرینک کی ماں ان سے ملنے کبھی نہیں آئی۔ البتہ ول ایک مرتبہ آیا تھا۔ اس نے ہفتے کی رات بار میں گزاری اور مفت کی شراب پیتا رہا۔ اتوار کی صبح وہ دیر تک سوتا رہا اور جب کیتھی اس کے لیے کھانا بنانے آئی تو وہ واپس جا چکا تھا۔ برائے اور جولیا سال میں دو مرتبہ آتے اور ماسٹر روم کے برابر والے چھوٹے کمرے میں قیام کرتے جسے اب تنگ بچوں کی نرسری میں تبدیل ہو جانا چاہیے تھا۔

اگلی مرتبہ جب وہ آئے تو برائے مستقل اپنے باس کی شکایت کرتا رہا اور جولیا نے بتایا کہ اس کی ترقی ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے بال مزید چھوٹے کروالیے تھے اور پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ کیتھی نے نوٹ کیا کہ فرینک چوری چوری جولیا کو دیکھ رہا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اسے بھی اپنے اسٹائل میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اسے ڈانٹنگ تو لازماً شروع کر دینا چاہیے۔ ان دنوں وہ مکمل طور پر بار کے کھانوں پر انحصار کر رہی تھی اور اس کے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا کہ اسے کن چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

فرینک اور کیتھی کو یہ بار چلاتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے کہ برائے نے فون کر کے کہا کہ وہ اور جولیا ان سے ملنے آرہے ہیں۔ اس نے اصرار کر کے کہا کہ وہ جمعے کی شب انہیں کیتھی کے پسندیدہ ریسٹورانٹ میں ڈنر کروائے گا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے فرینک سے کہا۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اس باس سے ٹگ آچکا ہوں اور اپنی علیحدہ ایجنسی شروع کر رہا ہوں۔“

”یہ تمہارے لیے اچھا رہے گا۔“ فرینک نے کہا۔

”اپنا کاروبار کرنا مشکل ضرور ہے لیکن آگے چل کر فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے جولیا؟“

”یقیناً!“ وہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”برائے کے پاس بہت اچھے آئیڈیاز ہیں۔“

برائے نے اپنی نظریں فرینک کے چہرے پر جمائیں اور بولا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کام کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو اونچے درجے کا سلیزمن ہو اور میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا مجھے ایسا ساتھی چاہیے جو اس ایجنسی میں سرمایہ لگا سکے۔ میں کام شروع کرنے کے لیے نصف سے زیادہ رقم کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں

از کم چار خاص ڈشیں تیار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ انہوں نے دو ہفتے کے لیے ٹپس کو بند رکھا اور اس کی ازسرنو ترتین و آرائش کے لیے ایک ٹھیکے دار کی خدمات حاصل کیں۔ اس کام میں بجٹ سے کچھ زیادہ ہی خرچ ہو گیا لیکن اس کا دوبارہ افتتاح بہت کامیاب رہا۔ فرینک نے افتتاحی تقریب کے لیے مقامی بینڈ کی خدمات حاصل کی تھیں اور خود بھی ایک گانا گایا، جب گانا ختم ہوا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ کیتھی نے دیکھا کہ اس کا چہرہ شرم، خوشی اور حیرت سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہم نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔

اگلے تین سال بہت اچھے گزرے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لوگوں کو ریسٹوران کا نیا روپ، فرینک کی موسیقی اور کیتھی کی بنائی ہوئی ڈشیں پسند آرہی تھیں۔ اس نے ایک مخصوص مشروب بھی متعارف کروایا تھا جو لیسن جوس، سرکہ اور رم پر مشتمل تھا۔ اب وہ صبح اٹھ کر درجنوں آلو کائی اور کئی گیلن مشروب بناتی لیکن فرینک کی خوشی کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔

فرینک کافی مطمئن تھا۔ پہلے چھ مہینے کچھ سخت تھے۔ انہیں اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑ رہا تھا پھر حالات بہتر ہونا شروع ہوئے۔ گاہکوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ہر ویک اینڈ پر کالج کے طلباء مخصوص ڈش اور مشروب سے لطف اندوز ہونے کے لیے آنے لگے۔ فرینک نے ہفتے میں ایک بار موسیقی کی محفل سجانا شروع کر دی جس میں قرب و جوار کے قصبوں سے آنے والے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے کئی ایک مستقل گاہک بن گئے۔ پہلا سال ختم ہونے سے پہلے انہیں اتنی آمدنی ہونے لگی کہ اس میں سے اپنی تنخواہ نکال سکیں۔

ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ کیتھی علی الصبح بچن میں جا کر کھانے کی تیاری کرتی کیونکہ دوپہر میں بھی کچھ لوگ لنچ کے لیے آتے تھے۔ فرینک سہ پہر میں آتا اور ان کی کوشش ہوتی کہ پی پی آر شروع ہونے سے پہلے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکیں۔ وہ کچھ دیر آرام کرتی اور رات میں جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تو وہ اسے سننے کے لیے دوبارہ آ جاتی، فرینک ریسٹوران بند کر کے گھر آتا اور دو چار باتیں کرنے کے بعد سو جاتا۔

انہوں نے بچوں کے بارے میں گفتگو کرنا چھوڑ دی تھی اور نہ ہی انہیں کتا پالنے کا خیال آیا۔ فی الحال یہ دونوں باتیں ممکن نہیں تھیں۔ کیتھی سوچتی تھی کہ ملک کے معاشی

کیونکہ اس خاص ڈش کی خفیہ ترکیب چرانا چاہتا ہوں۔“
 ”یہ اتنی خفیہ بھی نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے
 بولی۔ ”میں لکھ کر دے دوں گی۔ فریک کا خیال ہے کہ تم
 تینوں آج جنہرں کا مشہور جنگل دیکھنے جاؤ۔ کیا تم پہلے کبھی
 وہاں گئے ہو؟“

”تمہیں پتا ہے مجھے درختوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔
 فریک اور جولیا چلے جائیں گے۔“ اس نے جوس کا گلاس
 میز پر رکھا اور ہک پر لٹکا ہوا فرانگ پین اتارتے ہوئے
 بولا۔ ”میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں تاکہ
 تمہیں اپنے منصوبے کے بارے میں قائل کر سکوں۔ اگر تم
 نے کہہ دیا کہ واپس بوٹن جانا چاہتی ہو تو فریک اس پر عمل
 کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائے گا۔“

اس نے بے دھیانی میں اپنا بازو گھمایا اور فرانگ
 پین کی ٹکڑ سے میز پر رکھا ہوا گلاس زمین پر گر کر چکنا چور
 ہو گیا۔ اس نے وہ جگہ صاف کی اور ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
 سمیٹتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا۔ غالباً یہ تمہارے خاص
 گلاسوں میں سے تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے کہا اور دل میں سوچتے
 لگی کہ یہ تیسرا گلاس تھا جو ٹوٹ گیا پھر بولی۔ ”مجھے قائل
 کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف فریک کو خوش دیکھنا
 چاہتی ہوں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”چلو اسی
 پر بات کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔“

وہ اصرار کر کے اس کے ساتھ ٹپس گیا اور اس نے پورا
 دن کیتھی کی مدد کرنے اور دن میں آنے والے گاہکوں کو اسٹینڈ
 کرنے میں گزارا۔ فریک اور جولیا کی واپسی سہ پہر کے
 بعد ہوئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ غالباً جولیا کو جنگل پسند
 نہیں آیا۔ اس رات فریک نے غضب کی پر فارمنس دی
 اور لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے رہے۔ کیتھی نے سوچا
 کہ وہ کبھی یہ کام نہیں چھوڑے گا۔ بوٹن جانے کا تو سوال ہی
 پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن انہیں ایسا کرنا پڑا۔ اگلی اتوار کو وہ کچن ٹیبل پر بیٹھے
 حساب کتاب کر رہے تھے جس سے یہ بات سامنے آئی کہ ٹپس
 کو چلانے کا مطلب جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ اگر معیشت بہتر
 رہی تو آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں
 حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔

”لیکن اگر میں برائن کی پیشکش قبول کر لوں۔“
 فریک نے کہا۔ ”تو میں اور وہ مل کر بہت کم وقت میں بڑا

تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم صرف ایک بہترین سیلز مین ہی
 نہیں بلکہ میرے بہترین دوست بھی ہو۔ میں تمہارے ساتھ
 کاروبار شروع کرنے سے بہتر کسی اور بات کا تصور نہیں
 کر سکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

حیرت زدہ کیتھی نے برائن کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ منجمد
 ہو کر رہ گیا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ جان سکی۔
 اس نے برائن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم چاہتے ہو کہ
 ہم یہ جگہ بیچ کر تمہاری انشورنس ایجنسی میں پیسہ لگا دیں لیکن
 ہم اپنا سب کچھ اس پر خرچ کر چکے ہیں اور ہم نے اسے
 کامیاب بنانے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔“

برائن منہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”جانتا ہوں۔ تم نے
 بہت بڑا کام کیا ہے لیکن کیا تم واقعی کامیاب ہو رہے تم دونوں
 دن رات کام کر کے برائے نام منافع کما رہے ہو اور اگر
 معیشت نیچے آئی تو تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر اس
 وقت بیچ دو گے تو شرط یہ کہتا ہوں کہ اچھی قیمت مل جائے گی
 اور تم ایسا کام شروع کر سکو گے جس میں حقیقی کامیابی کے
 امکانات ہوں۔“

ایک بار پھر کیتھی نے فریک کی طرف دیکھا۔ اس
 نے جواب میں سر ہلایا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔

”تم نے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اپنا
 سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔“ برائن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے
 بولا۔ ”اور تم تین سال سے اس خواب کے سہارے زندہ
 ہو۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر تمہیں اس کی تعبیر مل جائے لیکن
 اس وقت تمہیں وہ کام کرنا ہے جو تم چاہتے ہو۔ کیتھی کے
 ساتھ مخلص ہونے کا کیا بہترین طریقہ ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم
 ہے کہ وہ بیچ چاہتی ہے۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری
 کر سکتے ہو اگر اس کام سے چٹے رہے؟“

”ہاں، مجھے بیچ چاہئیں۔“ کیتھی نے کہا جب وہ
 اور فریک اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ اس نے اپنی آواز
 دھیمی رکھی۔ ”لیکن ہم ابھی جوان ہیں اور ہمارے پاس کافی
 وقت ہے۔ برائن بھی تمہاری طرح ایک سیلز مین ہے اور
 اپنے مطلب کی بات کر رہا ہے لیکن تم اسے اس کام کے
 بارے میں بات مت کرنے دو جو تم نہیں کرنا چاہتے۔“

”میں اتنی آسانی سے اس کی باتوں میں آنے والا
 نہیں ہوں۔“ اس کی آواز میں ایک کاٹ تھی۔

دوسری صبح جب وہ کچن میں گئی تو برائن پہلے سے موجود
 تھا۔ ”میں ناشتا بنا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں ٹپس پر
 کافی کھانا بنانا ہوتا ہے۔ آج میں بھی تمہاری مدد کروں گا

انہیں بروک لین کی ایک مشین پر رہائی عمارت میں ایک اپارٹمنٹ مل گیا جس کے چھوٹے کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی لیکن اسے نرسری کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کیتھی کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ سامان کھولنے اور اسے ترتیب سے رکھنے کے بعد انہوں نے مسز موریل اور ول کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ مسز موریل نے ان کے ڈڑیاں لیاں لیونگ روم کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو تم واپس آگئے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔“

”وہ کوئی برا بار نہیں تھا۔“ ول نے کہا۔ ”تم اگر وہاں کام کرتے رہتے تو اچھی آمدنی ہو سکتی تھی لیکن لگتا ہے کہ تمہیں اپنے دوست کے ساتھ کام کرنا پسند ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس پر اعتبار کر سکتے ہو؟“

”میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں۔“ فرینک نے کہا۔ ”مجھے اس پر یورابھر وسا ہے۔“

”فرینک اگر تمہیں پارٹنر چاہیے تھا تو اپنے بھائی کے ساتھ کام کرتے۔“ مسز موریل نے کہا۔

”دراصل برائن نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی۔“ کیتھی نے کہا۔

”بہت ہو گیا کیتھی۔“ فرینک نے کہا۔ ”اب ہمیں ڈنر کرنا چاہیے۔“

جب وہ کچن میں آئی تو فرینک بھی اس کے ساتھ آگیا اور بولا۔ ”وہ میری ماں ہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔“

تمہیں بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ پہلی پالیسی میں لے رہا ہوں جو بہت بڑی ہے۔ میرے مرنے کی صورت میں میرے کی رقم تمہیں ملے گی جبکہ برائن اور

جولیا ثانوی حقدار ہوں گے اور وصیت کے مطابق میری ماں اور بھائی کو کچھ نہیں ملے گا بلکہ میری حقیقی فیملی اس کی حقدار ہوگی۔“

”ہم جلد ہی اپنی فیملی شروع کر دیں گے۔“ کیتھی نے کہا۔

”فی الحال میری توجہ اپنے کام پر ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچیں گے۔“

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ فرینک نے دوسرے بیڈ روم کو اپنا دفتر بنالیا جہاں وہ رات کے کھانے کے بعد ایک دو گھنٹے کراہندہ کر کے کام کیا کرتا تھا۔ اس دوران کیتھی

ٹیلی ویژن دیکھتی، کتابیں پڑھتی یا مشین پر ورکش کرتی۔ اس نے بارہ پونڈ وزن کم کر لیا تھا۔ فرینک کو ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ دور دراز کے مضافاتی علاقوں میں جانا پڑتا اور اسے

منافع کما سکتے ہیں۔ تم کسی اچھے لباس کے ساتھ بہتر ملازمت تلاش کر سکتی ہو اور اس طرح ہم دوبارہ کچھ بچت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں دوبارہ اپنے دوستوں میں مل بیٹھنے اور ان کے ساتھ لُچ یا ڈنر کرنے کا موقع مل سکے گا۔“

اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ سخت محنت کے باوجود وہ اس جگہ کو یہاں کام کرنے والوں اور مستقل گاہکوں کو پسند کرنے لگی تھی۔ جب فرینک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور لوگ اسے داد دیتے تو اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوبارہ معالج کا پیشہ اختیار کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے فرینک سے کہا۔

”لیکن تم بیمہ پالیسی بیچنے میں خوش نہیں تھے اور یہاں تم مطمئن ہو۔“

”کبھی کبھی لیکن زیادہ تر میں ٹھکن اور دباؤ محسوس کرتا ہوں اور تمہیں کچن میں کام کرتا دیکھ کر مجھے ندامت ہونے لگتی ہے۔ برائن کے ساتھ کام کرنے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور پھر یہ کہ ہماری بچوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“

”ہاں۔ میں نے اس بارے میں سوچا ہے۔“ کیتھی نے آہستہ سے کہا۔

”پھر تم نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ یہاں رہ کر یہ ممکن نہیں۔ ہم دونوں ہفتے میں ساٹھ ستر گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کمی کر دیں تو مزید ملازم رکھنا پڑیں گے اور منافع کم ہو جائے گا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد اخراجات بڑھ جائیں گے۔ ہمیں ان کی پرورش اور تعلیم کے لیے کچھ پس انداز کرنا ہوگا جو کہ ممکن نظر نہیں آتا۔“

کیتھی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”برائن ٹھیک ہی کہتا ہے تم ایک اچھے سلیزمن ہو۔“

فرینک پرجوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے اپنی ماں سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں خود ہی اس جگہ کو فروخت کر دوں گا۔ کسی ایجنٹ کو کمیشن کیوں دوں؟ امید ہے کہ اس کی اچھی قیمت مل جائے گی۔“

اس نے انٹرنیٹ کا سہارا لیا اور لوگوں سے فون پر رابطہ کرنے لگا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی سودا ہو گیا اور اسے اس جگہ کی معقول قیمت مل گئی چونکہ برائن اتنی رقم کا انتظام نہ کر سکا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ اس لیے فرینک کو ہی ابتدائی اخراجات کا بڑا حصہ ادا کرنا پڑا۔ پارٹنرشپ کے معاہدے میں کیتھی کا نام بھی لکھوایا اور کہا۔ ”بہر حال یہ تمہارا ہی پیسا ہے۔“

کرتا ہیں جو فرینک نے پہنچی ہیں۔ تمہارا شو ہر ایک ڈانٹتو ہے کیتھی۔“

”یقیناً وہ ایسا ہی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر برائن کے گھر گئی لیکن فرینک کی کار وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ برائن کسی وقت بھی گھر آ سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے موٹل میں ملنے کو ترجیح دی۔ اگر برائن جلدی گھر آ جاتا اور جولیا موجود نہ ہوتی تو وہ کوئی بھی بہانہ بنا سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی ساتھی ورکر کی ماں کی عیادت کے لیے گئی تھی۔

کیتھی نے موٹل کی پارکنگ لاٹ دیکھنے کے بارے میں سوچا لیکن اسے یہ ایک احمقانہ بات لگی۔ گھر واپس جاتے ہوئے اس نے سگریٹ کا ایک کارٹن خریدا اور سوچنے لگی کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔

جب فرینک نصف شب کے قریب گھر پہنچا تو وہ سگریٹ کا آدھا پیکٹ ختم کر چکی تھی اور کاؤچ پر بیٹھی جن پل رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”جولیا کیسی ہے؟“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں جولیا سے ملنے نہیں گیا بلکہ چیلیا میں ایک گاہک کے ساتھ تھا۔“

”ڈیڈ سم“ اس نے کہا۔ ”تم نے برائن کو ڈیڈ سم بتایا تھا۔ تمہاری کہانی میں جھول ہے فرینک۔ تم اسی لیے ٹپس چھوڑنے پر خوش ہو رہے تھے تاکہ اس کے ساتھ وقت گزار سکو۔ کیا یہ کہانی ور جینا میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس روز جب تم اور جولیا جنگل دھمکنے گئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم وہاں نہ گئے ہو اور وہ دن کسی موٹل میں گزارا ہو۔“

وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کیتھی میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو جائے گی۔“

”بالکل نہیں۔“ کیتھی نے کہا۔ ”بہر حال میں بہت ہوشیار نہیں ہوں۔ تم اور جولیا ساری عمر مجھے دھوکا دیتے رہتے پھر تم نے یہ کوشش کیوں کی۔ تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

فرینک نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور بولا۔ ”کیونکہ تم میری بیوی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسی طرح میں برائن کو بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن جولیا کے ساتھ یہ تعلق اچانک ہی بن گیا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی تھی۔“

جب واپسی میں دیر ہو جاتی تو کیتھی سوچتی ہوتی۔

فرینک اب پہلے سے زیادہ اسٹارٹ نظر آنے لگا تھا۔ بوسٹن آنے کے بعد اس نے اپنے لیے بہت سے کپڑے اور جوتے خریدے۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اپنے بال کٹواتا تھا اور یہ بات سمجھ میں آتی تھی کیونکہ اس کا کام ہی ایسا تھا جس میں اچھا نظر آنا ضروری ہوتا ہے حالانکہ پہلے اس نے بھی ان باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ کیتھی کو تشویش ہونے لگی کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی خرچ کر رہا تھا حالانکہ وہ کیتھی کے لیے بھی تحفے لاتا رہتا تھا۔ بھی اس کے پسندیدہ مصنف کا ناول یا کوئی ڈی وی ڈی، ایک شام وہ اس کے لیے آئی بیڈ لے کر آیا۔

”بہت اچھا ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ ”لیکن بہت قیمتی لگ رہا ہے۔ کیا ہم یہ انورڈ کر سکتے ہیں؟“

”بالکل۔“ اس نے آئینے میں اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ وہ کسی متوقع گاہک سے شام کی ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ ”میں روزانہ پالیسی بیچ رہا ہوں۔ تم اس فون سے دل بہلاؤ۔“

اس کے جانے کے بعد وہ ان تحائف کے بارے میں سوچنے لگی جو وہ اس کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ کبھی اس کے لیے جیولری، پرفیوم یا کپڑے لے کر نہیں آیا۔ کتا میں، ڈی وی ڈی اور آئی بیڈ تو وہ خود بھی خرید سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ سب اسے مصروف رکھنے کے طریقے تھے ہیں جب وہ اس سے دور ہوتا ہے۔ اس نے ان شاموں کے بارے میں سوچا جب وہ کمرابند کر کے کام کرتا ہے یا اپنے گاہکوں کے ساتھ شامیں گزارتا ہے پھر وہ سوچتی ہی چلی گئی۔ اس کے کپڑوں، جوتوں اور ہیئر اسٹائل کے بارے میں۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ اس نے کوئی محبت بھرا جملہ نہیں کہا۔ نہ ہی وہ بچوں کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا اور جولیا کے ساتھ اس کی بے تکلفی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

کیتھی نے برائن کو اس کے سیل فون پر کہا۔ ”فرینک نے کہا تھا کہ تم دونوں آج رات دفتر میں کام کرو گے۔ میں نے اسے فون کرنے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ کیا میں اس سے بات کر سکتی ہوں؟“

”فرینک یہاں نہیں ہے۔“ برائن نے کہا۔ ”وہ کسی گاہک سے ملنے ڈیڈ سم گیا ہوا ہے۔“

”اچھا۔ مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔“ وہ قدرے توقف سے بولی۔ ”لیکن تم دفتر میں ہی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ اس سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے آدھی رات تک بیٹھ کر ان پالیسیوں کے کاغذات مکمل

میں تمہارے بچے کا باپ بننا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دیکھا جائے گا۔“

اس رات بھی وہ کاؤچ پر سوئی۔ صبح چھ بجے بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کافی بنا رہا تھا اور شیو اور غسل کر چکا تھا۔ اس نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”رات جو کچھ ہوا، اس پر مجھے افسوس ہے۔ جانتا ہوں کہ میں نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی لیکن یہی ایک طریقہ تھا کہ میں تمہارا سامنا کرنے کے لیے اپنے اندر ہمت پیدا کرتا۔ اب ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ آج رات انتہائی میں ڈنر کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

کیتھی نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کل رات فریڈر سے چلی نکال لی تھی اگر آج نہ کھاتی تو خراب ہو جائے گی۔ معاف کرنا۔ مجھے کام پر جانے کے لیے تیاری کرنا ہے۔“

فریڈر نے بہت زیادہ پینا شروع کر دی تھی۔ اس نے کیتھی کو یہی بتایا کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کو بھلانے کے لیے پیتا ہے۔ پہلے تو کیتھی سمجھی کہ یہ عارضی کیفیت ہے۔ جانتی تھی کہ وہ اسے اور برائے کو دھوکا دینے پر اپنے آپ کو قصور وار سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسے جولیا کی طرف سے دھتکارے جانے کا غم ہو۔ کیتھی کا خیال تھا کہ صورت حال معمول پر آنے کے بعد وہ اس سے نجات حاصل کر لے گا۔ لیکن کچھ بھی معمول پر نہیں آیا اور اس کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ ایک رات جب اس کی ماں اور بھائی ڈنر پر آئے ہوئے تھے۔ فریڈر نے اتنی پی لی کہ اس کے ہاتھ سے پانچواں گلاس بھی چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور فریڈر اس کے ٹوٹنے پر رونے لگا۔ اس کی ماں نے حسب عادت کہا۔ ”میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا، جس پرول تھقبہ لگانے لگا اور دونوں بھائیوں میں ہاتھ پائی کی نوبت آگئی۔“

فریڈر کا کام بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اکثر اوقات کلائنٹ سے ملنے کا موقع ضائع کر دیتا اور اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ مجبوراً برائے کو ایک نیا ایجنٹ رکھنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں دلبرداشتہ ہو کر فریڈر نے مزید پینا شروع کر دی۔ برائے نے کیتھی کو فون کر کے کہا کہ فریڈر اس کے لیے بھائیوں جیسا ہے..... لیکن اسے حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ اب اس کا دل اس کام میں نہیں لگ رہا تھا اور اس کے وہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ نیا ایجنٹ بہت متحرک تھا اور بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اور برائے مل کر فریڈر کا حصہ خرید سکتے تھے اور یہ ہر ایک کے حق میں بہتر ہوتا، ممکن ہے کہ

”کیا تم مجھ سے وعدہ کر سکتے ہو کہ اس کے ساتھ آئندہ کوئی تعلق نہیں رکھو گے اور جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، اس سے نہیں ملو گے۔“

”میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس سے محبت ہے اور تم سے بھی محبت کرتا ہوں لیکن اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر وہ برائے سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو میں اس کے ساتھ رہنا پسند کروں گا۔“

کیتھی نے اس پر گلاس پھینکا جو اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور اس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ وہ ہذیبی انداز میں چلتے ہوئے بولی۔

”نکل جاؤ اور جب تک میں یہاں ہوں، واپس مت آنا۔ اپنے لیے وکیل کر لو کیونکہ میں بھی کل ایک وکیل کو فون کرنے والی ہوں۔“

جب وہ اگلے روز گھر آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ چند جوڑے کپڑے، جوتے اور گٹار کے علاوہ کچھ لے کر نہیں گیا۔ اگلے تین روز اسی طرح گزر گئے۔ وہ کام پر جاتی۔ واپس آ کر اپنے لیے کھانا بناتی لی وی دیکھتی اور کاؤچ پر بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔ اسے تنہا بستر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اس بارے میں کچھ نہ سوچے۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی وکیل کو فون کیا۔ چوتھے روز جب وہ لی وی دیکھ رہی تھی تو وہ خود ہی آگیا۔ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔

”وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔“ فریڈر نے کہا۔ ”وہ اب بھی کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی وہ ایسا چاہتی ہے اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ میں تم سے ہر وہ وعدہ کرنے کو تیار ہوں جو تم چاہتی ہو۔ بس مجھے گھر آنے دو۔“

اس نے تحارت آمیز انداز میں کہا۔ ”اب تم مجھ سے وعدے کرو گے جب اس نے تمہیں دھتکار دیا اور تم کسی بھی طرح اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھ سکتے۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پکڑ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ ”میں تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ ایک موقع اور دے دو۔ میں نہیں جانتا کہ کہاں جاؤں گا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کیتھی سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا۔ وہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا بازو اس کے کندھے کے گرد ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اندر چلو۔“

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت اچھی ہو کیتھی،

کیتھی اور فرینک ٹپس جیسی کوئی دوسری جگہ تلاش کر لیں، برائن چاہتا تھا کہ کیتھی اس بارے میں سوچے۔

کیتھی نے سوچا اور اس نے فرینک سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بار پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ کیتھی نے برائن کو فون کر کے کہا کہ وہ خود ہی فرینک سے بات کر لے۔

وہ نومبر کی ایک سرد شام تھی، اس روز سہ پہر سے ہی برف باری ہو رہی تھی۔ کیتھی کے گھر پہنچنے تک سڑکیں برف سے ڈھک چکی تھیں۔ ساتھ بچے اس نے فرینک سے اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ دس بجے اس کا فون آیا۔ اس کی آواز کمزور اور بھرائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے معمول سے زیادہ شراب پی رکھی ہے۔

”تم کہاں ہو؟“ کیتھی نے پوچھا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ میں نے کیوں اس پر یقین کر لیا میں اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہوں لیکن تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم واحد ہستی ہو جس نے مجھ سے محبت کی۔“

وہ ماضی کا صیغہ استعمال کر رہا تھا جس نے کیتھی کو خوفزدہ کر دیا۔ ”تم کہاں ہو؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ ”کیا تم گھر سے قریب ہو؟“

”ابھی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”برف باری ہو رہی ہے۔ تمہیں اس موسم میں ڈرائیونگ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو۔ میں تمہیں لینے آجاتی ہوں۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد کیتھی نے کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے ٹائن الیون کو بھی فون کر کے فرینک کی گاڑی کا نمبر دیا اور کہا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے لہذا پولیس اس کی مدد کرے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پولیس والے اسے کہاں ڈھونڈیں گے اور فون سننے والے نے بھی اس بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ وہ کاؤچ پر بیٹھی اس کے انتظار میں سگریٹ پھونکتی رہی پھر تین بجے ایک غمزہ صورت آفیسر نے آکر بتایا کہ فرینک کی کار پھسلن کے سبب ایک درخت سے جا ٹکرائی تھی۔

تدفین کے بعد جولیا نے کیتھی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ اس نے تمہیں کیا بتایا تھا لیکن مجھے بہت افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

کیتھی نے وہ جگہ فروخت کر دی پھر اس نے فلاڈلفیا میں ملازمت کر لی اور ایک اپارٹمنٹ کے لیے زرخیز جگہ جمع کروا دیا۔ برائن کمپنی میں فرینک کا حصہ خریدنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے ایک دن برائن، جولیا، مسز موریل اور ول کوڈنر پریدعو کیا اور اس نے چکن کی وہی ڈش بنائی جو نو سال پہلے بنائی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے ریستوران کی مخصوص ڈش بھی بنائی۔ سب چیزیں اتنی اچھی تھیں کہ مسز موریل بھی ان میں کوئی نقص نہ نکال سکیں۔

کیتھی نے الیکٹرانک سگریٹ نکالا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ مسز موریل نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”اس فضول شے کو ہٹاؤ۔ میں سگریٹ کا دھواں برداشت نہیں کر سکتی۔“

”یہ دھواں نہیں، صرف بخارات ہیں اور ان سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میرے سپرد انکوڑے نے سگریٹ نوشی چھوڑنے کے لیے انہیں استعمال کیا ہے۔“

”یہ بہت مہنگے ہیں۔“ ول نے کہا۔ ”ایک کارٹر جج کتنے کا ہوگا۔“

”میں انہیں دوبارہ بھر لیتی ہوں۔“ کیتھی نے کہا۔ ”اور مجھے صرف مالع کلکٹن خریدنا ہوتی ہے۔“

”بہر حال مجھے خوشی ہے کہ تم سب لوگ یہاں آئے تاکہ میں فلاڈلفیا میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے تم سے مل سکوں۔“

”ہمیں فرینک کی موت کا بہت غم ہے۔“ برائن نے کہا۔ ”لیکن کیتھی کے لیے یہاں سے جانا بہت ضروری ہے۔“

”مجھے امید ہے کہ تم وہاں خوش رہو گی۔“ جولیا نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہیں نیا سا گھر مل جائے۔“

”کون جانتا ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ ”ممکن ہے ایسا ہو جائے۔“

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”میں تم لوگوں کے لیے ڈرنکس لاتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آج وہ خاص مشروب جنجر لیمن ڈریز ہو جو میں ٹپس میں بناتی تھی۔ برائن، یاد ہے تم نے ایک دفعہ میری مدد کی تھی کیا آج بھی تم اس مشروب کی تیاری میں میرا ساتھ دو گے؟“

اس نے بچن میں کپ بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے زیادہ تر گلاس پیک کر دیے ہیں۔ صرف چند گلاس وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ کیا تم انہیں اتار سکتے ہو؟“

اس نے وہ گلاس نکال کر میز پر رکھ دیے۔ ان میں دو

”میں روم لانا تو بھول ہی گئی۔ کیا تم لا سکتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ تاکہ کیسٹ کہاں ہے؟“

جب وہ چلا گیا تو اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور نیلے گلاس میں لیمن کے فلیور والی ٹکونین انڈیل دی۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کا ایک کھانے کا چمچہ کسی بھی بالغ شخص کے لیے مہلک ہو سکتا ہے۔ اس نے تین چمچے ڈال دیے۔ وہ انصاف کرنا چاہ رہی تھی جو کسی عدالت سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے شیشی صاف کر کے کوڑے دان میں پھینک دی جب برائن واپس آیا تو وہ گلاسوں میں لیمن اور سادہ سیرپ کچھر ڈال رہی تھی۔

”یہ میری خفیہ ترکیب ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب میں ان میں روم ڈالوں گی۔ مسر موریل کا گلاس الگ کرنا ہوگا۔ کیا تم یہ گلاس لے جاؤ گے۔ مجھے نیلا گلاس دینا۔ آج میں بہت جذباتی ہو رہی ہوں۔“

اس نے وہ گلاس اٹھایا اور بولا۔ ”میری خواہش ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ تم کمپنی میں اپنا حصہ برقرار رکھو۔ اگر تم اسے بیچ دو تو نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتی ہو۔“

”میں وہی کر رہی ہوں۔ میں نے نئی ملازمت ڈھونڈ لی ہے۔ ایپارٹمنٹ کا زرخیزانہ جمع کروادیا ہے۔ ایک بار پھر سگریٹ نوشی چھوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے شوہر کی خواہش کا بھی احترام کرنا ہے۔ اس کی وصیت کے مطابق تم اور جولیا انشورنس پالیسی کے ثانوی حق دار تھے۔ اب تم دونوں میرے حقیقی وارث ہو گے۔ میں نے امریکن کینسر سوسائٹی کو ثانوی حق دار بنا دیا ہے اور جیسا کہ فرینک نے ہمیشہ کہا کہ تم اور جولیا ہماری حقیقی بیٹی ہو۔ اس لیے اگر میں مر گئی تو میرا سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔“

اس نے دل میں کہا۔ ”تمہاری انگلیوں کے نشان گلاس پر ہیں۔ تم نے ہی فرینک کا قتل کیا ہے لیکن اس کی سزا سے بچ گئے۔ خوش قسمتی سے مجھے یہ موقع مل گیا ہے۔ اس لیے تم مجھے قتل کرنے کے الزام میں جیل چلے جاؤ گے۔“

برائن کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ”شکریہ لیکن تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو۔ ابھی تم صرف چونتیس برس کی ہو۔ تم کیوں مرنے کی باتیں کر رہی ہو؟“

”میں کینسر کی آخری اسٹیج پر ہوں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ صرف چند روز کی مہمان ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ آخری گلاس منہ سے لگا لیا جو اس کے شوہر کی نشانی تھا۔

سادے، دو گلابی اور ایک نیلا گلاس تھا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔“ برائن نے کہا۔ ”میں اسے ہر روز یاد کرتا ہوں۔“

کیتھی بولی۔ ”جس دن اس کا انتقال ہوا، تم نے کہا تھا اس سے بات کرو گے، کیا تمہاری بات ہوئی تھی؟“

”موقع ہی نہیں ملا۔ اس روز میری ایک میٹنگ تھی جو دیر سے ختم ہوئی۔ تب تک فرینک جا چکا تھا۔“

”بہت برا ہوا۔ اس رات اس نے فون پر مجھ سے کچھ عجیب باتیں کہی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کی وضاحت کر سکو گے۔“

برائن نے اسے چونک کر دیکھا اور بولا۔ ”اس نے تمہیں فون کیا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟“

”اس نے کہا کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ یہ بات اس نے دو مرتبہ کہی اور یہ بھی کہا کہ وہ احمق تھا جو اس نے یقین کر لیا۔ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا سچ نہیں تھا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟“

برائن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”وہ نشے میں تھا اور اس حالت میں کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔“

کیتھی نے دل میں کہا۔ ”ہاں، وہ شراب پینے لگا تھا اور تم اسے شراب مہیا کرتے تھے اور تم نے ایسی باتیں کیں کہ وہ دل برداشتہ ہو کر اپنا حصہ تمہیں بیچ دے۔ جولیا اور تم نے اس سے جھوٹ بولا۔ تمہیں اس سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ تم نے اس روز ایک اسکیم کے تحت جولیا کو اس کے ساتھ جنگل دیکھنے کے لیے بھیجا تا کہ جولیا اس کے ساتھ محبت کا جھوٹا ٹانک رچا کر اسے بوشن واپس آنے اور تمہاری کمپنی میں سرمایہ لگانے پر آمادہ کر لے۔ ممکن ہے کہ تم نے یہ نہ سوچا ہو کہ وہ اس حد تک آگے چلے جائیں گے کہ ان کے درمیان جنسی تعلق قائم ہو جائے لیکن تم نے اپنی بیوی کو اتنی جھوٹ ضرور دی کہ جب تک وہ تمہارے لیے کام کر رہا ہے، وہ اس کے ساتھ چپکی رہے پھر جب تمہارے پاس ایک معقول رقم جمع ہو گئی اور فرینک کے کام کی رفتار سست پڑ گئی تو تم نے اس سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ تم جانتے تھے کہ وہ پہلے ہی اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہا ہے اور تم نے یہ کہہ کر رہی تھی کسر پوری کردی کہ تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں اور یہ کہ جولیا اس سے کبھی بھی محبت نہیں کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ تم یہ نہ جانتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو مار لے گا لیکن تم چاہتے تھے کہ وہ یہ خطرہ مول لے اور میں شرطیہ کہتی ہوں کہ اب تمہیں سکون مل گیا ہے۔“

”اوہ!“ کیتھی نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

کوہِ گراں

مرزا امجد بیگ

عدالت کے منظر میں بہت سی کہانیاں آپ نے پڑھیں مگر اب عدالت سے باہر کیس کی شروعات اور انجام بخیر بھی پڑھ کر دیکھیں... مرزا امجد نے ثابت کر دیا کہ وکالت پر مقام پر دلیل پیش کر سکتی ہے اور یہ دلیل ہر مجرم کو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس رات بھی کئی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھا مگر حقیقت نظر انداز کرنے سے نہ تو نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اور نہ ہی دیکھنے کا انداز بدلتا ہے۔ وہ جو کسی کی محبت کے حصول کی خاطر گلی گلی بھٹکتا پھرتا تھا کہ اچانک ساری گلیوں نے اس پر رستے تنگ کر دیے... اور وہ اس محبت سے اس قدر تنگ آ گیا کہ الامان الحفیظ... کیونکہ غلط راستے کبھی کسی مسافر کو درست منزل تک نہیں پہنچاتے... یہ فلسفہ اسے دیر سے سمجھ میں آیا مگر موت اب بھی اس سے چند قدم دور ہی تھی اور پھر بیگ صاحب کی وکالت کے سبب اس دوری کو طویل فاصلوں میں بدلتے دیر نہیں لگی۔

انہی کنویں میں چھلانگ لگانے والے ایک
عاشق کی نامہ سرا دیوں کا قصہ

مدد آپ کے تحت شہریوں نے اپنے اپنے محلوں میں گلی گلی پہرہ دینا شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک ایسی ہی ستم ظریف رات کی داستان ہے۔

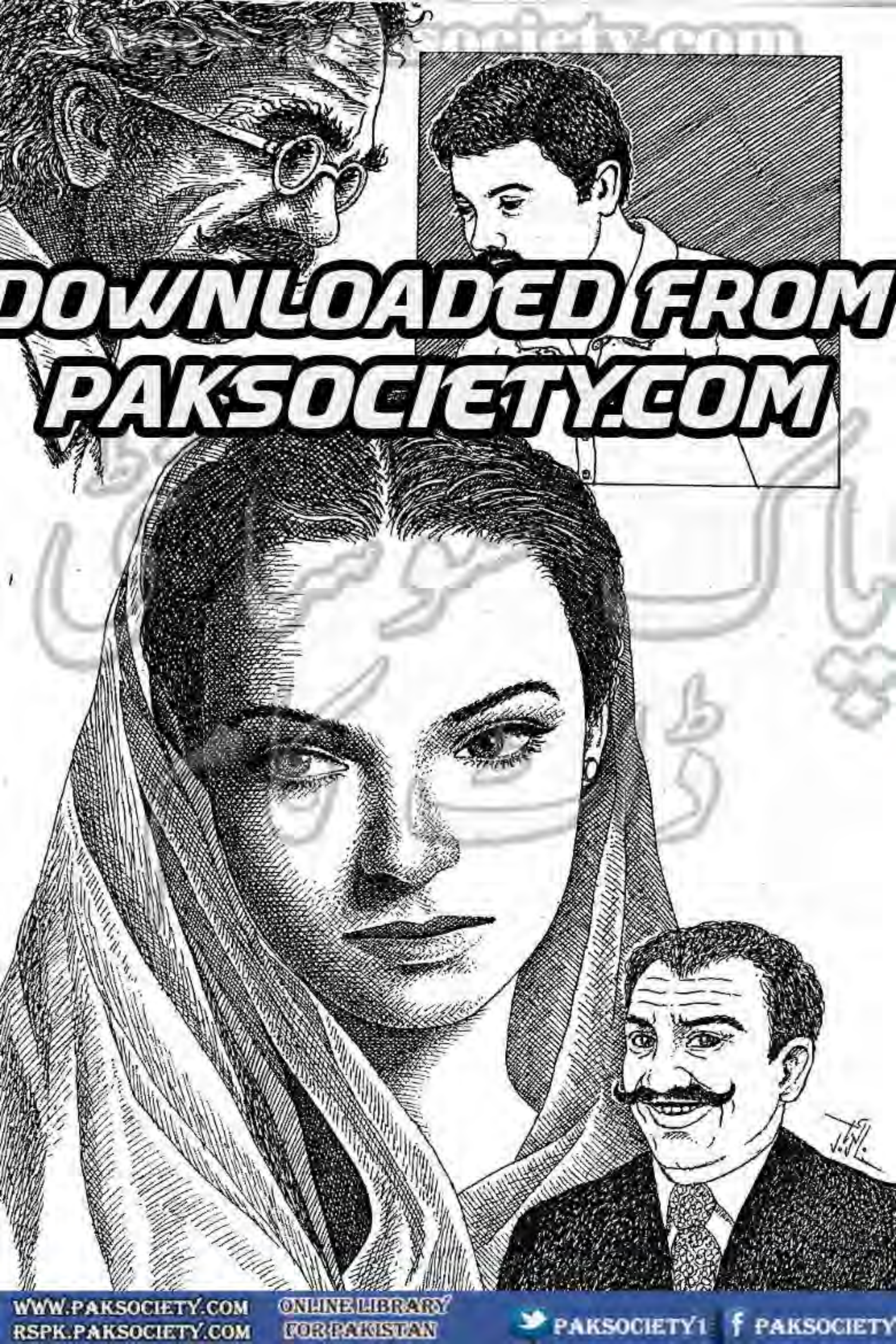
میں معمول کے مطابق اپنے بیڈروم میں ایک اہم کیس کی اسٹڈی میں محو تھا کہ شور کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ شور کی یہ آواز گھر سے باہر گلی میں ابھری تھی۔

بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے کیس کی فائل کو ایک جانب رکھا اور توجہ گھر کے باہر ابھرنے والی آواز پر مرکوز کر دی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس آواز کے بارے میں میرا ابتدائی اندازہ غلط تھا۔ اصل میں وہ شور میرے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان کو دولت ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے تو پاکستان اپنے قیام کے وقت ہی دولت تھا یعنی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا تاہم مجموعی طور پر یہ دونوں ایک ہی ملک کہلاتے تھے مگر سقوط ڈھاکہ کا ایسے سانحے نے ایک کو پاکستان اور دوسرے کو بنگلہ دیش بنا دیا تھا۔ زیرِ نظر واقعہ موجودہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا ہے۔

ملک میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے میں چوروں اور ڈاکوؤں کی بن آئی تھی کراچی کے باسیوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں ان دنوں ڈکیتی کی وارداتوں کا تناسب بہت بڑھ گیا تھا۔ اپنی



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

”اوہ.....!“ میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا پھر پوچھ لیا۔ ”تمہارے ابو کہاں ہیں؟“
”ابو گھر ہی میں ہیں جی۔“ اس نے بتایا۔ ”ابو نے اس ڈاکو کو پکڑ رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔“

حق ہمسائیگی کا معاملہ تھا اس لیے میں مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس صورت حال نے میرے اندرونی تجسس کو بھڑکادیا تھا۔
☆☆☆

قدوس صاحب نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ قدوس مضبوط بدن کا مالک ایک پست قامت شخص تھا۔ اس کی عمر بچپن کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ مبینہ ڈاکو کو زیر کر لیا تھا۔ جب خالدہ نے تھوڑی دیر پہلے کسی ڈاکو کا ذکر کیا تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی خطرناک شخص تھا مگر قدوس نے جس بندے کو قابو کر رکھا تھا وہ میرے تصور سے بہت مختلف تھا۔

قدوس کے قریب ہی اس کی بیوی کلثوم اور بڑی بیٹی عابدہ بھی موجود تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو کلثوم نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”لیس جی..... وکیل صاحب آگئے۔ اب وہ خود ہی اس کم بخت کا بندوبست کر دیں گے۔“

مبینہ ڈاکو کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت نوجوان تھا۔ شیو بڑھا ہوا اور لباس سے اجڑپن جھلکتا تھا۔ ان لحاظ میں وہ صحن کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور خاصا سہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسی دوران میں عابدہ دو کرسیاں اٹھالائی۔ کلثوم کے اصرار پر ایک کرسی میں نے سنبھال لی اور دوسرے پر قدوس براجمان ہو گیا۔ قدوس نے اس لفنگے نوجوان کو زیر کر کے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ میری آمد پر اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے کڑے تیوروں سے اس نوجوان کو گھورا۔

اس نے جواب دیا۔ ”مراو.....!“
”تم مراد نہیں نامراد ہو!“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”جسبی ڈاکا ڈالنے اس گھر میں گھسے تھے..... ہیں نا؟“
”نہیں جناب.....“ وہ گھگھایا۔ ”میں چور ہوں اور نہ ڈاکو۔“

”پھر تمہارا اس گھر میں گھسنے کا مقصد کیا تھا؟“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آدھی

پڑوس والے بنگلے کے اندر سے اٹھ رہا تھا اور اس کی شدت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اب میرے لیے اپنے گھر کے اندر بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا لہذا میں نے چل پھنی اور اپنے گھر سے باہر نکل آیا تاکہ پتا چلا سکوں کہ میرے پڑوس کے بنگلے میں رات کے اس پہر کون سی آفت آگئی ہے۔
میں نے اپنے پڑوس کے جس بنگلے کا ذکر کیا وہاں قدوس نامی ایک صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہ ایک مختصر سا خاندان تھا۔ قدوس، اس کی بیوی کلثوم اور ان کی دو بیٹیاں خالدہ اور عابدہ۔ قدوس صاحب کی ایم اے جناح روڈ پر ڈینسو ہال کے نزدیک گھریوں کی ایک دکان تھی۔

میں اپنے گھر کا گیٹ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔
”انکل! آپ وکیل ہیں نا.....؟“

”جی بالکل، میں وکیل ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کون؟“
”میرا نام خالدہ ہے۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولی۔
”ہم اس بنگلے میں رہتے ہیں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے میرے پڑوس والے بنگلے کی جانب اشارہ کر دیا۔

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ شور کی آوازیں آپ کے گھر کے اندر سے آرہی تھیں؟“

میں نے ”نہیں“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ اب وہ شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں خالدہ یا اس کی بہن عابدہ کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ صرف مجھے اتنا معلوم تھا کہ میرے پڑوسی قدوس کی دو بیٹیاں ہیں جن کے نام خالدہ اور عابدہ ہیں۔

”خیریت تو ہے نا بیٹی!“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ”یہ کیسا شور تھا؟“

”انکل! آپ جلدی سے ہمارے گھر چلیں۔“ وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ”امی نے آپ کو بلایا ہے۔“
”خالدہ بیٹی!“ میں نے اس متوحش لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔ ”میں وکیل ضرور ہوں مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آدھی رات کو تمہاری امی مجھے کیوں بلا رہی ہیں؟“

”وہ جی..... ہمارے گھر میں ایک ڈاکو گھس آیا ہے۔“ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

ہونے دیا اور یہ آہستگی اس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر میں نے گرج دار آواز میں اسے پکارا۔
”اے..... کون ہو؟“

”اپنے عقب میں میری آواز سن کر یہ اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا اور چند فٹ آگے جا کر اسے دبوج لیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی اور کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے یہاں لے آیا.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب سے یہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ یہ چور نہیں بلکہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے ہمارے گھر میں کودا ہے۔“

”قدوس صاحب!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بلاشبہ آپ نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے ورنہ اس قسم کی صورت حال میں لوگ عموماً حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ چور اور سانپ کی ایک اپنی ہی دہشت ہوتی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید بری طرح گھبرا جاتا۔ بس جی.....“ لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”جوانی کی کسرت کام آگئی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”نو جوانی میں مجھے پہلوانی کا شوق تھا۔ میں روزانہ باقاعدگی سے اکھاڑے جاتا رہا ہوں بہر حال.....“ اس نے نفرت آمیز نظر سے مبینہ ڈاکو مراد کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”اب وہ جوانی والی پھرتیاں تو باقی نہیں ہیں اور نہ ہی جسم میں وہ طاقت موجود ہے لیکن اس جیسے چور اچکوں سے تو میں اب بھی دودو ہاتھ کرنے کی سکت رکھتا ہوں۔“
”بہر حال، آپ کی کارکردگی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔“ میں نے انہیں سراہتے ہوئے کہا پھر میں مراد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”ہاں بھی نامراد! بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا سلوک

رات کو یہاں پکنک منانے آئے تھے.....؟“
”میں جھوٹ نہیں بول رہا جناب۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔“

”مجھے تمہاری چھوٹی اور بڑی قسموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم آدھی رات کو قدوس صاحب کے گھر میں کیا کر رہے تھے؟“

”میں اپنی جان بچانے کے لیے دیوار پھلانگ کر اس گھر میں کود گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے نہیں پتا، یہ کسی قدوس صاحب کا گھر ہے یا کسی اور کا.....“

”یہ بکواس کرتا ہے وکیل صاحب!“ قدوس نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں کافی دیر سے اس مردود کی یہی بک بک سن رہا ہوں۔“

”مزدردوس نے کہا۔“ وکیل صاحب! آپ کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ آپ قانونی معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بد معاش کو قابو کر کے پولیس کے حوالے کر دیں۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ یہ آپ کا ہم پراحسان ہوگا۔“

مراد باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”وکیل صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔“

”قدوس صاحب!“ میں نے صاحب خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کی بات تو میں بعد میں سنوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے اسے کب اور کہاں سے پکڑا ہے؟“

”ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ بیٹنگلے کے عقبی حصے میں ”دھپ“ کی آواز ابھری۔“ قدوس مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ”میں اس وقت واش بیسن پر کھڑا تھا اور برش کرنے کا ارادہ تھا۔ اس پر اسرار آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہمارے گھر کے اندر کودا ہو۔ میں نے دانت برش کرنے کے ارادے کو وقتی طور پر ملتوی کیا اور دبے قدموں سے بیٹنگلے کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گیا اور پھر میں نے اسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ میں نے اسے محسوس نہیں

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان شیطانوں نے مجھے بچنے کے اندر کودتے ہوئے نہیں دیکھا اور میری جان بچ گئی.....“ بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری لی۔

وہ مئی کا مہینہ تھا۔ ان دنوں موسم کے کیا تیور ہوتے ہیں یہ بات سب کو معلوم ہے۔ مسز قدوس نے ایک پیڈل فین ہمارے رخ پر آن کر دیا تھا اور وہ یاں بیٹیاں بھی کرسیاں ڈال کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔ عدالت سے باہر وہاں قدوس صاحب کے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی ”عدالت“ لگ گئی تھی اور وہ بھی بعد از نصف شب!

ملزم مراد کافی دیر سے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس پوزیشن میں بیٹھا وہ رحم کا منتظر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی تکلیف رفع کرنے کی غرض سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ..... آلتی پالتی مار کر.....“ اس نے فوراً سے پیشتر میری ہدایت پر عمل کیا اور صحن کے پختہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان جھلک رہا تھا۔

میں نے باقاعدہ جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ”وہ غنڈے تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے۔ تم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟“

”ناہراد“ نے اپنا قصہ شروع کرنے سے پہلے باری باری ہم سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ شاید کسی چکر بازی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میں نے فوراً تنبیہی انداز میں اس پر واضح کر دیا۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو مراد..... اور وہ یہ کہ اگر تم نے ذرا سی بھی غلط بیانی یا چکر بازی سے کام لینے کی کوشش کی تو پھر سیدھے یہاں سے تھانے جاؤ گے۔ میرے ایک فون پر پولیس والے اس بچکے کے گیٹ پر کھڑے ہوں گے..... پھر تم مجھ سے کسی مدد اور رعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جو بھی کہوں گا، سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”جناب! ان غنڈوں سے براہ راست تو میری کوئی دشمنی نہیں ہے وکیل صاحب!“ اس نے ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ ایسی صورت حال دیکھی تو گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ”یہ سارا چکر و صی شاہ کا چلایا ہوا ہے۔“

”وصی شاہ.....“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”کون

کیا جائے؟“ ”آپ مجھے معاف کر دیں جناب۔“ وہ التجا آمیز انداز میں بولا۔ ”مجھے یہاں سے جانے دیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔“ ”نہیں، قدوس صاحب تو تمہیں تھانے میں بند کروانے کے حق میں ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ میرے پڑوسی ہیں اور ان کی خواہش کا احترام کرنا مجھ پر واجب ہے۔“

”میں ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔“ وہ قدوس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس علاقے کا رخ نہیں کروں گا۔“ میری تجربہ کار نگاہ نے مجھے بتا دیا کہ مراد غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ وہ واقعی چوری یا ڈکیتی کی نیت سے اس گھر میں گھسا تھا البتہ یہ عقدہ کھٹنا ضروری تھا کہ وہ کس سے جان بچانے کے لیے دیوار پھلانگ کر قدوس کے گھر میں کودا تھا۔

”تمہارے وعدے وعید اور معافی سلائی کی کوئی اہمیت نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”جب تک مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ ہو جائے، تم یہاں سے جا نہیں سکتے بلکہ اگر یہاں سے جاؤ گے تو سیدھے تھانے کی حوالات میں جاؤ گے.....“

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”وکیل صاحب! آپ کو..... میری بے گناہی کا..... کیسے یقین..... آئے گا.....؟“ ”تمہاری بے گناہی صرف سچ بولنے ہی سے ثابت ہو سکتی ہے۔“ میں نے دد ٹوک انداز میں کہا۔

”میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا وکیل صاحب.....“ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

”تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس گھر میں کودے تھے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا قصہ ہے..... تمہیں کس سے جان کا خطرہ تھا؟“

”چند غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے جناب۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنی جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ اس بچکے کی عقبی گلی میں تاریکی نظر آئی تو میں ان غنڈوں کو چمکا دے کر ادھر آ گیا اور خود کو محفوظ کرنے کے لیے بچکے کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔“ وہ سانس درست کرنے کے لیے رک پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”وصی شاہ ایک نجومی ہے وکیل صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جوتاروں کا حال بتاتا ہے۔“
”تو تمہاری دشمنی کسی نجومی سے ہے؟“
اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”پھر.....!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر وہ تمہارا دشمن نہیں تو پھر اس نے تمہارے پیچھے غنڈے کیوں چھوڑ رکھے ہیں؟“
”سب سسلی کا کیا دھرا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”سسلی کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”سسلی بلی کی ماں ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔
اس کی کہانی ایک سے ایک دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ لے رہی تھی۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بلی کسی سسلی کی بیٹی ہے اور سسلی نے کسی نجومی وصی شاہ کو تمہارا دشمن بنا رکھا ہے لہذا وصی شاہ نے تمہارے پیچھے غنڈے لگا دیے ہیں جو تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔ تم کوئی ہوش ربا کہانی سنا کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“

”میری توبہ جو میں آپ کو کوئی چکر دینے کی کوشش کروں۔“ وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔
”بلی کا اصل نام سحرش ہے۔ آپ نے میری کہانی کو ہوش ربا کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میری کہانی بڑے انوکھے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ اس نجومی کے بچے وصی شاہ نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا.....“

”مجھے بتاؤ، تمہاری کہانی کیا ہے؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس دوران میں کلثوم نے بیچھے کے کچن میں جا کر چائے بنالی تھی اور اس وقت ہم چائے سے بھی شغل کر رہے تھے۔ اگرچہ قدوس اور اس کی بیگم کلثوم تو اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ ”نامراد“ کو بھی چائے پیش کی جائے تاہم میرے کہنے پر انہوں نے چائے کی ایک پیالی اسے بھی دے دی جس پر مراد نے خلوص دل سے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس موقع پر کلثوم کہے بنا نہیں رہی تھی۔

”وکیل صاحب! آپ ہمارے پڑوسی ہیں، ہمارے محسن ہیں اسی لیے ہم نے آپ کی بات مان لی ورنہ اس بد بخت کو تو میں ایک بوند پانی بھی نہ دیتی۔ ایسے چور ڈاکو کسی

رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔“

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مسز قدوس! میں مراد کا حمایتی نہیں ہوں لیکن ایک سوال آپ سے ضرور کرنا چاہوں گا۔“

”جی ضرور.....“ وہ سنجیدگی سے مجھے تنکے لگی۔

”کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ مراد نے آپ کے گھر سے کون سی چیز چرائی ہے؟“ میں نے بہ دستور زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن.....“ وہ گڑبڑا گئی۔ ”یہ چوری کی نیت..... ہی سے دیوار پھلانگ کر..... ہمارے گھر میں کودا تھا.....“

”نیت کا حال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے مسز قدوس جو ہم سب کا خالق اور مالک ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”انسان محض اندازے ہی قائم کر سکتا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ.....“

”کیا اندازہ ہے آپ کا؟“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے وہ بول اٹھی۔

”میرا اندازہ یہ ہے کہ مراد ہرگز چور نہیں ہو سکتا۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”اب اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے ہی میں اس پر جرح کر رہا ہوں۔“

”مجھے بھی اس کے اندر چوروں والی پھرتی اور دم خم نظر نہیں آ رہا۔“ قدوس مراد کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے میری تائید میں بولا۔ ”اسے قابو کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔“

”مراد.....!“ میں نے اس مصیبت زدہ جوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تم خود اپنی زبان سے سچ بولنے کا حلف اٹھا چکے ہو۔“

”جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے وکیل صاحب۔“ وہ چائے کی چسکی لینے کے بعد اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے وعدے، مطلب یہ کہ اپنے اس حلف پر قائم ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ”اب جلدی سے تم مجھے وہ کہانی سنانا شروع کر دو جس میں بلی، سسلی اور وصی شاہ کے کردار سچے ہوئے ہیں۔“

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر اپنی داستان بیان کرنے لگا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو مراد کے پس منظر سے آگاہ کر دوں تاکہ اس کہانی کے مطالعے کے دوران میں

آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ اس میں سے بیشتر باتیں تو مجھے خود مراد ہی نے بتائی تھیں اور کچھ میں نے بعد ازاں اپنی تحقیق اور تفتیش سے معلوم کر لی تھیں۔

مراد کا پورا نام مراد علی تھا۔ وہ کراچی کے علاقے غریب آباد کا رہنے والا تھا۔ وہ یوڑھے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ عمر تیس سال اور قد و قامت و صحت کے بارے میں ابتدائی صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ وہ محض مڈل تک تعلیم یافتہ تھا اور فی الحال بے روزگار بھی تھا۔

مراد کا باپ امداد علی ایک تجربہ کار ماہر موٹر مکینک تھا اور غریب آباد کے مین روڈ پر اس نے اپنی ایک چھوٹی سی مکینیکل شاپ بنا رکھی تھی جہاں وہ صبح سے رات گئے تک کام میں مصروف رہتا تھا۔ امداد علی اپنے کنبے کا واحد کفیل تھا۔ اس کی سب سے بڑی محرومی اس کا غیر تعلیم یافتہ ہونا تھا۔ وہ بچپن ہی سے موٹر مکینکی کے کام میں پڑ گیا تھا اور پھر اسی روزگار میں اس کی عمر گزر گئی۔ اب وہ بڑھاپے کی منزل پر کھڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں وہ پہلے جیسی طاقت اور توانائی تو باقی نہیں رہی تھی تاہم جب تک سانس چل رہی تھی، اسے یہی کام کرنا تھا۔

انسان نے اپنی زندگی میں جو محرومیاں دیکھی ہوں، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد کا ان محرومیوں سے واسطہ نہ پڑے لہذا امداد علی کی بھی شدید خواہش تھی کہ اس کی اکلوتی اولاد ورنہ نہ پڑھ لکھ کر کوئی بڑا آدمی بنے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی طرح مراد بھی مشینوں اور کل پرزوں کے خیل سے ہاتھ پاؤں اور کپڑے کا لے کرے۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا قلم کی نوک سے کاغذ کا لے کرے اور ایک دن وہ اپنا اور اپنے والدین کا نام روشن کرے مگر امداد علی کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔..... وہ خود اس لیے تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا کہ اس کے والدین اسے تعلیم دلانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اسی لیے اس نے خود محنت اور کڑی مشقت کر کے بیٹے کو پڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی محنت رائگاں گئی۔ وہ مراد کو ”بامراد“ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی اس کوشش میں مالی تنگی آڑے نہ آئی بلکہ مراد کی تعلیم سے عدم دلچسپی نے امداد علی کا دل توڑ دیا اور اس کے ارمانوں کا خون کر ڈالا۔

مراد کی والدہ سلطانہ نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر والدین کی کوئی نصیحت اس بد نصیب کے پلے نہ پڑی۔ پڑھنا لکھنا تو رہا ایک طرف اس نامراد نے تو کسی کام کاج میں بھی دلچسپی نہ لی اور تیس سال کا ہونے

کے باوجود بھی بے روزگار ہی تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے باپ کے موٹر گیراج میں چلا جاتا اور اس کا ہاتھ بنا دیتا ورنہ دن کا بیشتر حصہ وہ آوارہ گردی کی نذر کر دیتا تھا اور اسی بے روزگاری، بے کاری اور آوارہ گردی کے دوران میں اسے سحرش عرف بلی سے محبت ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں، اگر انسان کے سامنے کرنے کو بہت کچھ ہو جس کی وجہ سے اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہو تو پھر اسے عشق و محبت کا خیال بھی نہیں آتا۔ مصروف انسان اپنے کام کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ فارغ لوگوں میں عشق و محبت کے جراثیم کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔ کسی کی کہی ہوئی یہ بات کس حد تک درست ہے؟ اس سوال کا جواب کوئی ایسا شخص ہی دے سکتا ہے جس نے کبھی محبت کی ہو۔

بلی، مراد ہی کے محلے میں رہتی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر اور کبھی کھلم کھلا بھی بلی کو دیکھا کرتا تھا۔ بلی ایک دھان پان، خوب صورت اور پرکشش سانولی سلونی لڑکی تھی۔ جب وہ اسکول کے لیے گھر سے نکلتی تو مراد بس اسٹاپ تک اس کا تعاقب کرتا تھا۔ جب تک وہ بس میں سوار ہو کر اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو جاتی، وہ ادھر اسٹاپ پر ہی کھڑا رہتا تھا۔ اسے بلی کی اسکول سے واپسی کا وقت بھی اچھی طرح ذہن نشین تھا۔ وہ اسے بس اسٹاپ سے گھر تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔

جب کسی شخص کے معمولات میں اس قدر ”نظم و نسق“ ہو پھر فریق ثانی بھلا کیسے ایسی سرگرمیوں سے بے خبر رہ سکتا ہے۔ بلی کو بھی بخوبی احساس تھا کہ محلے کا ایک آوارہ لڑکا اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ابھی تک مراد کی کوئی قابل اعتراض حرکت بلی کے نوٹس میں نہیں آئی تھی لہذا وہ مراد کی ان حرکات کو اچھال کر بلاوجہ کوئی ایٹو نہیں بنانا چاہتی تھی۔ یہ سب کچھ یونہی چل رہا تھا کہ ایک روز اس۔۔۔ معمول میں اچانک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔

اس دن بلی حسب معمول چھٹی کے وقت جب اسکول سے واپس لوٹی تو بس اسٹاپ پر مراد موجود نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے کسی بھی مرحلے پر مراد میں اپنی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا تاہم وہ روزانہ اس آوارہ لڑکے کی شکل دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی چنانچہ اس روز مراد کی غیر موجودگی اسے عجیب سی لگی۔

بلی نے غیر ارادی طور پر گردن گھما کر چاروں جانب نگاہ دوڑائی پھر اپنے گھر کی سمت قدم بڑھا دیے۔ جب وہ

آئندہ تین چار روز تک مراد نے بلی کا تعاقب نہیں کیا اور دن رات یہی سوچتا رہا کہ بلی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا تھا۔ اس سنگ دل لڑکی نے تو مراد کی محبت کے نوزائیدہ پودے کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا۔ جب انسان کسی معاملے پر سوچ بچار کرتا ہے تو دماغ سے کوئی نہ کوئی جواب ضرور آتا ہے۔

مراد کے دماغ نے سمجھایا کہ یہ عشق و محبت اس کے بس کا کام نہیں لہذا اس بکھیڑے کو چھوڑ چھاڑ کر اسے آگے بڑھ جانا چاہیے لیکن دل نے اس کے برخلاف فیصلہ دیا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاؤ دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلشنگ

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیئر لیکسٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئی روڈ کلاسی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

اپنی گلی میں داخل ہونے ہی والی تھی تو اسے اپنے تعاقب میں کھنکھانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے پکارا بھی گیا۔

”بلی جی..... ایک منٹ.....“

بے ساختہ اس کے قدم تھم گئے اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے مراد کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک کتاب اٹھا رکھی تھی۔

”جی فرمائیں؟“ وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئی۔

”میں آپ ہی کے محلے میں رہتا ہوں۔“ مراد نے خوشگوار لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مراد علی ہے۔“

”جی، جانتی ہوں۔ آگے بولیں!“ بلی نے رکھائی سے کہا۔

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”کیا یہی بتانے کے لیے آپ نے مجھے روکا ہے.....؟“

”اگر آپ میرے دلی جذبات کی قدر کریں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ مراد نے خوشامد انداز میں کہا۔ ”آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”ایسے فضول کاموں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ بلی نے اکھڑے لہجے میں کہا اور جانے کے لیے مڑی۔

”میں یہ آپ کے لیے لایا ہوں۔“ مراد نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کو آگے بڑھاتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔

بلی ایک لمحے کے لیے رکی اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”شعر و شاعری کی کتاب ہے۔“ مراد نے حتی الامکان شیریں انداز میں کہا۔ ”آپ پڑھیں گی تو بہت لطف اندوز ہوں گی۔ یہ آپ کے لیے میرا پہلا تحفہ ہے۔“

”مجھے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی آپ کے گھٹیا جذبات سے۔“ بلی نے ناگواری سے کہا۔ ”آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں ورنہ ایک دن آپ کو بری طرح پچھتانا پڑے گا.....“

مراد دنگ رہ گیا۔ بلی کے دھمکی آمیز انداز نے اس کی محبت کے غبارے میں سوئی چھو دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ بلی نے وہ شعری مجموعہ کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا ہو۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

اس دوران میں بلی تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اندر کا عاشق اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا چنانچہ چند روزہ ”عطل“ کے بعد وہ دوبارہ ”کام“ سے لگ گیا۔
مراد کو ”غیر حاضر“ پا کر بلی نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ ایک مصیبت سے جان چھوٹی لیکن جب مراد سے دوبارہ اپنے تعاقب میں دکھائی دیا تو اسے بہت غصہ آیا اور ایک روز اس نے خود ہی رک کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت بھی وہ اسکول ہی سے واپس آرہی تھی۔ مراد چند قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ قدرے کم بھڑوالی جگہ دیکھ کر رکی تو مراد چونک اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بلی اچانک رک کیوں گئی۔ وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”میں نے شرافت کی زبان میں تمہیں جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی بھی وہ تمہاری عقل میں نہیں آیا۔“ بلی نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے، مجھے تمہارا کوئی بندوبست کرانا ہی پڑے گا۔“

بلی کے خطرناک تیور دیکھ کر مراد گھبرا گیا پھر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے اس دن کے رویتے پر شرمندہ ہوں۔ اگر آپ کو میرا اظہار محبت برا لگا ہو تو میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ آپ کے لیے میرے دل میں جو جذبات تھے وہ میں نے.....“

”جہنم میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائے تمہارا عشق۔“ بلی ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ”اگر آئندہ تم میرے آس پاس دکھائی دیے تو سر پر اتنے جوتے برسائیں گی کہ محبت کا بھوت پر لگا کر اڑ جائے گا..... آوارہ، بدمعاش..... چلا کہیں کا.....“

اپنی اس درجہ ذلت پر مراد سلگ اٹھا۔ اسے بلی کی جانب سے ایسے جارحانہ رویے کی توقع نہیں تھی۔ توقع چھوٹی ہو یا بڑی، جب یہ پوری نہیں ہوتی تو دل میں ایک فخر سا ہیوست ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا موقع تھا کہ وہ بلی کو اس رد عمل کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اگر بات بڑھ جاتی تو لوگوں کا وہاں جمع ہونا لازمی تھا اور اس کے بعد مراد کی جو دھلائی منجھائی ہوتی اس کا تصور بھی لرزادینے والا تھا لہذا وہ کان دبا کر چپ چاپ اپنی راہ ہولیا۔

اس دُخراش واقعے کے بعد مراد ایک مرتبہ پھر گوشہ نشین ہو گیا۔ اب وہ شام و سحر اپنے دل کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ چند روز بعد جب اس کی حالت ذرا سنبھل تو دل بے قرار نے اسے پھر بلی کی سن گن لینے پر مجبور

کر دیا اور..... اس مرتبہ مراد پر آسمانی بجلی کو نڈھائی۔ اس نے دیکھا، بجلی اب ایک کار میں اسکول جا آرہی تھی۔ مراد کو اچھی طرح خبر تھی کہ ان لوگوں کے پاس کوئی کار نہیں تھی اور نہ ہی وہ کوئی گاڑی خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ پھر یہ کار کس کی تھی.....؟

یہ سوال کسی خوف ناک بگولے کے مانند اس کے دماغ میں چکرانے لگا۔ اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر وہ اس شخص کی کھوج میں لگ گیا۔ ان دنوں جس کی کار میں بلی اسکول جا آرہی تھی، وہ کالا بھینگ شخص مراد کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ اس منحوس بندے کی ٹوہ میں لگ گیا اور چند ہی روز میں وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کالا کلونا قریب اندام شخص کوئی نجومی تھا۔ اس کا نام وصی شاہ پتا چلا۔ بلی وصی شاہ کو ”انکل“ اور اس کی ماں سلٹی اسے ”بھائی صاحب“ کہہ کر بلاتی تھی۔ محلے والوں کی معلومات کے مطابق وہ بندہ بلی کے باپ شوکت حسین کا کوئی دور کا رشتہ دار تھا۔ یہ حقیقت تھی یا بلی کے گھر والوں نے ایسا مشہور کر رکھا تھا، مراد اس راز سے واقف نہیں ہو سکا۔

دو چار بار جب مراد اور وصی شاہ کا آمناسامنا ہوا تو وصی شاہ نے اسے گھور کر ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے کچا چبانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وصی شاہ کے اس انداز سے مراد کو یہ سمجھنے میں کسی وقت کا سامنا نہ ہوا کہ بلی نے اپنے انکل بلیکی کو اس کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہوگا۔

بلی کا انکل بلیکی مراد کے لیے کسی مصیبت سے کم نہیں تھا۔ وہ اس گینڈے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وصی شاہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ بلی کو اسکول لے جانے اور لانے کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

چند روز کے بعد وصی شاہ نے باقاعدہ بلی کے گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ اس بے ڈھنگے کالے مسنڈے کو بلی کے نزدیک دیکھ کر مراد کا دل خون ہو جاتا تھا۔ اسے اس رقیب روسیہ سے حسد محسوس ہونے لگا تھا لیکن چونکہ اس کا وصی شاہ پر کوئی بس نہیں چلتا تھا اس لیے مراد دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک مر کھنے کانے بھینسنے نے اس کی محبوبہ چھین لی ہو۔

وصی شاہ کی ذات کے حوالے سے مراد کی تحقیق کا سفر جاری رہا۔ چند روز کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ بلی اور سلٹی کا یا شوکت حسین کا کہیں سے بھی رشتہ دار نہیں تھا بلکہ وہ بلی کی ماں سلٹی کے چکر میں ان کے گھر کے پھیرے لگا رہا تھا۔ چور رشتوں کو محلے داری میں

تعمیل

سالن اہل کر دیتی سے باہر گر گیا اور اس کے چلنے کی بو پھیلی تو مالکن نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے غصیلے لہجے میں نئی ملازمہ سے کہا ”میں نے تم سے کہا تھا کہ خیال رکھنا، سالن کب ابنا شروع ہوتا ہے۔“

”میں نے خیال رکھا تھا جی.....!“ ملازمہ نے سعادت مندی سے کہا ”سالن گیارہ بج کر اٹھارہ منٹ پر ابنا شروع ہوا تھا۔“

”وکیل صاحب!“ قدوس صاحب نے ترحم آمیز نظر سے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ بے چارہ تو بڑا مظلوم لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے جانے کی اجازت دے دیں اور اگر ممکن ہو تو اس کی کچھ مدد بھی کر دیں۔“

”مدد.....“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”میں سمجھا نہیں قدوس صاحب؟“

”میرا مطلب ہے.....“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ وحی شاہ کو سمجھا بھجا کر یا اگر ضرورت محسوس کریں تو ڈرا دھمکا کر اس مجبور غریب کی خلاصی کر ادیں۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہوگا۔“

”یقیناً!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر مراد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم آج..... میرا مطلب ہے کل سہ پہر یا شام میں میرے آفس آ جاؤ۔ پھر تم سے تفصیلی بات ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب۔“ وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنا کوئی وزیننگ کارڈ وغیرہ مجھے دے دیں تاکہ آپ کا آفس تلاش کرنے میں مجھے آسانی رہے۔“

”تم میرے گھر کے گیٹ تک چلو۔“ میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں اپنا وزیننگ کارڈ بھی دیتا ہوں اور آفس کا ایڈریس بھی سمجھا دیتا ہوں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے باری باری اپنی پڑوسی قبیلے کے ممبران کی طرف دیکھا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ لوگ اطمینان اور سکون سے سو سکتے ہیں۔ میں چور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں.....“

ان سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔

☆☆☆

زیادہ عرصے تک چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ منجانب آباد محلے والے خصوصاً اس محلے کی عورتیں اس نوعیت کی تنقید اور تحقیق میں ”پی ایچ ڈی کرنا لوجی“ سے کم نہیں ہوتیں.....

جب مراد کو یہ یقین ہو گیا کہ وحی شاہ سسلی پر رال ٹپکا رہا ہے تو اس کے دل کو قدرے اطمینان محسوس ہوا۔ وہ خوش تھا کہ وحی شاہ کی نظر بلی پر نہیں ہے لیکن اس انکشاف سے بھی مراد کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ بلی کا طلب گار تھا جو اس سے ”کوسوں دور“ وحی شاہ کی نگرانی اور محافظت میں تھی اور اس صورت حال نے مراد کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تھی۔

ایک روز بڑا ہنگامہ خیز اور خطرناک واقعہ رونما ہوا جب وحی شاہ نے مراد پر اپنی گاڑی چڑھا کر اسے مارنے کی کوشش کی۔ مراد کی قسمت اچھی تھی کہ اسے بروقت خطرے کا احساس ہو گیا، اس لیے وہ بال بال بچ گیا۔ اس کے بعد تو گویا وحی شاہ نے باقاعدہ مراد کے خلاف محاذ ہی کھول دیا۔

چند روز بعد جب ان کا سامنا ہوا تو وحی شاہ نے پستول نکال کر مراد کو دھمکی دی۔ ”اگر تم نے بلی کا خیال دل سے نہ نکالا تو میں کسی تاریک کونے میں تمہیں ایک گولی مار کر ٹھنڈا کر دوں گا.....“

وحی شاہ نے اتنی سفاکی سے یہ جملہ ادا کیا تھا کہ مراد اندر باہر سے لرز کر رہ گیا تھا۔ وحی شاہ کی آواز میں جھٹکے استیقام کو محسوس کر کے مراد کو یقین ہو گیا کہ وہ کالا ناگ اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں کسی تکلف سے کام نہیں لے گا۔

یہاں تک اپنی داستان سنانے کے بعد مراد نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وکیل صاحب! یہ ہیں وہ حالات جن سے میں ان

دنوں گزر رہا ہوں۔ اس خبیث کالے جن وحی شاہ نے میرا جینا حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ کبھی وہ پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں میرے پیچھے لگا دیتا ہے۔ پولیس خواجواہ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔ میں، چالیس روپے دے کر ہی ان سے جان چھڑانا پڑتی ہے اور اب تو جناب.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک جھرجھری لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس کمبخت کالے بھجنگ نے میرے پیچھے کرائے کے غنڈے لگا دیے تھے جو میری جان لینا چاہتے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے اس بنگلے میں کوڈر جان بچائی ہے۔ آگے پتا نہیں، کیا ہوگا.....“

پڑتی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن وہاں قدوس صاحب کے گھر میں ان کی بیوی اور دونوں بیٹیاں نہیں بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھیں اور بلی والے قصبے پر ان کی دلچسپی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس صورت حال میں تم خاصے نروس ہو رہے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان لوگوں کے سامنے بلی والا واقعہ بیان کرتے ہوئے مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔“

سیکریٹری نے آفس بوائے کے ہاتھ ایک ٹھنڈی ٹھار بوتل میرے ٹیمبر میں پہنچا دی تو میں نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بوتل بھی پیتے جاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب۔“ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

”میرا اشارہ بلی کی طرف ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے وحی شاہ کی عداوت کے چند نمونے دیکھ لیے ہیں۔ کیا ان حالات میں بھی تم بلی کی محبت کا دم بھرو گے؟“

میں نے یہ سوال دو مقاصد کی غرض سے کیا تھا۔ ایک مقصد تو محض مراد علی سے چھیڑ چھاڑ کرنا تھا اور دوسرے میں اس کی محبت کے ٹمپر پچر کو ناپ کر اس معاملے میں اس کی سنجیدگی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

”جناب.....“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”میں تو ایسی محبت سے باز آیا جس میں میری جان ہی داؤ پر لگ جائے اور میں زندگی بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپتا پھروں۔“

”اس کا مطلب ہے، تم نے بلی کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”جی.....“ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ ”ظاہر ہے.....“

”اس کا مطلب ہے، تم کچے عاشق ہو.....“

”بات کچے اور کچے کی نہیں ہے وکیل صاحب۔“ وہ پرسوج انداز میں بولا۔

میں نے بھی اسی کے انداز میں پوچھ لیا۔ ”پھر کیا بات ہے؟“

اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ بلی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ ”وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔“ وہ بہت ہی حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی ہے۔ اس کے تصور پر ہی میرا

آئندہ روز جب میں عدالتی بکھیرے ٹمٹا کر اپنے آفس میں پہنچا تو مراد علی پہلے سے وہاں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت میرے آفس کے ویٹنگ روم میں مراد کے علاوہ بھی تین چار کلائنٹ موجود تھے۔ میں نے سب کے سلام کا جواب دیا اور سبک خرامی سے چلتے ہوئے اپنے جیمبر میں داخل ہو گیا۔ مراد علی کی باری پر میری سیکریٹری نے اسے میرے پاس بھیج دیا۔

رنگی علیک سلک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا حال ہے جوان؟“

”اللہ کا شکر ہے وکیل صاحب۔“ وہ چمک کر بولا۔

”ابھی تک تو ٹھیک ٹھاک ہی ہوں۔“

”جس اللہ کا تم نے شکر ادا کیا وہ ہمیشہ تمہیں اپنی حفاظت اور نگہبانی میں رکھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آمین.....!“ وہ تشکرانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”رات امن و امان سے اپنے گھر پہنچ گئے تھے نا۔ وحی شاہ کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے کہیں دوبارہ تمہیں گھیرنے کی کوشش تو نہیں کی؟“

”جی نہیں..... سب خیریت گزری۔“ وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

گزشتہ رات مراد علی جس قدر ڈرا سہا ہوا دکھائی دیتا تھا آج اس کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اس وقت وہ خاصے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا اور مطمئن بھی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے شٹلے گرم کی پیشکش کی تو وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے وکیل صاحب۔ اگر آپ مجھے اس مصیبت سے نکال دیں تو آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہوگا۔“

میں نے انٹرکام کا ریسپور اٹھا کر موسم کی مناسبت سے مراد کے لیے کولڈ ڈرنک لانے کے لیے اپنی سیکریٹری سے کہہ دیا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں اپنے آفس میں محض اسی لیے بلایا ہے تاکہ تمہارے اس مسئلے کا کوئی ٹھوس اور پائیدار حل نکالا جاسکے۔“

”جی بہت شکریہ وکیل صاحب۔“ وہ عقیدت بھرے انداز میں مجھے نکتے لگا۔

”میں اگر چاہتا تو کل رات ہی تم سے بہت ساری باتیں کر لیتا اور تمہیں میرے آفس آنے کی زحمت نہ اٹھانا

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ دشمن سے ہمیشہ بچو اور دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری زیادہ تعریف کرنے لگے۔

☆ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ نیکی کرتے وقت بدلے کی توقع نہ رکھو کیونکہ نیکی کا بدلہ انسان نہیں اللہ دیتا ہے۔

☆ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا کہ انسان کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح نرم ہونا چاہیے۔

☆ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے سچے دل سے کوشش کی وہ ضرور کامیاب رہا۔

☆ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

☆ حضرت علیؓ نے فرمایا جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاضِ بٹ، حسن ابدال

ندامت کا آنسو

عقل کی لاکھوں دلیلیں اللہ تعالیٰ سے ایک گناہ معاف نہیں کروا سکتیں لیکن..... ندامت کا ایک آنسو ساری زندگی کے گناہ معاف کروا سکتا ہے۔

مرسلہ۔ ماریہ چودھری، تابہر، پاک پتن شریف

”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آج کے بعد تم بلی سے ملنے یا اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکیدِ انداز میں کہا۔ ”اور نہ ہی وصی شاہ یا بلی کی ماں سلمیٰ سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ رکھو گے..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے یقینی انداز میں بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”گڈ.....!“ میں نے نوٹ پڑھ کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے قلم سنبھال لیا اور کہا۔ ”تم مجھے بلی کے گھر کا ایڈریس

دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے دل کا تو یہی مطالبہ ہے کہ اسے ہر قیمت پر بلی چاہیے لیکن اس کے رویے اور رد عمل نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اس نے میری محبت کی توہین کی ہے اور پھر اپنے اس کالے جن انکل وصی شاہ کو میرے پیچھے لگا کر میرا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔ آپ کسی طرح وصی شاہ سے میری جان چھڑا دیں تو میں سکھ کی سانس لوں گا۔“

”وصی شاہ سے تو میں تمہاری گلو خلاصی کرادوں گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”ایک نہیں، میں دس وعدے کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔

”دس نہیں، صرف ایک!“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”لیکن ایسا وعدہ کہ جس کی تمہیں ہر حال میں پاسداری کرنا ہوگی۔“

”جی میں سمجھ گیا۔“ وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے پُر عزم لہجے میں بولا۔

”بلی کو بھول جاؤ۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”کک..... کیا.....؟“ وہ بھونچکا نظر سے مجھے گھنٹے لگا۔

”وعدہ کرنے میں کوئی وقت پیش آرہی ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں کوشش کروں گا وکیل صاحب!“

”کوشش نہیں..... یہ کام یقینی طور پر کرنا ہوگا۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”ہاں یا نہ.....؟“

”ہاں۔“ وہ مضبوط انداز میں بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں بلی کو بھول جاؤں گا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”لیکن اگر وہ خود بخود میرے خیالوں میں آگئی تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ”انسان کو اپنی سوچوں پر تو اختیار نہیں ہے نا۔“

”سوچنا انسان کی فطرت ہے۔“ میں نے بڑی رصان کے ساتھ کہا۔ ”اور فطرت پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی.....“

”لحاقی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

کہا۔ ”کیا میں نے تمہیں نوکری کرنے سے منع کر رکھا ہے؟“
 ”نہیں جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ خفیف
 ہوتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ”کیا ایک کام نہیں ہو سکتا؟“
 ”کون سا کام؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔
 ”آپ اپنی فیس ادھار نہیں کر سکتے؟“ اس نے
 عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”ادھار..... کیا مطلب؟“ میں نے سوالیہ نظر سے
 اس کی طرف دیکھا۔

”جی، میرا مطلب یہ ہے کہ.....“ وہ جلدی سے
 وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر آج میں بے روزگار ہوں
 تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بے روزگار رہوں
 گا۔ میں جیسے ہی کسی کام پر لگوں گا، سب سے پہلے آپ کی
 فیس ادا کروں گا۔“

در اصل، میرا مراد علی سے فیس لینے کا کوئی ارادہ نہیں
 تھا۔ اس کا کام ایسا تھا کہ جس کے لیے مجھے کوئی خاص چارہ
 جوئی کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ
 اس وقت میری فیس ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں
 پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں یہ ساری گفتگو درحقیقت اس
 کے اندر احساسِ ذمہ داری کو جگانے کے لیے کر رہا تھا۔

”اوں.....“ میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی
 پھر کہا۔ ”تمہاری تجویز تو بری نہیں ہے مگر اس کے لیے میری
 ایک شرط ہے۔ اگر تم میری یہ شرط ماننے کے لیے تیار ہو جاؤ
 تو میں اپنی فیس ادھار کر لوں گا۔“

”جی بتائیں۔“ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے
 بولا۔ ”آپ کی کیا شرط ہے؟“

”یہ ایک ایسی شرط ہے کہ جس کے ماننے سے تمہاری
 جیب میں خود بخود پیسے آنے لگیں گے۔“ میں نے ڈرامائی
 انداز میں کہا۔ ”پھر تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکو گے کہ تم ایک
 مفلس اور کنگے انسان ہو۔“

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ایسا کون سا کام ہے۔
 میرا مطلب ہے..... ایسی کون سی شرط ہے۔“

”تم آج کے بعد اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹاؤ
 گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکید
 انداز میں کہا۔ ”امداد علی کو اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت
 ہے۔ اس بے چارے نے ساری زندگی محنت مشقت کر کے
 تمہیں پالا پوسا ہے، تمہیں جوان کیا ہے۔ اس کے بدلے
 میں تم نے اسے کیا دیا ہے؟ کچھ بھی نہیں.....“ میں سانس
 ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے

نوٹ کر اُدو۔“
 اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔
 میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے بوڑھے والدین کو
 ان غیر یقینی حالات کی کچھ خبر ہے؟“
 ”نہیں!“ وہ گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے
 بولا۔ ”وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”کیا وہ لوگ تمہارے عشقیہ معاملات سے بھی
 واقفیت نہیں رکھتے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں وکیل صاحب..... انہیں کچھ پتا نہیں۔“
 ”ٹھیک ہے.....“ میں نے خلا میں گھورتے ہوئے

پرسوج انداز میں کہا۔ ”سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا۔“
 ”میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔“ وہ تیزی سے پلکیں
 جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”اس طرح چٹکی بجاتے میں کس طرح
 کام ہو سکتا ہے؟“

”برخوردار! تمہارا مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل نہیں
 ہو گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے
 ہوئے کہا۔ ”اس کے لیے مجھے چند روز تک دوڑ دھوپ کرنا
 ہوگی اور چونکہ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا اس لیے
 میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ دیا کہ..... سمجھ لو، تمہارا
 کام ہو گیا۔“

”اوہ.....“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ
 بہت ذہین اور باکمال وکیل ہیں۔“

”ان خالی خالی تعریفی جملوں سے کام نہیں چلے گا
 مراد علی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”جناب! میں نے یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ دی۔“ وہ
 جلدی سے بولا۔ ”میں دل سے آپ کا معترف ہو گیا ہوں۔“

”اچھی بات ہے مگر.....“
 ”مگر کیا وکیل صاحب؟“ میری بات مکمل ہونے

سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔
 میں نے کہا۔ ”وکالت میرا پیشہ ہے، میرا روزگار

ہے، یعنی میری روزی روٹی ہے اور میں یہ کام فی سبیل اللہ
 نہیں کرتا ہوں۔ تمہیں میری اس دوڑ دھوپ، اس کڑی محنت

کی فیس دینا ہوگی۔“
 ”فیس.....!“ اس کے چہرے پر پریشانی کے

تاثرات ابھرے۔ ”لیکن میں تو ایک بے روزگار شخص
 ہوں۔ آپ کی بھاری فیس کیسے ادا کر سکتا ہوں؟“

”اگر تم بے روزگار ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“
 میں نے تفریح کے عمل کو گہری سنجیدگی سے جاری رکھتے ہوئے

”مجھے سوچنے دو۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔
 ”چند روز بعد بتاؤں گا۔“
 ”بہت مہربانی جناب کی۔“ وہ احسان بھری نگاہ سے
 مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے؟“
 ”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
 ”ٹھیک ہے مراد علی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے
 میں کہا۔ ”تم تین چار دن کے بعد میرے دفتر چکر لگانا۔ میں
 تمہارے لیے کوئی صاف ستھری اور ڈھنگ کی مصروفیت
 تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
 اس نے تہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا پھر پُر جوش انداز
 میں مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

غریب آباد کا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ایک روز
 آفس سے واپسی پر میں سسلی کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ وہاں
 اکثر میرا آنا جانا نہیں ہوتا تھا تاہم میں اس علاقے کے کلی
 کوچوں سے بخوبی واقف تھا لہذا سسلی اینڈ کمپنی کا گھر تلاش
 کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ویسے مراد
 علی نے اتنی تفصیل سے اس کے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا تھا کہ
 کسی دشواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مراد علی خود بھی
 ایک کلی چھوڑ کر اسی محلے میں رہتا تھا۔

سسلی کے گھر کے باہر پرانے ماڈل کی ایک گاڑی
 کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار اس سے تھوڑے فاصلے پر
 پارک کر دی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ پرانے
 ماڈل کی گاڑی وحشی شاہ کی ہو سکتی تھی جس میں مراد علی کے
 بیان کے مطابق وہ سسلی کی بیٹی سحرش عرف بلی کو اسکول
 لانے لے جانے کا فریضہ ادا کرتا تھا۔ اگر وہ گاڑی سسلی کے
 گھر کے سامنے موجود تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ
 وحشی شاہ بھی اس وقت گھر کے اندر موجود ہوگا۔ اس علاقے
 میں متوسط طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے لہذا بہت کم
 گھروں کے سامنے گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

یہ واقعہ گزرے وقتوں کا ہے۔ اس زمانے میں آج
 کی طرح مختلف بینکوں نے عوام کے لیے گاڑیوں کا جمعہ
 بازار نہیں لگایا ہوا تھا۔ ایک تو اس وقت بینک ہی کنتی کے
 ہوا کرتے تھے پھر ان کی جانب سے عوام کے لیے ایسی
 پُرکشش آفرز بھی نہیں ہوا کرتی تھیں جیسی آج کل ہیں۔
 ان دنوں تو گاڑی کا حصول اتنا آسان ہو گیا ہے کہ چاہے
 گھر میں آتا ہو یا نہ ہو مگر گھر کے باہر یا اندر گاڑی دیکھنے کو

ہوئے کہا۔
 ”تم نے اس غریب کے ارمانوں کے شیش محل چکنا چور کر دیا ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش کے نتیجے
 میں اگر تم پڑھ لکھ کر اس معاشرے کے ایک مفید انسان
 بن جاتے تو اس بیچارے کے خوابوں کو تعبیر مل جاتی۔
 یاد رکھو، جو لوگ اپنے والدین کو ناخوش رکھتے ہیں انہیں
 دنیا اور آخرت میں کبھی فلاح نہیں ملتی اور اگر کسی شخص کا
 باپ اس سے ناراض ہے تو خدا بھی اس شخص سے خفا
 ہو جاتا ہے۔“

وہ حیرت اور بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے
 دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی آواز برآمد
 ہوئی۔ ”آپ وکیل صاحب ہیں یا کوئی مولوی.....؟“
 ”ارے نہیں بھی..... انہیں تو اپنے بھگڑوں سے
 فرصت نہیں۔“

مراد علی حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر
 میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ”وکیل صاحب!
 آپ تو زبردست انسان ہیں۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں۔“
 ”گویا تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟“ میں
 نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی، میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“ وہ
 اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے اس امر کی تصدیق چاہ رہا تھا کہ میری
 ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کل سے تم اپنے باپ کا ہاتھ
 بٹانے اس کے گیراج جایا کرو گے۔“

”وکیل صاحب.....!“ وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز
 میں بولا۔ ”میں کام کرنے کے لیے تو تیار ہوں لیکن
 موٹر مکینیکل نہیں کروں گا۔“

”کیوں.....!“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی
 طرف دیکھا۔ ”اس کام میں کیا خرابی ہے؟“

”اس کام میں ہاتھ، منہ اور کپڑے سب.....“
 ”کالے ہو جاتے ہیں؟“ میں نے اس کی بات قطع
 کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟“

”جی.....“ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”آپ نے
 بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔“

”اوکے!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اگر
 تمہیں یہ کام پسند نہیں تو رہنے دو۔ میں تمہارے لیے کچھ اور
 بندوبست کرتا ہوں۔“

”اور بندوبست کیا؟“ وہ پوچھے بنانہ رہ سکا۔

ضرور مل جائے گی۔ دنیا والے جب ہمارے ملک کی سڑکوں پر گاڑیوں کا سیل آب رواں دیکھتے ہیں تو حیرت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ..... ایسے ہوتے ہیں غریب ملک؟ اس زمانے میں گاڑی اسی شخص کے پاس ہوتی تھی جو گاڑی رکھنا افورڈ کرتا تھا۔ آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔

میں نے سلمیٰ کے گھر کی دوڑ۔ سیل بجائی تو چند لمحات میں دروازہ کھل گیا اور ایک سائڈ نما کالا کلوٹا شخص میری نگاہ میں اجاگر ہو گیا۔ میرے ذہن نے پکارا، یہ وصی شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس قوی الجشہ، سیاہ صورت شخص نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کی تیاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے درمیان لگایا۔ اس کے سر کے سامنے والے حصے کے بال اڑ چکے تھے اور آنکھوں میں وحشت کی سرخی پائی جاتی تھی۔ میرا سرتاپا، بغور جائزہ لینے کے بعد وہ سخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

”جی..... فرمائیے؟“

میں نے فرمایا۔ ”کیا سلمیٰ اسی گھر میں رہتی ہیں؟“

”جی، رہتی ہیں۔“ اس نے سرکوا ثباتی جنبش دی پھر پوچھا۔ ”آپ کو سلمیٰ سے کیا کام ہے؟“

”سوری..... کام تو میں انہی کو بتاؤں گا۔“ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟“

دروازے کے بیچوں بیچ ایسا وہ اس جنگلی ریتجھ نے گھور کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور مجھے اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات دکھائی دے جیسے وہ مجھے دروازے سے ہی چلتا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن اسی لمحے گھر کے اندر سے ایک زنانہ آواز ابھری۔

”وصی! کون ہے باہر.....؟“

میری معلومات کے مطابق اس گھر میں بلی کی ماں صرف ایک عورت یعنی سلمیٰ ہی رہتی تھی لہذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونا چاہیے تھی کہ وصی شاہ سے استفسار کرنے والی وہ عورت سلمیٰ ہی تھی۔

”کوئی تمہیں پوچھ رہا ہے۔“ اس گینڈے نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”آکر خود ہی دیکھ لو کون ہے.....“

سلمیٰ کے سوال کے جواب میں اس کا لے بھنگ شخص نے جو کچھ کہا وہ اس بات کی تصدیق تھا کہ سلمیٰ گھر کے اندر۔

موجود تھی۔ سلمیٰ نے جس انداز میں وصی کو مخاطب کیا تھا اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ لگی کہ ان دونوں کے بیچ بڑی خطرناک نوعیت کی بے تکلفی پائی جاتی تھی، ان دونوں کے مابین ”آپ جناب“ والی کوئی اخلاقیات نظر نہیں آتی تھیں۔ ابھی انہوں نے جس انداز میں گفتگو فرمائی تھی اس طرز تو ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے میاں بیوی آپس میں بات کرتے ہیں۔

اگلے ہی لمحے وصی دروازے کے فریم سے ہٹا اور اسی فریم میں آکر سلمیٰ ج گئی۔

وہ خاصی بنی سنوری نظر آتی تھی۔ بھرا بھرا جسم جسے مائل بہ فرہبی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے چہرے سے خاص قسم کی تنک مزاجی جھلکتی تھی۔ وہ اس وقت ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس تھی اور چہرے پر تھوپے ہوئے بے دریغ میک اپ سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی تفریب وغیرہ میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے اریب قریب محسوس ہوتی تھی تاہم اس نے خود کو پچیس کا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ یہ تمام تر تجزیہ میں نے ایک نظر میں کر لیا تھا۔

میں آج سلمیٰ سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور رویے میں اپنایت کی جھلک دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھ سے ہم کلام ہونے سے پہلے اس نے میرے عقب میں میری کار کو ستائی نگاہ سے دیکھا پھر بڑے معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرائی اور لگاؤ سے بولی۔

”معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں.....“

اخلاقیات کے تقاضے کے پیش نظر کہنا تو نہیں چاہیے لیکن کہے بغیر بات بھی نہیں بنے گی کہ سلمیٰ کے اخلاص، مسکراہٹ اور رویے میں مجھے بازاری پن سا محسوس ہوا تھا چنانچہ میں نے اسی کے لیول پر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

”ارے، آپ پہچانیں گی کیسے۔ ہم زندگی میں آج پہلی مرتبہ تو مل رہے ہیں.....“

یہ بات میں نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہی تھی۔ میرے اس انداز نے اسے خاصا حوصلہ دیا۔ وہ میرے لیے گھر میں داخل ہونے کا راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

”آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں تو باہر کیوں کھڑے ہیں؟“

”جب تک آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گی، میں گھر میں داخل ہونے کی جرات کیسے کر سکتا ہوں۔“ میں نے۔۔۔ بدستور مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”ورنہ آپ نے

کی اجازت ہونا چاہیے تھی اور گھر میں بٹھانے کے بعد بھی ٹوڈی پوائنٹ بات ہونا چاہیے تھی مگر ہمارے بیچ ابھی تک کوئی بھی اہم یا ڈھنگ کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں بھی کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ سسلی کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو بغیر کسی موضوع کے، کسی بھی اجنبی کے ساتھ گھنٹوں خوش دلی سے کہیں لگا سکتی تھیں اور اس کا یہ وصف یا یہ عادت کسی بھی طور مستحسن یا قابل تعریف نہیں تھا۔

”جی ضرور! میرے استفسار کے جواب میں وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”آپ کے میاں کہاں ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”جو یہ شخص اتنی دیدہ دلیری سے آپ کے اوپر مسلط ہو گیا ہے۔“

”میرے میاں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔“ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“

”اس واقعے کو تو برسوں گزر گئے ہیں۔“ وہ سادگی سے بولی پھر شاید اسے خیال آ گیا کہ میری آمد کا سبب جاننا بھی ایک ضروری کام ہے۔ ”اوہ، آپ بھی کن دھکی معاملات میں الجھ گئے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”مجھے امجد کہتے ہیں..... امجد بیگ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک وکیل ہوں۔“

”اچھا جی۔“ میرے منہ سے وکیل کا لفظ سنتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور محتاط لہجے میں کہا۔ ”وکیل صاحب! اب آپ یہ بھی بتادیں کہ مجھے کیسے جانتے ہیں اور مجھ سے ملاقات کا سبب کیا ہے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

اس نے ایک ہی سانس میں جتنے سوالات داغ دیے تھے اور وہ بھی ایک ترتیب کے ساتھ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ سسلی خاصی حاضر دماغ اور تیز طرار عورت تھی۔

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“

”ہمدردی.....“ اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”کیسی ہمدردی اور کیوں؟“

”میں آپ کو قانونی چکروں اور عدالتی بکھیرؤں سے بچانا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اگر ”چور چور“ کا نعرہ لگا دیا تو میں عزت دار بندہ دو منٹ سے پہلے دو کوڑی کا ہو کر رہ جاؤں گا۔“

”ارے، ارے..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں چوروں اور ڈاکوؤں کو ایک نظر میں پہچان لیتی ہوں۔ آپ ایک معزز شخص نظر آتے ہیں..... اندر تشریف لے آئیں۔“

چند لمحات کے بعد میں سسلی کے سامنے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کالا بھینسا وحشی شاہ بھی ہمارے پیچھے چلا آیا تھا۔ سسلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وصی! بس، میں ذرا ان سے بات کر لوں۔ پھر ہم چلتے ہیں۔“

وصی شاہ نے جواب دینے سے پہلے گھور کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ تم جلدی سے فارغ ہو جاؤ۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

وصی شاہ کے جانے کے بعد میں نے دانستہ سسلی کے ایک چٹکی کاٹی۔ ”یہ آپ کے میاں تو بہت غصے والے ہیں.....“

”یہ میرے میاں نہیں ہیں۔“ اس کے چہرے پر کچھ اس نوعیت کے تاثرات ابھرے جیسے اس نے کوئی کڑوی شے چبالی ہو۔

”میاں نہیں ہیں، کیا مطلب؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب وہی ہے جو میں نے کہا۔“

”اوکے۔ اگر یہ آپ کے میاں نہیں ہیں تو پھر؟“

”ہمارے دور کے ایک رشتے دار ہیں بلکہ ہمارے بھی کیا، یہ میرے میاں کے ایک دور کے رشتے دار ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

”قدرت نے پتا نہیں، ہمارے کن گناہوں کی سزا کے طور پر اس بندے کو ہم پر مسلط کر دیا ہے۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”جانے کب اس سے جان چھوٹے گی۔“

”واقعی.....“ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہی صورت حال ہے تو پھر آپ تو بڑے عذاب میں ہوں گی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی سا سوال کروں؟“

میں سسلی کے لیے اجنبی تھا۔ اصولی طور پر تو میرے بارے میں تسلی کرنے کے بعد ہی مجھے گھر کے اندر آنے

ہوئے کہا۔ ”تو آپ لوگوں کے معاملات اس حد تک بگڑے ہوئے ہیں۔“

”آپ کے تصور سے بھی زیادہ وکیل صاحب۔“ وہ ایک خاص ادا سے بولی۔ ”میں تو اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ الٹا اس نے آپ کو میرے پاس بھیج دیا۔ اس کے پیٹ میں کس قسم کا مروڑ اٹھا ہے، یہ تو بتادیں.....؟“

میں ایک مخصوص ذہن کے ساتھ سلیٹی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ سلیٹی سے کس نوعیت کی بات چیت کرنا ہے، یہ سب میں نے طے کر رکھا تھا۔ مراد علی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی اس کے تین حصے تھے۔ ایک حصے پر میں اس وقت عمل کر رہا تھا۔ دوسرا سیشن مراد علی کے ساتھ کرنا تھا اور تیسرے حصے میں مجھے اپنے پڑوسی قدوس صاحب سے ایک سنجیدہ میٹنگ کرنا تھی۔ یہ ایک، تین ایکٹ کا پلے تھا جس کے اینڈ پر مراد علی کے مسئلے کو لازمی حل ہو جانا تھا۔

”سلیٹی جی!“ میں نے اس کے سوال کے جواب میں اسے گہری سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ میرے پاس آپ کی شکایت لے کر آیا تھا۔“

”میری شکایت لے کر؟“ وہ منہ بگاڑ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

”جی، میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔“

”یہ تو الٹا چور کو تو الٹے کوڑاٹنے والی بات ہو گئی۔“ اس کی آواز سے غصہ ٹپکتا تھا۔ ”ناک میں اس نے ہمارا دم کر رکھا ہے اور شکایت بھی ہمارے خلاف..... یہ کیسی اندھیر نگری ہے وکیل صاحب؟“

اس نے مجھ سے سوال کیا تھا تو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی۔“

”آپ کیا تھانے دار لگے ہوئے ہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”جو وہ میری کپلین لے کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔“

”میں تھانے دار نہیں، ایک وکیل ہوں۔“ میں نے متحمل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور شکایت کا لفظ تو میں نے محض آپ کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ درحقیقت، وہ باقاعدہ مقدمے کا ارادہ رکھتا ہے۔“

”مقدمہ..... آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ غیر یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور وہ

”سوچا، جو معاملہ گھر میں نمٹایا جاسکتا ہے اسے عدالت میں لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”آپ کی باتیں میرے اوپر سے گزر رہی ہیں وکیل صاحب۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی قانونی چکر میں کیوں پڑوں گی۔ میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جو مجھے عدالت تک جانا پڑے.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”بتائیں، ایسا کون ہے جو مجھے عدالت کی سیر کرانا چاہتا ہے اور کیوں.....؟“

”وہ جو کوئی بھی ہے آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔“

میں نے اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ وہ میری بات سن کر پریشان یا خوف زدہ نہیں ہوئی تھی تاہم اس کے انداز میں وہ پہلے والی بے پروائی بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

”مگر وہ ہے کون؟“

”وہ آپ ہی کے محلے میں رہتا ہے۔“ میں نے اس کے اضطراب سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”اسی نے مجھے آپ کے گھر کا ایڈریس دیا ہے۔“

”اس کا کوئی نام تو ہوگا۔“ وہ قدرے زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ اتنی رازداری کیوں برت رہے ہیں۔“

کھل کر بتائیں، کون محلے دار مجھ سے دشمنی کے بارے میں سوچ رہا ہے؟“

”اس کا نام ہے مراد علی!“ میں نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

”اوہ.....“ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”آپ کہیں اس لڑکے کا ذکر تو نہیں کر رہے جو امداد علی موٹر مکینک کا بیٹا ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گئی ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”وہ لفنگا.....“ سلیٹی نے نفرت آمیز انداز میں کہا۔

”اس کہنے نے آپ کو میرے گھر کیوں بھیجا ہے؟“

”آپ کے روئے عمل سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ اس سے سخت خفا ہیں۔“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”خفا.....“ وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔

”وکیل صاحب! یہ تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس مردود کی گردن ہی دبا دوں۔“

”اوہ!“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے

”آپ کے خلاف نہیں.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر.....؟“ اس کی آنکھوں میں دوچند ہو گئی۔ ”ابھی تو آپ نے کہا تھا، وہ میری شکایت لے کر آپ کے پاس آیا تھا اور اسی نے آپ کو میرے گھر بھیجا ہے؟“

”جی، میں نے آپ سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔“ میں نے بڑی رسان کے ساتھ جواب دیا۔ ”دراصل، مراد کو آپ کے اس عزیز سے کوئی مسئلہ ہے جو ابھی یہاں سے گیا ہے۔ وہ اسی شخص پر مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔“

”اوہ..... آپ کا مطلب ہے، وصی شاہ پر۔“ وہ ہونٹ سیکھرتے ہوئے بولی۔ ”وصی نے اس کی کون سی بھینس چرائی ہے؟“

”بھینس چرائی ہے یا بکری، یہ تو میں نہیں جانتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بہر حال، وہ میرے توسط سے وصی شاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہے۔“

میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عملی کے ذہن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ تو مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ سلمیٰ کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو مردوں کو گھیرنے اور ان کی جیبیں خالی کرانے کی ماہر ہوتی ہیں۔ مجھے اس کے کردار یا پیشے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو محض اس مقصد سے یہاں آیا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی سلامت رہے۔ میں صرف اور صرف یہ چاہتا تھا کہ مراد علی، وصی شاہ کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے اور یہاں آمد کا مقصد سلمیٰ کو یہ باور بھی کرانا تھا کہ مراد کوئی لاوارث یا بے یار و مددگار نہیں کہ اس کے ساتھ یہ لوگ جو چاہیں، وہ سلوک کرتے پھریں۔

”اس نے شکل دیکھی ہے اپنی مقدمہ کرنے والی۔“ وہ تسخراہ انداز میں بولی۔ ”جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں اور چلا ہے مقدمہ کرنے.....“ لمحاتی توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”وکیل صاحب! آپ بھی کس احمق کی باتوں میں آ گئے.....؟“

”میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں اور اپنے پاس آنے والوں کی بات کو پوری توجہ سے سنتا ہوں۔ یہ سب میرے فرائض کا حصہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے اپنی کہانی سنانے والا وہ شخص احمق ہے یا دانشور..... البتہ“ میں نے ڈرامائی

توقف کر کے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں اپنے طور پر اس شخص کی بیان کردہ کہانی کے سلسلے میں تھوڑی تحقیق اور تفتیش ضرور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص غلط بیانی کا سہارا لے کر میری خدمات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے تو میں دو ٹوک الفاظ میں اس سے معذرت کر لیتا ہوں۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں تاکہ مراد علی کا کیس پکڑنے سے پہلے میں اپنی تسلی کر لوں۔“

یہ ساری باتیں میں نے سلمیٰ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کی تھیں ورنہ وکالت میں اس نوعیت کی تسلیوں کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی وکیل کیس پکڑنے سے پہلے اپنے موکل کا شجرہ نسب کھودنے میں لگ جائے۔ سلمیٰ کا اعتماد حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس طرح اسے اپنے ڈھب پر لانے میں مجھے آسانی ہو جاتی اور میں ذہن میں جو منصوبہ لے کر اس کے پاس آیا تھا اس میں کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے اور..... یہ دیکھ کر مجھے خوشی اور اطمینان ہو رہا تھا کہ میری باتوں نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا تھا۔

”آپ تو بہت ہی اصول پرست وکیل ہیں!“ اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اگر کوئی وکیل اصول پسند نہیں ہوگا تو وہ قانون کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے کلائنٹ کو انصاف دلوانے کی صلاحیت سے بھی پیدل ہوگا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ تعریفی انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ”یہ تو بتائیں، اس بد معاش نے آپ کو کیا کہانی سنائی ہے؟“

ہزار نفرت کے باوجود بھی وہ مراد علی کے معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بتایا۔

”مراد کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کی بیٹی بلی سے بچی محبت کرتا ہے۔ بلی بھی پہلے اس کی طرف مائل تھی لیکن پھر آپ نے بلی کو اس کے خلاف بھڑکادیا اور اس کی وجہ یہ شخص وصی شاہ ہے۔“

”وہ مراد نہیں بلکہ مراد ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔ ”ذلیل انسان سراسر بکواس کرتا ہے۔ اس نے آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلی بہت ہی شریف اور تمیز دار

ہوں۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میری باتوں نے خواہ مخواہ آپ کا موڈ خراب کر دیا حالانکہ آپ تو خوشی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔“

”کوئی بات نہیں بیگ صاحب! خوشی اور غمی تو زندگی کا حصہ ہے۔ آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ سرسری انداز میں بولی پھر سوال کیا۔ ”آپ مجھے مراد کے حوالے سے کچھ بتا رہے تھے۔“

”جی، میں آپ کو بتا رہا تھا کہ.....“ میں نے منقطع سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے کہا۔ ”مراد کا خیال ہے کہ وصی شاہ کی آمد کے بعد بلی اس سے دور ہو گئی ہے۔ آپ بلی کو وصی شاہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں اور وصی شاہ، مراد کو ڈرا دھمکا کر بلی سے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”جھوٹ بولتا ہے وہ، بکواس کرتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وصی شاہ، بلی کے باپ کا دور کارشتے دار ہے اور ہمارے گھر میں بس اس کا آنا جانا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”کیا یہ بھی غلط ہے کہ وصی شاہ نے مراد کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ایک مرتبہ وصی شاہ نے اپنی گاڑی مراد پر چڑھا کر اس کی جان لینے کی کوشش کی، دوسری بار پستول دکھا کر قتل کی دھمکی دی، تیسری دفعہ پولیس والوں کو اس کے پیچھے لگا دیا جو دن رات اسے پریشان کرتے رہتے ہیں اور جب اس پر بھی وصی شاہ کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے کرائے کے غنڈوں کو مراد کی جان لینے پر مامور کر دیا۔“

”لجاتی توقف کر کے میں نے سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”وصی شاہ کی یہ تمام تر خطرناک کارروائیاں محض اس لیے ہیں کہ مراد اپنے دل سے بلی کے خیال کو نکال دے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”میں آپ کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتی بیگ صاحب لیکن.....“

ایک بار پھر گھر کے باہر گلی میں گاڑی کے ہارن کی آواز گونجی تو سلمیٰ کو اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی اور وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ایک منٹ بیگ صاحب! میں ذرا وصی کو تسلی دے دوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی تیز خفگی بھری آواز میری

لڑکی ہے۔ وہ مراد جیسے لفٹگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی روداد نہیں کجایہ کہ وہ اس کی طرف مائل ہو جائے۔ یہی بد معاش ہاتھ دھو کر میری بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے کھچی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا.....؟“

اس کا یہ سوال سیاق و سباق سے لگا نہیں کھاتا تھا تاہم میں نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔

”امجد بیگ..... مرزا امجد بیگ۔“

”کیا میں آپ کو صرف بیگ صاحب کہہ سکتی ہوں؟“

”جی ضرور۔“ میں نے اسے اجازت دے دی۔

”بیگ صاحب!“ وہ بڑی اپنایت سے بولی۔ ”ہم اس آوارہ لڑکے کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ یہ اسکول آتے جاتے بلی کا تعاقب کرتا ہے اور اس پر گھٹیا جملے پھینکتا ہے۔ عامیانہ انداز میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وصی شاہ نے تو محض اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور یہ وصی پر مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔ بیگ صاحب! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ مراد کس نوعیت کا مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

میں نے پہلے بھی دائستہ سلمیٰ کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور اس مرتبہ بھی یہ ذکر گول کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا خیال ہے کہ آپ اچھے کردار کی عورت نہیں ہیں اور بلی کو بھی اپنی لائن پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ مراد کو بلی سے محبت ہے۔ وہ اس کی خیر خواہی چاہتا ہے اور.....“

”اس بد ذات نے اپنی ماں کے کردار کو کبھی ٹاپنے کی کوشش کی ہے جو میرے کردار پر انگلی اٹھا رہا ہے۔“ وہ تڑخ کر بولی۔ ”اور اس نے میرے سامنے یہ بات کی ہوتی تو میں گدی سے اس کی زبان کھینچ لیتی۔“

اسی لمحے باہر گلی میں گاڑی کے ہارن کی آواز ابھری۔ یہ یقیناً وصی شاہ کی حرکت تھی جو گاڑی میں بیٹھا سلمیٰ کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے سلمیٰ سے پوچھا۔ ”آپ کی بیٹی بلی اس وقت گھر میں دکھائی نہیں دے رہیں۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہیں؟“

”بلی کی ایک دوست کی آج رخصتی ہے۔“ وہ خفگی بھرے انداز میں بولی۔ ”وہ گزشتہ رات سے اپنی اسی دوست کے گھر میں ہے۔ ہم لوگ بھی ابھی شادی ہال کی طرف ہی جا رہے تھے کہ آپ آ گئے۔“

”اس کا مطلب ہے، میں بہت غلط وقت پر آیا

سماعت سے نکل آئی۔ وہ وحی شاہ سے مخاطب تھی۔
 ”دس منٹ رک جاؤ۔ بس، میں ایک اہم معاملہ نمٹا کر ابھی آ رہی ہوں۔“

چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں وارد ہوئی پھر میرے قریب ہی ایک صوفے میں دھستے ہوئے بولی۔ ”بیگ صاحب! آپ ایک سمجھدار اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ مراد کی بجواس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ کو اس کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔“

”دھیان دینا تو میرے پیشے کا تقاضا ہے سلی جی۔“ میں نے بڑی رمان سے کہا۔ ”جب تک میں آپ کی اور مراد کی باتوں پر دھیان نہیں دوں گا، مجھے کھرے کھوٹے کی پہچان کس طرح ہو سکے گی؟“

”بس تو پھر آپ میری بات کا یقین کر لیں۔“ وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مراد جھوٹا عیار اور کھوٹا شخص ہے جبکہ میں سو فیصد کھری بات کر رہی ہوں۔ مراد کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں، یہ میں تسلیم کرتی ہوں کہ وحی نے اسے سخت الفاظ میں سمجھانے کی کوشش ضرور کی تھی کہ وہ بلی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں درتہ وحی شاہ کے لیے مراد جیسے لپے لفنگے لڑکے کو سیدھا کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کام کے لیے اسے دھمکی دینے یا مراد کے پیچھے غنڈے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ وحی شاہ خاصا خطرناک شخص ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا مئی پھر جلدی سے بولی۔ ”آپ میری بات کا غلط مطلب نہ لیں بیگ صاحب! دراصل..... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ..... وحی شاہ بڑا باجمال اور..... ہنرمند شخص ہے۔“

”ہنرمند..... باکمال.....“ میں نے اسی کے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ”آپ وحی شاہ کو کن معنوں میں ان بیان کردہ اوصاف کا اہل سمجھتی ہیں؟“

”بیگ صاحب! وحی شاہ بہت بڑا نجومی ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”پھر؟“ میں نے بڑی معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ ستاروں کی چالیں دیکھ کر ہر شخص کے بارے میں بالکل درست حساب کتاب کرتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت بلی اسکول گئی ہوئی تھی اور وحی شاہ

کرتے ہوئے بولی۔ ”اور میں نے اس سے بڑا عامل آج تک نہیں دیکھا۔ اگر وہ مراد کو کوئی خطرناک سبق سکھانے کا فیصلہ کر لے تو اس کا ایک عمل.....“

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنی بات نامکمل چھوڑی تو میں نے بڑی سرعت سے سوال کیا۔ ”اس کا ایک عمل کیا؟“

”اس کا ایک عمل مراد کو خون کی الٹیاں کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔“ وہ سرا سیمہ لہجے میں بولی۔ ”اور وہ کبخت خون کی الٹیاں کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دے گا۔“

”اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وحی شاہ سفلی کا ماہر ہے؟“ میں نے چہرے پر مصنوعی خوف کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل..... وہ اس دنیا میں بہت پہنچ رکھتا ہے۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

”میں نے سنا ہے کہ.....“ میں نے بہ دستور حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ ”ایسے خطرناک کاموں کے لیے بندے کا نام مع والدہ کی ضرورت ہوتی ہے؟“

”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”اچھا ہوا، میں نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لی۔“ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اس طرح ساری حقیقت میرے علم میں تو آ گئی۔“

وہ بھی میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”اگر حقیقت آپ کی آنکھوں کے سامنے مکمل ہی گئی ہے تو اس احق کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں کہ مقدمے کا خیال ذہن سے نکال کر وہ بندے کا پتر بن جائے۔ یہی اس کے لیے بہتر ہے ورنہ خواخواہ نقصان اٹھائے گا۔ ابھی میں نے وحی شاہ کو اس نامراد کی ایک گھٹیا حرکت کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں.....“

وہ بولتے بولتے جملہ ادھورا چھوڑ کر اچانک خاموش ہو گئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی فوری خیال نے اسے آگے بولنے سے روک دیا تھا۔ اس بات نے میرے تجسس کو ہوا دی اور میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”کون سی گھٹیا حرکت؟“

”یہ کبخت مراد ایک دن موقع پا کر میرے گھر میں گھس گیا تھا۔“ وہ سنسنی خیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت بلی اسکول گئی ہوئی تھی اور وحی شاہ

لیکن اس کام کے لیے میں اپنی فیس وصول کروں گا۔
 ”ڈن!“ وہ سختی لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ نے میرا
 یہ کام کر دیا تو میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گی۔“
 ”سوری سسلی جی!“ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ”میرا
 اول روز سے یہ اصول ہے کہ میں فیس ایڈوانس لیتا ہوں۔“
 ”اوکے، میں آپ کو ایڈوانس فیس ہی دوں گی۔“ وہ
 تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس
 وقت نہیں۔ میں کل آپ کے آفس میں آپ سے ملاقات
 کرنے آؤں گی۔ مجھے آپ سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا
 ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیں تو مجھے آسانی
 ہو جائے گی۔“

”جی ضرور.....“ میں نے پرس میں سے وزیٹنگ
 کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ہوشیاری سے
 کہا۔ ”سمجھ لیں کہ اسی وقت میں نے آپ کا کیس اپنے ہاتھ
 میں لے لیا ہے لیکن اس کیس میں کامیابی اسی صورت ممکن
 ہے جب آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گی۔“
 ”مثلاً کس قسم کا تعاون؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے
 دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”صرف آپ کو مجھے ایک یقین دہانی کرانا ہوگی۔“
 میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیسی یقین دہانی بیگ صاحب؟“
 ”آج اور اسی لمحے سے آپ وحی شاہ کو مراد کے
 خلاف کسی بھی قسم کی معاندانہ کارروائی کی اجازت نہیں دیں
 گی۔“ میں نے تاکید لہجے میں کہا۔ ”نہ مادی اور..... نہ ہی
 عاملانہ قسم کی۔ آپ میری بات تو سمجھ گئی ہیں نا؟“
 ”جی بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“ وہ معنی خیز نظر
 سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ بہت ہی ذہین وکیل
 ہیں۔ ایک تیرے دوشکار کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔“
 ”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے ابھرن زدہ لہجے میں کہا۔
 ”مطلب یہ کہ آپ میرا کام کرنے کے ساتھ ساتھ
 اس نامعقول انسان کی حفاظت کا بھی بندوبست کر رہے
 ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ
 رہی بیگ صاحب؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ میں نے سرکوشاقتی
 جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ مراد کا حق بھی بتا ہے۔ اگر
 میں نے آپ کی وکالت کرتے ہوئے مراد کو کسی قسم کی
 مقدمے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کے ساتھ ہی اس امر
 کو بھی یقینی بنانا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی کا ہمیشہ کے لیے پیچھا

بھی گھر میں موجود نہیں تھا.....“
 ”لیکن اس نے حرکت کیا کی، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں؟“
 ”اس شیطان کی اولاد نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں،
 شرافت سے اس کی شادی بلی سے کر دوں ورنہ.....“ وہ
 میرے ہمراہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔
 ”ورنہ کیا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔
 وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ”ورنہ وہ بلی کو اغوا
 کر لے گا.....“

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی
 کہ سسلی دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ مراد کو برا آدمی
 ثابت کرنے کے لیے اس نے من گھڑت قصہ سنایا تھا۔
 میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”ہاں بھئی، یہ
 تو واقعی بڑی بچ حرکت ہے۔“
 ”اس کے باوجود بھی آپ اس گھٹیا ذہن اور بچ آدمی
 کی وکالت کرنا چاہتے ہیں.....؟“ وہ مجھے مراد کے خلاف
 بھڑکانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
 ”میرے پاس جو شخص بھی اپنا مسئلہ لے کر آتا ہے،
 میں اس کی وکالت کرتا ہوں کیونکہ وکالت میرا پیشہ ہے۔“
 میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے
 کہا۔ ”اگر آپ بھی مجھے کوئی کیس دیں گی تو میں آپ کا وکیل
 بن جاؤں گا۔“

”زبردست!“ وہ چونک کر میری طرف دیکھتے
 ہوئے بولی۔ ”پھر آپ ابھی میرے وکیل بن جائیں.....“
 ”کس کیس کے سلسلے میں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کیس بہت سیدھا اور سادہ ہے۔“ وہ ایک ایک
 بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ کسی طرح کوشش
 کر کے مراد کے ذہن سے بلی کا خیال نکال دیں۔ بس وہ
 میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے۔“
 سسلی جس مقصد کے حصول کے لیے مجھے اپنا وکیل کرنا
 چاہتی تھی وہ کام تو میں پہلے ہی کر چکا تھا بلکہ میں نے مراد کے
 کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس پر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ
 بلی کے عشق کے بخار سے باہر نکل آئے گا اور کبھی بھول کر بھی
 اس کی طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا اور اس نے میری
 شرط ماننے ہوئے میری اس ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ بھی
 کیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں آپ کا یہ کام کر دوں گا۔“ میں نے
 سسلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”وہ آپ کی بیٹی بلی کی طرف کبھی میلی نگاہ سے نہیں دیکھے گا

www.paksociety.com

میں آیا ہوا تھا تو سوچا آپ کو بھی سلام کرتا چلوں۔ گھر میں آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔ آپ ایک مصروف انسان ہیں۔“

”انسان کی مصروفیت اپنی جگہ مگر پڑوسیوں کے بہت حقوق ہوتے ہیں۔“ میں نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

”آپ کسی بھی وقت مجھ سے ملنے آسکتے ہیں۔“

”آپ کی نوازش ہے۔“ وہ تشکرانہ لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”اس لڑکے کا کیا بنا بیگ صاحب؟“

”کون سا لڑکا؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”بیگ صاحب! میں اس لڑکے کی بات کر رہا ہوں جو اس رات دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر میں ٹھس گیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے وہ معاملہ نمٹایا تھا اور اسے اپنے دفتر آنے کے لیے کہا تھا۔“

”اچھا وہ!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ آیا تھا اگلے روز مجھ سے ملنے اور میں نے اس کی دکھ بھری داستان بھی سنی تھی۔“

”مجھے بھی تو کچھ بتائیں۔“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”اگر آپ کو اس میں کوئی حرج محسوس نہ ہو تو.....؟“

”کوئی حرج نہیں ہے قدوس صاحب۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

وہ ہمتن گوش ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں قدوس احمد کو مراد علی سے ہونے والی گفتگو اور بعد ازاں سلمیٰ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا دیا اور ظاہر ہے، اس داستان میں سحرش عرف بلی اور اس کے نام نہاد انکل وصی شاہ کا ذکر بھی آیا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے کہا۔

”بیگ صاحب! بس اللہ معاف کرے۔ انسان کو گمراہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ یہ سلمیٰ تو مجھے کوئی باکردار اور شریف عورت نہیں لگتی اور..... یہ عامل کامل لوگ تو مجھے ایک دم زہر محسوس ہوتے ہیں۔ پتا نہیں، کیسے کیسے لٹے سیدھے دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں قدوس صاحب۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”سلمیٰ کے بارے میں میرا بھی یہی تجزیہ ہے جس نوعیت کے تجلیات کا اظہار آپ نے کیا ہے اور جہاں تک وصی شاہ کا تعلق ہے تو.....“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

چھوڑ دے تو پھر اس کا تحفظ بھی ضروری ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب! اگر مراد اچھی حرکتوں سے باز آگیا تو میں وصی شاہ کا ذمہ لیتی ہوں۔ وصی شاہ کو کیسے ہینڈل کرنا ہے، یہ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے گھر کے مین دروازے تک آگئے۔ میں نے کہا۔ ”تو یہ طے ہو گیا کہ میں نے مراد علی کو ہینڈل کرنا ہے اور آپ نے وصی شاہ کو.....“

”جی بالکل، یہ ہی طے ہوا ہے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہم گھر سے باہر نکلے تو میں نے کہا۔“ ٹھیک ہے تو پھر مجھے اجازت دیں۔“

”آپ کی آمد بہت اچھی لگی بیگ صاحب۔“ وہ بڑی لگاؤ سے بولی۔ ”لیکن ایک بات کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔“

”کس بات کا؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”آپ پہلی مرتبہ میرے گھر تشریف لائے اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی اس بداخلاقی کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔“

”زندگی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی سلمیٰ جی۔“ میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اللہ کو منظور ہوا تو دوبارہ بھی آپ کے گھر کا چکر لگ سکتا ہے۔ پھر آپ اپنا یہ شوق پورا کر لیجیے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ وہ ہل سے بولی۔

میں نے اسے ”اللہ حافظ“ کہا پھر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے قدم وصی شاہ کی گاڑی کی سمت اٹھ گئے جو کافی دیر سے اپنی گاڑی میں بیٹھا سلمیٰ کا انتظار کر رہا تھا۔

میرے سوچے ہوئے منصوبے کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی بڑی کامیابی کے ساتھ طے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

منظر میرے آفس کا تھا اور اس وقت میرے سامنے قدوس احمد بیٹھا ہوا تھا میں نے رکی علیک سلیک کے بعد کہا۔

”قدوس صاحب! خیریت تو ہے نا۔ آپ میرے آفس میں؟“

”سب خیریت ہے بیگ صاحب۔“ وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔

”آج ایک شخص سے ملنے ادھرٹی کورٹ کے علاقے

اور یہ کام میں نے بڑی کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ دوسرا مرحلہ مراد علی سے اہم ترین گفتگو کا تھا جبکہ تیسرے حصے میں مجھے قدوس احمد سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں لیکن موجودہ صورت حال میں مجھے اپنے منصوبے میں تھوڑی تبدیلی کرنا پڑی مطلب یہ کہ..... قدوس کی مراد علی میں خصوصی دلچسپی کو دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیسرے حصے کو ابھی اور دوسرے مرحلے کو بعد میں نمٹانا زیادہ مناسب ہوگا۔

”اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔“ قدوس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”اگر مراد کسی ٹھکانے لگ گیا تو اس کے دل سے آپ کے لیے جو دعا نکلے گی اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔“

”جناب! تھوڑی سی نیکی آپ بھی کمالیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ مراد علی کے دل سے آپ کے لیے بھی دعا نکلے؟“ ”ضرور..... کیوں نہیں۔“ وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”حکم کریں بیگ صاحب! میں مراد کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”اگرچہ میں نے سسلی کو اس بات کے لیے راضی کر لیا ہے کہ وہی شاہ اب مراد سے کسی بھی قسم کی دشمنی نہیں کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ سسلی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن مراد علی کا ذہن بنانے کا بھی کوئی مناسب بندوبست ہونا ضروری ہے۔ اس کے دل و دماغ پر بیلی نے قبضہ جما رکھا ہے۔“

”کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟“

”مراد کی سوچ کو بیلی سے پاک کرنے کے لیے میرے ذہن میں نیک آزمودہ کار آئیڈیا ہے۔“ میں نے نحوس انداز میں کہا۔ ”اس آئیڈیا کو بروئے کار لانے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہوگا۔“

”اور وہ آئیڈیا کیا ہے؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”مراد کا باپ، جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، وہ ایک موٹر مکینک ہے اور اسے اپنے بیٹے کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔“ میں نے اپنے منصوبے سے قدوس احمد کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مراد کو موٹر مکینکی پسند نہیں ہے۔ میں نے سوچا ہے، اسے کسی صاف ستھری نوکری پر لگا دیا جائے۔“

”یہ لوگ اپنے اندر اچھے سیدھے عملیات کے دوران میں ایک تلخ حقیقت کو بالکل فراموش کر بیٹھتے ہیں۔“ ”کون سی حقیقت بیگ صاحب؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”آپ نے ان کے اکثر سلوگن سنے ہوں گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جیسے..... سنگ دل سے سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں۔“

”جی ہاں، بالکل سنا ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ سادہ دل افراد کو بے وقوف بناتے ہیں۔“

”آخر ان عاملوں کا ملوں اور اسی قسم کے دعوے کرنے والے دیگر آلو کے پتھوں اور گدھے کے بچوں سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ انہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ یہ کسی کی بہن یا بیٹی کو کسی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کوئی عمل کریں۔“ میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”یہ تو سیدھا سیدھا جرم بلکہ سنگین جرم ہے۔“

”اگرچہ ایسا ہوتا ممکن نہیں جس قسم کے یہ لوگ دعوے کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس مذموم کاروبار کو روکنا قانون کا فرض اول ہونا چاہیے۔“ قدوس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”شہر کی ہر دیوار پر ان اشتہاری عاملوں کی چاکنگ نظر آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ان معاشرتی ناسوروں کے خلاف قانون حرکت میں آئے، الٹا پولیس ان بد معاشوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔“ ”میری آپ سے ایک درخواست ہے بیگ صاحب۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”حکم کریں قدوس صاحب؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کسی طرح سمجھا بجا کر مراد علی کو سسلی اور وصی شاہ کے چنگل سے نکال لیں۔“ اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ”مجھے وہ لڑکا بھلا لگا ہے۔ اگر وہ ان بد معاشوں کی گردش میں پھنس گیا تو پھر کہیں کا نہیں رہے گا۔“

”بھلا تو وہ مجھے بھی لگا ہے قدوس صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسی لیے تو اس کا معاملہ سیدھا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔“

میں نے اس کیس کو حل کرنے کے لیے جو تین اسٹیپ بنائے تھے ان میں ایک سسلی کے کانوں کے کپڑے جھاڑنا تھا

مراد کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا تو میں فوراً اسے یہ خوش خبریاں سنا دیتا۔ میں اگر چاہتا تو اس کا گھر تلاش کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا لیکن میں نے یہ مناسب نہ جانا اور اس کی آمد تک اپنے منصوبے کے تیسرے مرحلے کو وقتی طور پر روک دیا۔

ایک ہفتے کے بعد مجھے مراد علی کی صورت نظر آئی۔ اس وقت میں عدالت کے کمرے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا جو سٹی کورٹ کے پارکنگ لائٹ میں کھڑی تھی۔ وہ سیدھا میری ہی سمت چلا آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں رک گیا۔

وہ میرے قریب پہنچا اور بڑے احترام کے ساتھ اس نے مجھے سلام کیا۔ ”السلام علیکم بیگ صاحب!“

”وعلیکم السلام۔“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں ادھر ہی تھا، کراچی میں جی۔“ اس نے بتایا۔ ”وصی شاہ یا اس کے غنڈے تمہیں تنگ تو نہیں کر رہے؟“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں جی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ میں بہت سکون میں ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ.....“

اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”تمہیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟“

”جیسے آپ نے ان لوگوں پر کوئی جادو پھونک دیا ہو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا تم مجھے کوئی جادوگر سمجھتے ہو؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں جی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”پھر کیا مطلب تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے اس روز تم نے مجھے ”مولوی“ کہا تھا اور آج ”جادوگر“ کہہ رہے ہو.....؟“

”وہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کہ.....“

اچانک وصی شاہ کا بخار کسے اتر گیا۔ اب ایک تو اس سے میرا سامنا ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ میرے روبرو آ جاتا ہے تو اس نے مجھے گھورنا چھوڑ دیا ہے اور..... اب وہ یا اس کے غنڈے مجھے ہراساں بھی نہیں کر رہے۔“

”گنڈا آئیڈیا۔“ قدوس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

”اس کے پاس تعلیم کی شدید کمی ہے ورنہ میں اسے اپنے ہی دفتر میں رکھ لیتا۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں اگر آپ کا تعاون حاصل ہو جائے تو مراد کی زندگی کسی پٹری پر آ جائے گی۔ اس کا ذہن کام میں مصروف ہوگا تو بلی کو بھولنے میں اسے آسانی حاصل ہو جائے گی۔“

”آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیگ صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”ڈینسو ہال پر میری گھڑیوں کی جو دکان ہے اس میں، میں نے دو ملازم بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ میں مراد کو اپنی دکان پر رکھ سکتا ہوں۔

کام صاف ستھرا ہے اور اس کے لیے زیادہ تعلیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اس طرح اس کی فوری آمدنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جب وہ مجھ سے ملنے آئے گا تو میں اسے سیدھا آپ کے پاس بھیج دوں گا۔“ میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

”آپ کو مایوسی نہیں ہوگی بیگ صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”تمہیں کہ آپ نے اسے میرے پاس بھیجا اور..... اس کا کام ہو گیا۔“

”گنڈا.....!“ میں نے تعریفی نظر سے قدوس صاحب کی طرف دیکھا۔

ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک اس موضوع پر بات چیت ہوتی رہی پھر وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

جیسا کہ آپ کو میں بتا چکا ہوں، سلمیٰ نے میرے آفس آکر فیس ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے وعدے کی پکی نکی اور اگلے روز اس نے آفس آکر مجھ سے ملاقات کی اور میری فیس بھی ادا کر دی۔ اس روز سلمیٰ سے میری جو گفتگو آفس میں ہوئی اس کا زیر نظر کس سے کوئی تعلق نہیں لہذا میں اس کا ذکر گول کرتا ہوں۔

مراد علی کے حوالے سے میرے پاس دو خوشخبریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وصی شاہ اور اس کے غنڈوں سے میں نے ہمیشہ کے لیے اس کی جان چھڑا دی تھی اور دوسرے اس کی ملازمت کا بھی بندوبست ہو گیا تھا۔ اگر میرے پاس

رپورٹ

استاد شاگرد سے۔ ”تمہارے ابا نے تمہاری اسکول رپورٹ دیکھ کر کیا کہا؟“
شاگرد۔ ”سر! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس میں سے سخت الفاظ اور گالیاں حذف کر دوں؟“
استاد۔ ”اجازت ہے.....“
سر۔ ”انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

محبت کی شادی

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔
”تمہارا کہنا ہے کہ تم جس لڑکی سے شادی کر رہے ہو وہ کروڑوں کی دولت اور جائیداد کی مالک تو ہے مگر نہایت بد صورت لڑکی ہے۔“

”ہاں!“ دوسرے دوست نے تائید کی۔
”اس کے باوجود تمہارا کہنا ہے کہ یہ محبت کی شادی ہے۔“ پہلے دوست نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔
”ہاں! مجھے دولت سے محبت ہے نا!.....“
دوسرے دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

”بھئی وہ اپنے مرزا صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟“
”دوب کر مر گئے۔“

”ارے وہ دھان پان سے تو تھے، کیا تیرا کی فرما رہے تھے؟“

”نہیں بھئی! وہ تو گھر کی ٹینکی میں پانی دیکھ رہے تھے کہ بچے نے چٹکے کا رخ ان کی طرف کر دیا۔“

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

لطیفہ

ایک کشتی میں چار ملکوں کے آدمی سفر کر رہے تھے۔ امریکی، جاپانی، انڈین اور کشمیری، امریکی نے جلدی سے اپنی شراب کی بوتل سمندر میں پھینک دی اور فخر سے بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ بہت پائی جاتی ہے۔ جاپانی نے جلدی سے اپنی گھڑی اتار کر پھینک دی اور بولا ہمارے ملک میں یہ بہت پائی جاتی ہیں۔ کشمیری نے جلدی سے انڈین کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور فخر سے بولا کہ ہمارے ملک میں یہ بہت پائے جاتے ہیں۔

مرسلہ۔ اسرار ساقی، ڈسٹرکٹ جیل انک

”بیٹا جی! وحشی شاہ کا بخار کوئی عام نوعیت کا نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو کہ خود بخود ہی اتر گیا ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے لگا تار تین چار انجیکشن دے کر اس کے بخار کو رخصت کیا ہے۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں بیگ صاحب!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ مولوی بھی ہیں، جادوگر بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی.....“

”بس بھائی، بہت ہو گئی میری تعریف۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب جلدی سے یہ بتا دو کہ اس وقت تم عدالت میں کیا کر رہے ہو؟“

”وہ جناب، میں ملنے تو آپ ہی سے آیا تھا لیکن مجھے ٹائم کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ ادھر دفتر میں نہیں تھے تو میں ادھر کورٹ آ گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”یہ..... بس اتنی سی بات نہیں ہے مراد۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”تم ادھر آئے ہو تو میں ادھر جا رہا ہوں۔“

”مطلب، آپ ابھی دفتر جا رہے ہیں؟“
”ہاں، عدالت میں میرا کام ختم ہو گیا ہے اور میں اب آفس ہی جاؤں گا لیکن لُچ کرنے کے بعد۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، آپ لُچ وغیرہ سے فارغ ہو جائیں۔“
وہ جلدی سے بولا۔ ”میں تھوڑی دیر میں آپ کے آفس پہنچتا ہوں۔“

”کیا تم نے لُچ کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں..... نہیں۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجہ میں بولا۔

”تو تم میرے ساتھ ہی چلو۔“ میں نے کہا۔
”ایک ساتھ لُچ کرتے ہیں اور وہیں پر تم سے بات بھی ہو جائے گی۔“

”مجھے کوئی خاص بھوک نہیں ہے.....“ وہ تکلف سے کام لیتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھی عام بھوک ہی ہے، کوئی خاص نہیں..... آؤ۔“
میرے ”آؤ“ میں اتنی توانائی تھی کہ وہ مزید کوئی حیل و حجت نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے جہاں میں روزانہ لُچ کیا کرتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے کھانوں کی تعریف میں پہلے ہی کئی مرتبہ کر چکا ہوں۔

جب میری زبانی مراد علی کو پتا چلا کہ میں نے سرتوڑ

کوششیں کر کے سلمیٰ اور وصی شاہ کو اس سے دشمنی کرنے سے روک دیا ہے تو وہ احسان بھری نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ اس احسان مندی میں حیرت کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

”آپ کی ان لوگوں کے ساتھ کیا باتیں ہوئی ہیں؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔“ میں نے اپنے منصوبے کے تیسرے اور آخری حصے پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے حوالے سے ان پر بہت کچھ واضح کر دیا ہے۔“ ”اوہ شکریہ بیگ صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”آپ کی بہت مہربانی ہے۔“

”میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ اگر تمہارا بال بھی باز کا ہوا تو میں ان دونوں کو عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ تمہیں کوئی کمزور اور لاوارث انسان نہ سمجھیں۔“

”زبردست.....“ وہ پُر جوش انداز میں بولا۔

”آپ نے تو کمال کر دیا۔ جیسی میں کہوں کہ وصی شاہ مجھ پر اتنا مہربان کیسے ہو گیا۔ تو..... یہ سب آپ کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔“

”ہاں.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرط جذبات میں آ کر تم ہاتھ ہی روک لو.....“

”جی.....“ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے ابھمن زدہ لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھا نہیں جناب۔ میں نے کہاں اپنے ہاتھوں کو روکا ہے؟“

”اس وقت ہم کون سا کام کر رہے ہیں؟“

”کھانا کھا رہے ہیں.....“ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

”بس اسی کام سے تم نے ہاتھ روک لیا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”باتیں تو چل ہی رہی ہیں، کھانے کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”جی ضرور.....“ وہ کھسیا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔“

کہ اگر احسان مند انسان کو کسی بھی طور قرار نہ مل رہا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ جب تک وہ احسان کا بدلہ نہیں اتارے گا، اسے سکون حاصل نہیں ہوگا تو پھر اسے ”احسان کا بدلہ احسان“ کے فارمولے پر عمل کرنا چاہیے.....“ لچاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم بھی کبھی ایسی ذہنی بے سکونی کی کیفیت سے دوچار ہو جاؤ تو میرے اس احسان کا بدلہ چکا کر حساب برابر کر دینا۔“

”مگر..... میں آپ پر کس طرح احسان کر سکتا ہوں بیگ صاحب۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ”میں تو بہت کمزور انسان ہوں۔“

”احسان کا کمزوری اور طاقت وری سے کوئی تعلق نہیں مراد۔“ میں نے کہا۔ ”بس، اس کام کے لیے انسان کی نیت صاف اور ارادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ قدرت خود ہی مدد کر دیتی ہے۔“

”میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے اور نہ ہی ارادہ کمزور ہے۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”اب دیکھیں، قدرت کب مجھے موقع فراہم کرتی ہے۔“

”واقعی، تمہاری نیت کی سچائی اور ارادے کی مضبوطی کا مجھے یقین آ گیا۔“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”اس لیے قدرت نے تمہیں ابھی اور اسی وقت موقع فراہم کر دیا ہے۔“

”جی.....“ وہ ہونفوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ نکلنے لگا۔ ”کیسا موقع بیگ صاحب؟“

”کھانا جاری رکھو۔“ میں نے کہا پھر اپنا بیان آگے بڑھایا۔ ”اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو اور پھر زندگی کی آخری سانس تک اس وعدے کو نبھانے کا بھی وعدہ کرو تو سمجھ لینا کہ تم نے میرے احسان کا بدلہ چکا دیا۔“

”جی حکم کر۔ س، آپ مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتے ہیں؟“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”تم آج کے بعد بلی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اس لڑکی سے کسی نوعیت کی چھیڑ چھاڑ یا فقرے بازی بھی نہیں کرو گے۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔“

کے دماغ کے سارے کیڑے جھاڑ کر اس کے اندر خودداری کو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ میری اس گہری چال کے نتیجے میں وہ تڑپ کر بولا۔

”وہ..... کیا وکیل صاحب؟“

”میں نے اپنے خفیہ ذرائع استعمال کر کے سلی، بلی اور وصی شاہ کا شجرہ بھی کھوج نکالا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”متعلقہ تھانے کا انچارج میرا دوست ہے۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں اپنے دوست سے بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ ان لوگوں کی رپورٹ بہت گندی ہے۔ یہ مختلف قسم کے اخلاقی اور معاشرتی جرائم میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے ہیں اور..... کسی بھی وقت سزا پا کر جیل جاسکتے ہیں.....“ میں نے ذرا سا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اس سے زیادہ تمہیں اور کچھ نہیں بتا سکتا مراد.....“

میری باتوں کا مراد پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ پھٹ پڑا۔

”بیگ صاحب! آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں یا گل ہوں، بلی کی محبت میں خوا مخواہ اندھا ہو گیا تھا۔ لوگ بلی اور سلی کے کردار کے حوالے سے گندی گندی باتیں کرتے تھے لیکن میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کرتا تھا۔ میری نظر صرف بلی پر لگی ہوئی تھی اور وہ.....“ وہ لمحے بھر کو تھا پھر زہر خند لہجے میں بولا۔

”اور وہ مجھے دنیا کی غلیظ ترین شے سمجھتی ہے۔ لعنت ہے ایسی خوب صورت بلا پر.....“

”مراد! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو..... کہ تم برباد ہونے سے بچ گئے۔“ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ہمدردی کی چوٹ لگائی۔ ”تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وصی شاہ اور سلی کتنے بدقماش اور خطرناک انسان ہیں۔ تمہیں تو وہ لوگ اس طرح غائب کر دیتے کہ تمہارے ماں باپ ساری زندگی ڈھونڈتے ہی رہ جاتے۔“

”بیگ صاحب!“ وہ سراپیمہ انداز میں ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”اللہ کے بعد میں سب سے زیادہ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میں ایک خونی دلدل میں قدم رکھنے سے بچ گیا ہوں۔“

”اسے تم تجدید غہد وفا سمجھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہاری جانب سے بلی یا سلی کو کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی تو سمجھو، پھر تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے..... شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ وصی شاہ کتنا خطرناک شخص ہے۔“

”جی مجھے کچھ اندازہ ہے۔“ وہ خوف بھری جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا بیگ صاحب!“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میری ہدایات تمہارے ذہن میں تازہ رہیں تو پھر تمہیں ان لوگوں کی طرف سے کبھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

”بیگ صاحب! اگر آپ ماسٹرنہ کریں تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“ وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ”ہاں، پوچھو۔“ میں نے کہا۔ ”اور کچھ پوچھنے سے پہلے یہ بتا دو کہ کولڈ ڈرنک یا چائے کافی؟“

اس نے کولڈ ڈرنک کے حق میں ووٹ دینے کے بعد مجھ سے جو سوال کیا وہ اس کے دل کی آواز تھی۔ ”کیا سلی کے گھر میں بھی آپ کی بلی سے بھی ملاقات ہوئی؟“

”ہاں!“ میں نے دروغ مبنی بر مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”بلی سے تمہارے موضوع پر میری تفصیلی بات ہو چکی ہے۔“

”اوہ.....“ وہ بے قرار لہجے میں بولا۔ ”وہ کیا کہتی ہے میرے بارے میں؟“

”تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت ہی دل شکن اور افسوس ناک ہیں۔“ میں نے اپنے منصوبے کو تکمیل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سنو گے تو تمہیں دھچکا لگے گا لہذا اس باب کو بند ہی رہنے دو۔“

اس کے اضطراب اور اشتیاق میں کوئی خاص کمی نہیں آئی، بے تابی سے بولا۔ ”آپ کچھ تو بتائیں نا بیگ صاحب.....“

”مراد! بلی تم سے شدید نفرت کرتی ہے۔“ میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اس نے اتنی حقارت سے تمہارا نام لیا جیسے تم اس دنیا کی غلیظ ترین چیز ہو۔ اگر تمہارے اندر غیرت کی ایک رقم بھی باقی ہے تو اس لڑکی کو اپنے دل و دماغ سے نوج ڈالو۔ تم شریف والدین کی اولاد ہو اور وہ.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں آج اس

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

”میں نے یہ ساری محنت بلا وجہ نہیں کی۔“ میں نے مصنوعی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی اس محنت کی تم سے فیس وصول کروں گا۔“

”بیگ صاحب!“ اس کی حالت قابلِ رحم ہوئی۔ ”میرے پاس تو مشکل سے واپسی کا کرایہ ہی ہوگا۔ میں بھلا آپ کی بھاری فیس کس طرح ادا کر سکتا ہوں؟“

”اپنی بھاری آمدنی میں سے۔“ میں نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ چند روز کے بعد تمہاری جیبیں نوٹوں سے بھر جائیں گی۔“

”مم..... مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“ وہ حیرت اور الجھن کے طے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ”دولت ایسے ہی تو نہیں آ جاتی نا..... بیگ صاحب!“

”تم ٹھیک کہتے ہو مراد۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”واقعی دولت کوئی پھل نہیں جو درختوں پر آگتی ہو۔ دولت کو حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ یہ جدوجہد تم کرو گے کیونکہ..... میں نے تمہارے لیے ایک صاف ستھری نوکری کا بندوبست کر دیا ہے۔“

”کہاں.....؟“ اس کی آنکھوں میں مسرت کے چکنو جاگ اٹھے۔

میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مراد کو قدوس احمد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے گہری توجہ سے میری بات سنی اور جب میں خاموش ہوا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ میں نے مزید کہا۔

”اب تم اپنی غلطی کو نہیں دہراؤ گے.....؟“ ”کون سی غلطی بیگ صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں.....“

”دیوار پھلانگ کر کودنے کی غلطی۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس رات تم اسی فارمولے پر عمل کر کے قدوس احمد کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور اب تمہارے سامنے ان کی دکان ہے۔ کہیں تم.....؟“

اس کی ہنسی نکل گئی۔ اس کے چہرے پر کھلنے والے خوشی کے رنگ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔ تین مراحل پر مبنی میرا منصوبہ گویا پانچ بجیل کو پہنچ گیا تھا۔ میری محنت کی اس سے زیادہ فیس کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک سال کے بعد مراد علی دوبارہ میرے آفس آیا تو اس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز خبر بھی لایا تھا۔ وہ ایک

کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”بیگ صاحب! پندرہ روز کے بعد میری شادی ہے۔ آپ کو لازمی آنا ہے۔“

میں نے کارڈ کھولتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”بھئی مبارک ہو..... کس سے ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”آپ کی پڑوسن سے.....! وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“ میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

”بیگ صاحب! میں قدوس صاحب کی..... بیٹی عابدہ کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ بڑے فخر سے بولا۔

”اوہ.....“ میں نے شادی کارڈ پر نگاہ دوڑائی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہاں میرے سابق پڑوسی قدوس صاحب کی بیٹی عابدہ کا نام چھپا ہوا تھا۔ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”پھر تو ڈبل مبارک ہو بھئی لیکن شاید ایک بات تمہارے علم میں نہیں ہے۔“

”کیا بیگ صاحب.....؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”قدوس احمد کچھ عرصہ پہلے تک میرے پڑوسی تھے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اب وہ شہر کے کسی اور علاقے میں شفٹ ہو چکے ہیں۔“

”جی۔ میں جانتا ہوں۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پڑوسی کا حوالہ میں نے یوں دیا ہے کہ ہماری پہلی ملاقات انہی کے گھر میں ہوئی تھی اور اس وقت وہ آپ کے پڑوسی تھے۔“

میں نے کہا۔ ”قدوس احمد جب تک میرے پڑوسی رہے، وہ گا ہے یہ گا ہے تمہاری تعریف کرتے رہتے تھے۔ اگر انہوں نے تمہیں اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ ان کی دانش مندی کا ثبوت اور تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے.....“ بات کے اختتام پر میں نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔

اس کی آنکھوں میں خوشی آنسو بن کر چمک اٹھی۔ اس نے مجھ سے شادی میں شرکت کا وعدہ لیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

انسان اگر محنتی ہو اور خلوص نیت سے کسی بھی کام میں جت جائے تو کوئی کوہِ گراں بھی اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ کامیابی ایک دن اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

(تحریر: حسام بیٹ)

”اٹارنی کیتھی مور نے کانفرنس ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے نوجوان کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔
”مسٹر جیمز! کیا تم سمجھ رہے ہو کہ یہ دو ہفتے قبل تمہاری پرائیویٹ آرٹ گیلری میں ہونے والی چوری سے متعلق عدالت کے روبرو حلفیہ بیان قلم بند ہو رہا ہے؟“

جیمز کے ہونٹوں پر ایک بناوٹی ہنسی ابھر آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی نیلے رنگ کی ریشمی ٹائی کو درست کیا۔ آرٹ گیلری کا لوگو اس کے کوٹ کی اوپری بائیں جیب پر سنہری تاروں کی کشیدہ کاری سے نمایاں تھا۔
”ویل، مجھے اس چوری کا یقین ہے۔ اسی لیے تو میں یہاں موجود ہوں۔“

”تم مزید یہ بھی سمجھ لو مسٹر جیمز کہ تم حلف اٹھا رہے ہو اور

کوٹاہ اندیش

سلیم انور

حالات چاہے جو بھی ہوں اگر اندیش بینی میں کوتاہی ہو جائے تو اس کا نتیجہ بہر حال بھگتنا پڑتا ہے۔ اسے بھی ہر حال میں یہ نقصان برداشت کرنا تھا جو محض اس کی نااندیشی کی بنا پر ہوا اور جس نے اس کے سارے اندیشوں کو سچ کر دکھایا۔

چالاک چور کی خود فریبیوں کا دلچسپ ماجرا



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

برابر تھا۔ شیشے کے ٹکڑے ٹائل کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ چور ہمارا بیش قیمت ہیرا ایک چھوٹے سے پیڈ پاؤچ میں منتقل کر رہا تھا۔

اثارنی کیتھی مور نے بات سمجھنے کے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا لیکن وہ پلٹ کر دوڑنے لگا۔ میں اپنے قیمتی ہیرے کو یوں ہاتھوں سے ٹکٹا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو میں اس چور سے بھڑ گیا۔“

”اور وہ پھر بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا؟“

”ہاں... لیکن ہم کچھ دیر تک لڑتے رہے تھے۔ ہم چھینا چھٹی کی اس تگ و دو میں دیر تک فرش پر لڑھکتیاں کھاتے رہے تھے۔ اس دوران وہاں رکھے ہوئے گلدانوں کے چند اسٹینڈ بھی نیچے گر گئے۔ آخر میں اس نے مجھے لات رسید کر کے خود کو چھڑا لیا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔“

جیمز نے اپنے بائیں رخسار کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے جوتے کی نوک مجھے یہاں لگی تھی۔“

”میں وہ پولیس فوٹو گراف دیکھ چکی ہوں جس میں تمہارے رخسار پر رگڑ کا نشان موجود ہے۔“ کیتھی مور نے کہا۔ ”تم نے بہت بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔“

”تھینک یو۔“ جیمز نے اپنی ڈیزائنر عینک اتار کر اسے ایک اسٹیل قسم کے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا بیان مکمل ہو گیا؟“

”تقریباً۔“ کیتھی مور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے تمہاری یہ عینک بہت اچھی لگ رہی ہے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟“

جواباً جیمز بھی مسکرا دیا۔ اس نے اپنی عینک میز کے پار بیٹھی ہوئی اثارنی کیتھی مور کی جانب بڑھا دی اور بولا۔ ”یہ عینک خاصی قیمتی ہے لیکن مجھے پسند ہے۔“

کیتھی نے پتے وار فریم کی بنی ہوئی اس قیمتی عینک کا بغور جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ ”یہ تو میزری توقع سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔ یہ دیکھنے میں جتنی نازک لگ رہی ہے تو یقیناً اسے بارہا ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہوگا تاکہ یہ پہننے میں بالکل فٹ رہے۔“

”نہیں، نہیں۔ میں اسے ہمیشہ بے حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا ہوں۔ یہ عینک گزشتہ چھ ماہ سے میرے پاس ہے اور مجھے اس کے فریم کو دوبارہ تطبیق کرانے کی بھی نوبت ہی نہیں آئی۔“

کیتھی نے عینک جیمز کو واپس لوٹا دی۔

یہ کہ تم جو کچھ بھی کہو گے وہ ہماری کورٹ کی ریکارڈر تحریر میں لے آئے گی جو اس میز کے اوپری سرے پر بیٹھی ہوئی ہے۔“

جیمز نے ایک اچھتی نگاہ اس خوش لباس خاتون پر ڈالی جس کی انگلیاں ایک چھوٹی سی سیاہ مشین کے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ اس مشین کے ساتھ ایک دھات کی ٹرے منسلک تھی جس میں کاغذ کی ایک پتلی سی پیٹی کارول لگا ہوا تھا۔

جیمز نے شانے اچکا دیے۔ ”میں تیار ہوں۔“

اثارنی کیتھی مور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری قانونی فرم کی خدمات اس بیمہ کمپنی نے حاصل کی ہیں جس کے پاس تمہاری آرٹ گیلری کی بیمہ پالیسی ہے۔ اس سے قبل کہ بیمہ کمپنی تمہارے چوری کے کلیم کی ادائیگی کرے، ہمیں چند حقائق کو تسلیم کیے جانے کی ضرورت ہے۔“

”یہ بات مناسب لگ رہی ہے۔“

”گڈ!“ اثارنی کیتھی مور نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک... فائل کی جانب ہلکا سا اشارہ کیا۔ ”پولیس رپورٹ کے مطابق جس وقت چوری کی یہ واردات ہوئی، اس وقت آرٹ گیلری میں صرف تم اکیلے موجود تھے۔“

”درست۔“

”اس روز کوئی ملازم کام پر موجود نہیں تھا؟“

”میرا سلیز مین ایک ڈیلیوری دینے کے لیے گیا ہوا تھا اور ریسپنڈنٹ جلدی لے جانے چلی گئی تھی۔“

”جب اس واقعے کا آغاز ہوا تو اس وقت تم کہاں تھے؟“

”میں عقی کمرے میں چند قیمتی وائن کے کیمپل کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وائن ہم اپنے بہترین کسٹمرز کو پیش کرتے ہیں۔“

اس سے انہیں خریداری کے موڈ میں آنے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی فرم ہونے کے ناتے ہم یہ وائن صرف اپنے بہترین خریداروں کو ہی آفر کرتے ہیں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہی کامیاب کاروبار کا گر ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“

”میں نے اپنی تجویز کردہ عینک ابھی اپنے کوٹ کے بریسٹ پاکٹ میں رکھی ہی تھی کہ مجھے مین گیلری میں کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔“ جیمز نے کہا۔

”جب تم اس کمرے میں داخل ہوئے تو تم نے کیا دیکھا؟“

جیمز نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”سیاہ اسکی ماسک پہنے ہوئے ایک شخص نے اسی وقت شیشے کے اس باکس کو ضرب لگا کر توڑ دیا تھا جس میں ہمارا روسی زار کے دور کے نوادرات میں سے ایک نادر ہیرا رکھا ہوا تھا جو انڈس کے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریعہ عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر II سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

”چونکہ چوری کی واردات کے دوران تم نے یہ عینک
نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے میرا خیال ہے کہ تم چور کو شناخت
نہیں کر پاؤ گے۔“

یہ سن کر جیمز بے ساختہ ہنس دیا۔ ”میری دور کی نظر
اتنی خراب بھی نہیں ہے۔ زیادہ تر میں یہ عینک پڑھنے کے
لیے استعمال کرتا ہوں لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چور
نے اپنے چہرے پر اسکی ماسک پہنا ہوا تھا۔ میں اس کا چہرہ
نہیں دیکھ سکا تھا۔“

کیتھی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ اس
نے ایک اچھٹی نگاہ اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی۔

”مسٹر جیمز! میں تمہیں صرف پورے تیس سیکنڈ کی
مہلت دے رہی ہوں یا تو تم اپنی کہانی تبدیل کر دو یا پھر اپنا
کلیم واپس لے لو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں اپنے
کلائٹ سے یہ سفارش کروں گی کہ وہ تمہارے کلیم کی
ادائیگی اس وقت تک کے لیے روک دیں جب تک اس
چوری کے بارے میں تمہارے بیان کا جھوٹ پکڑنے والی
مشین پر پولی گراف ٹیسٹ نہ ہو جائے۔ اب تمہارے پاس
پچیس سیکنڈ کا وقت باقی رہ گیا ہے۔“

جیمز کے چہرے کی رنگت کچھکی پڑ گئی۔ ”کیا؟“
”تم پہلے یہ کہہ چکے ہو کہ اس چور کو روکنے کی کوشش
میں تم اور تمہارا بیان کردہ وہ چور فرسٹ پر ایک دوسرے سے
الچھ کر لڑھکیاں کھاتے رہے تھے اور خود تمہارے اپنے بیان
کے مطابق اس وقت یہ نازک عینک تمہارے کوٹ کے
بریسٹ پاکٹ میں موجود تھی۔ ڈیزائنر فریم کی باریک
تاروں سے بنی ہوئی یہ عینک جتنی نازک دکھائی دے رہی
ہے تو اس دھینگامشی کے دوران اگر یہ نہیں ٹوٹی تو اسے کم
از کم مضرور جانا چاہیے تھا..... اور ابھی تم یہ حلفیہ بیان دے
چکے ہو کہ اس کے فریم کو کبھی تطبیق کرانے کی نوبت ہی نہیں
آئی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے چوری کی بہانہ بازی کی ہے
اور حقیقت میں چوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ سب
تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے اور جھوٹ موٹ چوری
کا ڈھونگ رچا کر تم نیسے کی رقم اینٹھنا چاہتے ہو۔“

جیمز کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
کیتھی نے ایک نگاہ اپنی دسی گھڑی پر ڈالی اور بولی۔
”اب تمہارے پاس صرف پانچ سیکنڈ کا وقت باقی رہ گیا ہے۔“
تب جیمز نے شکست تسلیم کرتے ہوئے اپنے ہاتھ
اد پر اٹھا دیے۔

محفل شہر و سخن



✽ زریان سلطان..... عید گاہ، کراچی
پیشہ ور گواہوں کی اور بھی مثالیں تھیں
مجھ کو قتل کرنے میں منصفوں کی چالیں تھیں

✽ سیدہ ثانیہ کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان
اک شخص مجھ کو زخم شناسائی دے گیا
جب دے سکا نہ پیار تو رسوائی دے گیا
جاتے ہوئے وہ اپنی نشانی کے طور پر
نکتے خلوص سے مجھے تنہائی دے گیا

✽ صادق معاویہ سعیدی..... خان پورہ ضلع رحیم یار خان
بال و پر کاٹ کے صیاد نے میرے یہ ارشاد کیا
اب توڑ دیا قفس جا تجھے آزاد کیا



✽ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ بائی پاس
گنگناتے ہوئے آچھل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سلا دے مجھ کو
✽ ایم کامران خالد..... محلہ خسر خیل چھب

جب بھی جی چاہے نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
ہو خوشی بھی ان کو حاصل یہ ضروری تو نہیں
غم چھپانے کے لیے بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

✽ اسرار ساقی..... ڈسٹرکٹ جیل انک
مجھ کو تو معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ہوں ساقی
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ سا لگتا ہوں
✽ عرفان احمد عاجز جمیل انور..... آڑہ چو اسیدن شاہ

ورق ورق پر تری حقیقت، تیرا فسانہ، تیری محبت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی، تیری ہی یادوں کا باب نکلا
✽ محمد شہباز ناز..... سرگودھا

بے نتیجہ، بے ثمر، جنگ وجدل سود و زیاں
ساری حیثیتیں ایک جیسی، ساری ماتیں ایک جیسی
سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبار زرگری
سب کی دہشت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک جیسی

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف
گرد بیٹھ جائے تو کچھ میں سمجھ سکوں
آنکھیں نہیں رہیں یا تماشا نہیں رہا
✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ

جلے جو جسم تو لگتی ہے روح کو بھی آج
وہ خود بھی جلتا رہا عمر بھر جلا کے مجھے
✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال

تجھے کیا خبر تیری یاد نے مجھے کس طرح ستا دیا ہے
بھی خلوتوں میں ہنسا دیا بھی محفلوں میں رلا دیا
کبھی یوں ہوا تیری یاد میں مری ہر نماز قضا ہوئی
کبھی یوں ہوا تیری یاد نے مجھے پاک رب سے ملا دیا

✽ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ
رکا ہوا تھا ہرا سانس، میرے سینے میں
اسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مر جاتا

✽ وسیم خان..... کوئٹہ

کچھ انوکھے تجھے اندازِ تم آتے ہیں
ہم تیری بزم سے بادیدہٴ غم آتے ہیں
جج تو ہے کہ کہہ سکتی ہے وہ پھولوں کی طرح
جس جگہ آپ کے گل رنگ قدم آتے ہیں

✽ محمد آصف جھانپ..... سراں بھکر

خوشبو ہوں سرِ بزم بکھر جاتی ہوں
نغمہ ہوں ہر اک دل میں اتر جاتی ہوں
درپیش تخیل کا سفر رہتا ہے
شاعر ہوں ذرا دیر سے گھر جاتی ہوں

✽ پادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ڈاہر انوالہ

سزا قبول مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے با اختیار وہ بھی تھے
سواد شہر سے بھی خاک اڑ گئی جن کی
کبھی تمہاری طرح شہریار وہ بھی تھے

✽ ملائکہ حریم..... اوکاڑہ

تُو اک بار جو دل کی زمین چھو لیتی
تو پھر میں اگلا قدم آسمان پر رکھتا

✽ اشفاق شاہین..... لاہور

ترے جمال کو میں چھو نہیں سکا لیکن
ترے خیال نے مجھ کو دیا بہت کچھ ہے

✽ محمود علی..... سیالکوٹ

ہر غم کو دل آویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشان کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

✽ محمد قدرت اللہ نازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال

اندر سے کیا ہیں لوگ، نظر کیوں نہیں آتے
اس غم نے کسی کو بھی ہمارا نہیں رکھا

✽ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

بے سبب ہم سے روٹھنے والے
خود بھی پھرتے ہیں کچھ اداس اداس

✽ انیلارشد سیال..... خیر پور، میرس

دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ گئی
کوئی اجڑا ہوا آئے تو دعا لے جائے

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں
دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو
لذتِ غم بھی عجب نشہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

✽ ناہید اختر..... اسلام آباد

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتہ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنے رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اتر جائے گی

✽ وسیم اکرم..... مہر شاہ، خانیوال

اپنا ہی تھا قصور جو طوفاں میں گھر گئے
اک موج تھی کہ جس کو کنارا سمجھ لیا

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال

تمنا وہ تمنا ہے جو دل ہی دل میں رہ جائے
جو مر کر بھی نہ ہو پورا اسے ارمان کہتے ہیں

✽ سید عبادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

میں تم سے کہوں کیسے اے مہریاں!
کہ تو علاج ہے میری ہر اداسی کا

✽ ظفر احمد..... راولپنڈی

ہم ہیں ظلمت میں کہ ابھرا نہیں خورشیدِ اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے
کون سنتا تھا حدیثِ غم دل یوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

✽ محمد شہباز اکرم نوٹی..... ڈھپٹی، پاک پتن شریف

عشق کرو تو اس کے آداب وفا بھی سیکھو دلنشین
یہ فارغ وقت کی بے قراری محبت نہیں ہوتی

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال

اس توقع پہ سردِ دل کو کھلا رکھا ہے
لوٹ آئے گا کبھی تو روٹھ کے جانے والا

✽ وردا، محمد آریز ملک..... کراچی
راتیں ہیں اداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں
✽ حاجی محمد زہد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکھیکی
آئے نہیں وہ جن کے لیے در کھلا رہا
دل میں مگر امید کا روشن دیا رہا
✽ رعنا رضوی..... مانچسٹر، یو کے
پھلے ہیں چار سمت مکاں ہی مکاں یہاں
اس شہر نامراد میں کوئی گھر تو دیکھتے
✽ شوکت علی زخمی..... رحیم یار خان
لفظ جب تک وضو نہیں کرتے
ہم تیری گفتگو نہیں کرتے
✽ سجاد علی شگری..... گلگت بلتستان
غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا.....!
✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضور شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی
✽ شاہ زیب..... سرگودھا
کل جب رکے گا بازوئے قاتل تو دیکھنا
اے اہل شہر تم تھے شہید وفا کہ میں
✽ وقار حسن..... راولپنڈی
ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہر نگاراں ہم نہ کہتے تھے
✽ محمد اسماعیل..... کوئٹہ
یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے اچھے پڑے ہم
یہ واقعہ ہے کہ پی رہے تھے شراب سارے
✽ مدثر علی..... پشاور
تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے ”نسخہ ہائے وفا“
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

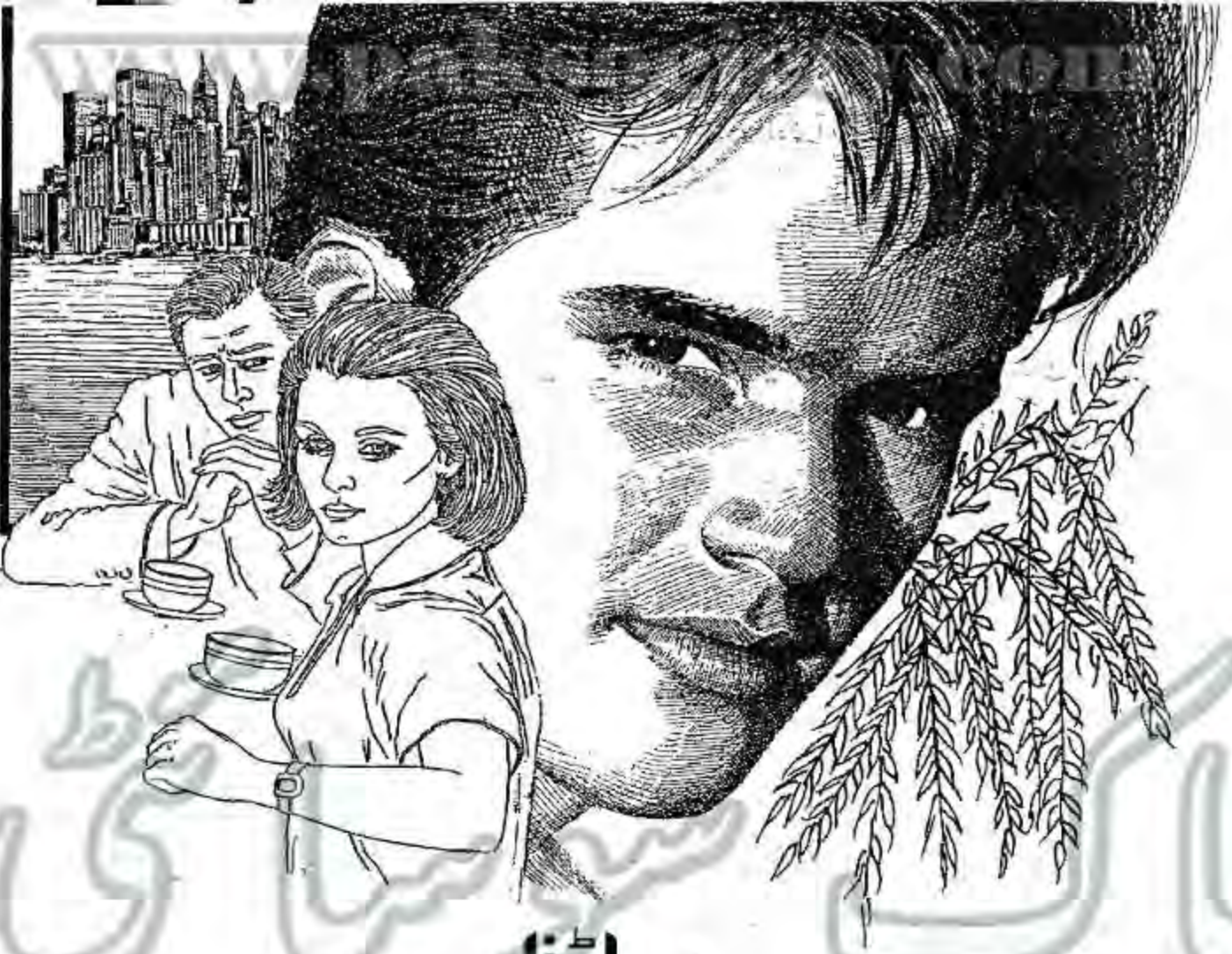
✽ مرزا گل، رمن گل..... درابن کلاں
حسنِ تحریر سے ظاہر ہے تیرے دل کا خلوص
خط کا ہر لفظ محبت کا پتا دیتا ہے
✽ محمد ذکریا حیدر..... نامعلوم مقام
سوکھی ہیں بڑی دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رلا دے کوئی آکے
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
✽ مدحت..... کراچی
اے رگِ جاں کے کمیں تو بھی کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے
✽ مختار احمد..... حیدر آباد
کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اٹھا لے جائے
✽ نازیہ خان..... بہاولپور
کوئی بتاؤ کہ اک عمر کا پچھڑا محبوب
اتفاقا کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں
✽ شازیہ..... کراچی
کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اُٹھی آنکھ سے دریا برسا
✽ سحرش ناز..... گجرانوالہ
گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور
✽ شمینہ وقار..... راولپنڈی
اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے
✽ جہانزیب احمد..... سرگودھا
ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

مَحْفَلِ شِعْرِ وَسِخَرَت



نام:

پتا:



پہلے

اثر نعمانی

پہلا پھیری ہے شک بہت دلچسپ کام ہے لیکن تیرا مشکل بھی ہے مگر... لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب سیر کو سوا سیر ٹکراتا ہے... وہ بھی خود کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا... اپنی طاقت، اپنے اختیارات اور اپنی ہوشیاری پر بڑا ناز تھا... غیر قانونی دھندوں میں اس کا نیٹ ورک بھی بہت مضبوط تھا لیکن... اس سب کے باوجود بازی ہلنے والے اپنی چال کچھ یوں چل گئے کہ اس کا سارا گھمنڈ چکنا چور ہو گیا۔

بے ایمان کی بے ایمانی کو ثابت کرنے کے لیے ایمانداروں کی تھوڑی سی بے ایمانی

بچ صاحب نے اپنی کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔
کرسی سے پشت لگا کر آرام دہ نشست اختیار کرتے ہوئے
انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ہیرس پوری توجہ سے ان کی کہانی
سننے کے لیے کرسی پر ذرا آگے کو جھک آیا۔
”اس زمانے میں، میں نائب ڈسٹرکٹ کی حیثیت
سے کام کر رہا تھا۔ غالباً 1931ء کی بات ہے۔ شراب
سازی اور شراب نوشی پر پابندی عائد تھی۔ وہ لٹل لاء کو نافذ
ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔ یہاں جنوب مغربی علاقے

میں شراب کی اسمگلنگ کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ اسمگل کی جانے والی شراب کا کچھ حصہ تو ناجائز طور پر اندرون ملک چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں کشید کیا جاتا تھا لیکن زیادہ مقدار میکسیکو سے آتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ باقاعدہ منظم طور پر جرائم کرنے کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی تھی۔ آج کل ناجائز منشیات کی اسمگلنگ کا بڑا زور ہے، لیکن اس اسمگلنگ کا اس اسمگلنگ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی خرید و فروخت میں نصف کے قریب آبادی شامل تھی۔

”نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہم نے محسوس کیا کہ فلکس جیسے چھوٹے قصبے میں بھی ہمیں ایک انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیم کا سامنا ہے، دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ چند پرجوش قوم کے علاوہ کسی کو شراب کی اسمگلنگ سے کوئی ایسی تشویش نہیں تھی لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ شراب کے کاروبار میں اضافے کے ساتھ ہی جرائم پیشہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شراب براہ راست ہمارے لیے وجہ پریشانی نہیں تھی لیکن اس سے جس قسم کے اثرات پیدا ہو رہے تھے، وہ ہمارے لیے مسئلہ بنتے جا رہے تھے۔ مجرموں کے سماجی اور سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ایماندار لوگوں کو یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں یہ مجرم برسرِ اقتدار نہ آجائیں۔ وہ لوگ سیاستدانوں کو خرید رہے تھے، بڑے بڑے کاروبار میں سرمایہ لگا رہے تھے اور اسی کے ساتھ تجارت پیشہ افراد کو ڈرا دھمکا کر ان سے غنڈا ٹیکس وصول کر رہے تھے اور ہم لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ایک دن ایسا آجائے، جب معاملات ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں۔ شراب کی اسمگلنگ ایک الگ بات ہے لیکن مجرموں کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ اپنی مرضی سے گورنر کا انتخاب کریں، ایک دوسری بات تھی اور یہ مجرم انسانی حقوق تو درکنار، خود قانون کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔“

”فلکس کے قصبے میں مجرموں کا بے تاج بادشاہ ارون اسٹیرک نام کا ایک آدمی تھا۔ بظاہر تین ریٹائرمنٹ کا مالک تھا جہاں جائے، کافی اور شراب کے علاوہ قمار بازی کی مختلف مشینیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ یوں تو وہ کسی گروہ کا سردار نہیں تھا اور نہ براہ راست اسمگلنگ میں ملوث تھا لیکن اسے مجرموں کی تنظیم میں سب سے اہم پوزیشن حاصل تھی۔ پہلے وہ وہاں محض ایک اکاؤنٹ کلرک تھا پھر ترقی کرتے کرتے چیف اکاؤنٹ بن گیا اور پھر رفتہ رفتہ اسے وہ

حیثیت مل گئی جو کسی کمپنی میں اس کے سربراہ یا مالک کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجرم اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا تو پہلے اسے ارون سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، ارون بھی کبھی کاروبار کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرتا تھا۔ بڑے بڑے سودے اس کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ تمام کالے کاروبار کا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا تھا۔

”ہم جانتے تھے کہ اگر اس کے اکاؤنٹ رجسٹر ہمارے ہاتھ آجائیں تو ہم نہ صرف تمام سرکردہ مجرموں کو گرفتار کر سکتے تھے بلکہ فلکس اور اس پاس کے قصابات کی حد تک اس کاروبار کا خاتمہ بھی کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ارون دن بہ دن زیادہ اہمیت، زیادہ طاقت اور زیادہ اثر و رسوخ حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ہماری طرح فیڈرل پولیس بھی اس کی گرفتاری کے لیے کوشاں تھی، لیکن ہم نے جب بھی اس کے دفتر پر چھاپا مارا، وہ اکاؤنٹ رجسٹر جن کی ہمیں ضرورت تھی، پر اسرار طور پر غائب ہو جاتے تھے اور ان رجسٹروں کے بغیر ہم اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ سیدھے سادے قانونی طریقے سے ہم بھی اس سے چھٹکارا نہیں پاسکیں گے۔“

”ان ہی دنوں فونیکس کے گورنر کے مشیر خاص کا انتخاب ہونے والا تھا۔ (ہمارا قصبہ فلکس کی حدود میں آتا ہے) اور یہ بات قطعی طور پر ظاہر تھی کہ ارون کا نامزد کردہ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو جائے گا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر مجرموں کا کوئی بھی آدمی گورنر ہاؤس تک پہنچ گیا، تب پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فونیکس کی ریاست قطعی طور پر مجرموں کے قبضے میں آجائے اور اس کے امیدوار کو منتخب ہونے سے روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ارون کو راستے سے ہٹایا جائے۔ اگر وہ موجود نہ ہو تو مقامی سیاستداں اور عام لوگ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتے تھے۔“

”ہم نے کورٹ ہاؤس میں میننگ بلائی۔ اس میننگ میں ڈپٹی پولیس کمشنر، ڈسٹرکٹ انٹرنی، اس کے دونائیب (جن میں سے ایک میں تھا) اور فلکس کا میئر شریک ہوئے۔ صرف ہم ہی لوگ ایسے تھے جو ابھی ارون کے زیرِ قید نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس اجلاس کی تفصیلات بتا کر بورنیم کروں گا لیکن اس میننگ کا حاصل یہ نکلا کہ مجھے ارون کو ٹھکانے لگانے پر مامور کیا گیا اور میں نے اس شرط پر یہ ذمہ داری قبول کی کہ میں اپنی تمام کارروائی کو اس وقت تک ان سب

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆.....قرآن پاک میں شہد کی مکھی، چیونٹی اور مکڑی کا ذکر آیا ہے۔

☆.....لعاب (پانی نماسیال) جسے saliva کہتے ہیں اس کے بغیر آپ کسی بھی کھانے کا ذائقہ محسوس نہیں کر سکتے۔

☆.....مچھلی کی جلد یعنی فش اسکیل لپ اسٹک بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

☆.....مینڈک اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر کوئی چیز نگل نہیں سکتے۔ انہیں نگلنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔

☆.....سانس لیتے وقت آکسیجن کی بجائیں سے تیس فیصد مقدار صرف آپ کا دماغ استعمال کر جاتا ہے۔

☆.....آپ کی اپنی سالگرہ والے دن دنیا میں تقریباً 90 لاکھ لوگوں کی برتھ ڈے ہوتی ہے۔

☆.....انسانی دماغ کا آٹھواں فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہے۔

☆.....آکسیجن کی مانع حالت میں رنگت نیلی ہوتی ہے۔

☆.....شہد کی مکھی الٹرا وائلٹ روشنی کو دیکھ سکتی ہے۔

☆.....سانپ کھائے سے بغیر 2 سال کا عرصہ گزار سکتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک چین شریف

اور اسے اچھی طرح ڈرا دھکا کر یہ ایچ ڈیاکے اگر وہ ہمیں ارون کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دے تو ہم اس کے خلاف مقدمہ واپس لے لیں گے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں خاص طور پر کن معلومات کی ضرورت ہے مگر اسے یہ خوف تھا کہ اگر اس نے ہمیں ارون کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو یہ بات چھپی نہ رہے گی اور جیسے ہی ہم اسے آزاد کریں گے، ارون کے حکم سے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر آمادہ ہوا کہ میں اس سے سوالات کروں اور وہ جس سوال کو بے ضرر خیال کرے گا، اس کا جواب دے دے گا۔ میں نے اس سے ارون اور اس کے گروہ کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اس نے بہت سے سوالات کا جواب دینے

سے... پوشیدہ رکھوں گا جب تک اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہوگی اور اس رازداری کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی رپورٹیں باقاعدہ تحریری طور پر پیش کر کے یہ خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا کہ دفتری عملے میں سے وہ لوگ جو ارون کے ہاتھوں فروخت ہو چکے ہیں، ان سے آگاہ ہوں اور ہمارے ہر اقدام کی اطلاع اسے بروقت پہنچاتے رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عدالتی کارروائی کا اکثر و بیشتر دارومدار کچھ لینے اور کچھ دینے کے اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ہمیں کبھی ایک خاص مجرم کو سزا دلانا مقصود ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے مجرم کو معافی بھی دینا پڑ جاتی ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ طریقہ کار نہیں ہے لیکن یہ دوسرے بہت سے طریقوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر ہے۔ آج کل بھی اس طریق کار پر عمل ہوتا ہے۔ سزا میں نرمی یا بالکل معافی کے وعدے پر خود مجرموں کے ساتھی سلطانی گواہ بن جاتے ہیں، اسی زمانے میں ٹکسن قصبے کی آبادی صرف بیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ مجرم پولیس کے ہر سپاہی اور افسر کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ ہم ان میں سے کسی سے بھی یہ کام نہیں لے سکتے تھے کہ وہ ہمیں بدل کر مجرموں میں شامل ہو جائے اور ہمیں مفید معلومات فراہم کرے۔ چنانچہ میں نے خود مجرم سے ارون کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

”اس وقت میری عدالت میں تین بڑے مقدمات زیر سماعت تھے۔ مقدمات تو اور بھی کئی تھے لیکن یہ ایسے مقدمے تھے جو ہمارے پیش نظر مقصد کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ملزم سینڈس تھا۔ وہ ارون کے گروہ میں پیغام رسانی کی خدمات انجام دیتا تھا۔ باقی دو کا تعلق ارون کے گروہ سے نہیں تھا، وہ اپنے طور پر جرم کرتے تھے۔ ان میں سے ایک پر مختلف اوقات میں جعلی دستخط بنا کر چیک کیش کرانے کا الزام تھا اور دوسرا قفل اور سیف کھولنے کا یا ہر تھا جو ایک بینک کے تالے کھول کر اس کے سیف سے رقم نکالتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، کیونکہ اسے خفیہ الارم کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

”اس خطرے کے پیش نظر جو ہمیں درپیش تھا اور اس ذمے داری کو دیکھتے ہوئے جو مجھ پر ڈالی گئی تھی، میں نے قانون کو اپنی مرضی کے مطابق جھکانے کی کوشش کی اور دراصل یہی نکتہ اس واقعے کے اخلاقی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے سینڈس سے تنہائی میں گفتگو کی

”یہ بات جہاں تک قانون کا تعلق ہے، قطعی قانونی حدود کے اندر تھی۔ یہ میرا اپنا ایک فیصلہ تھا۔ بلاشبہ اس کی اخلاقی حیثیت پر اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن قانون کے مطابق ایک پبلک پراسیکیوٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کسی خاص کیس کے سلسلے میں اسے کسی فرد پر مقدمہ چلانا ہے یا نہیں، میں نے اسے جملہ سازی کے الزام سے بری نہیں کرایا تھا، صرف ہر دست اس کے خلاف اس الزام میں مقدمہ نہ چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہمارے آزاد کرنے کے بعد وہ بھی ممکن قصبے کی حدود میں پایا جاتا تو ہم اسے دوبارہ گرفتار کر کے اسی الزام میں مقدمہ چلا سکتے تھے۔“

”اس سے فارغ ہو کر میں نے اس سیف توڑنے والے سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی معاہدہ کر لیا۔ ابھی تک میں کسی قسم کی قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد میرے منصوبے کے اگلے مرحلے کا تعلق پولیس کے تعاون سے تھا میں ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا اور اسے اپنی اسکیم بتائے بغیر یہ اجازت حاصل کر لی کہ میں جب جاہوں پولیس سے ہر قسم کی امداد لے سکتا ہوں۔ چوکیدار بارہ گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ وہ شام کو ساڑھے سات بجے پراپرٹی ایجنسی کے دفتر آتا تھا اور صبح ساڑھے سات بجے تک ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ جس وقت وہ آتا تھا تو اکاؤنٹ کلرک اور بھی بھی خود ارون بھی دفتر میں موجود ہوتے تھے لیکن اس کے آنے کے بعد وہ پونے آٹھ بجے یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک رخصت ہو جاتے تھے۔ اسی طرح اگلی صبح کو جب ساڑھے سات بجے کوئی نہ کوئی اکاؤنٹ کلرک آ جاتا تھا تب چوکیدار کو گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔“

”رات کے وقت سیف کو مقفل کر دیا جاتا اور سوائے چوکیدار کے کوئی نگرانی کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ چوکیدار بھی ارون کا دور کے رشتے سے بھائی تھا اور ارون کو اس پر مکمل اعتماد تھا، وہ ایک صحت مند اور طاقتور آدمی تھا لیکن اس کے جسم میں جتنی طاقت تھی، دماغ میں اتنی عقل نہیں تھی پھر بھی اس کی وفاداری میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا اور بلاشبہ اسے یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر رات کے وقت کوئی پولیس افسر یا کوئی اور اعلیٰ عہدے دار تلاشی کے وارنٹ لے کر آئے تو وہ سیف میں رکھی ہوئی تمام چیزیں ضائع کر دے۔ سینڈس نے میرے سامنے اس سیف کے حفاظتی انتظامات کا بڑے فخر یہ انداز میں ذکر کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چوکیدار اور الیکٹریک الارم کے علاوہ سیف میں ایک اور مشین بھی لگی تھی

سے انکار کر دیا لیکن کئی سوالات کے جواب بھی دیے اور یوں رفتہ رفتہ گھما پھرا کر سوال کرتے کرتے آخر کار میں اس سے وہ بات اگلوانے میں کامیاب ہو گیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ مجھے اس کے جوابات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ارون گروہ کے حساب کتاب کے رجسٹر کہاں رکھتا ہے۔

وہ رجسٹر جیسا کہ مجھے اندازہ تھا، ایک آہنی سیف میں رکھے جاتے تھے اور یہ آہنی سیف نارتھ اسٹون ایونیو کے علاقے میں واقع ایک پراپرٹی ایجنسی کے دفتر میں رکھا ہوا تھا۔ بظاہر یہ ایجنسی جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتی تھی اور ارون کا ایک بھائی اس کا مالک تھا، لیکن اندرونی طور پر ارون اس کے دفتر میں بیٹھ کر اپنے گروہ کو چلاتا تھا اور تمام گروہ کا حساب کتاب اور اکاؤنٹ مختلف رجسٹروں میں تحریر کرتا تھا، اس کی مدد کرنے کے لیے دو تین اکاؤنٹ کلرک بھی دفتر میں بیٹھتے تھے۔ عام پر کلرک ہی کام کرتے تھے اور ارون بھی کبھی وہاں چیکنگ کے لیے چلا جاتا تھا۔ یہ لوگ صبح سے شام تک ایجنسی کے عقبی کمرے میں کام کرتے تھے۔ رات کے وقت ایک چوکیدار سیف کی نگرانی اور حفاظت کے لیے پہرہ ادا کرتا رہتا تھا۔ یہ سیف اتنا بڑا تھا کہ اسے اٹھا کر لے جانا ناممکن تھا۔ پھر اس کے ساتھ ایک الیکٹریک الارم بھی منسلک تھا۔ اسے کسی وقت اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ دن کے وقت کلرک موجود رہتے تھے اور رات کو چوکیدار۔“

”یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے سینڈس کو قید تہائی میں رکھوا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی طریقے سے اس بات کی اطلاع ارون کو پہنچا سکے پھر بعد میں جب ہمارا کام مکمل ہو گیا تو طے شدہ وعدے کے مطابق اسے آزاد کر دیا گیا لیکن وہ جرم سے باز آنے والا آدمی نہیں تھا۔ چند ماہ بعد ہی اسے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اپنی باقی زندگی اس نے زیادہ تر کبھی ایک بھی دوسرے جرم کی سزائیں جیل میں ہی گزار دی۔“

”گورنر کے مشیر کا انتخاب جون میں ہونے والا تھا اور اس وقت اپریل کا مہینہ تھا۔ گویا ہمارے پاس کم و بیش سات ہفتوں کی مہلت تھی، ایک دن میں نے اس جملہ ساز کو ملاقات کے لیے بلایا۔ اس پر کئی ہزار ڈالرز کے چیک کیش کرانے کا الزام تھا اور ہمارے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ اگر مقدمہ چلایا جاتا تو اسے کئی سال کی سزا ہو سکتی تھی۔ وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے کسی دوسری ریاست میں لے جا کر آزاد کر دیا جائے گا اور اس کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ بھی جاری نہیں کیا جائے گا۔“

اب آزاد کیا جا رہا ہے۔

بہر حال جیسے ہی پولیس آفیسر چوکیدار کو لے کر رخصت ہوئے تو میرے دونوں ساتھی انجینی کے دفتر میں پہنچے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میرے پاس بھی ریوالور تھا اور وہ دونوں یہ بات جانتے تھے کہ مجھے دھوکا دے کر بھاگنا ان کے لیے مشکل ہے۔

”پہلے سیف کھولنے والے نے اپنے کام کی ابتدا کی۔ اس نے الیکٹرک کے الارم کے تار تلاش کر کے انہیں کاٹ دیا پھر سیف کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ خاصا صبر آزما کام ثابت ہوا۔ یوں ہم چاہتے تو سیف کو توڑ بھی سکتے تھے لیکن میرے منصوبے کے مطابق یہ بہت ضروری تھا کہ بعد میں ارون یا کسی اور کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ سیف کھولا گیا ہے۔ اسے اتنی دیر لگی کہ میں تو پریشان ہونے لگا تھا کہ شاید اس کے بس کی بات نہیں ہے مگر آخر کار طویل محنت کے بعد اس نے کامیابی حاصل کر لی۔

”اب میری اور اس جگہ کی باری تھی۔ پہلے میں نے سیف میں رکھے ہوئے تمام رجسٹروں اور کاغذات کا جائزہ لیا اور ان رجسٹروں کو چھانٹ کر الگ کر لیا جن کا تعلق ارون کے گروہ اور اس کے کالے کاروبار سے تھا۔ میں نے انہیں سرسری نظر سے دیکھا۔ ہر چند مجھے اکاؤنٹ کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن مجھ جیسا اکاؤنٹ سے کورا آدمی بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ ان رجسٹروں میں مجرموں کی تنظیم کے طریق کار اور ان کی آمدنی و خرچ کے بارے میں ایسی ایسی تحریریں تھیں کہ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ ان رجسٹروں کی مدد سے ہم ارون اور اس کے گروہ کا مکمل خاتمہ کر سکتے تھے لیکن ہم وہاں ان رجسٹروں پر ایک نظر ڈالنے نہیں گئے تھے ان رجسٹروں کو چرا کر لے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر میں انہیں لے جاتا تب بھی انہیں عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ عدالت میں صرف ثبوت کا پیش کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ وہ ثبوت کس طرح حاصل کیا گیا اور اس معاملے میں نہ میرے پاس تلاشی کا وارنٹ تھا اور نہ میں ارون کی اجازت سے اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ میں کسی کے مکان میں ناجائز طور پر داخل ہوا تھا اور نقب زنی کا مجرم تھا اور اگر میں یہ رجسٹر عدالت میں پیش کرتا تو ارون کے ساتھ جو کچھ ہوتا وہ تو ہوتا، لیکن اس سے پہلے مجھے اور میرے ساتھ دوسرے لوگوں کو جو اس منصوبے میں شامل تھے، چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا۔

”چنانچہ میں ان رجسٹروں کو چوری کرنے وہاں نہیں گیا۔

جس کے آن کرنے کا بین ایک میز میں فٹ کیا گیا تھا۔ بین دبانے پر سیف کے اندر رکھی ہوئی تمام کتابیں، رجسٹر اور کاغذات چٹم زدوں میں جل کر راکھ ہو جاتے لیکن ساتھ ہی چوکیدار کو سختی سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ انتہائی ضرورت اور مجبوری کے بغیر وہ یہ بین بھی نہ دبائے کیونکہ ظاہر تھا کہ ایک مرتبہ اگر وہ رجسٹر ضائع ہو جاتے تو ان کے بغیر نہ صرف کاروبار کو سنبھالنا مشکل تھا بلکہ ان کی دوبارہ تیاری ایک صبر آزما مرحلے سے کم نہ تھی اور ہمیں یہی توقع تھی کہ چوکیدار کم سے کم اتنا غفلت مند ضرور ہوگا کہ وہ پولیس کو دیکھتے ہی بین دبانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ چوکیدار کئی مرتبہ کا سزایافتہ مجرم بھی تھا۔ اگرچہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس نے ہمارے اگلے قدم کی کامیابی کو آسان بنا دیا۔

”میں نے اپنے دونوں مددگاروں یعنی جگہ ساز اور سید توڑنے والے کی جیل سے رہائی کا انتظام کیا۔ انہیں ایک ایک پولیس ریوالور بھی دے دیا، پھر میں انہیں اپنے ساتھ اپنی کار میں لے کر پراپرٹی انجینی کے دفتر روانہ ہوا۔ کار دفتر سے ایک بلاک کے فاصلے پر چھوڑ دی اور عمارت کے عقبی دروازے کی جانب مگر اس سے کچھ دور اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے، جہاں سے دروازے اور سڑک دونوں پر نگاہ رکھی جاسکے۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے، کلرک اور دوسرے تمام لوگ جا چکے تھے اور صرف چوکیدار یونی پر تھا۔

”چند منٹ کے بعد ایک پولیس کار آئی، دو آفیسر اترے اور انہوں نے عقبی دروازے پر دستک دی۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا، پولیس افسروں اور چوکیدار میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ہم اتنی دور تھے کہ ان کی باتیں نہیں سن سکتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ چوکیدار کچھ غصے میں اور کچھ الجھن میں مبتلا ہے، ایک آفیسر نے ریوالور نکال لیا تھا۔ پھر جیسے بادل ناخواستہ چوکیدار نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا اور پھر چاہتا تھا کہ اندر واپس جائے۔ غالباً فون پر ارون کو یہ اطلاع دینے کے لیے کہ اسے گرفتار کیا جا رہا ہے لیکن ہمارے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت آفیسر نے اسے اندر جانے اور فون کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں اور اسے اپنی کار میں ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ وہ عقبی دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ چوکیدار کو جیل میں بند کر دیا جائے گا اور اگلی صبح جب بچے معذرت کر کے اسے رہا کر دیا جائے گا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے شے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ شخص اب پکڑ لیا گیا ہے اس لیے اسے

کبھی وہ واپس نکلن آئے۔ مجھے امید ہے کہ اس حادثے سے عبرت پکڑ کر وہ آئندہ پوری طرح محتاط رہے ہوں گے۔ ”گورنر کے مشیر کا انتخاب ہونے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے اور ان تین دنوں میں یہ بات مشکل نظر آتی تھی کہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی سے گزرنے کے بعد ہم ارون کے امیدوار کو الیکشن میں حصہ لینے سے روک سکیں گے لیکن کوشش کرنا بہر حال ہمارا فرض تھا۔ میں کسی رازداری کے اہتمام کے بغیر سیدھا سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوا اور درخواست کی کہ ہمیں پراپرٹی ایجنسی اور ارون کے دوسرے کاروباری دفاتر کی تلاشی کا وارنٹ اور ضروری رجسٹروں، کتابوں اور کاغذات کو قبضے میں لینے کا اختیار دیا جائے۔

”ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پولیس کے چھاپے کی اطلاع وقت سے پہلے ہی ارون اور اس کے کارندوں کو مل گئی اور جب تک میں پولیس کے آدمیوں کو لے کر ایجنسی کے دفتر پہنچتا، دفتر کا سیف تمام اہم رجسٹروں اور کاغذات سے خالی کیا جا چکا تھا۔ اب وہاں صرف جائیداد کی خرید و فروخت سے متعلق چند رجسٹر اور کاغذات ہی نظر آ رہے تھے۔ جس وقت سیف کھولا جا رہا تھا تو ہم نے دفتر کے تمام عملے کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ میں نے ہر کمرے میں ایک چکر لگایا اور پھر سب کے ساتھ آگیا۔ میں نے پولیس کے انچارج آفیسر کو بتایا کہ وارنٹ کے مطابق ہمیں نہ صرف سیف یا دفتر بلکہ پوری عمارت میں ہر جگہ تلاشی لینے کا اختیار دیا گیا ہے اور اسے ہدایت کی کہ وہ دفتر کے ہر کمرے بلکہ ہر میز اور ہر الماری کی اچھی طرح تلاشی لے۔

”تھوڑی ہی دیر میں پولیس کے ایک نو جوان ڈیٹیکٹو نے بیرونی آفس میں ایک میز کی چٹلی دو درازوں سے وہ تمام رجسٹر اور نوٹ بکس برآمد کر لیں جن کی ہمیں ضرورت تھی میں نے اس اطلاع پر دوسروں کو دکھانے کے لیے بڑی حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

”سترہ سال کے بعد ارون کا جیل ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس کارنامے کے صلے میں پہلے مجھے ڈسٹرکٹ ایٹارنی اور آخری جج کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس طرح انصاف کے تقاضے پورے ہوئے یا نہیں؟“

”لیکن ان لوگوں کو یہ شبہ ضرور ہوا ہوگا کہ وہ رجسٹر اور کاغذات جملی ہیں۔“ ہیرس نے کہا۔

”بلاشبہ انہیں تو شک ہوتا ہی تھا۔“ جج صاحب نے

تھا، میں ان رجسٹروں کے فوٹو اتارنے گیا تھا اور یہ کام جیلساز کے سپرد تھا، وہ اس کام کو جانتا بھی تھا۔ ایک ایک صفحہ کر کے اس نے تمام رجسٹروں اور نوٹ بکس کے فوٹو اتارے۔ یہ کام بھی کھنٹوں کا تھا۔ میں پسینے میں شرابور ہر چند منٹ کے بعد اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب آخری رجسٹر کے آخری صفحے کا فوٹو لیا گیا تو چھینچ کر دو تین منٹ ہو چکے تھے اور ہم جانتے تھے کہ ٹھیک چھ بجے چوکیدار کو جیل سے رہا کر دیا گیا ہوگا اور وہ جلد سے جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ہم نے جلدی جلدی وہ فلم سمیٹی جواب تک اتاری جا چکی تھی۔ جیلساز نے رجسٹروں پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ اسے رجسٹروں کی نقل تیار کرنے کے لیے تمام جزویات اور باریک سے باریک تفصیل کی ضرورت تھی۔ تحریر کا انداز، روشنائی کا رنگ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں تاکہ بعد میں بالکل اسی طرح کے رجسٹر خرید کر وہ لی گئی تصویروں کی مدد سے ان کا ایک ایک صفحہ اصل رجسٹر کے مطابق تحریر کر سکے۔

”سب کام کر کے، چیزیں سمیٹ کر رجسٹروں اور دوسرے کاغذات کو بالکل اسی طرح سیف میں رکھ کر جس طرح وہ پہلے رکھے ہوئے تھے اور سیف کو بند کر کے، اپنی آمد کا ہر نشان مٹاتے ہوئے جب ہم آفس سے باہر نکلے تو چھ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار کسی بھی لمحے پہنچے والا ہوگا۔ بہر حال ہم لوگ اس کے نمودار ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلے آئے تھے، بعد میں مجھے پتا چلا کہ جب ارون کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ اور اس کے آدمی کئی دن تک نہ صرف چوکیدار سے پوچھ گچھ کرتے رہے بلکہ انہوں نے تمام دفتر اور خاص طور پر سیف کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا لیکن آخر کار وہ مطمئن ہو گئے کہ چوکیدار کی گرفتاری واقعی کسی غلط فہمی کا نتیجہ تھی اور یہ کہ اس کی گرفتاری سے پولیس کے پیش نظر کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ چوکیدار کو بدستور اپنی ڈیوٹی پر برقرار رکھا گیا تھا۔

”دوسری طرف ہمارے جیلساز مددگار کو سادہ رجسٹر خرید کر ان پر تمام اندراجات منتقل کرنے میں سات ہفتوں کی شب و روز محنت صرف کرنا پڑی۔ اس نے اس قدر جسمانی اور ذہنی محنت سے کام کیا کہ جب اس کا کام ختم ہوا تو وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اس نے واقعی اپنی آزادی کی قیمت ادا کر دی تھی۔ چنانچہ اسے اور سیف توڑنے والے کو پولیس کی نگرانی میں میکسیکو کے شہر ایل پاسو لے جا کر رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اور نہ

بتایا۔ ”ان کے وکیل صفائی نے مختلف مقامات سے ماہرین کی ایک پوری جماعت یہ ثابت کرنے کے لیے بلائی کہ وہ رجسٹر جلی ہیں اور رجسٹروں میں درج شدہ اندراجات ارون یا اس کے اکاؤنٹ کلروں کے ہاتھ سے تحریر کردہ نہیں۔“

”تب پھر اس کے نتیجے میں تم مقدمہ ہارے کیوں نہیں، جیت کیسے گئے؟“

”اس لیے کہ ماہرین تحریر بغیر اپنا بیان دیے واپس چلے گئے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا؟“

”انہوں نے وکیل صفائی کو بتایا کہ رجسٹر میں جملہ اندراجات ہرگز ہرگز جلی نہیں ہیں اور جب انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا تو وکیل صفائی نے جتنی جلدی ممکن ہو سکا، انہیں قصبے سے واپس بھجوا دیا۔ چنانچہ ہمیں اپنے ماہرین تحریر پیش کرنا پڑے جنہوں نے حلفیہ بیان دیا کہ رجسٹروں کے اصلی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ میں وکیل صفائی کے بلائے ہوئے ماہرین سے بیان دلواتا کیونکہ اس طرح بات ذرا زیادہ دلچسپ اور روزنی ہو جاتی، لیکن جیسا کہ میں نے کہا انہیں بڑی عجلت میں قصبے سے باہر بھجوا دیا گیا تھا۔“

”میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ ہیرس نے اچھٹے ہوئے کہا۔ ”آخر ماہرین ایسا بیان دینے پر کیسے راضی ہو گئے؟“

”جج صاحب کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ نمایاں ہو گئی۔“ اس لیے کہ وہ تمام رجسٹر اور کاغذات حقیقت میں جعلی نہیں بلکہ اصلی ہی تھے۔ ”انہوں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ”جس رات ہم نے سیف کھول کر رجسٹروں کے فوٹو اتارے تھے تو سیف توڑنے والے نے مجھے سیف کے قفل کا نمبر بتا دیا تھا اور میں نے اسے حفاظت سے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔ جس دن ہم نے چھاپا مارا اس سے ایک رات قبل میں نے پولیس کے دو آفیسروں کو ایجنسی کے دفتر بھیجا کہ وہ چوکیدار کو اپنے ادھر ادھر کے سوالات میں الجھا کے عمارت سے باہر لے جائیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ پولیس آفیسر چوکیدار کو باہر سڑک پر کھڑی ہوئی اپنی کار تک لے گئے اور انہوں نے اسے پانچ منٹ سے زیادہ روکا بھی نہیں، لیکن میرے لیے پانچ منٹ ہی کافی تھے۔ میں نے سیف کھولا، اس کے اندر سے اصلی رجسٹر اور کاغذات نکالے اور ان کی جگہ جعلی رجسٹر رکھ دیے۔ اور پھر دوسرے دن چھاپے کے دوران جب دفتر کے عملے کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا

تو میں نے اس اصل رجسٹروں کو ایک میز کی چٹائی دو درازوں میں چھپا دیا، جہاں سے بعد میں انہیں برآمد کرنے کا ڈراما کھیلا گیا۔ چنانچہ جو رجسٹر ہم ایجنسی کے دفتر سے بظاہر برآمد کر کے لے گئے تھے، اصل رجسٹر تھے، نقلی نہیں تھے۔ جبکہ سیف میں رکھے ہوئے جعلی رجسٹروں کو اصل خیال کرتے ہوئے ارون نے ہمارا چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کہیں چھپا دیا تھا۔ چنانچہ تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم کسی کو دھوکا یا فریب نہیں دے رہے تھے۔ ہم ایک وارنٹ لے کر آئے اور تلاشی میں ہم نے وہی چیز حاصل کر لی جسے حاصل کرنے گئے تھے۔ ارون کے اصل رجسٹر..... اور یہ ہی اصلی رجسٹر عدالت میں پیش کیے گئے تھے۔“

”جج صاحب نے ایک نیا سا رنگال کر سلگایا اور کش لے کر بولے۔“

”بے شک ارون اور اس کے ساتھیوں کو اس بات پر بڑا... تعجب تھا کہ ہم اصلی رجسٹر پیش کرنے میں کیسے کامیاب ہو سکے، کیونکہ ارون تو اپنی دانست میں انہیں چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کسی خفیہ مقام پر پہنچا چکا تھا اور غالباً اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جن رجسٹروں کو وہ اتنی حفاظت سے چھپا رہا ہے، وہ جعلی ہیں۔“

”آپ نے ذہانت اور چالاکی میں لومڑی کو بھی مات دے دی۔“ ہیرس ہنسنے لگا۔

”جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے ہم نے شروع سے آخر تک..... قطعی قانونی تقاضوں کے مطابق لڑا۔ ہم نے کوئی جعلی ثبوت نہیں بنایا اور نہ پیش کیا۔ ہم نے کسی کو فریب نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارون کو جیل بھجوانے اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوشش میں، میں ایک سے زیادہ قانون توڑنے کا مرتکب ہوا۔ اب تم بتاؤ کہ تم حصول انصاف کے اس طریق کار کے بارے میں کیا فیصلہ دو گے؟ کیا واقعی جائز مقصد حاصل کرنے کے لیے غلط اور ناجائز ذرائع اختیار کرنا قانونی اور اخلاقی اعتبار سے درست ہے؟“

”میں..... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ ہیرس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”جی بات یہ ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے باوجود میں خود آج تک اس بارے میں کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔“ جج صاحب نے متانت سے کہا اور خاموشی سے سگار کے کش لینے لگے۔

لاچس کولا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

زیر نظر کہانی اپنے عنوان سے ہی چونکا رہی ہے... یقیناً اس کے مصنف کو بھی اسی جستجو اور دلچسپی نے لکھنے پر مجبور کیا ہوگا... دنیا میں جگہ جگہ بہت کچھ اوجھل اور بہت کچھ نمایاں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہیں ”بہت“ ہے اور کہیں ”کچھ“ ہے لیکن جو بھی ہے دلچسپ ہے۔

غیر ملکی معاشرے اور نئے پس منظر میں انوکھا منظر



رہی ہوں۔ میں ٹھنک کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
لاچس کولا میں الورتینا کی تصویر کیوں تھی، میں
سوچنے لگا۔ لاچس کولا اس گھر کا نام تھا جو ایک جہاز کے
مانڈ تھا۔ ایک چھوٹا سا بحری جہاز..... خشکی پر ٹھہرا ہوا۔

”یہ الورتینا کی تصویر ہے۔“ اس نے خوب صورت
فریم کی ہوئی ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
الورتینا یقیناً خوب صورت تھی۔ ایک خاص کشش تھی
اس کے چہرے پر اور چمکتی ہوئی آنکھیں جیسے دور تک دیکھ

ستمبر 2016ء

161

سینس ڈائجسٹ

یہ سب کچھ چلی کے شہر سانٹیا گو میں ہو رہا تھا۔ اسی چلی میں جس کا نام پہلی دفعہ میں نے اس وقت سنا جب میں میڈیکل کالج میں دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے بس کے رکتے ہی نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بورڈ پہ نظر پڑی جہاں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا کہ امریکا کی مدد سے چلی کے صدر ایلنڈے کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ایلنڈے جو عوام کا منتخب کردہ تھا، فوجی بوٹوں کے تلے روند گیا۔

پھر سانٹیا گو کا نام اس وقت سامنے آیا جب میں نے لندن میں جیک لیمن کی فلم 'میسنگ' (Missing) دیکھی جس میں جیک لیمن ایک ایسے امریکی باپ کا کردار ادا کرتا ہے، جس کے صحافی بیٹے کو سانٹیا گو میں قتل کرنے کے بعد اس کی لاش غائب کر دی جاتی ہے۔ جیک لیمن کا کردار بڑی ہوشیاری اور نہایت درمندی کے ساتھ انسانی حقوق کی پامالی کی روداد بیان کرتا ہے۔ اس وقت سے میرے دل میں خواہش تھی کہ چلی دیکھوں اور سانٹیا گو کا وہ میدان بھی دیکھوں جہاں نہ جانے کتنے کیونستوں کو حق و انصاف کی آواز بلند کرنے کے جرم میں پنوشے کے دور اقتدار میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

چلی کے اسی شہر سانٹیا گو میں قسمت ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئی تھی۔

سانٹیا گو شہر کے بازاروں، گلیوں میں گھومتے ہوئے چائے خانوں، کافی ہاؤسز میں محفوظ ہوتے ہوئے شراب خانوں اور ریسٹورانوں میں چکر لگانے کے بعد ہمارا گروپ لاجس کو لا پہنچا تھا۔

”یہ میری نانی ہے۔“ میرے گانڈ گونالوا استورانے میرے چہرے پر ابھرے ہوئے سوالوں کو بھانپ کر خود ہی جواب دیا۔

اس جواب نے میرے دماغ میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ ”لاجس کو لا“ سانٹیا گو شہر کے بیچوں بیچ پابلو نیرودا کا جہاز نما گھر تھا۔ پابلو کے گھر میں خوب صورت عورت اور حینا کی تصویر جو ہمارے گانڈ گونالوا استورا کی نانی تھی۔ میں نے سوچا کہ گانڈ نے یہ تصویر ایسے ہی لگا دی ہوگی، خوب صورت عورتوں کو تو سجا یا بھی جاسکتا ہے۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے امریکی لہجے والی انگریزی میں آہستہ آہستہ رک رک کر کہا کہ ”الور حینا پابلو کی معشوقہ تھی۔ ایک طویل مدت تک اس کی محبوبہ رہی۔ یہ تصویر اور اس کے برابر رکھے ہوئے تمام خطوط پابلو نے

گاہے بگاہے الور حینا کو لکھے تھے۔“ وہ سارے خطوط بڑی احتیاط سے تصویر کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ تاریخ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن۔ ان ہفتے مہینوں اور سالوں کو پھلانگتے ہوئے الور حینا کے پاس رک گئے تھے۔

”پابلو کی پہلی کتاب میں الور حینا کے لیے بے شمار نظمیں ہیں۔ وہ تمام محبت بھری نظمیں ان انسانی جذبات سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو زندگی میں خوشی، نکلن، جذبہ اور مقصد بھر دیتے ہیں۔“ گونالو نے بڑے رومانی انداز میں تقریر کی تھی۔

ہم سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پابلو نے صرف عشق کیا اور تمام زندگی عشق میں گزار دی۔ سمندر سے عشق، عورت سے عشق، علم اور کتابوں سے عشق، جنوبی امریکا، افریقا اور ہندوستان سے عشق اور پھر جمہوریت، شخصی آزادی اور آزادی کے دیوانوں سے عشق۔ اس کا عشق، اس کی محبت کہیں چھپی ہوئی ہے، کہیں علی الاعلان اشتہار بنی ہوئی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ وہ کہیں تو بالکل سامنے ہے اور کہیں مکمل طور پر چھپا ہوا اور پراسرار۔

میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ کیا وہ اپنی نانی الور حینا کے بارے میں سچ کہہ رہا ہے۔ ابھی یہ سوال ذہن میں کلبلا ہی ہوا تھا کہ اس نے کہا۔ ”اب اس جہاز نما مکان کو ہی دیکھ لیں۔ یہ مکان بھی پابلو کی طرح پراسرار ہے۔ پابلو کی طرح عاشق ہے اور پابلو کی طرح بے باک بھی۔“

گونالو نے کسی اچھے گانڈ کی طرح ہم لوگوں کو سمجھ کر لیا تھا۔ ”اس گھر کو پنوشے کے فوجیوں نے تباہ کر دیا۔ پابلو نے یہ گھر بڑی محبت سے مفلڈا کے لیے بنایا تھا۔ وہ سامنے تصویر ہے مفلڈا کی۔ مفلڈا اسے اس نے شادی نہیں کی مگر وہ آخر دم تک اس کی محبتوں کا مرکز بنی رہی۔“ ہم سب نے دیوار پر لگی ہوئی عورت کی تصویر کو دیکھا۔ بھرے بھرے ہونٹ، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اور سر پر ڈھیر سارے سیاہ بالوں کا بڑا سا الجھا ہوا دائروں میں بنا گھولسلا۔

”یہ تصویر پابلو کے ایک بہت اچھے دوست نے بنائی ہے۔ اسے غور سے دیکھیں۔ اس تصویر میں صرف ایک مفلڈا نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔“ گونالو نے سکراتے ہوئے کہا۔

ہم سب بڑے غور سے خوب صورت مفلڈا کی تصویر دیکھ رہے تھے اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

رہا۔ اپنی محبتوں کے بارے میں، ان فوجیوں کے بارے میں جو غاصب بھی تھے اور خدا بھی۔ ان سیاسی کارکنوں کے بارے میں جن کی لاشیں راتوں کو پہلی کاپٹروں میں بھر کر بیچ سمندر میں شارک مچھلیوں کی خوراک بنا دی گئیں۔ وہ محبتوں کے دوران اور عشق کے کرناک لمحوں میں بھی ان مزدوروں، صحافیوں اور ان باضمیر انسانوں کا درد لے کر فوجی جنتا کے جسم و روح پر بوجھ بن گیا تھا۔

ہم اب لاجس کولا کے دوسرے کمرے میں پابلو کے چھوٹے سے مے خانے میں اور اس کے ساتھ بنے ہوئے باورچی خانے میں شراب کی پرانی بوتلوں، مختلف انداز و اطوار کے جام اور ہندوستان اور افریقا سے جمع کیے ہوئے برتنوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی پابلو کی خواب گاہ تھی، پرانے زمانے کا اونچے ستونوں والا پلنگ جیسے کسی جہاز کے کیمین میں رکھا ہوا تھا۔ ”پابلو نے دو خواب گاہیں بنائی تھیں۔ ایک یہ اور ایک اوپر، کتابوں کے کمرے کے ساتھ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کتابوں کا وہ کمرہ نہیں دکھا سکوں گا مگر اس خواب گاہ کی ایک خاص بات ضرور بتانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گونسا لو نے دیوار سے لگی ہوئی الماری کا دروازہ کھول دیا۔ یہ

”لاجس کولا.....“ اس نے زور سے کہا۔ ”لاجس کولا کا مطلب یہ ہے گھنے بالوں والی عورت۔ مغلڈا گھنے بالوں والی عورت تھی۔ پابلو نے لاجس کولا اس کے لیے بنوایا تھا اور اس کی اسی صفت پر اس گھر کا نام رکھ دیا تھا۔“

”اس تصویر میں فنکار نے ایک اور شرارت کی ہے۔“ اس نے پھر مسکرا کر کہا۔ ”پابلو نے مغلڈا سے کبھی شادی نہیں کی مگر ہمیشہ مغلڈا کے پیچھے کہیں چھپا رہا۔“ یہ کہہ کر گونسا لو آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گتے کے کارڈ سے مغلڈا کا چہرہ اور پیشانی چھپادی۔

ہم سب حیران رہ گئے۔ مغلڈا کے گھنے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں پابلو مسکرا رہا تھا۔ وہی چہرہ، وہی پیشانی، وہی گال، وہی ٹھوڑی اور پگلی ہوئی ناک کے نیچے وہی پتلے نیلے مسکراتے ہوئے ہونٹ۔

وہ مغلڈا کے گھنے بالوں میں، لاجس کولا میں چھپا رہا، لکھتا رہا۔ اس کمرے کے دوسری جانب بنے ہوئے چھوٹے سے مے خانے میں سرخ اور سیاہ انگور کی شراب پیتا رہا۔ کمرے کی دیواروں میں بنی ہوئی جہازی کھڑکیوں سے، دیوار کو چھوتی ہوئی مصنوعی سمندر کی لہروں کو گنتا اور لکھتا

ماہ آزادی کی تیاریاں
اگست کے شمارے کی کہانیاں

ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ

لیکھے وطن کی چاہ میں جان بٹا کر دینے کا عزم رکھنے والوں کا
آتش جنوں..... **سلیم فاروقی** کے قلم کی سوغات

شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عجم کی کجائی
جسم لینے والا ہولناک سلسلہ۔ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پائی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سیرورق کی کہانیاں

پہلا رنگ۔ جرم کی گریختی، اپنی کھوپڑی ہوں سلجھانے کا ہنر نا چاہیے۔ سیرورق کی تنکھی کہانی

دوسرا رنگ۔ معاشرے کی عکاس ایک انوکھی کہانی کے پیچ و خم۔ سیرورق کا دوسرا رنگ



آپ کے تیرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا ہیں

تھا اور افریقا میں بھی گھومتا رہا تھا۔ راجستھان، یوپی، حیدرآباد اور کیرالا سے جمع کی ہوئی چھوٹی چھوٹی خوب صورت چیزیں فوجیوں کی دستبرد سے محفوظ رہی تھیں۔ وہ تمام چیزیں اب بھی پابلو کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ پابلو کو گلاس جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملک ملک کے گلاس، طرح طرح کے پیالے گھر میں موجود الماریوں میں اب بھی سجے ہوئے تھے۔

لوگ انہماک سے پابلو کے جمع کیے ہوئے نوادرات دیکھ رہے تھے۔ میں گونالو کے قریب کھڑا ہو گیا، پھر میں نے ہمت کر کے دھیرے سے پوچھا۔ ”مجھے اپنی نانی اور تینا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

وہ ہنس دیا۔ ”تم سارے لوگ، جو ہندوستان سے آتے ہو ایسے ہی سوال کرتے ہو۔ تمہارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ میں اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں اور اس کے آگے کے سوال بھی مجھے پتا ہیں لہذا میں سارے سوالوں کا ایک ساتھ جواب دے دیتا ہوں۔“

گونالو دبلا پتلا اٹھائیس تیس سال کا آدمی تھا۔ اس کے گہرے سیاہ بال تھے جو بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں کو پونی ٹیل کی طرح باندھا ہوا تھا۔ اس کی وسیع پیشانی سے بال کچھ کر پونی ٹیل میں بندھ گئے تھے۔ اس کی بھوس ٹھنی تھیں اور نمایاں ناک کے ساتھ پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ وہ خود بھی ایک خوب صورت آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی نانی بھی بہت خوب صورت رہی ہوگی۔

”نہیں ہمیں کوئی پشیمانی نہیں ہے اس بات پہ کہ ہماری نانی اور تینا، پابلو کی محبوبہ تھی۔ درحقیقت یہ بات تو شاید کبھی بھی منظر عام پر نہیں آئی، شاید ہمیشہ ایک راز رہتی۔ دراصل پابلو کی محبت ایک راز ہی تھی۔ پابلو نے خود بھی کہا ہے کہ میں اس زمانے میں دوغلا تھا۔ اور تینا سے محبت کرتا تھا مگر اس کا برسرِ عام اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت چلی اور سانتیا گوروا تئوں اور مذہبی انتہا پسندوں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔“

وہ پابلو کا ابتدائی دور تھا۔ وہ ڈرتا رہا، شاعری کرتا رہا، محبت کے نغمے گنگنا تا رہا، چھپ چھپ کر اور تینا سے ملتا رہا۔ وہ بھی محبت کے خاموش طوفان میں رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے اور پابلو کے تعلقات کو قاتل نونی شکل مل جائے مگر سماج کا نیٹ ورک زیادہ مضبوط تھا۔ وہ دونوں نہ شادی کر سکے نہ ساتھ رہ سکے اور اور تینا کی شادی میرے نانا سے

ایک سادہ سی الماری تھی۔ اس نے بیچ کا دروازہ بھی کھول کر دکھایا۔ یہ بھی ایک سادہ سی الماری تھی جس میں بینگر لٹکانے کے لیے راڈ لگی ہوئی تھی جہاں پابلو اپنے کپڑے لٹکاتا ہوگا۔ الماری کے تیسرے دروازے کو کھولا گیا تو وہ بھی ایک سادہ سی الماری ہی تھی مگر اوپر سے نیچے تک اس میں کسی بینگر کی جگہ نہیں تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا لگا کہ درحقیقت الماری کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے کا ایک پوشیدہ ہینڈل تھا۔ گونالو نے آہستہ سے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ ہم سب الماری کے اس دروازے سے پابلو کے گھر سے باہر آ چکے تھے۔ ”آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا کہ پابلو کو اس خفیہ دروازے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ جاننے والوں سے چھپتا رہا۔ شاید یہ دروازہ فوجی جاسوسوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ خواتین و حضرات! میں گونالو اور تینا کا نواسہ جو پابلو کی محبوبہ تھی، پابلو کے اس راز سے پردہ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔“

”مجھے پتا ہے آپ لوگ پابلو کی لائبریری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان بیش قیمت پینٹنگز کو دیکھنا چاہتے ہیں جو پکا سونے خود بنا کر پابلو کو دی تھیں۔ چلیے میں آپ کو لے چلتا ہوں مگر افسوس کہ آپ انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے قدموں کے نشان پر چل رہے تھے۔ ”یہ سارا مکان لوٹ لیا گیا۔ ایک رات پنوشے کے فوجیوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ بے شمار کتابیں، بیش قیمت پینٹنگز اور پابلو کے جمع کیے ہوئے مختلف نوادرات فوجی اٹھا کر لے گئے۔ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کتابیں، فن کے وہ نادر نمونے کہاں گئے۔ فوجیوں نے جہاں لوٹ مار کی وہاں لاپس کولا کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ جہازی مکان کی کھڑکیاں، کھڑکیوں کے باہر کھڑا ہوا پانی کا نظام جسے پابلو سمندر کی طرح دیکھا کرتا تھا، ان لوگوں نے سب کچھ ختم کر دیا۔“ میں نے سوچا فوج کہیں کی بھی ہو، کسی زمانے کی بھی ہو صرف فوج ہوتی ہے۔ حالت امن میں بھی لوٹ اور حالت جنگ میں بھی لوٹ۔ شاید لوٹ فوجی تربیت کا بنیادی جز ہے۔

لائبریری کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں پابلو اپنے مہمانوں کی دلداری کرتا ہوگا۔ کمرے میں کچھ بچی ہوئی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ پابلو ہندوستان میں سفارت کاری بھی کرتا رہا

فکار جو سڑکوں اور چھوٹے موٹے تھیٹروں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، معاشی خوشحالی نہ ہونے کے باوجود امریکا نہیں جانا چاہتے، بلکہ یورپ جانا بڑے فخر کی بات مانی جاتی ہے۔ آخر کیوں؟“ میں نے اس سے ایک طویل سوال کر ڈالا۔

”ارے! یہ تو بہت سادہ سی بات ہے۔ پورے جنوبی امریکا میں زیادہ تر لوگ اپنے آپ کو یورپ کی ان انقلابی تحریکوں سے وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور انہیں اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں جن کا مقصد جمہوریت کا حصول، شخصی آزادی کی بالادستی اور انسانی حقوق کی بحالی ہے۔ امریکا میں یہ سب کچھ نہیں ہے، ان کے اصول مختلف اور پیمانے جدا ہیں۔ وہ امریکا میں امریکیوں کے لیے جو چاہتے ہیں وہ سب کچھ دنیا کے عوام کو دینا پسند نہیں کرتے ہیں۔ پابلو جیسے شاعروں کا یہی کمال ہے انہوں نے جنوبی امریکا کے عوام کو اور نو جوانوں کو شناخت دی ہے، ان میں ان بلند انسانی اقدار کی روح پھونکی جس نے انہیں دنیا سے تھوڑا مختلف کر دیا ہے۔“

”پابلو نے مغلڈا سے شادی کیوں نہیں کی؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”وہ لاپس کولا میں چھپا رہا۔ مغلڈا کے گھنے بالوں میں اپنے آپ کو چھپا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا مگر اس نے مغلڈا سے بھی شادی نہیں کی۔ شاید وہ شادی کو نہیں مانتا تھا۔ وہ چلی کے اشرافیہ کے اس دو غلے پن سے شدید نفرت کرتا تھا جہاں وہ ایک بیوی اور خاندان کے ساتھ خوش و خرم رہنے کی نمائش کرتے تھے اور ہر ایک نے दाشتائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اس کی زندگی کا کوئی بھید نہیں تھا بلکہ مکمل طور پر اعلان تھا کہ وہ کس قسم کے سماج پر یقین رکھتا تھا۔ اگر اس کی شادی میری نانی سے ہو جاتی تو شاید اس کی زندگی کچھ اور ہوتی مگر اس کے باوجود بہت سارے سوالات ہیں جن کے جواب نہ مل سکے..... اور نہ کبھی ملیں گے۔“

گروپ کے دوسرے لوگ لاپس کولا کے سامنے والے دروازے پر پہنچ چکے تھے جو سڑک پر کھلتا تھا جس پر حکومت کی جانب سے پابلو کی یادگار کی تعمیر کی گئی تھی۔ ہم لوگوں نے یادگار کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تصویر کھینچوائی اور پابلو کے پسندیدہ ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھانے چل دیے۔

”میں نے پابلو کو اپنی نانی سے سمجھا ہے، پڑھا ہے، دیکھا ہے، محسوس کیا ہے۔ شاید اس دنیا میں پابلو سے سب سے شدید محبت اسی نے کی ہے۔“

”میرے نانا کے مرنے کے کئی سال کے بعد جب پابلو بھی مر چکا تھا، میری ماں کو جوتے کے دو ڈبوں میں چھپائے ہوئے پابلو کے خطوط مل گئے۔ اس وقت پہلی دفعہ میری نانی نے اقرار کیا کہ وہ پابلو کی محبوبہ رہی ہے۔“

”شروع میں ہمارے خاندان کے لیے یہ بڑے شرم کی بات تھی مگر میری ماں نے میری نانی کو پابلو سمیت قبول کر لیا۔ وہ ہمارے گھر میں بہت اطمینان سے اپنے بچوں کے درمیان پابلو کی تحریروں، نظموں کو دہراتی ہوئی ایک دن شاید اس کے پاس چلی گئی۔“

”گو نسا لو واقعات کو کسی نظم کی طرح بیان کر رہا تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم اپنے لمبے بالوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے زور زور سے ہلتا تھا۔“ مجھے تو تم بھی شاعر لگتے ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں میں بھی شاعر ہوں اور شاعری کرتا ہوں۔ رومانی شاعری، سیاسی شاعری، امریکا کے خلاف، ظلم و غربت کے خلاف، انصاف اور امن کے لیے، علم و آگہی کے لیے، ایک ایسے سماج کے لیے جہاں ظلم نہ ہو، انصاف ہو۔“

”تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔ چلی میں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ ہر کوئی ہسپانوی بولتا ہے کوئی انگلش سمجھتا ہی نہیں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں امریکا میں پڑھا ہوں اور میری بیوی بھی امریکن ہے، اس وجہ سے میری انگلش میں امریکن انداز ہے۔“

”تو تم امریکا واپس چلے جاؤ گے اپنی بیوی کے ساتھ؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ امریکا میں کیا ہے۔ نہ تاریخ، نہ زبان، نہ کچھ صرف دوسری اقوام کو محکوم بنانے کی خواہش۔ اگر مجھے چلی چھوڑنا پڑا تو میں یورپ جاؤں گا اسپین، فرانس یا اٹلی۔“

”سانتیاگو کی یہ خاص بات ہے۔ ریستورانٹس میں کام کرنے والے بے شمار بیرے، ٹیکسیاں چلاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور، ہزاروں کی تعداد میں نظر آنے والے وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-





محی الدین نواب

چونتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کئی چھاؤں کئی روپ، محبت کی مٹاؤں، رقابتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دو برجدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی مگنی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جیمرو اور چاچی مٹی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوشہ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منگی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے سین گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈ سے ہو گئی جو کہ میرا سبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم محل تھا۔ محبوب چانڈ یو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی میرا سبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، بر باد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ جیزاب سے منسوخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف محلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکرٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرعہ لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈ یو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انہو کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سبلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوشہ گئی، تاہم محبوب چانڈ یو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کور ہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکبے سے فرار ہو گیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مرینہ دوبارہ MET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مینی من سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جرنل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ رہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاؤ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیل جانے لگی۔ درگاہ مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگار کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگار سے نکاح پڑھوایا اور بشری اور پلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگار میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسر اقتدار آ گیا۔ بابا جیمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد

نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو تانوں چتے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زادی یادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو ختم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ محبوبہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہو گیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو اغوا کاروں کو عابی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بنی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہو گئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرائے۔ حماد کے پیچھے شامہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرا دیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ایئر پورٹ پر شامہ پر حملہ ہوا عابی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمہ داری عابی کے سپرد کر دی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی اپنے دوست پولیس آفیسر کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ادھر عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں کھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کون ہے۔ دشمن خوش تھے کہ میر پر سوا سیر آ گیا ہے۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا اور بے درجے ناکامی کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ارض اسلام میں بشری کے دماغ پر قابو پایا تاہم وہ اسے ایک ذرا نقصان پہنچا پایا۔ بشری اس کے چنگل سے نکل گئی۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ جو بھی ہوا تھا، مشیت ایزدی سے ہوا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ دنیا مرد اور عورت کے باہمی تعلقات سے قائم ہے۔ ان تعلقات کے جاری و ساری رہنے سے دنیا آباد اور پُر رونق رہتی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے، فنا ہوتا ہے۔ اس کی آمد و رفت کے لیے عورت کا وجود اس دنیا میں آنے کا پہلا دروازہ ہے۔

کبھی انسان کی اپنی غلطیوں سے اور کبھی قضائے الہی سے اس وجود میں تباہیاں آتی رہتی ہیں۔ ویسے ماریہ کے وجود کی تباہی انوکھی تھی۔ ایک کلی کی تیز و تند دھار سے ماریہ کی ہتھیلی کی پشت زخمی ہو گئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا تھا۔ وہ بعد ازاں اسی طرح زخم کھا کر اس دنیا سے گئی تھی۔

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس عجیب معاملے پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ یہ سب ہی سمجھ گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پرنس عابی ایک پتھر ہے جس پھول پر گرے گا وہ بری طرح پس کر رہ جائے گا۔ پرنس کے لیے یہ بحث بھی جاری تھی، کیا وہ فطری تقاضے پورے کیے بغیر پہاڑ جیسی زندگی گزار سکے گا؟

وہ مایوس نہیں تھا۔ آئندہ جو بھی ہونے والا تھا، اس

وہ حسین و شیزاؤں کو دیکھتا تو ماریہ کی طلب پکارنے لگتی تھی۔ وہ فوراً ہی حسین جلوؤں سے منہ پھیر لیتا تھا۔ نہ کبھی گناہ کا مرتکب ہو سکتا تھا، نہ ہی کسی کی قربت سے کھیلنے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا ظلم کر سکتا تھا۔ وہ غلطیوں سے اور گناہوں سے بچنے کے لیے بہت زیادہ محتاط رہنے لگا تھا۔ عورتوں سے کترانے اور پردہ کرنے کی حد تک دور رہنے لگا تھا۔ یہ اٹل فیصلہ کر چکا تھا کہ جب رب راضی ہوگا تب وہ کسی سے راضی ہوگا۔

وہ دنیا میں تباہیاں آتی رہتی ہیں۔ ویسے ماریہ کے وجود کی تباہی انوکھی تھی۔ ایک کلی کی تیز و تند دھار سے ماریہ کی ہتھیلی کی پشت زخمی ہو گئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا تھا۔ وہ بعد ازاں اسی طرح زخم کھا کر اس دنیا سے گئی تھی۔

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس عجیب معاملے پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ یہ سب ہی سمجھ گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پرنس عابی ایک پتھر ہے جس پھول پر گرے گا وہ بری طرح پس کر رہ جائے گا۔ پرنس کے لیے یہ بحث بھی جاری تھی، کیا وہ فطری تقاضے پورے کیے بغیر پہاڑ جیسی زندگی گزار سکے گا؟

وہ مایوس نہیں تھا۔ آئندہ جو بھی ہونے والا تھا، اس

دوسری طرف دو شیرازوں اور بھرپور جوان عورتوں کے جذباتی معاملات تھے۔ وہ ماریہ کا انجام دیکھنے کے بعد سہم گئی تھیں پھر بھی خیالوں میں اور خوابوں میں اسے طلب کر رہی تھیں۔

بھانت بھانت کی عورتیں اتنا کچھ ہونے کے باوجود اپنے مزاج کے مطابق دعویٰ کر رہی تھیں کہ شہ زور پرنس کی قربت حاصل کریں گی۔

عابی کسی کا چیلنج قبول کر کے نہ تماشا کرنا چاہتا تھا، نہ خود تماشا بننا چاہتا تھا۔ اسے کسی نازک بدن کی ہوس نہیں تھی۔ وہ ماریہ جیسی کسی شریف زادی کو اس وقت قبول کرتا جب یقین ہو جاتا کہ اس پیار کرنے والی کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔

ان نون اپنے اس جھوٹے بیان پر قائم تھا کہ اس نے ماریہ کو ہلاک کر دیا ہے۔ وہ پرنس کی پہلی سہاگ رات کا قاتل بن کر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جسے جو بہ اور روبوٹ کہا جاتا تھا، اسے وہ بڑی آسانی سے مات دے رہا ہے۔

وہ رہ رہ کر بیان دے رہا تھا کہ جب تک پرنس اس کے آگے گئے نہیں ٹیکے گا، تب تک وہ کسی حسینہ کو اس کی خلوت میں آنے نہیں دے گا۔ جو بھی آئے گی، وہ ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار سے ماری جائے گی۔

ان نون کے ایسے دعوے سن کر پرنس کی آرزو کرنے والی حسینہ کو یقین ہو رہا تھا کہ اس کی روبوٹ والی قوت نے ماریہ کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے خوش خبری تھی۔ ان چاہنے والیوں کے حوصلے پھر سے جوان ہو رہے تھے۔ بس ایک ہی رکاوٹ سامنے تھی کہ پرنس کی قربت حاصل کرنے کے لیے ان نون کی دشمنی سے بچنا ہوگا۔

پرنس کو دیوانہ وار طلب کرنے والیوں کے دل سے ان نون کے لیے ہائے نکل رہی تھی۔ مسئلہ ایک نہیں تھا۔ کئی تھے۔ پیار سے خلوت میں آنے والیاں ہی طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے والی تھیں۔ ادھر ان نون موقع سے فائدہ اٹھا کر ایسی سر پھری حسینہ کو بھی اپنا آلہ کار بنا سکتا تھا۔ آگے بہت کچھ ہونے والا تھا۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں ایک نئی عداوت کا راستہ کھل رہا تھا۔ عداوت نئی تھی لیکن اس کا اشارہ زیب النساء کو پہلے ہی خواب کے ذریعے مل چکا تھا۔ اس نے لہو برستے دیکھا تھا۔ باقاعدہ موسلا دھار لہو کی بارش دیکھی تھی۔ ایسے تشویش میں مبتلا کرنے والے خواب کی تعبیر واضح تھی..... موت آئے گی

یاشامت آئے گی۔ آدی خواب نہ دیکھے۔ اسے کوئی اشارہ نہ ملے، تب بھی موت آتی ہے اور جب تک نہیں آتی، شامت آتی رہتی ہے۔ زیب النساء اور ہم زاد نے ماروی کی پیدائش سے پہلے دہلی جانے کا معمم ارادہ کیا تھا۔ بابا صلاح الدین اجیری بہت یاد آرہے تھے۔ وہ ماروی کو ان کے حجرے میں لے جانا چاہتے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بزرگ اس دنیا میں ہیں یا نہیں؟

ہم زاد نے کہا۔ ”وہ ہوں گے تو ماروی کو ان کی دعائیں ملیں گی۔ نہ ہوئے تو وہ حجرے کی مقدس چار دیواری سے گزرنے کے بعد دنیا میں آئے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”میں بھی بابا صاحب کے در پر حاضری دینے جاؤں گا۔ وہ ایک عرصے سے ہماری طرف نہیں آرہے ہیں۔ ہم تو ان کے در پر جا سکتے ہیں۔“

ہم زاد نے ایک ریاست کے فرماں روا کی حیثیت سے بھارتی حکومت کو اطلاع دی کہ وہ کسی سیاسی معاملے میں نہیں روحانی معاملے میں ہندوستان آنا چاہتا ہے۔ بھارتی حکام نے بڑی فراخ دلی سے اسے خوش آمدید کہا لیکن در پردہ چوکنے ہو گئے۔ ان کے نقطہ نظر سے موجودہ دور کا سب سے خطرناک اور ناقابل گرفت مجرم مراد علی منگی ان کی دھرتی پر قدم رکھنے والا تھا اور وہ اسے مجرم نہیں کہہ سکتے تھے۔

سپر پاور، دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک اور عالمی عدالت اسے ریاست ارض اسلام کا ایک ٹیک نام حکمران تسلیم کر چکے تھے۔ لہذا اپنے دیس میں مراد کا شایان شان استقبال کرنا بھارتی حکومت کا فرض تھا۔

انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والے مراد پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ کئی بار ان کے دیس میں آکر قانون کے خلاف رہائش اختیار کر چکا تھا۔ اس نے وہاں اپنی سلامتی اور بہتری کے لیے جو وارداتیں کی تھیں، وہ اس ملک کے قانون کے خلاف تھیں۔

اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ اس نے بھارتی حکومت کے ایک بنیادی اہمیت کے راز کی حفاظت کی تھی۔ ریڈ الرٹ کا سربراہ میکی البرٹ وہ راز چرا کر لے جانا چاہتا تھا۔ مراد نے اسے ہلاک کر کے اس اہم دستاویز کو منشر دھرم داس کے حوالے کیا تھا۔

گھبراہٹ میں پلٹنے کی سربراہ جگنی بانی نے اور اس پلٹنے کی معزز ڈاکٹر بیرسٹر اور دانشور خواتین نے بیان دیا تھا کہ مراد

کرنے والا جادو گر نہیں تھا۔ پرانے دور کا گرو گھنٹال نظر نہیں آتا تھا۔ وہ موجودہ دور کے مطابق بہت ہی اسارٹ جنٹلمین دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلین شیو رہتا تھا۔ بہترین تراشیدہ لمبوسات میں رہ کر اونچی سوسائٹی کا ایک معزز شخص کہلاتا تھا اور فر فر انگریزی بولتا تھا۔

اس نے جادو کی جھکنڈوں سے اپنا ووٹ بینک اس حد تک بڑھایا تھا کہ اسمبلی میں پہنچ کر ایک شعبے کا منسٹر بن گیا تھا۔ وہ اپنے دیس کا پہلا جادو گر تھا جو بچپن سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے اونچی سوسائٹی کا معزز فرد کہلاتے ہوئے ایک کامیاب مکار سیاستدان بن گیا تھا۔

جادو ہر ملک میں قانوناً جرم ہے۔ جادو کے ذریعے جو لوگ قتل جیسی سنگین واردات کرتے ہیں انہیں گرفتار کیا جاتا ہے اور سزائے موت دی جاتی ہے۔ رکھونا تھ کا لیا بہت محتاط رہ کر بڑی راز داری سے واردات کرتا تھا۔ اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ اس لیے نہ کبھی گرفت میں آتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کے منہ پر اسے جادو گر کہنے کی جرأت کرتا تھا۔

آئی جی کیدار شرما سے اور چند سراغ رساںوں سے اس کی دوستی تھی۔ انہوں نے کالیا سے کہا۔ ”ان نون ٹیلی پیٹھی کے ذریعے مراد سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس نے ایک زبردست نقصان اسے پہنچایا ہے۔ تم بھی اپنی کالی شکتی سے اسے زیر کر سکتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”میرا ٹارگٹ پرنس عابی ہے۔ اس کی غیر معمولی شکتی کے بڑے چرچے سن رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایک گیارہ یا بارہ برس کا چھوٹا تہا پوری ایک فوج کو شکست دے دیتا ہے۔ اسے گولیاں نہیں لگتی ہیں پھر تو وہ میرے جیسا جادو گر ہوگا۔ اسے ہتھیاروں سے اور جسمانی قوتوں سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ میں اپنی پراسرار شکتیوں سے اس ہاتھی کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دوں گا۔“

کیدار شرما نے کہا۔ ”وہ پرنس ماں کے پیٹ سے ایک عجیب اور غیر معمولی انسان بن کر آیا ہے۔ اب اس کی ایک بہن بھی پیدا ہونے والی ہے۔ اس کا بھی بڑا چرچا ہے۔ میڈیکل رپورٹ سے اور اس کے ماں باپ کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح عجیب و غریب صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔“

کالیا نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ مراد کی جو واقف یہاں آرہی ہے وہ حاملہ ہے۔ اس بچی کو جنم دینے والی ہے؟“

علی منگی مجرم نہیں ہے۔ لیکن وہاں مراد کی غیر قانونی رہائش اور اس کی سرگرمیاں انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے چیخ بن گئی تھیں۔ وہ اسے گرفتار کرنے کا کارنامہ انجام دینے میں ناکام رہے تھے۔

وہ اب تک جسے چھو بھی نہ سکے تھے وہ ان کے سامنے شاہانہ انداز میں آرہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ تپ رہے تھے۔ جھنجھلا رہے تھے کہ اسے گرفتار کرنے کے بجائے سیلوٹ کرنے والے ہیں۔

محبت کہتی ہے کھل کے کرو۔ نفرت کہتی ہے چھپ کے کرو۔ دشمنی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ دوستی کی طرح کرو۔ گلے لگا کر گلا کاٹو۔ آئی جی آف پولیس کیدار شرما جیسے کئی افسران پلاننگ کرنے لگے کہ اسے خوش آمدید کہیں گے۔ اس سے ہاتھ ملائیں گے پھر اس ہاتھ کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ پلاننگ کے دوران ایک اہم نکتے کو سب نے تسلیم کیا کہ مراد کو جسمانی قوتوں سے ہتھیاروں سے اور مکاریوں سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ اسے ختم کرنے کے لیے غیر معمولی جھکنڈے استعمال کرنے ہوں گے۔

غیر معمولی جھکنڈوں میں ایک ٹیلی پیٹھی کا علم تھا۔ آن نون ماریہ کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کر کے ہیرو بن گیا تھا۔ سب ہی کو یہ یقین دلا چکا تھا کہ آئندہ بھی ٹیلی پیٹھی کے ذریعے مراد اور اس کے بیٹے عابی پر مسلط ہوتا رہے گا اور یہ سب ہی تسلیم کر رہے تھے کہ مراد نے اپنی بہو سے محروم ہونے کی بہت بڑی شکست کھائی ہے۔ وہ آئندہ بھی ٹیلی پیٹھی کے ہتھیار سے مات کھاتا رہے گا۔

آئی جی شرما اور انٹیلی جنس کے سراغ رساں ان نون سے کسی طرح رابطہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس روپوش رہنے والے تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ فی الحال ایک اور غیر معمولی علم کو آزمانے والے تھے اور وہ علم تھا کالا جادو.....

ٹیلی پیٹھی اور کالے جادو کے دو طرفہ حملے مراد کی کمر توڑ سکتے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ دو پراسرار علوم کے درمیان سینڈ ویج بن کر ان کے دانتوں تلے آتا رہے گا۔ رکھونا تھ کا لیا ایک بہت ہی خطرناک اور گھاگ تا مثرک مہاراج تھا۔ کوئی مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ اور جان لیوا ہو، وہ اسے اپنی کالی شکتی سے حل کر دیتا تھا۔ لوگ اس کے کالے کرتوتوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔

وہ میلے کپڑے پہنے والا ڈاڑھی بھوئیں اور سر کے بال بڑھانے والا اور ظاہری حلیے سے دہشت طاری

اس نے روانگی سے کئی دن پہلے جگنی بائی سے اسکا پ کے ذریعے رابطہ کیا تھا۔ وہ اسکرین پر اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”جگ جگ جیو میرے بیٹے! تم کانٹوں میں گھرے رہتے ہو۔ جانے انجانے دشمنوں سے نمٹتے رہتے ہو اور ایسی سنگین مصروفیات کے باوجود اپنی ماں کو نہیں بھولتے۔ میں تم پر ماں کی جتنی بھی مستانچھا کروں، کم ہے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”ماتا جی! میں مراد نہیں ہوں۔ اس کا ہم شکل ہوں۔ دو روز کے دورے پر دہلی آ رہا ہوں۔ میں بظاہر مراد بن کر آؤں گا۔ مراد کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ وہ حماد کے نام سے نئے بہروپ میں آپ کے پاس آ رہا ہے۔“

وہ خوشی سے کھل گئی۔ ”ہے بھگوان! میں خوشی سے مر جاؤں گی۔ وہ کب آ رہا ہے؟ میں اسے کیسے پہچانوں گی؟“

اس نے حماد کی کئی تصویریں دکھائیں۔ وہ اسے اپنی ٹی وی اسکرین پر دیکھتی رہی۔ یہ سن کر خوشی سے بے چین ہوتی رہی کہ وہ دوسرے دن کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔

اس نے گھبراہٹ کی فائزر اور شوٹر عورتوں کو الٹ کر دیا۔ ”سن لو کہ میرا بیٹا آ رہا ہے۔ دو راتوں کے لیے اپنی نیندیں اڑا دو۔ ہتھیاروں اور گاڑیوں کے ساتھ ہر وقت تیار رہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے اندر اس کے دشمن چھپے ہوں گے۔ کسی وقت کچھ بھی ہوتا رہے گا۔ میرے بیٹے پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔“

وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی میدان ہموار کر رہی تھی۔ مراد کی اس ماں کی طرح ایک جان نچھاور کرنے والی بہن بھی تھی۔ اس کا نام درگا تھا۔ وہ بھی غضب کی فائزر اور شوٹر تھی۔ ایک بار دہلی سے شملہ جاتے ہوئے اس نے اپنے دشمن ہتی دیو کے گن فائزروں سے تنہا مقابلہ کیا تھا پھر مراد اور چمپت راؤ نے درگا اور اس کے بچے کو اس دشمن سے نجات دلائی تھی۔ مراد نے اسے بہن بنا لیا تھا اور چمپت راؤ نے اس سے شادی کر لی تھی۔

چمپت راؤ انڈیا میں ماسٹر کو بوبو کا دست راست اور معتمد خاص تھا۔ وہ اور درگا بڑی عقیدت سے مراد کو یوتا مانتے تھے۔ مراد نے انہیں بھی اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس کا استقبال کرنے اتر پورٹ آئے تھے۔

جگنی بائی اپنی پلٹن کے ساتھ وہاں آئی تھی لیکن مراد سے دور تھی۔ انٹیلی جنس والے گھبراہٹ کی نظر رکھتے تھے۔ لہذا طے پایا تھا کہ وہ بظاہر مراد سے دور

”ہاں، مراد کا پورا خاندان بابا صلاح لدین اجیری کا عقیدت مند ہے۔ وہ سب ان کے حجرے میں حاضری دینے آ رہے ہیں۔“

کالیانے پوچھا۔ ”اور وہ بچی مراد کے پیٹ میں ہے؟“

”ہاں۔ سنا ہے اسی مہینے ماں بننے والی ہے۔“

وہ خم ٹھونک کر بولا۔ ”پھر تو پرنس عالی تک رازداری سے پہنچنے کا راستہ آسان ہو رہا ہے۔ میں اس پیٹ کی بچی کو اپنی معمولہ اور تابعدار بنالوں گا پھر اس کے ذریعے مراد کے پورے خاندان میں گھس کر ان سب کی کمزوریاں معلوم کرنا رہوں گا۔“

ایک سراغ رساں نے کہا۔ ”تم اس بچی کے اندر گھس کر ایک لمبا گیم کھیلتا چاہتے ہو اور ہم یہاں مراد کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ صرف دو دن کے دورے پر آ رہا ہے۔ تیسرے دن یہاں سے چلا جائے گا۔ کیا ہم پھر منہ دیکھتے رہ جائیں گے؟“

”نہیں۔ شکار خود ہمارے گھر آ رہا ہے۔ ہم اسے زندہ جانے نہیں دیں گے۔ ایسی ٹھوس پلاننگ کریں گے کہ وہ ہمارے شکنجے میں پھڑپھڑا کر رہ جائے گا۔“

مراد نادان نہیں تھا۔ یہ خوب جانتا تھا کہ انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والے دل میں کینہ کپٹ رکھ کر اسے اپنی زمین پر برداشت کریں گے اور دیر پردہ اس سے دشمنی کرنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کی اپنی پلاننگ کے مطابق ہم زائر ریاست ارض اسلام کا حکمران مراد علی منگی بن کر جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ حماد کے روپ میں دہلی پہنچ گیا تھا۔

شاہی اور سرکاری دورے مختصر ہوا کرتے ہیں۔ وہ صرف دو دنوں کے لیے جا رہے تھے۔ عالی پیرس میں تنہا اپنے حالات سے نمٹنے والا تھا۔ مراد نے کہا تھا۔ ”بیٹے صرف دو دنوں کی بات ہے۔ میں تیسرے دن لوٹ آؤں گا۔“

عالی نے کہا۔ ”بابا جانی! میری فکر نہ کریں۔ بابا (ہم زاد) مراد بن کر جا رہے ہیں۔ آپ کی تمام بلائیں ان کے سر جائیں گی۔ آپ ان پر توجہ دیں۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مراد کی تمام مصیبتیں اس پر ٹوٹنے والی تھیں۔ کسی بھی ملک کے حکمران دوسرے ممالک میں اپنی ذاتی مختصر سی سیکورٹی فورس کے ساتھ جاتے ہیں۔ ہم زاد کے ساتھ بیس عدد ایسے ماہر جاں باز تھے جو دور سے خطرے کی بوسونگھ لیا کرتے تھے۔ ہم زاد مطمئن تھا۔

نہیں دی جا سکی ہے۔ وہ بھی کالے جادو سے ہی زیادہ امیدیں وابستہ کر رہے تھے۔

رگھوناتھ کالیا صرف پیدا ہونے والی بچی پر توجہ دے رہا تھا۔ اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے پر اسرار منتروں میں جکڑ لیتا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہاں نو بد نصیب کنواری لڑکیوں کو لا کر رکھا گیا تھا۔

زیب النساء حمل کے نوے ماہ سے گزر رہی تھی۔ جادو بہت ہی غیر انسانی اور گھناؤنا تھا۔ کالیا نو کنواریوں کے لبو سے زیب النساء کو نہلانے والا تھا۔ اسے سحر زدہ کر کے ہر کنواری کے لبو کا ایک گھونٹ اسے پلانے والا تھا۔

اس نے اب تک جادوئی مہارت سے جتنی بھی وارداتیں کی تھیں ان میں کامیاب رہا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ناکامی اس کے مقدر میں نہیں ہے۔ وہ پیلس کے ایک خالی کمرے میں گھورتپیا کر رہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ بڑے اعتماد سے کالے عمل کے مختلف مراحل سے گزر رہا تھا۔

مراد ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد بابا صلاح الدین اجیری کے حجرے کے سامنے آ گیا۔ اس حجرے کو مقفل رکھا جاتا تھا۔ یہ عقیدہ اور یقین تھا کہ بابا صاحب کسی دن ضرور واپس آئیں گے۔ تقریباً پندرہ برس گزر گئے تھے۔ کسی نے انہیں کہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ اچانک کہاں گم ہو گئے تھے؟ کوئی نہیں جانتا تھا اور کوئی ان کی زندگی اور موت کے متعلق ایک رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے جذبے اور عقیدت سے یہی کہا جاتا تھا کہ وہ کسی دن واپس آئیں گے۔

اس حجرے کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے دن میں ایک بار کھولا جاتا تھا۔ دروازے کی چابی پیش امام کے پاس رہتی تھی۔ حکومت کی طرف سے پیش امام کو اطلاع دی گئی تھی کہ حضرت صلاح الدین اجیری کے ایک عقیدت مند ریاست ارض اسلام کے حکمران مراد علی منگی اپنی زوجہ کے ساتھ دوسرے دن حجرے میں آئیں گے۔ ان کے لیے دروازہ کھولا جائے۔

مراد نے نماز کے بعد پیش امام سے کہا۔ ”میں بھی بابا صاحب کا عقیدت مند ہوں۔ ان کے حجرے میں دو رکعت نماز نفل ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہاں تھوڑا وقت گزارنے دیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”بابا صاحب کے لاکھوں عقیدت مند ہیں۔ سب ہی وہاں کے فرش کو چومنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے دن رات اسے کھلا رکھنا ہوگا۔ ہمارے لیے بڑی ذمہ

رہیں گے۔ پھر یہ ناک کیا جائے گا کہ پیرس سے آنے والے ایک حماد نامی سیاح سے ان... کی شناسائی ہوگئی ہے اور جگنی بانی دہلی میں اس کی گائڈ بن گئی ہے۔

درگا کا وہ بیٹا جسے مراد نے تحفظ فراہم کیا تھا، وہ اب سترہ برس کا جوان ہو گیا تھا۔ اس نے مراد کے سامنے آتے ہی ہاتھ جوڑے پھر اس کے پاؤں چھونا چاہتا تھا۔ مراد نے اسے روک کر گلے لگا لیا۔ درگاہ نے کہا۔ ”بھیا.....! ہم نے اس کا نام کرن مراد رکھا ہے۔“

چپت راؤ نے کہا۔ ”یہ تمہاری بہن تو پاگل ہے۔ بیٹے کے ساتھ میرا نام ہونا چاہیے لیکن اس نے تمہارا نام رکھا ہے۔“ وہ بولی۔ ”جھگوان میرے بیٹے کو لمبی زندگی دے۔ جب تک یہ جیسے گا دنیا والے اس کے ساتھ میرے بھیا کا نام بھی سنتے رہیں گے۔“

مراد نے دور جگنی بانی کو دیکھ کر سر جھکاتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ پلاننگ کے مطابق وہ قیام کرنے کے لیے جس ہوٹل میں گیا، وہاں جگنی بانی کی ایک شوٹر رنجا گاڈ بن کر آئی۔ مراد نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے سے کسی قدر قریب آ گئے۔

وہ سب محتاط رہ کر اجنبی سے شناسا بننے کی راہیں ہموار کر رہے تھے تاکہ انٹیلی جنس والوں کو حماد نامی سیاح پر کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ دوسرے دن ہم زاد زیب النساء کے ساتھ وہاں پہنچا تو مراد ان پورٹ پر موجود تھا۔ اس کے پیچھے جگنی بانی اور چپت راؤ کے درجنوں شوٹر زچھے ہوئے تھے۔

ان پورٹ سے سرکاری مہمان محل تک اتنی گاڑیاں اچھے اسلحہ بردار تھے کہ شاہی مہمانوں پر کسی طرف سے آنچ نہیں آ سکتی تھی۔ سرکاری مہمان محل بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کے اندر اور باہر سیکورٹی کے سخت انتظامات تھے۔ جگنی بانی اور چپت راؤ کے جاسوس اور شوٹرز وہاں تک جانہیں سکتے تھے۔ وہاں آئی جی کیدار شرما اور رگھوناتھ کالیا کی اجارہ داری تھی۔

وہاں تمام بڑے افسران رگھوناتھ کالیا کے رازدار تھے۔ اسے پیلس کے ایک مخصوص حصے میں کالے جادو کے مراحل سے گزرنے کی سہولتیں حاصل تھیں۔ یوں تو پیلس میں درجنوں خدام اور کنیزیں تھیں لیکن نو عدد خاص کنواری لڑکیوں کو زیب النساء کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔

کیدار شرما اور چند سراغ رساں مراد کو اپنے طور پر بھی ختم کر دینے کی سازشیں کر رہے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ مراد کو آج تک ہتھیاروں اور شطرنجی چالوں سے مات

ہوئے تھے۔ کیدار شرما دو سراغ رسالوں کے ساتھ اس حجرے میں آیا۔ ان میں سے ایک جاسوس نے اپنے بیگ میں سے ایک بڑا سا موبائل فون نکالا۔ وہ فون نہیں تھا۔ ریموٹ کنٹرولر سے بلاسٹ ہونے والا بم تھا۔ انہوں نے اسے چاندنی اور دری کے نیچے اس جگہ چھپا دیا جہاں حضرت صلاح الدین اجمیری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے اور اپنے عقیدت مندوں کا جسمانی و روحانی علاج کیا کرتے تھے۔

اس دیوار میں ایک ننھا سا سوراخ پہلے ہی بنا دیا گیا تھا۔ بم کے تار کو اس سوراخ سے گزارا گیا تو تار کا وہ سرا حجرے کے باہر نکل آیا۔ ادھر ایک ملکینک کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تار کے اس سرے پر ریموٹ ریسور لگا کر ایک ٹیپ کے ذریعے اسے دیوار سے چپکا دیا۔ پھر وہاں دو ایٹیش رکھ کر اس ریسور کو چھپا دیا گیا۔

مراد کو یہ مناظر کسی فلمی سین کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم زاد اور زیب النساء کی حفاظت کے لیے بظاہر سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ ان کی کار کے آگے پیچھے سب افراد کی کئی گاڑیاں تھیں اور حجرے کے اطراف بھی ہتھیاروں سے لدے ہوئے سپاہی تھے۔ ہم زاد اور زیب النساء کار سے اتر کر حجرے کے اندر چلے گئے۔ گویا موت کے منہ میں پہنچ گئے۔ وہاں سے واپس آنے والے نہیں تھے۔ کیدار شرما اپنے رازدار ساتھی افسروں اور سراغ رسالوں کے ساتھ حجرے سے بہت دور کھڑا ہوا تھا۔ وہاں ہونے والے موت کے دھماکے سے محفوظ رہنے والا تھا۔

لیکن وقت گزر رہا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ریموٹ کنٹرولر کام نہیں کر رہا ہے۔ وہ کیوں ناکارہ ہو گیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مراد کو سجدے میں دکھائی دے رہا تھا۔ حجرے کے باہر جہاں ریموٹ ریسور کو چھپایا گیا تھا وہاں ایک ننھی سی بچی دوڑاؤ ہو کر نماز پڑھ رہی تھی۔ عبادت کے وقت اس کا ننھا سا وجود آڑے آ گیا تھا۔ ریموٹ کنٹرولر کی لہروں کو ریموٹ ریسور تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔

بس..... مراد کو اتنا ہی دکھائی دیا پھر آگہی کے مناظر یکنخت گم ہو گئے۔ اس نے اپنے آپ کو حجرے کے اندر سجدے کی حالت میں پایا۔ اس کی زبان بے اختیار سبحان ربی الاعلیٰ کہہ رہی تھی۔

داریاں بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“ مراد نے اپنا پاسپورٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے وہاں دو رکعت پڑھنے آیا ہوں۔ جب ایک ریاست کے حکمران کے لیے دروازہ کھولا جاسکتا ہے تو اسے میرے لیے بھی کھلنا چاہیے۔“

پیش امام نے قائل ہو کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”سرکاری افسران بہت پریشان کر رہے ہیں۔ مراد علی منگی کی سکیورٹی کے لیے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ایک افسر تو جوتوں سمیت اندر جانا چاہتا تھا۔ میں نے اعتراض کیا تو اس نے بابا صاحب کی شان میں گستاخی کی پھر دوسرے افسران کے سمجھانے پر وہ جوتے اتار کر اندر گیا تھا۔“

یہ سنتے ہی مراد کا دماغ گرم ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس افسر کو جانتے ہیں؟“ ”اسے کون نہیں جانتا۔ وہ آئی جی آف پولیس کیدار شرما ہے۔“

مراد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اس آئی جی کو بابا صاحب کی شان میں گستاخی منگی پڑنے والی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے حجرے میں قدم رکھا۔ وہاں رکھے ہوئے مختصر سے سامان کو بڑی عقیدت سے دیکھنے لگا۔ وہاں کی تمام چیزیں بابا صاحب کے استعمال میں رہتی تھیں۔ وہ ہر چیز کو بڑی اپنائیت سے چھونے لگا۔ دل میں کہنے لگا۔ ”کہاں ہیں آپ.....؟ ہمیں کیوں بھول گئے ہیں.....؟ گلاب کانتوں میں ملے ہیں۔ ہم شہر دشمنوں میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ہمیں بشارت دیں۔“

فرش پر سفید اجلی چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ وہ قبلہ رو ہو کر نماز کی نیت کرنے لگا۔ ایسے ہی لمحات میں یوں لگا کہ وہ آگئے ہیں۔ اس کے شانہ بشانہ ہیں۔ اس کے ساتھ نماز قائم کر رہے ہیں۔ وہ روحانی مسرتوں سے سرشار ہو کر عبادت میں ڈوب گیا۔

اسے حیران کر دینے والا اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ جن کا وجود برسوں سے نابود تھا، وہ اس کے شانہ بشانہ سجدہ کرنے آگئے تھے۔ پہلے بھی اس کے ساتھ نمازیں پڑھتے رہے تھے۔ وہی گزرا ہوا وقت واپس لے آئے تھے۔

نماز جاری تھی۔ اسے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتی تھی۔ ایسے وقت وہ بے اختیار اللہ اکبر کہتا ہوا سجدے میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں لیکن اسے پورا حجرہ نظر آ رہا تھا اور وہ حجرے کے باہر بھی دیکھ رہا تھا۔

وہاں سکیورٹی کے لیے دور دور تک مسلح سپاہی کھڑے

حضرت صلاح الدین اجمیری پر ایسا اٹل عقیدہ اور ایسا غیر متزلزل اعتماد تھا کہ مراد نے چپ سادھ لی تھی۔ اس نے ہم زاد کو اور دوسرے قابل اعتماد چاہنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ دوسرے دن کیا ہونے والا ہے؟

اس شہر میں اسے اپنی ماں کے ساتھ بھی تھوڑا وقت گزارنا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق گانڈر بنجانے اس کی اور جگنی بائی کی ملاقات کرائی تھی۔ دونوں میں شناسائی بڑھانی تھی۔ اسپیشل برانچ والے مراد کو نہیں، حماد کو دیکھ رہے تھے۔ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان مختصر سے وقت میں گہری شناسائی کیسے ہو گئی ہے؟

جگنی بائی اسے اپنی کوشی میں لے گئی تھی۔ وہاں اس کی تینوں بیٹیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تینوں پندرہ برس پہلے اس کی دیوانی تھیں۔ اب ایک مدت گزر چکی تھی۔ وہ دیوانی جوانی اب نہیں رہی تھی۔ وہ تینوں ہی دو دو تین تین بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

گھاگھرا پلٹن کی ڈاکٹر بیرسٹر اور دانشور خواتین اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوئی تھیں۔ ایسے وقت اسپیشل برانچ کے دو افسران نے آکر جگنی بائی سے پوچھا۔ ”ہماری معلومات کے مطابق مسٹر حماد ایک فورسٹ ہیں۔ آپ انہیں کب سے جانتی ہیں؟“

جگنی بائی نے کہا۔ ”آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔“
”اور ملاقات ہوتے ہی گھر لے آئی ہیں..... اپنی پوری پلٹن سے ملاقات کر رہی ہیں؟ مسٹر حماد میں ایسی کیا بات ہے کہ انہیں اتنی اہمیت دے رہی ہیں؟“

”بہت اہمیت ہے۔ مسٹر حماد دنیا کے تمام ملکوں میں جا کر خواتین کے اہم کارناموں کے متعلق سروے کر رہے ہیں اور یہ تو سارا ہندوستان جانتا ہے کہ گھاگھرا پلٹن کی عورتیں کیسے کیسے یادگار کارنامے انجام دیتی رہتی ہیں۔ مسٹر حماد یہاں سے ہماری پوری ہسٹری لے کر جائیں گے۔“

ایک افسر نے مراد سے کہا۔ ”چپت راؤ ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔ وہ ماسٹر کو بوبو کے لیے کام کرتا ہے۔ وہ آپ کا استقبال کرنے اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ آیا تھا۔ ایسے کر مثل سے آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا وہ کر مثل ہے یا نہیں؟ جب ان کا بیٹا دس برس کا تھا، تب وہ لندن آئے تھے۔ میں نے ان کے بیٹے کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ تب سے وہ میرے احسان مند ہیں۔ وہ بڑی عقیدت سے میرا استقبال کرنے آئے تھے۔ اس سے زیادہ میں کچھ

اس نے بابا صاحب کی آواز سنی۔ وہ بھی سجدے میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اس نے التجیات پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے ہوئے دائیں طرف دیکھا تو وہ نظر آئے۔ انہوں نے بھی دائیں طرف سلام پھیرا تھا۔ مراد نے بائیں طرف سرگھما کر کہا۔ ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ.....“

نماز ادا ہوئی تو وہ بابا صاحب کی طرف گھوم کر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ذہن کو ایک جھٹکا سالگا۔ وہ نہیں تھے۔ دل میں ایک درد سا اٹھا۔ اس نے فوراً ہی جھک کر دونوں ہاتھ اس جگہ رکھے، جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جگہ گرم تھی۔ یعنی وہ واقعی موجود تھے۔ آہ..... اب نہیں تھے۔

وہ اسی طرح بڑے جذبے سے دونوں ہتھیلیاں وہاں رکھے بیٹھا رہا۔ ان کے کم ہو جانے سے دل دکھ رہا تھا۔ یہ روحانی آسودگی بھی تھی کہ ان کا دیدار ہوا تھا اور اس نے برسوں کے بعد ان کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔

وہ حجرے سے باہر آ گیا۔ اب جو آگئی ملی تھی، وہ اس کے اندر چنچ رہی تھی۔ وہ دشمن دوسرے دن ہم زاد اور زیب النساء کے ساتھ پیدا ہونے والی بچی کی بھی موت کا سامان کرنے والے تھے۔ وہ انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ کئی جاں نثار تھے۔ چپت راؤ کے شوٹرز اور جگنی بائی کی گھاگھرا پلٹن تھی۔ وہ دشمنوں کو حجرے میں بم رکھنے سے روک سکتا تھا۔

وہ اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں سے فون پر ہم زاد کو خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فون نکال کر اس کا بٹن دبانا، رابطہ کرنا چاہا پھر رک گیا۔ کیوں رک گیا؟ وہ تعجب سے سوچنے لگا۔ رکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے دوسری بار رابطہ کرنا چاہا۔ اس کی انگلی پھر بٹن تک نہیں گئی۔ وہ اپنی انگلی کو حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں سٹیج ٹون سنائی دی۔ اس کی انگلی نے بے اختیار بٹن کو دبایا تو ننھی سی اسکرین پر مختصر سی تحریر ابھری۔ ”خدا پر چھوڑ دو۔“

وہ بڑی حیرانی سے اور بڑے ایمانی جذبے سے اس تحریر کو دیکھنے لگا۔ وہاں نہ میسج سنٹر کے نمبر تھے، نہ میسج بھیجنے والے کا نام لکھا تھا۔ صرف وہ تحریر تھی۔ وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئی۔ اسکرین سادہ ہو گئی تھی۔

اس کا دل بڑی عقیدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے حجرے میں بابا صاحب کی خالی جگہ پر اپنی ہتھیلیاں رکھی تھیں۔ یہاں خالی اسکرین پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

نہیں جانتا۔“

دوسرے افسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”جگنی بائی اور اس کی گھاگھرا پلٹن بھی ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔ کیا ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں جو بھی خطرناک مجرم ہیں وہ آپ کے سنا سنا اور قدردان ہیں؟“

”آپ حضرات کا کام یہی ہے۔ جس پر چاہتے ہیں شبہ کرتے ہیں۔ مجھ پر بھی شبہ کرتے رہیں۔ میں پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

وہ افسران بڑی پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔ جس وقت مراد کا محاسبہ کر رہے تھے، اس وقت ان کا ایک جاسوس اس ہوٹل کے کمرے میں گیا تھا جہاں مراد نے قیام کیا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے اس سے تعاون کیا تھا۔ مراد کے کمرے کو ماسٹر کی سے کھولا تھا۔ پھر وہ جاسوس وہاں ایک ریوایور رکھ کر چلا آیا تھا۔

وہ انٹیلی جنس والے جانتے تھے کہ جگنی بائی اور چپیت راؤ جرائم کے چھپے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ حماد کو قانون کی گرفت میں آنے نہیں دیں گے۔ وہ جاسوس افسران اپنے طریقہ کار کے مطابق مراد کو حراست میں لے کر اسے سیل میں لے جا کر اس کی اصلیت اس سے اگھواتا چاہتے تھے۔ اسے گرفت میں لینے اور اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لیے اسے جھوٹے الزام میں پھانسا ضروری ہو گیا تھا۔

جب وہ جگنی بائی سے رخصت ہو کر ہوٹل میں آیا تو وہاں ایک جاسوس افسر سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم آپ کے کمرے کی تلاشی لیں گے۔“ مراد نے اعتراض نہیں کیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ قانون کے محافظ اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے غیر قانونی چال چلیں گے۔ اس کے کمرے سے ایک ریوایور برآمد ہوا تو افسر نے کہا۔ ”یو آر انڈر ریسٹ۔“

مراد نے ایک گہری سانس لی پھر ناگواری سے کہا۔ ”آپ حضرات کیا چاہتے ہیں؟ مجھے مجرم ثابت کرنے کے لیے آگے لیا کرنے والے ہیں؟ یہ مجھے نظر آ گیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے ایک بھی کال نہیں کرنے دیں گے۔“ افسر نے ایک ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”اپنا فون دو۔“

مراد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فون کے ایک بٹن کو دبا دیا۔ دوسری طرف خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ چپیت راؤ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مراد نے جیب سے فون نکال کر افسر کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

افسر نے غصے سے کہا۔ ”یہ آن ہے، تم نے کچھ کیا ہے۔“ ”میں نے کچھ نہیں کیا ہے، یہ لاکڈ نہیں تھا۔ بٹن دب گیا ہوگا۔ آپ ایسا کریں، اس بٹن کو دبائیں تو فون کا سوئچ آف ہو جائے گا۔“

افسر نے اس بٹن کو دبایا، اس کا سوئچ آف نہیں ہوا۔ دوسری طرف جگنی بائی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی شوٹرز سے کہا۔ ”فوراً چلو، میرے بیٹے پر آفت آئی ہے۔“ افسر نے جھنجھلا کر گرجتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ سوئچ آف نہیں ہو رہا ہے۔“

اس نے پھر بٹن کو دبایا۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے اپنی جیب میں ایک بٹن کو دبایا، تم نے دوسری بار پھر تیسری بار بٹن کو دبایا ہے۔“

اس نے تھکی سی اسکرین کو دور سے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو۔ یہاں کیا لکھا ہے؟“

اسکرین پر لکھا تھا۔ ڈیجیٹل۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ ڈیجیٹل پھر اس کے نیچے ڈیجیٹل تھری لکھا تھا۔ افسر نے پوچھا۔ ”یہ تین بار خطرہ کیوں لکھا ہوا ہے؟“

”اس لیے کہ یہ ٹائم بم ہے۔ تین بار بٹنوں کو دبایا جا چکا ہے۔ اسے چوتھی بار دباؤ گے تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔ کیا دبانے کی جرأت کرو گے؟“

افسر نے سہم کر خطرے سے آگاہ کرنے والی تحریروں کو دیکھا پھر فون کو بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”تم... تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”تو پھر بٹن کو دباؤ دیا اسے بم ڈسپوزل کے ماہر کے پاس لے جاؤ۔“

وہ اپنا فون نکالتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی ایک ماہر کو کال کرتا ہوں۔“

مراد نے اچانک بیڈ پر چھلانگ لگائی پھر اپنے فون کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”خبردار.....! کسی نے گولی چلائی تو اس سے پہلے یہ چوتھا اور آخری بٹن دب جائے گا۔ مجھے مرنا ہی ہے تو تم سب کو ساتھ لے کر مروں گا۔“

سپاہیوں کی گتیں جھک گئیں۔ وہ سب ہی سہم کر اس فون کو دیکھنے لگے۔ ایک سپاہی نے افسر سے کہا۔ ”سر! یہ ہمیں ڈر رہا ہے۔ یہ فون ہے۔ ٹائم بم نہیں ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گا میں تین تک گنتا ہوں۔ اپنے ہتھیار بیڈ پر پھینک دو۔ میں تین کہتے ہی آخری بٹن کو دبا دوں گا اور تم سب کے ساتھ فنا ہو جاؤں گا۔“

پھر اس نے گنتی شروع کی۔ اسے ٹھہر ٹھہر کر گنتا چاہیے

شاہی اور سرکاری دستور کے مطابق اس کا استقبال کیا گیا۔ اسے وہاں سے مہمان محل میں جانا تھا۔ اس نے کہا: ”پہلے ہم بابا صاحب کے حجرے میں جائیں گے پھر کسی اور چار دیواری میں قدم رکھیں گے۔“

وہ انریپورٹ سے سیدھے حجرے کی طرف آگئے۔ وہاں درجنوں مسلح سپاہی ان کی حفاظت کے لیے الرٹ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اللہ کا نام لیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کیدار شرما، دیگر افسران اور سراغ رسانوں کے ساتھ وہاں سے دور کھڑا تھا۔ وہ سب دھماکا ہوتے ہی اور دور بھاگنے والے تھے۔ دوسری طرف حجرے کے پیچھے جس افسر کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا، اسے سمجھا دیا گیا تھا کہ جب وہ دونوں حجرے میں چلے جائیں تو ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا جائے۔

زیب النساء اور ہم زاد بھرے کے اندر اس دیواری کی طرف دوڑا نو ہو کر بیٹھ گئے تھے جہاں بابا صاحب ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ بڑی عقیدت سے سر کو جھکائے انہیں یاد کر رہے تھے۔ ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ ہونے والی بچی کی سلامتی اور بہتری کے لیے دعا فرمائیں۔

پھر وہ دونوں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ دنیا کی ہر متحرک چیز پل بھر کے لیے رک سکتی ہے لیکن وقت ایک ساعت کے لیے بھی نہیں رکتا۔ وہ گزرتا جا رہا تھا۔ یاہر پندرہ منٹ گزرنے کے بعد کیدار شرما اور اس کے ساتھی بے چین ہو گئے۔ وہ سب وہاں سے بھاگنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن دھماکا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

مراد مسجد کی چھت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں کیدار شرما پر تھیں۔ اس نے بابا صاحب کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مراد اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ موقع کا منتظر تھا۔ سچویشن ایک ذرا موافق ہوتی تو ایک خاموش گولی اس کے نام کر دیتا۔

اس وقت سب ہی ٹینشن میں تھے۔ کیدار شرما فون کے ذریعے پوچھ رہا تھا: ”کیا بات ہے؟ آدھا گھنٹا گزر چکا ہے۔ کیا کر رہے ہو؟ کام کیوں نہیں ہو رہا ہے؟“

وہ ریموٹ کنٹرولر ایک جونیر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جواباً فون پر بولا: ”سر! میں کئی بار بٹن دبا چکا ہوں۔ یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ ملینک میرے ساتھ ہے۔ کنٹرولر کو کھول کر چیک کر رہا ہے۔ پلیز انتظار کریں۔ یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

تھا لیکن اس نے تیزی سے ایک دو تین کہا پھر ایک بٹن کو دبا دیا۔ پھر تو جیسے قیامت آگئی۔ ایسا ہی لگا کہ موت کا دھماکا ہوا ہے۔ وہ سب اچھل کر ادھر ادھر گرنے پڑنے لگے۔ ہاتھوں سے ہتھیار چھوٹ گئے۔

کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ مراد نے نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔ ان کے دماغوں میں پہلے ہی ٹائم بم کی دہشت طاری کر دی تھی۔ ادھر موبائل فون سے آڈیو ریکارڈنگ کی فائرنگ گونج رہی تھی۔ وہ فائرنگ انہیں دھماکا لگی تھی۔

یہ صرف چند سیکنڈ کا تماشا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ دھماکا نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے میں دیر ہو گئی۔ ان کے تمام ہتھیار مراد نے سمیٹ لیے تھے۔

اس نے اپنے فون کے سسٹم کو تبدیل کرنے کے بعد چھت راؤ اور جگنی بائی کو کال کی۔ ان سے کہا: ”میں خیریت سے ہوں۔ ہوٹل کے کمرے میں آجائیں۔“

وہ دونوں ہی ہوٹل میں پہنچ رہے تھے۔ کال سنتے ہی اس کے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے اس افسر کو اور سپاہیوں کو گن کے نشانے پر رکھ کر معلوم کیا کہ اس نے مراد کی غیر موجودگی میں ہوٹل کے منیجر سے ماسٹر کی لے کر اس کمرے کو کھول کر وہاں ایک ریوالور رکھ دیا تھا۔

ہوٹل کے منیجر کو کمرے میں بلا دیا گیا۔ جگنی بائی نے ان سب سے کہا: ”ایک شریف آدمی جرائم سے پاک ہو کر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے تمہارے دیس میں آ کر نہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے، نہ پہنچائے گا۔“

چھت راؤ نے کہا: ”صحیح باتیں اتر نہیں کرتیں۔ کل صبح یہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ قانون کے محافظ حاد ثانی ایک سپاہی کو گرفتار کرنے آئے تھے۔“

جگنی بائی اور چھت راؤ اس افسر کو منیجر کو اور تینوں سپاہیوں کو وہاں سے لے گئے۔ رات کی تاریکی میں پتا نہیں کہاں گئے؟ ویسے جہاں بھی انہیں لے گئے وہاں سے وہ کبھی واپس آنے والے نہیں تھے۔ صبح سے پہلے وہ دو افسران بھی مارے گئے جنہوں نے جگنی بائی کی گٹھی میں مراد کا محاسبہ کیا تھا۔

یہ دشمنی اور کدورت رکھنے والے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے عجیب سی بات تھی کہ مراد (ہم زاد) آیا نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد وہاں اپنی زوجہ کے ساتھ پہنچنے والا تھا اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کئی دشمنی کرنے والے اوپر پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

ہم زاد زیب النساء کے ساتھ آگیا۔ انریپورٹ میں

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی طبعی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

کنٹرولر ٹھیک تھا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ مکینک نے کہا۔ ”یہ پرفیکٹ ہے۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔“

جونیر افسر نے پوچھا۔ ”پھر یہ کام کیوں نہیں کر رہا ہے؟“ انہوں نے دور حجرے کی اس دیوار کو دیکھا، جہاں ریموٹ کے ریسور کو چھپایا گیا تھا۔ وہاں سے اینٹیں ہٹا دی گئی تھیں۔ وہ بم کے تار سے منسلک رہنے والا ریسور دور سے بھی نظر آ رہا تھا لیکن نماز پڑھنے والی وہ شخص سی پچی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ریسور اور ریموٹ کنٹرولر کے درمیان آ گئی تھی۔ مکینک نے کہا۔ ”اس ریسور میں کوئی خرابی ہوگی۔ اسے چیک کرنا ہوگا۔“

بہت دیر ہو چکی تھی۔ زیب النساء اور ہم زاد ہجرے سے باہر آ گئے تھے اور کار میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ یقیناً پچی بھی اب وہاں نہیں ہوگی۔ وہ تو ماں کے پیٹ میں تھی۔ روحانی کرشمہ کسی کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔

کیدار شرما اور اس کے ساتھی غصے سے جھنجھلاتے ہوئے مکینک اور جونیر افسر کے پاس آئے۔ وہ دونوں ہجرے کی دیوار کے پاس ریسور کو اٹھا کر چیک کر رہے تھے۔ کیدار شرما کے ہاتھ سے ٹکڑے میں آیا ہوا شکار نکل گیا تھا۔ اس نے غصے سے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟ آپریشن ناکام کیوں ہو گیا؟ میں تم دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔“

مکینک کے ہاتھ میں بم کے تار سے منسلک رہنے والا ریسور تھا۔ جونیر افسر کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرولر تھا۔ اس نے کہا۔ ”سر.....! آپ خود ہی دیکھیں۔ ہم بٹن دبا رہے ہیں اور یہ.....“

اس نے بولتے بولتے بٹن کو دبایا تو یکبارگی قیامت کا دھماکا ہو گیا۔ حجرے کی دیواریں تنکا تنکا ہو کر دور تک اڑتی چلی گئیں۔ آگ بجھ کر نہ لگی۔ وہاں کھڑے رہے۔ افسروں کا سراخ رسالوں کا اور کیدار شرما کا وجود پلک جھپکتے ہی نابود ہو گیا تھا۔

پرانی کہاوت کے مطابق اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود اس میں گر جاتے ہیں۔ ایک ریاست کا حکمران جس حجرے سے ہو کر گیا تھا اسے کھنڈر بنا دیا گیا تھا۔ یہ ایسی واردات تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دینے لگی۔ تمام نیوز چینل چلے رہے تھے۔

”دھماکا کیسے ہوا؟“

انٹر پول کے جاسوس محل کے اس حصے کو دیکھ نہیں پا رہے

تھے جہاں وہ پراسرار محل میں مصروف تھا۔ گویا کالے جادو

نے ان آنکھوں والوں کو عارضی طور پر اندھا کر دیا تھا۔

اس تائثرک کالیا کا انتظار ختم ہوا۔ ایک کینز نے

اطلاع دی کہ زیب النساء غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں

جانے والی ہے۔ کالیا نوکنواریوں کو سحر زدہ کر چکا تھا۔ انہیں

پیس کی چھت پر لایا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے

ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

اس کے بارہ چیلے لنگوٹ باندھے ہاتھوں میں بخدا

لیے کھڑے تھے۔ بخدا ایسا بھاری بھر کم ہتھیار ہوتا ہے کہ

اس کی ایک ہی ضرب سے گردن تن سے جدا ہو جاتی ہے۔

پیس کی چھت پر پانی کی ایک بڑی ٹنکی تھی۔ اسے

خالی کر دیا گیا تھا۔ وہ نوکنواریوں کے لہو سے بھرنے والی

تھی۔ کالیا ٹنکی کی چھت پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔ چشم تصور

سے زیب النساء کو دیکھ رہا تھا اور اسے گرفت میں رکھنے کے

منتر پڑھ رہا تھا۔

وہ منتر بڑے ہی آزمودہ تھے۔ شکار ان کے طلسم

سے نکل نہیں پاتا تھا۔ کالیا کو یقین تھا کہ زیب النساء منٹروں

کے شکنجے میں آگئی ہے۔ اسے پکڑ کر نہلانے کی ضرورت

نہیں تھی۔ اسے تو غسل کرنا ہی تھا۔ وہ خود ہی باتھ روم میں

آگئی تھی۔

وہ اپنی کالی شکنجے سے اسے واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ

باتھ روم میں رک رک کر آرہی تھی۔ جیسے آنا نہ چاہتی

ہو۔ کوئی انجانی قوت اسے روک رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ

منتر اسے دھکے دے رہے تھے۔ آگے بڑھا رہے تھے۔

وہ شاور کے نیچے آگئی۔ وہاں پہنچ کر شاور کے ہینڈل

کو نہیں گھما رہی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایسے وقت کالیا شاور کے

ہینڈل کو گھور کر دیکھتے ہوئے منتر پڑھنے لگا تو ہینڈل میں ایک

ذرا سی لرزش پیدا ہوئی۔ وہ کھل رہا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے میں

وہ خواب معتبر ہو گیا۔ ایک ہنسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے

اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ ادھر ہینڈل پوری طرح گھوم گیا تھا اور

شاور سے پانی کی جگہ لہو برس رہا تھا۔

وہی خواب کا منظر تھا۔ لہو کی بارش ہو رہی تھی۔ زیب

النساء پر اس کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا تھا۔ اس ناکامی نے

کالیا کو غضبناک بنا دیا تھا۔ وہ گرج گرج کر منتر پڑھ رہا

تھا۔ لہو کی ٹنکی پر بیٹھا غصے سے اس پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اسے وہ

بچی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر زیب النساء بھی اس کی طلسمی

سر پر ننگی تلوار کی طرح رہیں گے۔ اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے جہنم میں جائے گا۔“ یہ بیان دے کر وہ زیب النساء کے ساتھ وہاں سے اپنی ریاست میں چلا گیا۔ فی الحال رکھونا تھ کا لیا کا یہ باب بند ہو گیا۔ اس سے بعد میں نمٹنا تھا۔ حماد کو عالی کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ وعدے کے مطابق تیسرے ہی دن بیٹے کے قریب چلا آیا۔

☆☆☆

عالی نے اعلان کیا تھا کہ وہ تین دنوں تک سوگ منائے گا، اپنی ماریہ سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرے گا۔ کارمن ڈی مورانے پہلے ماریہ کی ماں کو پھر باپ کو ہلاک کرایا تھا پھر اپنی جان بچانے اور عالی سے چھپنے کے لیے اپنی ماں کے پاس استنبول چلا گیا تھا۔

اس کی ماں کا نام ثالی ووڈ تھا۔ وہ انٹرنیشنل شیطانی سوسائٹی کی ایک اہم رکن تھی۔ اسے کالے جادو میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عالی پر حاوی کرنے کے لیے دوبارہ جادوئی حربے استعمال کر چکی تھی۔ ایسے خطرناک منتر پڑھتی رہی تھی جو عالی کو فولاد سے موم بنا دیتے لیکن اس فولاد پر منتروں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس پر جادو کر رہا ہے۔

ثالی... ان دنوں عالی کو مار ڈالنے کے لیے خطرناک منتروں کے ساتھ چلہ کشی کر رہی تھی۔ کارمن ڈی مورانے اعتماد تھا کہ جب تک ماں منتر پڑھتی رہے گی، تب تک عالی اس کا سراغ نہیں لگا سکے گا پھر چلہ کشی کے اختتام پر وہ خون تھوک تھوک کر مرجائے گا۔ بڑی خوش فہمی تھی۔ دولڑنے والوں میں کسی ایک کی شامت آتی ہے۔ جس کی بھی شامت آئی ہو، اس سے خیریت دور ہو چکی ہوگی۔

ماسٹر کو بوبو کے ایک کارندے نے کارمن کو اپنی ماں کے ساتھ استنبول کے اتر پورٹ پر دیکھ لیا تھا۔ عالی کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ وچ لیڈی ثالی ووڈ کی ایک پرانی حویلی میں سانس لے رہا ہے۔

عالی چھپ کر استنبول نہیں جاسکتا تھا۔ اسے تو جیسے دنیا کے تمام بوڑھے جوان اور بچے پہچان لیتے تھے۔ پہاڑ جیسا قد چیتے جیسا لچکتا پلٹتا جھپٹتا ہوا بدن اور چہرے کی مردانگی دور سے پہچان لی جاتی تھی۔ اس نے چہرے کو بھی میک اپ کے ذریعے نہیں چھپایا تھا اور نہ آئندہ کبھی بھیس بدلنا چاہتا تھا۔

وہ پیرس سے استنبول آیا تو تمام دوست نما دشمنوں کو معلوم ہو گیا۔ سب ہی کھوج لگانے لگے کہ وہ اچانک پیرس

آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ اچانک ہی طلسمی ٹکٹے سے نکل کر چھپنے لگی۔ ہم زاد کو پکارنے لگی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے شدید حیرانی سے اس لہو اگلنے والے شادر کو دیکھا۔ پھر انٹر پول کے سراغ رسالوں نے بھی وہ منظر دیکھ کر اوپر چھت پر جانا چاہا تو انہیں راستہ نہیں ملا۔

وہ چھت پر جانے والے زینے پر چڑھتے تھے لیکن اوپر محل کے کسی اور حصے میں پہنچ جاتے تھے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”رکھونا تھ کا لیا کو حراست میں لیا جائے۔ وہی خبیث ہم سے دشمنی کر رہا ہے۔“

وہ نظر بندی کے منتر پڑھتا ہوا، سراغ رسالوں کو عارضی طور پر اندھا بناتا ہوا اپنی کونھی میں چلا گیا۔ انٹر پول کے ایک اعلیٰ افسر نے فون پر اس سے پوچھا۔ ”آپ کہاں ہیں؟ ہم آپ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”میں اپنے پیلس میں ہوں۔ جب چاہیں آپ یہاں تشریف لاسکتے ہیں۔“

ایسے وقت ان سراغ رسالوں نے پیلس کی چھت پر مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ کالیا کے بارہ چیلے اس کے طلسمی ٹکٹے میں رہا کرتے تھے۔ اس نے ان سب کو حکم دیا تھا کہ وہ فوراً آتما ہتیا کریں اور وہ چھت پر بے چون و چرا خود کو گولی مار رہے تھے۔ آخری فائر کے بعد ہی جادوئی حصار ٹوٹ گیا۔ چھت پر جانے کا راستہ کھل گیا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے اوپر آئے تو انہیں بارہ چیلوں اور نو کوناریوں کی لاشیں ملیں۔ بڑی ہی درندگی سے ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ ایسی بھیانک واردات کرنے والا اپنے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔

انٹر پول کے سراغ رساں اس کے پیلس میں آئے تو وہ دو منٹروں کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہاں چھیل چھیلی حسنین بھی تھیں۔ دو معزز منسٹر گواہ تھے کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ان کے ساتھ شراب و شباب میں مست ہے۔ رکھونا تھ کا لیا ایک معزز منسٹر تھا۔ اس پر شب تو کیا جاسکتا تھا لیکن کھل کر اسے ایک ملزم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ گرفت میں آنے والا نہیں تھا۔ پولیس اور سراغ رساں اس مجرم کی موجودگی میں کسی اور کو تلاش کر کے اسے گرفتار کر کے رکھی کارروائی انجام دینے والے تھے۔

مراد نے روانگی سے پہلے اتر پورٹ پر چھیلز والوں سے کہا۔ ”اس دیس کے قانون کے محافظ اصل مجرم کو گرفتار کریں یا نہ کریں۔ ہم ابھی جارہے ہیں لیکن خبیث مجرم کے

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تم پرئس کو یہاں بھی مات دو گے۔ اسے بھاگنے پر مجبور کرو گے تو میرا بیٹا سلامت رہے گا۔ میں بھی خطرناک منتر پڑھ رہی ہوں۔ یہاں سے تو اس کی لاش ہی جائے گی۔“

وہاں عالی کے خلاف دوز بردست محاذ تھے۔ ایک محاذ کالے جادو کا تھا اور دوسرا ٹیلی پتھن کا۔ اس کے باوجود وہ دونوں متفکر تھے۔ ایک شیطانی منتروں کے حملے کر کے ناکام رہی تھی۔ دوسرے نے بھی حقیقتاً ماریہ کو ہلاک کر کے عالی کو مات نہیں دی تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں کس طرح پرئس سے نمٹ سکے گا۔ بظاہر وہ تنہا استنبول آیا تھا لیکن یہ یقین تھا کہ بیٹے کے پیچھے مراد علی منگی ضرور آیا ہوگا۔ ارض اسلام سے آنے والے جاں نثار بھی ہوں گے۔ ماسٹر کو بیوہ کے شوٹرز بھی ہوں گے۔ وہ تنہا اور خالی ہاتھ نظر آنے والا درپردہ مسلح اور منظم ہوگا۔

عالی نے ماریہ کی وفات کے بعد چینلز کے ذریعے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ ماریہ کی وفات قضائے الہی سے ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہی ظاہر ہے۔ لہذا ان نون ڈیٹیکٹس نہ مارے۔ میں فی الحال اسے لفٹ نہیں دے رہا ہوں۔ اس بیان کے بعد اس نے گہری خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ان نون طرح طرح کے بیانات داغ رہا تھا تا کہ عالی مشتعل ہو کر کچھ بولتا رہے اور معلوم ہوتا رہے کہ وہ استنبول میں کب اور... کیا کرنے والا ہے۔

دوران جنگ میں خاموشی بہت بڑا ہتھیار بن جاتی ہے۔ دشمن کو الجھاتی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتی رہتی ہے۔ ان نون... جھنجھلا رہا تھا۔ عالی سپر پاور سے اور دیگر بڑے ممالک سے اور یہودی اکابرین سے بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ اگر بولتا تو ان کے ذریعے کچھ معلومات حاصل ہوتی رہتیں۔

وہ استنبول میں آ کر یوں وقت گزار رہا تھا جیسے تفریح کے لیے آیا ہو۔ جہاں اس نے قیام کیا تھا۔ وہاں سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پرانی حویلی میں کارمن ڈی مورا مسلح گارڈز کے سائے میں ماں کے کالے جادو کے ساتھ رہتا تھا۔ عالی ادھر کارخ نہیں کر رہا تھا۔ اپنے ٹارگٹ کو یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

وہ تو جہاں جاتا تھا، وہاں اپنے رب کی ذات میں گم ہو جاتا تھا۔ استنبول مسجدوں، گنبدوں اور بلند و بالا میناروں کا شہر ہے۔ وہ ایک وقت کی نماز ایک مسجد میں تو دوسرے وقت کی نماز کسی دوسری مسجد میں پڑھتا تھا۔ یہ طے کر چکا تھا کہ جب تک اس شہر کی ہر مسجد میں عبادت نہیں کر لے گا، تب

سے استنبول کیوں جا رہا ہے۔ یہودی اکابرین نے بھی پوچھا کہ وہ ماریہ کا سوگ منانے کے لیے استنبول کیوں جا رہا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ”اس شہر میں ایسا سوگ مناؤں گا کہ میری ماریہ کی روح خوش ہو جائے گی۔ آپ حضرات میرے پیچھے نہ آئیں۔ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“

اب وہ یہودی اکابرین سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ ماریہ کی وفات کے بعد وہ جیسے گوشہ نشین ہو رہا تھا۔ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اکابرین اسے یہودی بنانے کی تدابیر پر عمل کرتے کرتے مایوس اور بے زار ہو رہے تھے۔

انہوں نے جینی کی جعلی ویڈیو فلم بنا کر ایک ماں کی بھرپور متا پیش کر کے بیٹے کے جذبات سے کھیلنے اور ماں کے مذہب کی طرف مائل کرانے کی انتہا کر دی تھی۔ اب سوچ رہے تھے کہ سیدھی انگلی سے کھی نہیں نکل رہا ہے۔ فیڈر حار استہ اختیار کرنا ہوگا۔

عابد علی منگی ارض اسلام کا شہزادہ تھا۔ ترکی کی حکومت اس کی آمد پر شاہی پروٹوکول دینا چاہتی تھی، اس نے انکار کر دیا تھا۔ حکومت سے گزارش کی تھی کہ اسے تنہا رہنے دیا جائے۔ اس کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔

مداخلت کیسے نہ کی جاتی؟ وہ ملکی اور عدالتی قوانین کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے اور ماریہ کے دشمن کو ہلاک کرنے آیا تھا۔ اسے خلاف قانون کھلی آزادی نہیں دی جاسکتی تھی۔

فی الحال وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے نہیں جانتے تھے کہ اس کے عزائم کیا ہیں؟ وہ دور ہی دور سے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس کی آمد سے کارمن ڈی مورا کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ ترکی کے حکام سے کہہ رہا تھا کہ پرئس اسے ہلاک کرنے آیا ہے۔ اس کی ماں ثنائی دعویٰ کر رہی تھی کہ پرئس اس کے بیٹے کے قریب آئے گا تو اسے جلا کر رکھ کر دے گی۔

ایسے وقت ان نون نے ثنائی کے دماغ میں آ کر کہا۔ ”ہائے وچ لیڈی! کیا میری طرح کسی کی بھی کھوپڑی میں گھس کر اسے مار ڈالنے کا جادو جانتی ہو؟“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”اومائی گڈنس، کیا تم وہی پرئس کے دشمن ان نون ہو؟ کیا تم نے اس کی بیوی ماریہ کو ہلاک کیا ہے؟“

”ہاں میں وہی ہوں۔ میں نے پرئس کو پہلی مات دی ہے۔ آئندہ بھی وہ جس مشن پر جائے گا، میں اسے ناکام بنا کر ذلیل کرتا رہوں گا۔“

تک وہاں سے نہیں جائے گا۔

اور کیسے کرے گا؟ تم اس کے اندر جاتے کیوں نہیں ہو؟“
اس نے کہا۔ ”کچھ رکاوٹیں ہیں لیکن میں دوسروں کے دماغوں پر قبضہ جما کر اسے دور سے دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ پانچوں وقت کسی نہ کسی مسجد میں رہتا ہے۔ کبھی کھلی فضاؤں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ کبھی عجائب گھر کے اس حصے میں وقت گزارتا ہے جہاں ایک صندوق میں رسول اللہ ﷺ کا متبرک سامان رکھا ہوا ہے۔ وہ تو اس علاقے کی طرف آتا ہی نہیں ہے جہاں تم رہتے ہو۔“

ڈی مورانے کہا۔ ”تعب ہے، کیا وہ پیرس سے اتنی دور صرف عبادت کرنے آیا ہے؟ مجھ سے انتقام لینے نہیں آیا ہے؟“

ایسے وقت ترکی کے حاکم اعلیٰ کے ساتھ عالی کا انٹرویو نشر ہوا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں اپنی مرحوم زوجہ کا سوگ منا رہا ہوں۔ آج دوسرا دن ہے، کل تیسرا دن گزارنے کے بعد پیرس واپس چلا جاؤں گا۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”کارمین ڈی مورانے آپ کی دائف کی والدہ کو اور پھر والد کو قتل کر دیا ہے۔ وہ جینیوا حکومت کو مطلوب ہے۔ آپ اسے گرفتار کرنے یا قتل کرنے آئے ہیں جبکہ اس نے ہمارے ملک میں پناہ لی ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کی پولیس اور آئیلی جنس والے دن رات میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں کل تیسرا دن گزار کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نے آج تک کارمین ڈی مورانے کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے اور نہ دیکھوں گا۔“

”آئراہیل پرنس! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ ہماری اس ملاقات کے ذریعے یقین دلارہے ہیں کہ کارمین ڈی مورانے کے خلاف کسی طرح کی انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔“

”میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں۔ مجرموں کو، قاتلوں کو لازمی سزا ملتی ہے۔ اسے بھی ملے گی تو آپ کی طرح میں بھی دور سے دیکھتا رہوں گا۔“

”محترم پرنس! آپ کا یہ جواب الجھار ہا ہے۔“
”میں آپ کی الجھن دور کرنے کے لیے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب یہاں سے جاؤں گا تو میرے ہاتھوں پر کارمین ڈی مورانے کے لہو کے دھبے نہیں ہوں گے۔“

یہ سنتے ہی ان نوں چینلز کے ذریعے بولنے لگا۔ ”پرنس خود کو بہت چالاک اور دوسروں کو نادان سمجھ رہا ہے۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک عبادت

عالی نے اس ہوٹل کے قریب قیام کیا تھا جہاں سلطان محمود فاتح نے ایک وسیع و عریض محل تعمیر کروایا تھا۔ اس محل کو توپ قبویا توپ کالی کہا جاتا ہے۔ اب یہ محل دنیا کا سب سے قیمتی عجائب خانہ ہے۔ اس کے ایک حصے میں سب سے اہم نوادرات سب سے اہم خزانہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی بعض متروکہ متبرک اشیاء محفوظ ہیں۔

عالی روز وہاں جاتا تھا جہاں رسول اللہ ﷺ کی ایک چادر ریش مبارک کے بال ایک دائرہ مبارک، ایک دستی چھڑی اور ان کا نقش قدم ایک صندوق میں محفوظ تھے۔ انہیں دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر دیوانہ وار ان مقدس تبرکات کی سمت کھینچتا چلا گیا تھا۔ وہ تمام نایاب تبرکات ایک صندوق میں بند ہیں۔ صرف 27 رمضان المبارک کو کھولے جاتے ہیں۔ عالی خوش قسمتی سے ستائیسویں رمضان کو وہاں پہنچا تھا۔ اس حصے میں تیس رمضان تک تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ عالی وہاں دن رات تلاوت کرتا تھا۔ ان تبرکات کو دیکھتا رہتا اور روحانی مسرتوں سے سرشار ہوتا رہتا تھا۔

دنیا میں اور بھی مقدس اشیاء ہوں گی۔ یہ تبرکات اس لحاظ سے زیادہ مستند ہیں کہ ان کے بیج اور بچے ہونے کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ دست بدست تمام مسلمان خلفاء سے منتقل ہوتے ہوئے اس عجائب گھر میں پہنچے ہیں۔ مسلمان فاتح اعظم جہاں گھوڑے دوڑاتے تھے، وہاں اسلامی تہذیب کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

عالی اس محل کی بلندی پر کھڑا ہو کر دور تک بے شمار مسجدوں کو دیکھتا تھا۔ یہ اسلامی شان و شوکت ان کے وسیع و عریض گنبد اور آسمان کی سمت انگلیاں اٹھائے ہوئے مینار کہتے تھے..... کبھی مسلمان صدیوں تک حکومت کرتے رہے تھے۔ کیا واقعی ہم کبھی سپر پاور تھے؟ یقین آجائے تو ہر مسلمان رو پڑے گا۔

وہ تین دنوں تک اپنے گھر میں سوگ منا سکتا تھا لیکن اپنا گھر اپنا شہر اپنا ملک چھوڑ کر دشمن کے قریب آ گیا تھا اور قریب آ کر اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ موت گھر کے دروازے پر کھڑی رہے، اندر نہ آئے تو مرنے والا دہلتا رہتا ہے۔ پوری طرح جینے سے محروم رہتا ہے۔

کارمین ڈی مورانے کی آدھی جان نکل رہی تھی۔ اس نے ان نوں سے کہا۔ ”تم اس کے دماغ میں کھس کر معلوم کر سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہوگا؟ مجھ پر کب حملہ کرے گا؟“

گزار فرشتہ بن کر رہے گا۔ اس کی پشت پر آج کا سب سے خطرناک شوٹر اس کا باپ مراد علی منگی ہے۔ یہاں وہ باپ اپنے بیٹے کا کام کرنے آیا ہوگا۔ ان کی مکارانہ چالوں کو سمجھا جائے۔“

ہم زاد نے ارض اسلام کے چینل سے کہا۔ ”میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ یہاں اپنے ملکی معاملات میں مصروف ہوں۔ میرا ہم شکل بھی استنبول میں نہیں ہے۔ کوئی ہماری موجودگی وہاں ثابت نہیں کر سکے گا۔ یہ ان نون کے لیے بہتر ہوگا کہ میرے بیٹے کے خلاف اچھلنا بند کر دے۔“

ان نون نے کہا۔ ”تمہارا بیٹا اب ناقابل شکست نہیں رہا ہے۔ یہ دنیا دیکھ چکی ہے کہ میں نے اس کی سہاگ رات کو نامی رات بنا دیا تھا۔ اس کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ وہ آئندہ بھی کسی حسینہ کے ساتھ رنگین لحات نہیں گزار سکے گا اور اگر استنبول میں کارمن ڈی مورا کی طرف رخ کرے گا تو اس کی لاش ہی وہاں سے جائے گی۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”تمہارا باپ بھی پرنس کو کبھی چھو نہیں سکے گا۔ لوگ میڈیکل رپورٹ کو مان رہے ہیں اور تمہارے جھوٹے دعوے پر ہنس رہے ہیں۔ چلو اچھا ہے جو کہ بن کر ہنساتے رہا کرو۔ اب تمہارا بیٹی کام رہ گیا ہے۔“

ہم زاد اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ اب مجھے ثابت کرنا ہی ہوگا کہ میں پرنس کو ٹیلی پیٹھی کی انگلیوں پر بچا سکتا ہوں۔ یہ تماشا اب میں استنبول میں دکھاؤں گا۔“

وہ چینل سے رابطہ ختم کر کے دماغی طور پر اپنے تاریک ماحول میں حاضر ہو گیا۔ وہ اندھیرے کی آغوش میں رہتا تھا اور وہیں سے جیتے جاگتے روشن دماغوں میں پہنچتا تھا۔ اس وقت وہ آلہ کاروں میں سے ایک کے دماغ میں پہنچا جو اس شہر میں دن رات عالی پر نظر رکھتے تھے۔

اس نے ایک تابعدار کی دماغی آنکھوں سے دیکھا۔ عالی مسجد ابوالیوب انصاری میں تھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد باہر آکر اپنی ریٹذ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ ان نون کے تابعدار کے ساتھ تین شوٹرز تھے۔ وہ چاروں دو موٹر سائیکل پر تھے۔ وہ کار میں بیٹھنے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ اسی وقت اس کے حکم سے آلہ کاروں نے ٹی ٹی اور شاٹ گن سے گولیاں چلائیں۔ اس علاقے میں خاصی چہل پہل تھی۔ عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان نون چند روز پہلے یہ دیکھ چکا تھا کہ سیکورٹی افیسر کے ذریعے چلائی جانے والی گولی ضائع ہوئی تھی۔ عالی کے پاس سے گزر گئی تھی۔

اس بار اس کے چاروں شوٹرز نے اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ مرد عورتیں بچے بوڑھے سب ہی چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ایک شخص کو گولی لگی تھی۔ ایک عورت زخمی ہو کر گر پڑی تھی۔ عالی کے آس پاس سے گزرنے والی گولیوں نے انہیں ہلاک اور زخمی کیا تھا۔

بے گناہوں پر یہ ظلم ہوتے ہی وہ تڑپ گیا۔ اس نے شوٹروں کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ موٹر سائیکلوں پر فرار ہو رہے تھے۔ عالی نے فضا میں اچھل کر قلابازی کھاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کے دو سواروں کو دبوچ لیا۔ وہ پولیس اسٹیشن جنس والے جو دور سے عالی کی نگرانی کرتے رہتے تھے، وہ فوراً ہی انہیں گرفتار کرنے آگئے لیکن وہ گرفتار کئے گئے؟ عالی کا پہاڑ جیسا وزن ان پر آیا تو ایک اس کے نیچے دب کر مر گیا۔ دوسرے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ بھاگنے کے قابل نہیں رہا۔

دوسرے دو شوٹرز اپنی موٹر سائیکل پر طوفانی رفتار سے فرار ہو رہے تھے اور عالی کے پیچھے کی رفتار دو سو میل سے زیادہ تھی۔ وہ بہت آگے جانے والوں کے قریب دوڑتا آ رہا تھا۔ ان نون موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے ہوئے شوٹر کے ذریعے حیرانی سے عالی کی طوفانی رفتار کو دیکھ رہا تھا۔

کیا عجوبہ تھا کہ ٹیلی پیٹھی کے کسی ہتھکنڈے سے اسے روک نہیں سکتا تھا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی کہ اسے گولیاں کیوں نہیں لگتی تھیں۔ اس سے کترا کر گزر جاتی تھیں پھر بھی ان نون نے اس تابعدار کے ذریعے گولی چلائی۔ اسی لمحے میں عالی نے بالکل قریب پہنچ کر ایک ہاتھ منہ پر مارا تو ان نون کے دماغ کو یوں جھٹکا لگا جیسے وہ ہاتھ اس کے منہ پر پڑا ہو۔ وہ دماغی طور پر پھر تاریکی میں حاضر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک گم سم سا رہا۔ اس تابعدار کے ساتھ جو دماغی کنکشن تھا، اس نے سمجھا دیا تھا کہ منہ پر پڑنے والا ہاتھ فولادی ہتھوڑا تھا۔ وہ تابعدار ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے پایا تھا۔

وہ فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر موٹر سائیکل چلانے والے کے اندر پہنچا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا اور سپاہیوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ عالی نے موٹر سائیکل کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس کی گردن کو دبوچ کر نیچے گرا دیا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نہیں جانتا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کسی نے میرے دماغ کو جکڑ لیا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب تک اپنی مرضی کے خلاف مجرمانہ

یہ ان کی عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان نون تو کبھی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ عالی نہ سہی، اس کا باپ مراد علی منگی ڈی موراکو نہیں چھوڑے گا۔ بیٹے کی وہاں سے روانگی سے پہلے کچھ ایسا کر گزرے گا جو ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

عالی ظہر کی نماز سے پہلے عجائب گھر کے ایک حصے میں آکر قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا۔ ایسے وقت کئی گن مین اور کئی سرپھرے تنگی تلواریں لے کر آ گئے۔

ان نون ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے ہر طرح کے ہتھیار بردار درندوں کو وہاں پہنچا دیا تھا۔ یہ خیال تھا کہ بندوق کی گولیاں کتراجاتی تھیں۔ وہ تیر اور تلواریں سے بچ نہیں سکے گا۔

لیکن عجائب خانے کے باہر مسلح آرمی نے ان ہتھیار بردار درندوں کو روک دیا۔ ان سب کو نشانے پر رکھ کر واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد چار قد آور پہلوان آئے۔ وہ چاروں تپتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ موت کے ہر کارے ہیں۔ انہیں اندر جانے سے کسی نے نہیں روکا۔ وہ عالی کے قریب آ گئے۔ انہوں نے دروازوں کو اندر سے بند کر لیا۔ ایک پہلوان کی لات اس کے سینے پر لگی ساتھ ہی حلق سے ایک کراہ نکلی۔ لات کھانے والے کے سینے سے نہیں مارنے والے کے حلق سے نکلی تھی۔ اس کے جوتے کا منہ کھل گیا تھا۔ انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ تکلیف کے باعث کراہتے ہوئے دوسرے پاؤں پر اچھلنے لگا۔

باقی تین پہلوان بیک وقت اس پر جھپٹ پڑے۔ اس پر سوار ہو کر اسے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ اسے گھونے مارنے لگے۔ یہ دعویٰ تھا کہ ان کی انگلیاں خنجر کی طرح جسم میں بیوست ہو جاتی ہیں اور مقابل کو چیر پھاڑ دیتی ہیں لیکن دعویٰ غلط ہو رہا تھا۔ انگلیاں بدن کے کسی بھی حصے سے ٹکرا کر دوسری بار حملہ کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گھونے مارنے والی کلاسیاں بھی ڈھیلی پڑ رہی تھیں۔

باہر سے دروازوں کو پینا جا رہا تھا۔ اندر وہ ان کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس کا تو ایک ہاتھ ایک لات ہی بہت ہوتی تھی۔ وہ تینوں فرش سے نہ اٹھ سکے۔

جس نے عالی کے سینے پر لات ماری تھی، اس نے ایک پاؤں سے اچھلتے ہوئے آکر دروازے کو کھول دیا۔ اسی میں اس کی سلامتی تھی۔ آرمی کے جوان اندر آکر ان چاروں کو لاتیں مارتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگے۔

اس کا یہ بیان پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچا۔ ہوم منسٹر نے ٹی وی چینل ریڈیو اور پریس میڈیا کے ذریعے کہا۔ ”منسٹر ان نون! تم سے گزارش ہے کہ ہمارے شہر کے امن و امان کو غارت نہ کرو۔ پرنس عابد علی منگی کل رات ہمارے ملک سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد ان سے عداوت کرو۔“

بے شمار ٹی وی چینلز پھر ان دونوں کی گرم گرم خبریں نشر کرنے لگے۔ خبر یہ تھی کہ عالی پر ان نون کا حملہ ناکام رہا ہے۔ اس کے تین آلہ کار ٹیلی پیٹھی کی پناہ میں رہنے کے باوجود عالی کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور ایک کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

خبروں میں کہا جا رہا تھا کہ اب سے پہلے بھی سیکورٹی افسر کے ذریعے عالی پر کیا جانے والا حملہ بھی ناکام رہا تھا اور ان نون ماریہ کو ہلاک کرنے کا جو دعویٰ کر رہا ہے، وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں کھوکھلا ثابت ہو رہا ہے۔

ان نون اچانک ہی ہیرو سے زیر و ہو رہا تھا۔ اپنی توہین پر تلہا رہا تھا۔ آئندہ اپنی برتری منوانے کے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ وہ کارمن ڈی موراکو ہر حال میں عالی سے بچالے۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بڑی خاموشی سے ڈی موراکو ہلاک کر کے جائے گا۔

یہ سوال اسے ستا رہا تھا کہ ڈی موراکو سے دور رہنے والا اسے نظر انداز کرنے والا پرنس کس چور دروازے سے جا کر انتقام لے گا؟

اس نے اپنے چار تا بعد اوروں کو ڈی موراکو کی حویلی کے اندر اور باہر رکھا تھا اور خود بھی اس کے دماغ میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اب تک کوئی دشمن عالی کا کوئی آلہ کار اس حویلی کے قریب نظر نہیں آیا تھا۔ ترک پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی ڈی موراکو کے پاڈی گارڈز بن کر دن رات حویلی میں رہتے تھے۔ ایسی سخت سیکورٹی میں عالی جادو سے غائب ہو کر حویلی کے اندر جا کر اسے ہلاک کر سکتا تھا اور وہ جادو نہیں جانتا تھا۔

اسی کشمکش میں عالی کے قیام کا تیسرا دن طلوع ہو گیا۔ اس کی روانگی کے لیے شام کی ایک فلائٹ میں سیٹ اوکے ہو گئی۔ سیاست کی اور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوست نما دشمن ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ عالی سوگ منانے کے لیے استنبول کیوں آیا ہے؟ کیا وہ اپنی بیوی کے والدین کے قاتل کو معاف کر کے شام کو

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

عابی نے کہا۔ ”ان نون! تم ان میں سے کسی کے دماغ میں ہو۔ سن لو کہ میں سوگ منانے کا اختتام کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کارمن ڈی مورا کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں۔ جاؤ اسے بچاؤ۔“

ان نون فوراً ہی خیال خوانی کی پچھلاٹ لگا کر ڈی مورا کے دماغ میں آیا۔ وہ حویلی کی بالکونی میں کھڑا اور سبک مسلح گارڈز اور پولیس فورس کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی سخت سکیورٹی تھی کہ ایک پرندہ بھی اڑ کر نہیں آ سکتا تھا لیکن آگیا۔

ایک گولی بڑی خاموشی سے آ کر اس کے سینے میں بیوست ہوئی، دوسری گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کیا۔ بالکونی کی ریلنگ کے باہر جھکتے اور گرتے وقت تیسری گولی اس کا تھوڑا سا گوشت ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

ان نون اس کے دماغ میں تھا۔ اسے گولیاں کھاتے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک گولی کو بھی اس کی طرف آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ حویلی کے اندر باہر بھگدڑ مچ گئی۔

کس نے فائر کیا تھا؟ کہاں سے گولیاں آئی تھیں؟ شوٹنگ ٹارگٹ کے حساب سے گولیاں کہیں دور سے نہیں آئی تھیں۔ حویلی کے احاطے کے اندر مسلح گارڈز اور پولیس فورس دور تک تھی۔ ان ہی کے درمیان سے آئی تھیں۔ کوئی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا، کوئی بولنے والا نہیں تھا کہ گھر کی بدوق نے ہی گھر والے کو اڑا دیا ہے۔

کارمن ڈی مورا اٹلی کا گاڈ فادر تھا۔ اس کی اہمیت جرائم کی دنیا میں برائے نام تھی۔ وہ اہم سیاسی شخصیت کا حامل ہوتا تو ترک حکومت اسے سیاسی پناہ دیتی۔ مراد نے سفارتی سطح پر ترک حکام سے باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔ مراد علی منگی اور عابد علی منگی دونوں چڑھتے سورج تھے۔ ترک حکام ان سے راضی کیسے نہ ہوتے۔ ان کی انٹیلی جنس نے ایسی رازداری سے اس کا کام تمام کیا تھا کہ دماغوں سے کھینچنے والا ٹیلی پیٹھی جاننے والا بھی مراد کی اس خفیہ ڈیلنگ کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ترک حکام انجان بن کر واویلا کر رہے تھے کہ شہر کے امن و امان کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ پرنس عابد علی منگی کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ آرمی اس کی بے گناہی کی گواہ ہے۔ جب ان نون کے تابعدار پہلوان پرنس عابی پر حملے کر رہے تھے، تب ہی ادھر کارمن ڈی مورا پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔

دشمن ان نون خود گواہ تھا کہ عابی نے ڈی مورا کو ہلاک نہیں کیا ہے لیکن وہ مراد کو الزام دے رہا تھا کہ وہ بھی

بدل کر پولیس کی وردی میں آیا ہوگا۔ سب اسے سپاہی سمجھ رہے ہوں گے۔ اس نے پولیس اور گارڈز کے درمیان رہ کر سائیکلسر لگے ہوئے ہتھیار سے بے آواز گولیاں چلائی ہیں۔ کوئی اسے دیکھ نہ سکا۔ وہاں بھگدڑ ہوتے ہی اسے بھاگنے کا موقع مل گیا ہے۔

وہ اس سے آگے یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مراد نے ارض اسلام کے حکمران کی حیثیت سے ترکی کے حکمران سے ڈیلنگ کی ہوگی۔ اس کے کئی تابعدار اس حویلی کے اندر اور باہر تھے۔ وہ ان کے دماغوں میں جا کر معلوم کر رہا تھا کہ حویلی کے کس حصے سے گولیاں چلائی گئی ہیں؟

بالکونی کے سامنے احاطے میں پولیس فورس اور ڈی مورا کے کئی مسلح گارڈز تھے۔ وہیں سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک ہی گن سے چلانے والا کوئی ایک ہی شوٹر تھا۔ بے آواز فائرنگ کے باعث نظروں میں نہیں آیا تھا۔ ان نون کو شبہ تھا کہ پولیس والوں نے بھاری رشوت لے کر اس شوٹر کو اپنا کام کر جانے کا موقع دیا ہوگا۔ وہ کسی ثبوت کے بغیر پولیس والوں کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔

ٹیلی پیٹھی ایسا علم ہے جس کے ذریعے دماغوں میں کہیں چھپے ہوئے مجرموں کو پکڑ لیا جاتا ہے لیکن ان نون کی قاتل تک پہنچنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

کارمن ڈی مورا کی ماں منتر پڑھنا بھول گئی تھی۔ بیٹے کی لاش پر ماتم کرتی ہوئی ان نون کو باتیں سنارہی تھی۔ ”ارے اوکھو پڑیوں میں آنے والے! بڑی لمبی ڈیلنگیں مار رہا تھا۔ میرے جادو نے تو اثر نہیں کیا۔ کہاں ہے تیری ٹیلی پیٹھی کا جادو؟ تیرے بھروسے پر میرا بیٹا مارا گیا ہے۔“ ان نون نے کہا۔ ”اے بڑھیا! مجھ پر بھروسہ نہ کرتی تو بیٹے کو بچانے اور کہاں جاتی؟ میدان جنگ میں کوئی ایک ہارتا ہے تو دوسرا جیت جاتا ہے۔ قسمت نے دشمن کا ساتھ دیا ہے۔ وہ جیت گیا ہے لیکن وہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔ تو جلد ہی اس کی موت کی خوش خبری سنے گی۔“

وہ روتی ہوئی غصے سے بولی۔ ”ارے کتے! میرے بیٹے کی میت پر خوش خبری سنانے کی بات کر رہا ہے۔ کیا اب اسے مارے گا تو میرا بیٹا زندہ ہو جائے گا؟“

اس نے دماغوں پر حکمرانی کرنے والے کو کتا کہا تھا۔ وہ غصے سے چیخ پڑا۔ اس نے بڑھیا کے دماغ کو ایسا جھٹکا پہنچایا کہ وہ تکلیف کی شدت سے فرش پر گر کر مایہی بے آب کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

دماغ کو پہنچنے والی چوٹ ناقابل برداشت ہوتی

موت مرتے دیکھتا رہے گا۔“
یہ ایسا شیطانی فیصلہ تھا کہ ترک حکام چنچ پڑے۔
”مسٹر ان نون.....! یہ غیر قانونی اور غیر انسانی فیصلہ ہے۔
تمہاری دشمنی پرنس عالی سے ہے اور تم ترکی کے عوام کو
کیڑوں مکوڑوں کی طرح ہلاک کرنے کی بات کر رہے
ہو۔ انسان ہو، انسانوں کو سلامتی دو۔ ہمارے ملک میں ہم
دھماکے کرو گے، گولیاں چلاؤ گے، ہماری معیشت کو تباہ
کر دو گے یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

وہ بولا۔ ”انصاف چاہتے تو انصاف کرو۔ وہ کارمن
ڈی موراکا قاتل ہے۔ اسے گرفتار کرو، اسے گولی مارو۔“
”اس بات کے معتبر گواہ ہیں کہ ڈی موراکا ہلاکت
کے وقت عالی اس سے تیس کلومیٹر دور عجائب گھر میں تھا۔“
اس نے کہا۔ ”میں ٹیلی ویژن کے ذریعے اندر کی بات
جانتا ہوں۔ اس نے اپنے جاں نثاروں کے ہاتھوں اسے
ہلاک کر دیا ہے۔ دماغ کے اندر پہنچنے والے کی گواہی قابل
اعتماد اور ناقابل انکار ہوتی ہے۔ میری گواہی سے انکار نہ
کرو۔ اسے ابھی گرفتار کرو اور سزائے موت دو۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”تم ہماری مجبوریوں کو سمجھو۔
پرنس عالی کوئی معمولی شخص نہیں ہیں۔ صرف تمہاری گواہی
سے ہم ان کا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔“
”اسے نہیں پکڑ سکو گے تو وہ تمہاری حکومت اور
تمہارے عوام کے لیے مصیبت بن رہے گا۔“

عالی نے کہا۔ ”میں استنبول کے عوام کی جان و مال کو
نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ آج شام کی فلائٹ سے نہیں
جاؤں گا۔ جس علاقے میں ہوں، وہاں سے باہر قدم نہیں
رکھوں گا۔ یہ دنیا دیکھ رہی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ ان نون
مجھ سے نہیں ترک حکومت سے اور یہاں کے عوام سے دشمنی
کر رہا ہے۔ میں اگلے چوبیس گھنٹوں تک یہ دیکھنا چاہوں گا
کہ اقوام متحدہ اور دنیا کے تمام ممالک ترک حکام کو موجودہ
مشکلات سے کیسے نکالیں گے؟ یہ ان کے لیے چیلنج ہے۔ اگر
نہ نکال پائے تو میں چوبیس گھنٹے بعد یہاں نظر نہیں آؤں گا۔
وہ ٹیلی ویژن کی آنکھوں سے مجھے یہاں سے جاتے دیکھ نہیں
سکے گا۔ میں کہیں بھی لوگوں کے درمیان نظر نہیں آؤں گا تو
اس کے تا بعد ارجس پر گولیاں چلائیں گے؟“

یہ ایسا چیلنج تھا کہ ان نون سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اب تک
یہی دیکھتا آیا تھا کہ عالی جو کہتا ہے، اسے کر گزرتا ہے۔ اس
نے کہا تھا کہ سہاگ رات منائے گا پھر ان نون کی رکاوٹوں
کے باوجود دلہن کی قربت حاصل کر لی تھی۔ وہ تین دنوں کے

ہے۔ وہ بوڑھی اور کمزور تھی۔ ڈوبتے ہوئے ذہن سے انک
انک کر بولی۔ ”یہ کتاب مجھے مار ڈالے گا۔“
ان نون نے تلملا کر دوسرا دماغی جھٹکا پہنچایا تو یکھت
اس کا دم انک گیا۔ وہ دوسری سانس نہ لے سکی۔ وہاں
پولیس فورس کے افسران اور مقامی ٹی وی کا عملہ موجود تھا۔
لائو چیویشن کو نشر کر رہا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ وہ ٹیلی ویژن پر
والا شہ زور عالی کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا ہے۔ کھسانی
بلی کھبانو پچے کے مصداق اس نے ایک بوڑھی عورت کو
مار ڈالا ہے۔

حقیقتاً اس سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
عالی کے مقابلے میں اس کی ناکامیوں کی فہرست طویل ہوتی
جا رہی تھی۔ اس نے پہلا حملہ سکیورٹی افسر کے ذریعے کیا تھا
اور ناکام رہا تھا پھر اس نے دعویٰ کیا تھا کہ پرنس کو اپنی دلہن
کے ساتھ سہاگ رات منانے نہیں دے گا۔ اس کا یہ چیلنج بھی
اس طرح کمزور ہو گیا کہ وہ دلہن کی خلوت میں گیا تھا۔ ماریہ
نے ازدواجی سرسری حاصل کرنے کے دوران ہی وفات
پائی تھی۔

پھر وہ اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے کہنے لگا کہ اس
نے عالی کی دلہن کو ہلاک کیا ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ
نے اس دعویٰ کو بھی غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب کارمن ڈی
موراکا ہلاکت ٹیلی ویژن کی دہشت کو بڑی حد تک کمزور کر
رہی تھی۔ اس کی ناکامی اور جھنجلاہٹ کھل کر سامنے آرہی
تھی۔ اس نے آخری فیصلہ کرنے کے انداز میں چینلز کے
ذریعے کہا۔ ”لوگو! سنو، اب میں اپنی طاقت کا صحیح
استعمال کروں گا۔ سنو کہ آج سے عابد علی منگی میرا محکوم
ہے۔ وہ میری اجازت کے بغیر نہ کسی ملک میں جائے گا، نہ
کسی کی پناہ میں رہ سکے گا۔“

وہ گرجنے کے انداز میں بولا۔ ”میرا حکم ہے، شام کی
فلائٹ کینسل کی جائے۔ وہ استنبول سے باہر نہیں جاسکے گا۔
اگر ائر پورٹ میں قدم بھی رکھے گا تو طیارے کو پرواز سے
پہلے تباہ کر دیا جائے گا۔ یہ منادی ہے کہ وہ خشکی کے جن
راستوں سے جائے گا، ان راستوں میں بم دھماکوں سے
گڑھے پڑ جائیں گے۔ وہاں کے بے گناہ لوگ مارے
جائیں گے۔ وہ بحری راستے سے جانا چاہے گا تو جہازوں کو
سمندر میں غرق کر دیا جائے گا۔ میرا حکم ہے وہ ابھی جس
علاقے میں ہے، وہیں تک محدود رہے۔ کسی دوسرے
علاقے میں جائے گا تو میرے تا بعد ارجس وہاں گولیاں چلائیں
گے۔ اگرچہ وہ عجوبہ محفوظ رہے گا لیکن معصوم لوگوں کو بے

اندر ڈی سورا کو ہلاک کرنے والا تھا اور اس نے تیسرے دن اسے ہلاک کر دیا تھا۔ ان نون دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس نے چیخ کو سن کر دماغ چیخ رہا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے بعد ہزار رکاوٹوں کے باوجود وہاں سے چلا جائے گا اور وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ وہ پھر عالی سے کمر ہوگا پھر اس کی سبکی ہوگی۔

سپر پاور اور تمام بڑے ممالک ان نون کو سمجھانے لگے کہ وہ اپنی اور عالی کی دشمنی کو سیاسی مسئلہ نہ بنائے۔ ایک ملک کو اور اس کے عوام کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی دھمکیاں نہ دے۔ کیا وہ پوری دنیا کی مخالفت مول لے کر اپنی طاقت کا لوہا منوائے گا؟

ان نون سوچ میں پڑ گیا۔ عقل نے سمجھایا کہ وہ بار بار شکست کھانے کے باعث غصے اور جھنجھلاہٹ میں بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔ ترک عوام سے دشمنی کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ عالی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مات نہ کھانے والا عجوبہ چوبیس گھنٹے کے بعد ٹھیکہ دکھا کر چلا جائے گا۔

بڑے ممالک سے بحث مباحثے میں بائیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس نے مزید دو گھنٹے بعد چینل کے ذریعے کہا۔ ”میں فون کے ذریعے عالی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اسے استنبول سے جانے کی اجازت دے دوں گا۔“ ترکی کے ہوم منسٹر نے کہا۔ ”چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں، تم کسے جانے کی اجازت دو گے؟ پرنس عالی شاید جا چکے ہیں۔ اپنے علاقے میں کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔“ ان نون کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ اس نے کہا۔ ”وہ پولیس کی نگرانی میں تھا۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کیسے جاسکے گا؟“

”وہ تمہارے بھی تابعداروں کی نگرانی میں تھا۔ ان کے دماغوں میں جا کر پوچھو وہ کیسے غائب ہو گیا ہے؟“ وہ فوراً ہی تمام تابعداروں کے اندر باری باری جا کر پوچھنے لگا۔ وہ سب ہی حیران تھے۔ کسی نے اسے آخری بار مسجد میں کسی نے توپ کا پی کی عمارت میں اور کسی نے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ یہ سب ہی کو یقین تھا کہ اس علاقے سے باہر نہیں جاسکے گا۔

اس کے درجنوں تابعدار اور پولیس والے پورے استنبول میں اسے تلاش کرنے لگے۔ عالی کو ایک دنیا جانتی پہچانتی تھی۔ پورے شہر میں یہ اعلان کیا گیا کہ پرنس عابد علی منگنی کہیں نظر آئے تو فوراً اطلاع کریں۔ اطلاع دینے کے لیے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے کئی فون نمبرز بتائے

جار ہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ اسے کوئی ڈھونڈ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہوم منسٹر کی رہائش گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ ان نون اس ملک کے تمام اکابرین کے دماغوں میں جا کر اپنا شبہ دور کر رہا تھا۔ ہوم منسٹر اور چند عہدیدار یوگا کے ماہر تھے۔ وہ ان کے چور خیالات نہ پڑھ سکا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ ترک حکام ارض اسلام کے حکمران مراد علی منگنی سے دوستانہ تعاون کر رہے ہیں۔ وہ عالی کے مقابلے میں پھر کمر ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پرنس عالی چال بازیاں دکھا رہا ہے۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آئندہ میرے خوف سے چھپا رہے گا۔ اس خوف سے کہ جب بھی اور جہاں بھی منظر عام پر آئے گا، میں اس علاقے میں موت کا بازار گرم کر دوں گا اور وہ ہمیشہ کی طرح میرے مقابلے میں مجبور اور بے بس رہے گا اگر پرنس عجوبہ ہے، غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے تو آئے اور مجھے ڈھونڈ نکالے۔ وہ مجھے نہ کبھی ڈھونڈ سکے گا نہ مجھے نقصان پہنچا سکے گا۔“

مراد نے چینل کے ذریعے کہا۔ ”یہی چیخ تمہارے لیے بھی ہے۔ تم بھی آئندہ پرنس کو دور سے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ کبھی اس کا راستہ نہیں روک سکو گے۔ آئندہ تم دونوں اندھیرے میں رہو گے۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں پائے گا۔ ہو سکتا ہے تم دونوں کبھی کسی کو دیکھ نہ پاؤ اور موت دیکھ لے اور سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کوئی اپنی غلطی سے نظروں میں آجائے پھر یہ دنیا دیکھے گی کہ کون کس کی شرگ تک پہنچ گیا ہے۔“

دنیا والوں کے لیے ان دونوں کی عداوت بہت ہی تجسس آمیز اور دلچسپ ہو گئی تھی۔ وہ آئندہ طرح طرح کے دلچسپ اور سنگین تماشے دیکھنے والے تھے۔ یہ دھڑکا بھی لگ گیا کہ ان کی عداوت کے نتیجے میں تماشادیکھنے والوں کو بھی جانی و مالی نقصان پہنچتا رہے گا۔

عالی کبھی چہرہ بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے پیدائشی چہرے کے ساتھ پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن مراد اور ہم زاد نے اسے سمجھایا کہ دشمن کی چال کے جواب میں اسی کی چال کو اس پر الٹا ڈال دے تو اس کے آگے کھلا ہوا ٹارگٹ بن کر نہیں رہو گے۔ اسے بھی اپنی روپوشی کے اندھیرے میں بھٹکانا لازمی ہے۔

وہ مراد اور ہم زاد کی ہر ہدایت پر سر جھکا تا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اور اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ پہلے ہی ان نون کو لوہے کے چنے چبوا رہا

والے مایوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا وجود نہیں رہا ہے۔ وہ دونوں ہی دنیا سے گزر چکے ہیں۔ بہر حال عقل کہہ رہی تھی کہ وہ روپوش رہ کر ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کسی دن اچانک ہی ظاہر ہو جائیں گے۔ فی الحال صبر اور انتظار تھا۔

ادھر زیب النساء کی زچگی کا وقت آن پہنچا تھا۔ ایک اور عجوبہ گل کھلانے آرہا تھا۔ عالی کی پیدائش سے یہ اندیشہ پیدا ہوئے تھے کہ زیب النساء کا انجام بھی جینیفر عرف جینی جیسا ہوگا لیکن اس بار اللہ مہربان تھا۔ میڈیکل رپورٹ کہہ رہی تھی کہ وہ زچگی کے مراحل سے بغیریت گزرے گی پھر بھی ایسے وقت مائیں بننے والیاں تھوڑی بہت تکالیف سے اور اندیشوں سے گزرتی ہیں۔ وہ بھی تکلیف سے گزرتے وقت اللہ کو یاد کر رہی تھی۔

زیب النساء ہر حال میں عبادت کرنے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک آیت گردش کر رہی تھی۔ یہی تجسس تھا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہے اور کیا ظاہر ہونے والا ہے۔ زیب النساء کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور ماروی آگئی لیکن کہاں آئی؟ کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک بجلی چلی گئی تھی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر یا کسی نرس کے ہاتھوں میں نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”وہ کہاں ہے؟ چارجر لائٹ آن کرو۔“ کسی کو یاد نہیں تھا کہ چارجر لائٹ کہاں رکھی تھی؟ بچی کے رونے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نرس نے کہا۔ ”بچی یہیں بیڈ پر ہوگی۔“ عنبر.....! تم ادھر دیکھو۔“

گہری تاریکی میں وہ کیسے دکھائی دیتی۔ وہ سب اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھا کر ادھر ادھر ٹٹول رہے تھے۔ دو نرسیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اپنا اپنا سر سہلانے لگیں۔ تاریکی نے بچی کو نگل لیا تھا۔ اندھیرا یہاں ہوتا ہے تو وہاں کسی دوسرے مقام پر بھی ہوتا ہے اور اندھیرے میں معلوم نہیں ہوتا کہ مقامات بدل گئے ہیں۔ اس کی جگہ بدل گئی تھی۔ وہاں کئی انسانی سائے متحرک تھے۔ وہ لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں نہیں تھیں۔ اندھیرے میں دنیا کالی ہو جاتی ہے۔ لوگ کالے سائے ہو جاتے ہیں۔ صورتیں کالی، وجود کالے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی کو پہچان نہیں پاتا۔

وہ تاریک دنیا کے باشندے کالے ماحول میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں ملی اور چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نوزائیدہ ماروی کی آنکھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ ایک سائے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سمجھ

تھا۔ اب اس کی طرح روپوش ہو کر ناقابل شکست ہو گیا تھا۔ وہ عالی کو نہ دیکھ سکتا تھا، نہ اس پر حملہ کرنے اور بے گناہوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دے سکتا تھا۔

صرف ان نون ہی نہیں، یہودی اکابرین بھی پریشان ہو گئے تھے۔ عالی نے ان سے بھی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے دجال معظم کا نمائندہ، یہودی ماں کا بیٹا کہاں گم ہو گیا ہے؟ وہ اسے پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے پکار رہے تھے۔ انہیں کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ آئندہ کبھی ان سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔

دنیا میں سراغ رسالوں کی جتنی تنظیمیں ہیں، وہ عالی اور ان نون کو تلاش کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی فعال ہو گئی تھیں۔ عالی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کے قد، جسامت، چال ڈھال اور لب و لہجہ سے شاید اسے پہچانا جائے گا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس کی طرح قد و جسامت رکھنے والے لاکھوں جوان ہوں گے۔ وہ اپنا لب و لہجہ بدل چکا ہوگا اور چیتے کی طرح چلتے والے نے اپنی چال بھی بدل دی ہوگی۔ ان نون کے سائے کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کھوج لگانے والے ہر اس شخص کو پکڑتے تھے جو ذرا سا بھی پراسرار دکھائی دیتا تھا۔ مجذوب اور قلندر جیسے نظر آنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن ان نون تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔

وہ ٹیلی فون بھی جاننے والا بھی پریشان تھا۔ کہیں بھی عالی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن ایک امید تھی۔ اس بات کا انتظار تھا کہ وہ کبھی تو اپنے کسی اور دشمن سے ٹکرائے گا پھر اس دشمن کی لاش دیکھ کر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر کسی روبوٹ کا ہاتھ پڑا ہے اور وہ روبوٹ فلاں ملک، فلاں شہر اور فلاں علاقے میں چھپا ہوا ہے۔

سب ہی دوست اور دشمنوں کو اسی بات کا انتظار تھا۔ عالی کبھی مجبور ہو کر اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتا تو اسے تلاش کرنے والے دور سے دیکھتے اور دور سے ہی کچھ کہہ سنے بغیر اس کی نگرانی کرتے کیونکہ دشمنی سے قریب جانے والوں کی شامت آ جاتی اور دوستی سے قریب آنے والوں سے وہ معذرت چاہتا پھر روپوش ہو جاتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی روپوش ہو کر اور زیادہ پراسرار بن گئے تھے۔

☆☆☆

دن اور مہینے گزرتے جا رہے تھے۔ ڈھونڈنے

آواز میں کہا۔ ”یہ ہمارے جیسی آگنی ہے۔“
دوسرے سائے نے پوچھا۔ ”کیا یہ وہی ہے جس کی
تم نے پیش گوئی کی تھی؟“

”اللہ بڑا جلال والا ہے۔ بڑی شان والا ہے۔ یہ
وہی ہے۔ یہ ان کی اولاد ہے جو صوم و صلوة کے پابند رہتے
ہیں اور جن کی دستگیری بابا اجیری فرماتے ہیں۔“
کئی آوازیں بیک وقت گونجنے لگیں۔ ”اللہ اکبر اللہ
اکبر اللہ اکبر.....“ تاریک ماحول ایمان پرورد صداؤں سے
گونج رہا تھا۔

کہیں دور سے کسی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ اللہ
والے کیوں شور مچا رہے ہیں؟“
کسی نے جواباً کہا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ وہ آگنی ہے جس
کی پیش گوئی کی گئی تھی اور ہمارے کاہن نے اس کی تصدیق
کی تھی۔“

”ہاں بے شک ہمارے کاہن نے کہا تھا وہ عجوبہ
ہوگی۔ کیا وہ ایسی ہی ہے؟“

”یہ ہمارا طاغوتی سردار جانتا ہے۔“
”اے خردو۔ وہ دماغوں میں چھپے ہوئے بھید معلوم
کر لیتا ہے۔ اے معلوم ہو گا تو ہمیں بھی اس بچی کی حقیقت
معلوم ہوگی۔“

پھر وہ تاریک ماحول شیطانی صداؤں سے گونجنے
لگا۔ وہ سایہ سایہ جیسے لوگ طاغوتی سردار ابلیس کے معتد
خاص کو پکارنے لگے۔

”ہا ہو۔ ہو ہو۔ آبنوس کی جے ہو۔ اے عظیم آبنوس!
تو بے دماغوں کا کا بوس جس کے اندر جاتا ہے اسے نادیدہ
شکجے میں جکڑ لیتا ہے۔ اے آبنوس! تجھے خبر ہو۔ مسلمان کہہ
رہے ہیں کہ وہ آگنی ہے۔ جس کی پیش گوئی ہمارے کاہن
نے کی تھی۔“

وہ آبنوس اندھیرے کے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
آنکھ کھلتے ہی تاریکی میں دیدے چمکنے لگے۔ وہ ناگواری
سے بولا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں..... وہ آگنی ہے؟“

وہ دوسرے ہی لمحے میں ابلیس کے پجاری ایک
کاہن کے پاس پہنچ کر بولا۔ ”اے پیشوائے اعظم کیا تیری
پیش گوئی درست ہو چکی ہے؟“

کاہن نے کہا۔ ”ہاں، وہ مسلمانوں کی بستی میں آگنی ہے۔“
”کیا تو وہاں گیا تھا؟ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
ہے؟ تو نے کیسے جانا کہ یہ وہی ہے؟“

”میں نے اسے دور سے دیکھا ہے۔ ہم مسلمانوں

سے ملتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں۔ ان سے قریبی
تعلق رکھتے ہیں لیکن میں اس بچی کے قریب نہیں جاسکا۔ یہی
اس کی پہچان ہے۔“

آبنوس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟
اس کے قریب کیوں نہ جاسکا؟“

کاہن نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہو جائے گا۔ تو ابھی اس
کے پاس جا پھر واپس آ۔ چل میں بھی چلتا ہوں۔“

تاریکی میں مقام بدل گیا۔ وہ دونوں وہاں پہنچے
جہاں تھیں ماروی شب دیبجور کی آغوش میں تھی۔ اسے چاہئے
والے کئی سائے کئی پرچھائیاں اس کے آس پاس تھیں لیکن
وہ دونوں اس کے بالکل قریب نہ جاسکے۔ کسی نامعلوم
رکاوٹ نے انہیں قریب جانے سے روک دیا تھا۔

آبنوس نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”میں جب بھی پرنس
عالی پر حملہ کرنے جاتا ہوں، ایسی ہی نامعلوم سی رکاوٹ
سامنے آ جاتی ہے۔ اے پیشوائے اعظم! یہ بچی کون ہے؟“
کاہن نے کہا۔ ”یہ پرنس عالی کی بہن ہے۔“

آبنوس کے ذہن کو جھٹکا پہنچا۔ اسے پرنس عالی سے
دشمنی کے پہلے دن سے معلوم تھا کہ وہ عالی سے کبھی مات کھاتا
رہے گا کبھی کامیاب ہوتا رہے گا لیکن کبھی اس کے دماغ میں
تو کیا اس کے جسم کے قریب بھی نہیں جاسکے گا۔ دور ہی دور
سے عداوت جاری رکھے گا۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ عالی
ابن مراد علی منجی ہے۔ مراد اور اس کے خاندان کے تمام
افراد صوم و صلوة کے پابند ہیں اور ان سب کو بابا صلاح
الدین اجیری کی سرپرستی حاصل ہے۔

ازل سے ایمان اور کفر پاکی اور ناپاکی کے درمیان
جنگ جاری ہے اور یہ قیامت تک جاری رہے گی۔ بابا
صلاح الدین اجیری کی روحانی قوت نے ایک حفاظتی
دیوار کھڑی کی تھی۔ طاغوتی قوتیں اس دیوار کو پار کر کے
مراد ہم زاذزب النساء، عابد علی منجی اور ماوری تک نہیں پہنچ
سکتی تھیں۔

جب پہلی بار آبنوس نے پاتال کی تاریک دنیا سے
نکل کر آفتاب و ماہتاب کی روشن دنیا میں حکومت کرنے کا
ارادہ کیا تھا تب ہی کاہن نے کہہ دیا تھا کہ وہ ارضی دنیا میں
کسی ایک شہ زور سے جنگ لڑتا رہ جائے گا۔ اپنی قوت
اور دہشت طاری کرتا رہے گا لیکن کبھی سپر پاور بن کر نہیں رہ
سکے گا۔

پھر کاہن نے کہا تھا۔ ”تو دشمن کی روشن دنیا میں
جائے گا اور فساد برپا کرے گا تو تیری تاریک دنیا میں بھی

مراد محبوب اور ماروی کے عشقیہ مثلث کے دوزاویئے نابود ہو گئے تھے۔ تیسرا زاویہ بھی کسی دن معدوم ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی ماروی ایک نئی داستان کا آغاز کرنے آگئی تھی۔ ماروی ایک نام ہے، پیار و محبت کا اور شرم و حیا کا۔ ایک ماروی یہ آئی تھی جو عجوبہ تھی۔ قدرتی اصول کے برعکس پیدا ہوتے وقت ملبوس تھی۔ آئندہ طاغوتی گناہوں کے اندھیرے میں رہ کر حیا کے چراغ جلانے والی تھی۔

ان نون کہلانے والا پریشان تھا۔ وہ نوزائیدہ بچی تاریک دنیا میں آ کر پھر چلی گئی تھی۔ اس نے کاہن سے پوچھا۔ ”یہاں سورج کی روشنی نہیں آتی، وہ کیسے آگئی تھی؟“ کاہن نے کہا۔ ”جیسے تم آفتاب و مہتاب کی دنیا میں جاتے ہو پھر آ جاتے ہو۔“ وہ بولا۔ ”مجھے طاغوتی قوت حاصل ہے۔“

”اسے روحانی قوت حاصل ہے۔“ اس کی آنکھیں ہماری طرح ہیں۔ جب وہ بولنے اور سمجھنے لگے گی تو مجھے صورت سے پہچان لے گی۔ اپنے بھائی کو بتادے گی کہ میں پاتال کے اندھیروں میں رہتا ہوں۔“ ”ہاں یہ تو ہوگا۔ جب ذرا عمر گزرے گی۔ وہ اپنے بھائی کے مسائل کو سمجھے گی تو شاید اسے یہاں لے آئے گی۔“ ”اس سے پہلے ہی میں اس ننھی کے دماغ میں پہنچ کر.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا میں اس بچی کے دماغ میں نہیں جاسکوں گا؟“

”تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں اس کے قریب نہ جاسکے سوچ کہ تو دماغ میں کیسے جاسکے گا؟“

یہ بہت ہی مایوس کرنے والی بات تھی۔ بابا اجیری کی سرپرستی میں جتنے افراد تھے، ان کے دماغوں میں وہ جاسکے گا تھا۔ عالی کی طرح ماروی سے بھی فاصلہ قائم رہنے والا تھا۔

کاہن نے کہا۔ ”کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ تم اور عالی ایک دوسرے کو ڈھونڈ نہیں پا رہے ہو۔ اب آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر عالی اپنی بہن کی مدد سے تجھے دیکھ لے گا تو تو بھی اپنے اس ٹارگٹ کو پالے گا۔ تو اس دنیا کا حکمران بننے کی ضد کر رہا ہے اور جنگ رک گئی ہے۔ اسے جاری رکھنے کے لیے روپوشی کو ختم ہونا چاہیے اور یہ اس بچی ماروی کے ذریعے ہی جاری ہوگی۔“

”عقل کہتی ہے وہ ماروی کی مدد سے یہاں نہ آئے۔“

اس سے پہلے میں اسے آفتابی دنیا میں ڈھونڈ نکالوں۔“ عالی کو پاتال کی تاریکی میں آنے سے کیسے روکنا تھا؟

محل کی تاریکی نے نوزائیدہ ماروی کو نگل لیا تھا۔ وہ پیدا ہونے کے بعد نظر نہیں آ رہی تھی۔ محل کے باہر بہت بڑے جزیئر کو چلانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور وہ آن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک ذرا شور مچا کر اسٹارٹ ہوتا تھا پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

پھر ماروی نے آنکھیں کھولیں تو لیڈی ڈاکٹر نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ ”وہ دیکھو..... دو ننھی سی آنکھیں چمک رہی ہیں۔“

ایک نرس نے لپک کر اسے چھو لیا۔ وہ گمشدہ ہاتھوں میں آگئی۔ ایسے ہی وقت جزیئر آن ہو گیا۔ پورے ارض اسلام کی بجلی بحال ہو گئی۔ پورے محل میں خوش خبری گونجنے لگی کہ بیٹی دنیا میں آگئی ہے اور ماں خیریت سے ہے۔

ہم زاد دوڑا چلا آیا۔ اس نے چاند جیسی بیٹی کو دیکھا جس کے وجود سے واقعی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ عجیب نورانی سی تھی۔ روشنی میں اس کی آنکھیں نہیں چمک رہی تھیں لیکن بہت ہی روشن اور پُرکشش سی تھیں۔

یہ سب نے حیرانی سے دیکھا، وہ نوزائیدہ بچی برہنہ نہیں تھی۔ سفید دھند نے اس کے وجود کو لپیٹ لیا تھا۔ پیدائش کے پہلے لمحے سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ شرم و حیا کی مثال قائم کرے گی۔

شاہی دستور کے مطابق شہزادی کی آمد پر توپوں کی سلامی دی گئی۔ پھر جیسے پورا ارض اسلام نیند سے اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر آتش بازی کے تماشے رنگ بکھیرنے لگے۔

مراد نے اسکا پ کے ذریعے ننھی سی ماروی کو دیکھا۔

منی چاچی اور چاچا اسی محل میں رہتے تھے۔ چاچی نے اسے گود میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔ ”مراد! بچپن میں ماروی کچھ ایسی ہی تھی۔ میری بیٹی واپس آگئی ہے۔ میں نے اسے دودھ پلایا تھا۔ اپنی گود میں رکھ کر اسے جوان کیا تھا۔ یہ میری گود میں پرورش پائے گی۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”بے شک ماروی پر آپ کا پورا حق ہے۔ یہ آپ کے سائے میں رہے گی۔“

ایسے وقت چاچی، چاچا اور مراد نے محبوب علی چانڈیو کو یاد کیا۔ ان کے سر جھک گئے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ماروی کا سچا عاشق تھا۔ اس کی وفات کے بعد اندر ہی اندر گھلتا رہا تھا۔ جب تک زندگی رہی، اسی کے نام سے سانس لیتا رہا۔ وہ عاشق آتش عشق میں جلتے جلتے معدوم

اس کے ذہن میں دو تدبیریں گردش کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ماروی کو ہی اپنی دنیا میں آنے سے روک دے۔ اسے ختم کر دے۔ وہ بچی ہے اسے آسانی سے ختم کرنے کے راستے نکل آئیں گے۔ دوسری تدبیر یہ سوچ رہی تھی کہ باپ کو چھیڑا جائے گا تو بیٹا اس کے پیچھے سے نکل آنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مراد علی منگی کا یہ ریکارڈ بھی سامنے تھا کہ آج تک اسے چھیڑنے والے اپناج اور معذور ہو گئے یا دنیا سے چلے گئے تھے۔ وہ مراد کی سمت رخ کرنے کے متعلق بار بار سوچتا تھا پھر سوچ کر رہ جاتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ طاغوتی قوتیں تھیں تو مراد کے ساتھ روحانی قوتیں تھیں۔

☆☆☆

یہ روحانی اور طاغوتی تضادات ازل سے ہیں۔ اب تک رہیں گے۔ ان میں سے ایک نور ہے۔ دوسرے کی خاصیت تاریکی ہے۔ روشنی میں کچھ چھپایا نہیں جا سکتا۔ سب ہی سامنے آ جاتا ہے۔ گویا روشنی سچ کو ظاہر کر دیتی ہے۔

اس دنیا میں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں سورج کی روشنی تو پہنچتی ہے لیکن انسانی آنکھیں پہنچ نہیں پاتیں۔ کسی آسیب زدہ مکان میں آئینیں اور آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ اسے اسرار کا اندھیرا کہتے ہیں۔

اس زمین میں ایسی سرنگیں ہیں جن میں اترنے والے کبھی واپس نہیں آئے۔ اس زمین پر نہ سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں۔ نہ دکھائی دینے والے وجود ہیں۔ انہیں جادو یا قدرت کے اسرار کہا جاتا ہے۔

ہندوستان کے شمال میں کیلاش پہاڑ اہرام مصر کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں ہزاروں عقیدت مند جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی بلندی تک کوئی چڑھ نہیں پاتا۔ اس پر اسرار پہاڑ پر ریسرچ کرنے کے لیے جرمنی کی ایک مہم جو ٹیم گئی تھی لیکن وہاں تک پہنچ نہیں پائی تھی۔ وہاں کے باشندوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس بلندی تک کوئی پہنچ نہیں سکے گا کیونکہ وہاں بھگوان رہتے ہیں۔

فی الحال یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس زمین پر وہ تاریک دنیا کہاں چھپی ہوئی ہے جہاں آنکھیں عرف ان نون چھپا رہتا تھا۔ جہاں نوزائیدہ ماروی پہنچ گئی تھی جہاں اور کئی پر اسرار ہستیاں سانس لے رہی تھیں۔

وہاں دماغوں سے کھیلنے والا ایک اور خطرناک

کھاڑی تھا اور وہ ان نون کا استاد کہلاتا تھا۔ اس کا نام بارودا تھا۔ عالی کی طرح حیرت انگیز جسمانی قوتوں کا حامل تھا۔ کسی چٹان پر گھونسنے مارتا تو وہ تڑخ جاتی تھی۔ اس کی بیٹی نیلماں بھی عجوبہ تھی۔ وہ ٹھوس وجود رکھتی تھی۔ لیکن جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی تھی۔ ایسے وقت اس کے آ رہا دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس تاریکی میں اور بھی پر اسرار ہستیاں تھیں۔ ان میں کچھ روحانی صلاحیتیں رکھتی تھیں کچھ شیطانی قوتوں کی حامل تھیں۔

بہت پہلے آنکس نے بارودا سے کہا تھا۔ ”ہمیں تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں حکومت کرنا چاہیے۔ ہم ٹیلی پتھنسی کے ذریعہ وہاں کے تمام حکمرانوں کو زیر کر سکیں گے۔“ بارودا نے کہا۔ ”تم جاؤ۔ اپنی ٹیلی پتھنسی کی قوتوں کو آزماؤ۔ میں دیکھتا رہوں گا۔ تم جن حالات سے گزرتے رہو گے انہیں سمجھتا رہوں گا۔“

پھر یہ حقیقت سامنے آئی۔ وہ عالی کے مقابلے میں ناکام ہو رہا تھا۔ بارودا نے کہا۔ ”میں دیکھتا آ رہا ہوں۔ اس آفتابی دنیا میں وہی ایک پرنس عالی ناقابلِ تسخیر ہے۔ ایک تو اس کے ساتھ روحانی قوتیں ہیں۔ پھر یہ کہ وہ میری طرح غیر معمولی جسمانی قوتوں کا حامل ہے۔“

آنکس نے کہا۔ ”تم تو بلا کے شہ زور ہو۔ جسے ایک ہاتھ مارتے ہو وہ مر جاتا ہے۔ تم پرنس کو توڑ کر رکھ دو گے۔ میرے ساتھ چلو۔ ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے اس سے بچنے لڑانے کی جلدی نہیں ہے۔ تم جلد بازی کے باعث اس سے کمزور ہو گئے ہو۔ بہتر ہے اسے تلاش کرو۔ اس سے فیصلہ کن جنگ لڑو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

پچھلے پانچ مہینوں سے یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ تلاش کرنے سے نہیں ملے گا۔ بارودا نے کہا۔ ”ایک ہی صورت ہے۔ تم اس کے مزاج کے خلاف کچھ ایسا کرو کہ وہ تم سے مقابلہ کرنے کے لیے ظاہر ہو جائے۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں؟ وہ بھی مجھے منظر عام پر لانے کی تدبیر کر رہا ہوگا۔“

جمود کو ایک دن ٹوٹنا تھا۔ آخر سکوت میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ انسانی اعضا کے بہت بڑے تاجروڈی جان ہنٹر نے پولیس کورپورٹ دی اور پریس میڈیا کے ذریعے بیان دیا کہ کسی نامعلوم شخص نے اسے دھمکی دی ہے کہ اس کی زندگی مختصر ہو گئی ہے۔ وہ آج کل میں دنیا سے جانے والا ہے۔

استنبول سے نکلنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں جہاں بھی جا کر رہوں گا وہاں کی زمین مجھے پناہ نہیں دے گی۔ دیکھ لو کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں محفوظ ہوں۔ میں نے تمہیں چوہے کے بل سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔“
”وہ تو نکلنا ہی تھا۔ صرف مجھے ہی نہیں تمہیں بھی کھلی دنیا میں آزادی سے سانس لینا تھا۔ ڈی جان ہنٹر پیرس کے ایک مضافاتی علاقے میں ہے۔ یہ دیکھو کہ کس طرح تمہارا سراغ مل رہا ہے۔ تم اسے ہلاک کرنے کے لیے وہیں کہیں قریب ہو۔“

عابی نے کہا۔ ”تمہاری معلومات میں منٹ پرانی ہو گئی ہے۔ اب نہ تو ڈی جان ہنٹر اس علاقے میں ہے اور نہ ہی تم نے میرا سراغ لگایا ہے۔ ذرا اس کی کھوپڑی میں جھانک کر دیکھو۔“

ان نون نے فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ ہنٹر کے دماغ میں خاموشی تھی۔ اس کی سوچ کی کوئی لہر نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ زندہ تھا لیکن سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس وقت کہیں بے ہوش پڑا تھا۔
وہ فون پر غصے سے بولا۔ ”تم نے اسے بے ہوش کر دیا ہے تاکہ اس کے خیالات سے معلوم نہ کر سکوں کہ وہ کہاں ہے؟“

”اور اب وہ جہاں بھی ہوگا۔ ہوش میں آئے گا تو اس کے خیالات بڑھ کر معلوم نہیں کر سکو گے کہ میں نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یہ دعویٰ غلط ہو گیا کہ تم نے میرا سراغ لگالیا ہے۔“

”ایک بات کہہ دوں کہ مجھے ڈی جان ہنٹر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے مرتا ہے، مرجائے لیکن تم مجھے ڈھونڈ نکالنے میں ہمیشہ ناکام رہو گے۔“

”تمہیں ڈھونڈنا ضروری نہیں ہے۔ میں ایک ہی کام کرتا رہوں گا۔ جب بھی میرے مقابلے میں سوا سیر بننے آؤ گے، تمہیں ایک چھٹانک بنا دوں گا۔ پوری دنیا تمہیں ناکامی کے جوتے کھاتے دیکھتی رہے گی۔“

آبنوس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ کیا کرے؟ وہ ایک عرصے کے بعد منظر عام پر آکر عابی سے مات نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اس نے اب تک کسی میڈیا کے ذریعے اپنی آواز نہیں سنائی تھی۔ یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ ڈی جان ہنٹر کو عابی سے بچانے آ گیا ہے۔ وہ فی الحال یہی چاہتا تھا کہ نہ منظر عام پر ظاہر ہو، نہ عابی کو ہنٹر کے معاملے میں چیلنج کرے۔ موجودہ حالات کہہ رہے تھے کہ عابی کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ مقابلے

ڈی جان ہنٹر کے بیان کے مطابق اس کا ایک ہی دشمن پرنس عابی ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ بحیرانہ طریقوں سے انسانی اعضا حاصل کرنے کی سزائیں اسے جلد ہی ملیں گی اور سزا کا وقت آن پہنچا ہے۔

ڈی جان ہنٹر کا دوسرا دشمن ان نون تھا۔ اس کے دماغ کو اپنے شکنجے میں لے چکا تھا۔ اس کے کروڑوں ڈالر کے کاروبار کو اپنے کسی تابعدار کے نام کر چکا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کا محافظ بن کر رہے گا۔ پرنس عابی کو کبھی اس کے قریب پہنچنے نہیں دے گا۔

اب وہ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ان نون کو پکار رہا تھا۔ ”کہاں ہو تم؟ تم نے کہا تھا میری موت طبعی ہوگی۔ تم مجھے حرام موت مرنے نہیں دو گے۔ تم کہاں ہو؟ ایک نامعلوم شخص نے فون پر کہا ہے کہ میری زندگی مختصر ہو گئی ہے۔ مجھے آج کل میں مار دیا جائے گا۔ میں حرام موت مرنا نہیں چاہتا اور ایسے وقت تم خود ہی پرنس عابی سے منہ چھپا رہے ہو اور میں یقین سے کہتا ہوں ابھی مجھے دھمکی دینے والا وہ نامعلوم شخص پرنس عابی ہے۔ پلیز مسٹر ان نون! تم پرنس کے اور دنیا والوں کے سامنے نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ۔ میرے دماغ میں تو آؤ۔ کیا میرے اندر رہ کر تم پرنس کو مجھ پر حملہ کرنے سے روک نہیں سکو گے؟“

آبنوس سن رہا تھا۔ اس کے دماغ میں پہنچا ہوا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ کسی نے فون پر اسے دھمکی دی تھی۔ اسے کہا تھا کہ وہ جسے چاہے مدد کے لیے بلا لے۔ یعنی دھمکی دینے والا چاہتا تھا کہ ڈی جان ہنٹر مدد کے لیے ان نون کو بلا لے۔ وہ آئے گا، دھمکی دینے والے کو چیلنج کرے گا تو پھر سے عداوت کا بازار گرم ہوگا۔

آبنوس نے ہنٹر کے دماغ سے وہ فون نمبر معلوم کیا جس کے ذریعے دھمکی دی گئی تھی پھر اس نے آواز اور لہجہ بدل کر اس نمبر پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو۔ میں ڈی جان ہنٹر بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تم ہنٹر نہیں ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی اوقات بدل کر بولو گے۔“

”مجھے بھی یقین ہے کہ تم بھی اپنی اوقات میں نہیں ہو۔ چوہے کے بل سے نکل آؤ۔“

”تمہاری ٹیلی پیتھی کتنی کمزور ہے۔ چوہے کے بل تک آنے سے معذور ہو گئی ہے۔“

”تم بھی مجھے ڈھونڈ نہ سکے۔“
”میں تمہیں نہیں، تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ تم نے

کا مشاہدہ کرتا رہوں گا۔“

اب تک یہی دیکھا گیا تھا کہ ہزار جتن سے چھیننے والے خلاف توقع اچانک ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان صرف اپنی قبر میں جا کر ہی ہمیشہ کے لیے چھپ سکتا ہے۔

عالی کے حوالے سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے قذافی جسامت اور اپنی حرکات و سکنات سے جلد ہی پہچانا جائے گا۔ لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ جسے چاہتی ہیں اسے ہزار روپ میں بھی پہچان لیتی ہیں۔ وہ عالی کو چہرے سے نہ پہچان کر بھی اس کی شخصیت کے آگے بھڑکنا بن جاتیں۔

اور نیلماں اسے ہزار جان سے چاہنے لگی تھی۔ وہ اکثر تاریکی سے نکل کر روشنی میں آتی تھی۔ اسے دور ہی دور سے دیکھتی رہتی تھی۔ عالی اس کے باپ کی طرح جسمانی قوت رکھتا تھا۔ اس کا آئیڈیل بن گیا تھا۔ وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی لیکن ماریہ پہلے ہی اس کا دل جیت چکی تھی۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اگر وہ چاہتی تو اپنی غیر معمولی طاغوتی صلاحیتوں سے ماریہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیتی لیکن وہ حسد، جلن اور عداوت پالنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے صبر کر لیا تھا۔ اب ماریہ کی وفات کے بعد دل نے کہا۔ ”تقدیر میرے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے لیکن خطرے کا سنگل بھی دے رہی ہے۔“

خطرے کا سنگل یہی تھا کہ کوئی بھی چاہنے والی اس کی منکوحہ بن کر ازدواجی سرسری حاصل نہیں کر سکے گی۔ وہ دنیا کا پہلا محبوب، پہلا آئیڈیل ہے جو پیار سے گلے لگا کر مار ڈالتا ہے۔

پھر یہ خیال بھی تھا کہ وہ اپنے باپ اور آنکس کی طرح طاغوتی قوتوں کی حامل ہے اور شیطان کو ماننے والے عالی کے قریب جانیں پاتے ہیں۔ وہ بھی اس کے قریب جانیں پائے گی۔

ان ہی دنوں اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر اپنی ہتھیلی کا سایہ کیا پھر کہا۔ ”دو ہی طاقتیں ازل سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک روحانی قوت ہے، دوسری طاغوتی..... ایک خیر ہے دوسری شر..... اپنی پر اسرار قوتوں سے کسی کو مار ڈالو تو یہ کالا جادو ہے۔ سراسر شیطانی ہے۔ کسی پر اسرار قوت سے کسی کو زندگی دو تو یہ روحانیت ہے۔ اللہ کی رضا ہے۔ اللہ تم سے راضی ہے۔ بدی کو نیکی میں، طاغوت کو روحانیت میں بدل دو.....“ وہ بزرگ غائب ہو گئے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ

پر آ کر پھر مات کھانے والا ہے۔ وہ دنیا والوں کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ ابھی تک کہیں گم ہے اور ڈی جان ہنٹر کے موجودہ حالات سے بے خبر ہے لیکن مراد نے چھینلز کے ذریعے پوچھا۔ ”ان نون خاموش کیوں ہے؟ ڈی جان ہنٹر نے اپنا کروڑوں ڈالر کا کاروبار اس کے نام کیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اسے پرنس عالی کی سزا سے بچائے لیکن وہ خاموش کیوں ہے؟“

آنکس یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ پریس میڈیا اور ٹی وی میڈیا کے ذریعے مراد کی آواز نہیں سن رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں عالی سے غافل رہا تھا۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ڈی جان ہنٹر کو اغوا کیا ہے۔ اس کے دماغ کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے بچانے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ میں عالی کو وارننگ دیتا ہوں کہ وہ ہنٹر کو رہا کر دے۔ وہ ایک کمزور شخص کو ہلاک کر کے شہ زور نہیں کھلائے گا۔ وہ شہ زور ہے تو میرے مقابلے پر رہے۔ وہ اب تک مجھے چھو بھی نہیں سکا ہے۔ پوری دنیا نے دیکھا ہے۔ میں نے اسے پانچ مہینوں تک منہ چھپا کر رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک چھپا ہوا ہے۔ صرف اپنی آوازیں سن رہا ہے۔ کسی کو منہ نہیں دکھا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں نظر آئے گا۔ میں اسے وہاں سے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ پہلے کی طرح اس کے آنے جانے کے تمام راستے بند کر دوں گا۔“

وہ اس حد تک درست کہہ رہا تھا۔ عالی اصلی چہرے کے ساتھ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اس نے واقعی اسے مجبور کر دیا تھا۔ جب تک وہ نظر نہ آتا عالی سے برابر کا مقابلہ نہ ہوتا۔ کسی حد تک برابر کا مقابلہ اب ہو رہا تھا۔ وہ بھی ان نون کی طرح نادیدہ ہو گیا تھا۔ موجود رہ کر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ بڑی رازداری سے بڑے لمبے راستوں سے گزرتے ہوئے ارض اسلام کے محل میں آ گیا تھا۔ وہاں ہم زاد کے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے دن گزار رہا تھا۔

اس نے ہم زاد سے کہا۔ ”بابا! میں پوری دنیا گھومنے لگا تھا۔ حالات نے واپس لا کر یہاں پھینک دیا ہے لیکن میں تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ایک ہی جگہ نہیں رہوں گا۔ یہاں سے جلد ہی چلا جاؤں گا۔“

اس نے بھی ماروی کو ہاتھوں میں لے کر اسے چوم کر کہا۔ ”یہ اچھا ہے کہ مجھے یہاں آ کر اس کے ساتھ رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ بڑی پر اسرار سی لگ رہی ہے۔ میں اس

نیم روشنی نیم تاریکی میں ماروی اور نیلماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ماروی کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ نیلماں کو حوصلہ ہوا تو وہ قریب آگئی۔ اس پر ڈرا سا جھک گئی۔ کسی طرح کی نادیہ رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ماروی کے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔

یہ ایک طرح سے اس کے لیے نوید تھی کہ وہ طاغوت کے اندھیروں سے نکل آئی ہے۔ اس خاندان میں صوم و صلوة کے پابند رہنے والے تمام افراد بابا اجیری کی روحانی سرپرستی میں تھے۔ طاغوتی قوتوں کے سائے میں رہنے والے ان کے قریب نہیں جاسکتے تھے۔ انہیں چھو بھی نہیں سکتے تھے اور اس نے چھو لیا۔ بڑی عقیدت سے بڑی محبت سے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا۔ اس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھا پھر اسے چوم لیا۔ ان لمحات میں اس کے احساسات اچانک ہی رومان پرور ہو گئے۔ ماروی کو سینے سے لگا کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عابی سے آگئی ہو۔

وہ اسے دھڑکنوں سے لگائے محل سے نکل کر ابھی

تاریکی میں ٹپکنے لگی۔ سوچنے لگی۔ زندگی میں پہلی بار ایک خواب نے کہا تھا کہ وہ طاغوت کے اندھیروں سے نکل کر روحانیت کے اجالوں میں آسکتی ہے۔

وہ ایسا سوچتے وقت عجیب سی طہانیت اور نامعلوم سی روحانیت محسوس کر رہی تھی۔ شاید شیطانی بوجھ اتر رہا تھا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا۔ محسوس کر رہی تھی۔

جب نوزائندہ ماروی تاریک دنیا میں آئی تھی، تب اس نے دور سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں اور بارود کی طرح جانتی تھی کہ اس بچی کے قریب نہیں جاسکے گی۔ اب اس نے سوچا۔ میرے دل میں عداوت نہیں ہے۔ عابی کے لیے محبت ہے۔ اس کی بہن بھی میرے لیے عزیز ہے۔ مجھے اس کے قریب جانا چاہیے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر پک جھپکتے ہی محل کی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ زیب النساء گہری نیند میں تھی۔ ماروی اس کے قریب ایک چھوٹے سے بیڈ پر تھی۔ نیلماں کے آتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

خواب گاہ میں زیر و پاور کی دھیمی سی روشنی تھی۔ اس

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں



بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹاسٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
گزشتہ 30 سال سے آزمودہ

حقیقی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بد فساد خد و جیوں، مہاسوں کو بھی مٹا کر کے برقی گوارا کرتی ہے۔

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

یونانی کریم گلیسی

اپنی PIC روانہ کریں

Watsapp: 0311-5800057

Email: bdhdeva@yahoo.com

skype: devapak

0322-2916250

0300-2500026

کراچی ہوم ایجری

چنئی ڈیلوری

- | | | |
|---|---|--|
| ☐ مسطرے درخشاں سالن و عید پار | ☐ خاندان و خانہ سرائے بازار اجودھا پار | ☐ خواجہ اسٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی |
| ☐ عجیب و غریب مشورہ جنت بازار محل آباد | ☐ قدیمی چھوٹی درخشاں پکھری بازار سرگودھا | ☐ صدر میڈیکل اسٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی |
| ☐ عوامی درخشاں بازار مظفر آباد | ☐ مسلم پٹناری گورنمنٹ روڈ حافظ آباد | ☐ مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی |
| ☐ خاندان و خانہ شاہ بازار بہاول پور | ☐ حنی القیوم جنرل اسٹور بہاول پور | ☐ امراہم بن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی |
| ☐ اعلیٰ و جملک بازار وٹیکٹ لڑا پور | ☐ یو پی پٹناری اسٹور ہری کشن روڈ کنوہ | ☐ وقاص میڈیکل اسٹور اے ایف اسکوائر این 22 کراچی |
| ☐ ملت درخشاں گھٹ گھٹا | ☐ ناصر درخشاں 20 صدر لائن پٹناری صدر | ☐ قمری اسٹور جنرل اسٹور پٹناری |
| ☐ علی ہوسٹو بکری درخشاں | ☐ کلاسک ہوسٹو بکری درخشاں | ☐ یو علی درخشاں کنوہ پٹناری |

بادشاہ وی ہٹی بوٹر بازار راو پٹناری 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں

الحیب یونانی اسٹور شاپ نمبر 4 صنعت میڈین مارکیٹ، ڈیفو ہل کراچی، 021-32720328 ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264

پورے پاکستان میں گھر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈولپنگ آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔

Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

تاریک دنیا میں آگنی پھر اسے چوم کر بولی۔ ”میرا جی چاہتا ہے تم سے خوب باتیں کروں۔ وہاں تمہاری ماما کی آنکھ کھل جاتی۔ یہاں کوئی نہیں سنے گا۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔“ وہ اس پر جھک کر بولی۔ ”تم مجھ سے بول نہیں سکو گی۔ میرے دل کی باتیں سنتی رہو گی۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں کون دھڑک رہا ہے؟“

”ننھی ماروی مسکرانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم مسکرارہی ہو۔ کیا میرے دل کی بات جانتی ہو؟“ ماروی نے پلک جھپکائی۔ صاف طور سے سمجھ میں آیا کہ ہاں کہہ رہی ہے۔

نیلماں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”ہائے ماروی! کیا تم مجھ سے بول رہی ہو؟ کیا میری باتیں سمجھ کر عجیب انداز میں اشاروں سے جواب دے رہی ہو؟“

اس نے پھر ایک بار پلک جھپکائی۔ یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ دو دن کی بچی باتیں سمجھ رہی ہے اور جواب دے رہی ہے۔ اس نے فرط حیرت سے اسے دھڑکنوں سے لگا کر بھیج لیا۔ ”اوہ ماروی! میں نے سنا تھا پیدائش سے پہلے ہی تمہیں بھی عابی کی طرح عجوبہ کہا جا رہا ہے اور واقعی جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ دیکھ رہی ہوں۔ تم حیران کر رہی ہو۔ بے شک تم اپنی دنیا والوں سے الگ ہو۔ اسی لیے پیدا ہوتے ہی ہماری تاریک دنیا میں آپ ہی چلی آئی تھیں جبکہ یہاں کوئی آنہیں سکتا۔ صرف یہاں کے لوگوں کو صرف ہمیں ہی یہ قدرتی قوت حاصل ہے۔ ہم چشم زدن میں اس دنیا سے اس دنیا میں جہاں چاہتے ہیں پہنچ جاتے ہیں۔ میری ننھی سی گڑیا یہ قوت تمہیں حاصل ہے۔ تم پیدا ہوتے ہی از خود یہاں آگئی تھیں۔ اوہ ماروی! بے شک تم عجیب و غریب ہو۔“

تاریکی میں دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ نیلماں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہاری صورت میں تمہارے بھائی کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ آنہوں کی عداوت کے باعث روپوش رہتا ہے۔ اس کی آزادی ختم ہو گئی ہے اگر میں عابی کو بتا دوں کہ آنہوں یہاں تاریک دنیا میں رہتا ہے تو اس کی آزادی بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی بھاگتا اور چھپتا پھرے گا۔“

اس بات پر ننھی بہن کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اور جھک پیدا ہو گئی۔ وہ آنکھیں کھد رہی تھیں۔ ”اللہ کرے وہ دشمن میرے بھائی کی نظروں میں آجائے۔“

نیلماں نے کہا۔ ”ہم مجبور ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ تاریک دنیا کہاں ہے؟ صرف ہم ہی ناویدہ ہو کر یہاں

آتے جاتے ہیں۔ کسی کو ساتھ نہیں لاسکتے مگر ہاں۔۔۔۔۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔ ”آنہوں جب بھی روشن دنیا میں عابی کو نقصان پہنچانے آئے گا تو میں عابی کو بتا دوں گی کہ وہ کس ملک کے کس شہر کس علاقے میں چھپ کر اس پر حملہ کرنے آیا ہے۔“

اس بات پر دو دن کی بچی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ نیلماں نے فوراً ہی اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ ننھا سا ہاتھ زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ میرا نہیں بھائی کا ہاتھ ہے۔ اسے تھام لو۔ بھائی کو دشمن کی صورت دکھا دو۔“

اس ننھی بچی کے اشاروں کی زبان پیچیدہ نہیں تھی۔ نیلماں سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پہلے یہ ضروری ہے کہ تمہارے بھائی سے شناسائی ہو۔ ہمارے درمیان دوستی اور اعتماد پیدا ہو۔“

ہاں، یہ ضروری تھا۔ ان لحاظ میں ماروی نے کرشمہ دکھایا۔ اس نے چشم زدن میں جگہ بدل دی۔ اپنے محل میں آگئی۔ نیلماں بھی اس کے ساتھ آگئی لیکن وہ اپنے اور زیب النساء کے بیڈروم میں نہیں آئی تھی۔ اس دوسری خواب گاہ میں ایک صحت مند قد آور جوان آرام دہ بیڈ پر سو رہا تھا۔

نیلماں اپنی غیر معمولی صلاحیت سے کسی کو بھی بہروپ میں (پلاسٹک سرجری کے میک اپ کے باوجود) پہچان لیتی تھی۔ وہ پرنس عابد علی منگی عرف عابی تھا۔

اس کے دل کی دھڑکنیں یکثرت تیز ہو گئیں۔ وہ پہلی بار عابی کے قریب آگئی تھی اور کوئی ناویدہ رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماروی کو محبت سے چوم کر اسے بھائی کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس نے کہا تھا پہلے تمہارے بھائی سے شناسائی ہو۔ ان کے درمیان دوستی اور اعتماد پیدا ہو۔ اس کی یہ طلب پوری ہو گئی تھی۔ بہن نے اسے بھائی کے پاس پہنچا دیا تھا۔

اس وقت عابی کے سر ہانے لگے ہوئے اسپیکر سے۔۔۔ ہم تراکی آواز ابھری۔ ”عابی! اٹھو، آنکھیں کھولو۔ غضب ہو گیا ہے۔ ماروی گم ہو گئی ہے۔ اسے پورے محل میں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ فوراً آؤ۔“

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بیڈ سے اترتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہیں جا نہیں سکتی۔ کوئی دشمن محل کے اندر آ نہیں سکتا۔ میں آ رہا ہوں۔“

وہ بولتے بولتے دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ بچی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو بہن گم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بیڈ پر پہنچی

ہوئی تھی۔ اس نے دوڑتے ہوئے آکر اسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ حیرانی سے بولا۔ ”بھائی کی جان۔۔۔ تم یہاں کیسے آ گئیں؟“

”میں لائی ہوں۔“

اس نے چونک کر دیکھا۔ نیلماں ایک پردے کے پیچھے سے جھلک رہی تھی۔ اس نے تیور بدل کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”دشمن نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو اسے یہاں نہ لاتی۔“

”دشمن نہیں ہو۔ دوست اور شناسا بھی نہیں ہو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی نہیں دیکھا۔“

”پہلے اپنی بہن ماروی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پیدا ہوئی ہے تو میں بھی پیدا ہو گئی۔ میں اس کی سہیلی ہوں۔“

”وہ ذرا چپ ہوئی۔ عالی نے کہا۔“ آگے بولو۔“

”اے ماں کے بیٹے سے اٹھا کر تمہارے پاس لائی ہوں تمہارا اعتماد حاصل کرنے۔ اس سے دشمنی نہیں کر رہی ہوں۔“

”تم کون ہو۔۔۔ میری بہن میں دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟“

”میں اس کے بھائی میں بھی دلچسپی لے رہی ہوں۔ مجھے یہ دل تمہارے پاس لے آیا ہے۔“

اس نے پہلی بار نیلماں کو توجہ سے دیکھا۔ وہ حسین تھی۔ پرکشش تھی اور وہ بحر ممنوعہ سے گزر کر آیا تھا۔ آرزو میں پکارتی تھیں لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ صبر کرے اور بہتری کی طرف جانے کا انتظار کرے۔

وہ بول رہی تھی۔ ”یہ دیکھو کہ تم نے بھیس بدلا ہے۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکتا۔ میں پہچان رہی ہوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا پر اسرار علوم جانتی ہو؟“

”ہاں۔ یہ علم ہی مجھے یہاں لایا ہے۔“

”اگر دل سے آئی ہو تو اسرار کے پردے اٹھاؤ۔ کون ہو؟ اپنی ہسٹری سناؤ۔“

دروازے پر دستک سنائی دی۔ باہر سے ہم زاد نے پوچھا۔ ”تم ابھی تک کمرے میں ہو؟“

وہ فوراً پردے کے پیچھے چلی گئی۔ عالی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ ماروی یہاں ہے۔“

زیب النساء دوڑتی ہوئی ماروی کے پاس آئی پھر اسے بیڈ سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ہم زاد نے پوچھا۔ ”یہ یہاں کیسے آ گئی؟“

عالی نے جواب دینے سے پہلے سر گھما کر پردے کی

طرف دیکھا۔ اس کا ایک ذرا سا لباس جھلک رہا تھا۔ اس نے ہم زاد سے کہا۔ ”ہم ماروی کی پیدائش سے پہلے سمجھ گئے تھے کہ یہ میری طرح عجوبہ ہوگی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ وہاں سے یہاں کیسے آ گئی؟ اللہ کا شکر ہے کہ محفوظ اور سلامت ہے۔“

زیب النساء نے کہا۔ ”بے شک۔ اللہ تعالیٰ سلامتی دینے والا ہے۔ یہ عجوبہ ہے۔ آئندہ بھی ہم عجیب و غریب حالات سے گزرتے رہیں گے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ماروی کو لے کر چلے گئے۔ عالی نے دروازے کو بند کر کے وہاں سے گھوم کر دیکھا۔ وہ پردے سے باہر آ کر بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں اندھیرے کی پروردہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا سے آئی ہوں، جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ میں نے نہ بزرگوں سے سنا ہے، نہ کتابوں میں پڑھا ہے۔ یا تال میں، سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں سورج کی روشنی پہنچ نہیں پاتی۔ ہماری دنیا شاید وہیں کہیں ہے۔ ہم ہزاروں کی تعداد میں وہاں رہتے ہیں۔“

”تعب ہے۔ تم اپنی دنیا کا جغرافیہ نہیں جانتی ہو۔ کسی ست کسی راستے کے بغیر وہاں سے کیسے آئی ہو؟ واپس کیسے جاؤ گی؟“

”میں نہیں جانتی۔ تاریک دنیا کا کوئی باشندہ نہیں جانتا۔ ہمیں ایک نامعلوم سی ماورائی قوت حاصل ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں پلک جھپکتے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہزاروں میل دور پہنچ جاتے ہیں، پلک جھپکنے کے مختصر سے لمحے میں معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے گزر کر مقام مطلوب تک آئے ہیں۔“

عالی نے پوچھا۔ ”کیا وہاں کے اور بھی لوگ ہماری دنیا میں آتے ہیں؟“

اس کے جواب نے اسے چونکا دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہاں۔ ان نون وہیں سے آتا ہے۔“

عالی ایک صوفے پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ یکخت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا کرنٹ لگا ہے؟“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”تم سب سچے دین کے سچے عبادت گزار ہو۔ میں طاغوتی ماحول میں پرورش پاتی رہی ہوں۔ تمہاری محبت اور کشش مجھے سچائی کی طرف لا رہی ہے۔“

”کیا تمہاری دنیا میں شیطان کی پرستش ہوتی ہے؟ کیا ان نون شیطان کا پجاری ہے؟“

”ہاں۔ اس کا نام آبنوس ہے۔ آبنوس کے درخت کی

قریب آگئی۔ اس نے کہا۔ ”نیلماں.....! کیا تم جانتی ہو کہ میری قربت موت بن جاتی ہے؟“
وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ”ہاں۔ سنا ہے۔“
”تو پھر سوچو۔ تم میری زندگی میں آنے کے لیے اپنے باپ کی اور شیطان کے پرستاروں کی مخالفتیں مول لو گی۔ میرا دین قبول کرو گی پھر میری منکوحہ بنو گی۔ پھر کیا ہوگا.....؟ سوچو اور سمجھو۔ وہی ہوگا جو میڈیکل رپورٹ کہہ چکی ہے۔ تمہاری محبت اور قربانیاں اس رپورٹ کو بدل نہیں سکیں گی۔“

وہ بڑے عزم سے بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میں بدل دوں گی۔“

”کیسے بدل دوں گی؟“
”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حیا مانع ہے۔ میری اس بات کا یقین کرو کہ تم میری موت کا سبب کبھی نہیں بنو گے۔“
وہ اور قریب آ کر بولی۔ ”تم رو بوٹ ہو۔ کسی کو بھی پکڑ کر پڑے کی طرح چھوڑ دیتے ہو۔ میری مرضی کے بغیر مجھے چھو بھی نہیں سکو گے۔“

وہ اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”میں کہتی ہوں، مجھے چھو نہیں سکو گے۔ لو میرے دھوے کو جھٹلاؤ۔“

عابی نے ایک ذرا سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

نہ پکڑ سکا۔ حیران رہ گیا۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہو گئی تھی۔ کالج کا جسم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے وجود کے آر پار نظر آ رہا تھا۔ کلائی عابی کی کٹھی میں تھی لیکن وہ گوشت پوست کی نہیں تھی۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ”سمجھ لو کہ مجھے تم سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں پھر آؤں گی۔ ابھی جانا ضروری ہے۔“
یہ کہتے ہی وہ نادیدہ ہو گئی۔ کالج کا وجود کم ہو گیا۔

☆☆☆

مراد پیرس میں تھا اور پرنس عابد علی منگی کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس کے فون کالز کے نوڈ نمبرز سے سب ہی کو یقین ہو گیا تھا کہ پرنس عابد پیرس میں ہے۔

یہودی اکابرین اسے بار بار کہہ رہے تھے کہ پہلے کی طرح ان کی سیکورٹی میں رہے۔ ڈی جان ہنٹر کے کاروبار سے یہودیوں کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ مراد کو پرنس سمجھ کر اس سے گزارش کر رہے تھے کہ ہنٹر کو معاف کر دے۔ اسے باقی زندگی جی لینے دے۔

طرح بہت ہی سیاہ بہت ہی سخت ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جلد ہی تمہیں ہلاک کر کے تمہاری دنیا کا سب سے طاقتور حکمران بن جائے گا۔ میرے پاپا اس سے زیادہ ٹیلی پتھن کے ماہر ہیں۔ ایسے طاقتور ہیں کہ تمہاری طرح رو بوٹ کہلاتے ہیں۔ وہ جلد ہی تمہارے خلاف آبنوس کی طاقت بننے والے ہیں۔“

”تم مجھ سے عداوت رکھنے والے کی بیٹی ہو۔ محبت سے یہاں کبھی چلی آئی ہو۔ عداوت اور محبت کے درمیان رہ کر میرے ان مخالفین تک مجھے پہنچا سکو گی؟“

”یہ جانتی ہوں کہ بڑی مخالفتوں سے بڑی مشکلات سے گزرنا ہوگا۔ پاپا سے مخالفت مہنگی پڑے گی۔ آبنوس سے نمٹ لوں گی۔ تمہیں اس کا چہرہ دکھا دوں گی۔ تاریک دنیا میں نہ کوئی جا سکتا ہے، نہ ہم کسی کو وہاں لے جا سکتے ہیں۔ میں تمہیں بتا دیا کروں گی کہ وہ تم پر حملہ کرنے کے لیے کس ملک میں کس علاقے میں موجود ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”تم تو میری تمام مشکلیں آسان کر رہی ہو۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ ان نون یعنی آبنوس کون ہے اور مقابلے کے دوران میں کہاں رہتا ہے پھر تو اسے تاریک دنیا میں جا کر چھپنے کا موقع ہی نہیں دوں گا۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی میں کسی طرح اس تاریک دنیا میں نہیں جا سکوں گا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”ناممکن ہے۔ وہاں جانے کی قدرتی صلاحیت صرف ماروی کو حاصل ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“
”ہاں، یقین کرو۔ وہ پیدا ہوتے ہی ہماری دنیا میں آئی تھی۔ پتا نہیں یہ کیا مجید ہے؟ کیسے آئی تھی؟ وہاں.....

نراسرار علوم کے ماہر کہتے ہیں کہ وہ ہمارے جیسے غیر معمولی علوم کی اور عجیب و غریب صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔“

وہ خوش ہو کر بڑے جذبے سے بولا۔ ”جل جلالہ و جل شانہ میری بہن تمہاری دنیا میں جا سکتی ہے۔ وہاں اس کے بارے میں پیش گوئیاں کی جا رہی ہیں۔“

پھر اس نے نیلماں کو بڑی اپنایت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے لیے عطاء خداوندی ہو۔ میرے لیے آبنوس تک پہنچنا ناممکن سا ہو رہا تھا۔ اب تم ممکن بناتی رہو گی۔ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ وعدہ کرتا ہوں تمہاری چاہت کا جواب ہمیشہ چاہت سے دیتا رہوں گا۔“

وہ خوش سے لہرائی۔ اک ادائے ناز سے چلتی ہوئی

نے کیا نہیں کیا ہے؟ اپنے مذہب کے خلاف اس کی سخت باتوں کو برداشت کیا ہے۔ مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ یہ ہمارا کبھی نہیں ہو سکے گا۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں ہمارے پیشوائے اعظم کی یہ پیش گوئی بالکل ہی غلط ہے۔ یہ پرنس کیا ہے؟ دو کوڑی کی ایک ماڈل کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ قوم یہود کا معتبر نمائندہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم نادانی میں اپنا وقت اور اپنی دولت ضائع کرتے آرہے ہیں۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم اسے چھوڑ دینے کی بات کر رہے ہیں جبکہ وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ اس نے پچھلے پانچ ماہ سے نہ ملاقات کی نہ دور سے ہی صورت دکھائی ہے۔ وہ دشمن سے منہ چھپا رہا ہے۔ ہم سے تو نہیں چھپانا چاہیے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور اب فون پر کسی سے بولتا ہے اور سم بدل دیتا ہے۔ اس نے ڈی جان ہنٹر کو درندگی سے ہلاک کر کے جتا دیا ہے کہ وہ جب چاہے گا، یہودیوں کا لہو اچھالتا رہے گا۔“

”کیا ہم اتنے بے بس اور مجبور ہیں کہ اس کے ہاتھوں نقصانات اٹھا کر ذلتیں اٹھا کر چپ چاپ بیٹھے رہیں۔“

ایک نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”اس نے اب تک ہمارے خلاف جتنی آیتیں پڑھی ہیں ان کا جواب دینا ہوگا۔“

”جواب کیسے دیں گے؟ وہ ناقابل شکست ہے۔ کیا مشکل ہے۔ کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے۔ اس کا ہاتھ کھاتے ہی پھڑ پھڑا کر مرجاتا ہے۔“

”ہم اسے مار نہیں سکیں گے۔ اس کے لیے مسائل تو پیدا کر سکیں گے۔ اسے نہیں چھیڑیں گے۔ دور ہی دور سے اس کی زندگی کو کانٹوں کا بستر بنا سکیں گے۔“

”مگر کیسے؟ کوئی تدبیر ہے؟“

”ہاں، ایک تدبیر ہے۔ ان نون سے دوستی کریں گے۔“

”وہ مقابلے میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس نے عالی کے قدم اکھاڑ دیے ہیں۔ اسے منہ چھپا کر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ کبھی آزادی سے منظر عام پر نہیں آسکے گا۔ آئے گا تو ان نون پھر اس کے آس پاس گولیاں چلائے گا۔ دھماکے کرے گا۔ تباہی مچائے گا۔ اسے پھر بھاگنا اور منہ چھپانا ہوگا۔“

”بے شک یہ ان نون کی کامیابی ہے۔ مراد علی منگی بھی ناقابل شکست کہلاتا ہے۔ وہ بھی ان نون کے خلاف

مراد نے کہا۔ ”ڈی جان ہنٹر کا وجود خالص نہیں ہے۔ اس کی پینائی ختم ہو رہی تھی۔ اس نے کسی کو اغوا کروا کے اس کی آنکھیں حاصل کی تھیں۔ میرے ڈاکٹر نے اس کی وہ آنکھیں نکال لی ہیں۔“

کریگ ہوشن نے صدمے سے کہا۔ ”پرنس! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ ہماری یہودی تنظیم کا ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔ اس پر ظلم نہ کرو۔“

مراد نے کہا۔ ”اس پر کوئی ظلم نہیں ہوا ہے۔ میں نے چودی کا مال اس سے واپس لیا ہے۔“

”پلیز ہمیں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ اسے ہمارے حوالے کر دو۔“

”وہ ایک اسپتال میں ہے۔ اس کے گردے بھی اپنے نہیں تھے لہذا انہیں بھی نکال لیا گیا ہے۔ اس کا دل بھی اپنا نہیں تھا۔ اسے بھی اس کے سینے سے نکالنے والے تھے لیکن اس سے پہلے ہی کبخت مر گیا۔“

ہوشن نے سخت لہجے میں کہا۔ ”پرنس! آپ نے بڑی درندگی کا ثبوت دیا ہے۔“

”ٹھیک وہی درندگی ہنٹر کے ساتھ کی گئی ہے جو وہ دوسروں کے ساتھ کر چکا ہے۔ چور سے چوری کا مال واپس لینا اور اسے سزا دینا عین انصاف ہے۔“

اس واقعے کے بعد یہودیوں کے تور بدل گئے۔ وہ پرنس کو ابتدا سے اپنے دائرہ اثر میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے۔ اس یہودی ماں کے بیٹے کو کٹر یہودی بنانے کے لیے تل اییب لے جا رہے تھے لیکن یہ دیکھتے آرہے تھے کہ دین اسلام اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ اس کی ہر سانس اللہ کے نام سے آتی جاتی ہے۔ وہ بہت ہی ضدی اور خود سر تھا۔ ان اکابرین کے منہ پر قرآن مجید کی ایسی آیتیں پڑھتا تھا جو یہودیوں کو مفسد اور شر شرپند ثابت کرتی ہیں۔

وہ اکابرین سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور یہ آخری فیصلہ کر رہے تھے کہ اسے اپنے مزاج اور اپنے مذہب کے سانچے میں نہیں ڈھال سکیں گے۔ اگر وہ واقعی ان کے دجال کا خالص نمائندہ ہے اور یہودی قوم کو عروج کی سمت لے جانے آیا ہے تو وہ خود ہی اپنا موجودہ رویہ تبدیل کرے گا۔ اپنے دین سے باز آکر ان کا دین قبول کرے گا۔

کریگ ہوشن نے کہا۔ ”ہم پچھلے ایک برس سے دن رات اس کے آگے پیچھے رہتے آرہے ہیں۔ اس کی دلجوئی کے لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم

کوئی کارروائی نہیں کر رہا ہے۔ ہم پہلی بار مراد کو کمزور اور مجبور پارہے ہیں۔“

”وائی صاف نظر آ رہا ہے۔ ان نون نے ان باپ بیٹے کو روپوشی کے اندھیرے میں پھینک دیا ہے۔ وہاں سے وہ باہر آنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔“

”ہمیں ان نون سے دوستی کرنے کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ ہم ابھی اسے مخاطب کریں گے۔“ پرنس عالی اور ان نون سے رابطے کے لیے ایک چینل کو مخصوص کروایا گیا تھا۔ کریگ ہوشن نے اپنی آواز اور لہجہ بدل کر فون کے ذریعے اس چینل سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں ان نون سے مخاطب ہوں۔ اگر وہ پرنس عالی کو چوہے کے بل سے نکالنا چاہتا ہے تو مجھ سے فون پر بات کرے۔“

اس نے فون نمبر بتایا پھر وہ تمام اکابرین انتظار کرنے لگے۔ ادھر بارودا نے آبنوس سے کہا۔ ”کوئی پرنس کی روپوشی توڑنے کا بہت بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس سے بات کرو۔“

آبنوس نے کہا۔ ”پرنس کوئی چال چل رہا ہوگا۔“

”چلنے دو۔ فون پر بولو گے تو وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟ جاؤ شاید تمہارے لیے راستہ کھل رہا ہے۔“

اس نے اپنے فون پر پردہ نمبر شیئر کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ”میں ہوں ان نون۔ کیا تم جانتے ہو پرنس کہاں چھپا ہوا ہے؟“

”پہلے یقین دلاؤ کہ تم ان نون ہو۔“

”تمہارے دماغ میں آکر یقین دل رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں آیا۔ ہوشن نے سانس روک کر سوچ کی لہروں کو جھکا دیا۔

پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نادان نہیں ہوں کہ اپنا دماغ، اپنی آزادی تمہیں دے دوں۔ تم سے محتاط رہنے کے لیے میں نے پہلے ہی تمہاری عمل کے ذریعے اپنے دماغ کو مقفل کروالیا ہے۔ اس طرح ہم آقا اور غلام نہیں رہیں گے۔ برابری کی سطح پر معاملات طے کریں گے۔“

”تم کام آؤ گے تو میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔“

ابھی کام کی بات کرو، پرنس کہاں چھپا ہوا ہے؟“

ہوشن نے کہا۔ ”اپنے گھر میں ہے۔ ارض اسلام کے محل میں یا وہیں کہیں بہروپ بدل کر رہا ہے۔“

”اتنی سی عقل ہمیں بھی ہے کہ وہ اپنی مملکت میں زیادہ محفوظ رہنے کے لیے وہیں چھپا ہوگا۔ میں کئی بار اس محل کے قریب جا چکا ہوں۔ جہاں مراد کے خاندان کا ایک بھی فرد ہو

وہاں جانے میں ناکام رہتا ہوں۔ میں نے دور سے مراد کو یا اس کے ہم شکل کو اس کی وائف زیب النساء اور اس فوٹو زائدہ بچی کو دیکھا ہے۔ محل کے اندر یا باہر وہ دشمن نہیں آیا۔“

”کیسے نظر آئے گا؟ اس کا چہرہ اور حلیہ بدل چکا ہے۔ جب تمہیں اتنی عقل ہے اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنی ریاست میں ہے تو وہاں بھی وہی دھمکی دو کہ وہ خود کو ظاہر نہیں کرے گا تو تم ارض اسلام میں بم دھماکے کرو گے۔ گولیاں برسائو گے۔ وہ اپنی ریاست کے لوگوں کو کبھی بے موت مرتے نہیں دیکھے گا۔ مجبور ہو کر اپنے بل سے باہر آ جائے گا۔“

”آخری راستہ یہی ہے میں یہی کرتے والا ہوں۔“

”کب کرنے والے ہو؟ پانچ مہینے گزر چکے ہیں۔ ایسی کیا رکاوٹ ہے کہ جو دھمکی استنبول اور پیرس میں دے چکے ہو، وہ ارض اسلام میں نہیں دے رہے ہو؟“

”تمہارے اس سوال کا جواب جلد ہی ملے گا۔ دنیا والے پہلی بار ارض اسلام میں قیامت برپا ہوتے دیکھیں گے۔“

ان نون فون کا رابطہ ختم کر کے اپنی دنیا کی تاریکی میں آیا۔ بارودا اپنی بیٹی نیلماں کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔ آبنوس نے پوچھا۔ ”کیا میں آسکتا ہوں؟“

بارودا نے کہا۔ ”آبھی سکتے ہو، کھا بھی سکتے ہو اور فون پر ہونے والی باتیں بھی بتا سکتے ہو۔“

وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک پلیٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ عالی اپنے محل میں چھپا ہوا ہے۔“

بارودا نے کہا۔ ”یہ تو ہم بھی سمجھ رہے ہیں۔“

”وہ کہہ رہا ہے، جب ہم سمجھ رہے ہیں تو وہی دھمکی کیوں نہیں دے رہے ہیں جو استنبول میں پہلی بار دی گئی تھی اور تب سے وہ منہ چھپا رہا ہے۔ یہ درست ہے۔ ہم دھماکے کریں گے تو وہ محل سے ضرور برآمد ہوگا۔“

نیلماں نے کہا۔ ”ارض اسلام ان کا مضبوط قلعہ ہے۔ آبنوس! تمہیں وہاں بھی ناکامی ہوگی۔“

بارودا نے کہا۔ ”کوئی مضبوط قلعہ نہیں ہے۔ ٹیلی بیسی کے دھماکے سے وہ دھنکی ہوئی روکی کی طرح اڑ جائے گا۔ کاہن کی پیش گوئی نے آبنوس کو روک رکھا ہے۔“

”پاپا! کاہن کیا کہتا ہے؟“

”وہ کہتا ہے، ریاست ارض اسلام میں ناکامی ہوگی۔ آبنوس کو ادھر نہیں جانا چاہیے۔ یہ کسی مصیبت میں پڑ سکتا ہے۔“

آبنوس نے کہا۔ ”میں نہیں مانتا کہ مجھ پر کوئی مصیبت

بارہ بجے شاہی محل کے اندر اور باہر موت کے دھماکے ہوں گے۔ اس اطراف میں معصوم اور بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ وہاں کا حکمران مراد علی منگلی اپنی رعایا کے جان و مال کا محافظ ہے۔ آج دنیا دیکھے گی کہ وہ صرف اپنے بیٹے کا محافظ ہے۔ اسے چھپائے رکھنے کے لیے اپنی وفادار رعایا کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ پہلے بم دھماکوں کے بعد بھی عالی سزا پانے کے لیے منظر عام پر نہیں آئے گا تو اس ریاست کی ہر گلی کوچے میں ہر گھر میں موت رقص کرے گی۔ ہر پندرہ مٹ کے بعد وہاں کی ایک عورت ایک مرد ایک بچہ اور ایک بوڑھا مارا جائے گا۔

یہ بڑی لرزہ خیز دھمکیاں تھیں۔ مراد ہم زاد اور عالی اپنی ریاست کے ہر گھر میں جا کر آنکھوں کو قاتلانہ حملوں سے نہیں روک سکتے تھے۔ وہ اب تک کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور ٹیلی پیٹھی کا ہتھیار بھی ناویدہ ہوتا ہے۔ جو عداوت نظر نہ آئے اس سے کیسے مقابلہ کیا جاسکتا تھا؟

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک کہہ رہے تھے کہ ریاست ارض اسلام پر پہلی بار کامیاب حملے ہوں گے۔ مراد ہمیشہ کی طرح منہ توڑ جواب نہیں دے سکے گا۔ جرائم کی دنیا میں وہ بھی زیر زمین نہیں ہوا تھا۔ اس سے شکست کھانے والے تمام خطرناک مجرم خوش تھے کہ ایک ٹیلی پیٹھی کا ہتھیار اس کی مضبوط ریاست کو کمزور اور کھوکھلا کرنے والا تھا۔

اور یہودیوں کی تو جیسے صدیوں کی دعائیں قبول ہو رہی تھیں۔ ایک مستحکم اسلامی جمہوری ریاست پر ایسا حملہ ہونے والا تھا جسے مراد ہم زاد اور عالی اپنی ذہانت سے اور غیر معمولی صلاحیتوں سے روک نہیں سکتے تھے۔

وہ سب ہی منتظر تھے۔ رات کے بارہ بجے تک مراد کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچنے والا تھا۔ اس کا بیٹا اس کا جاں نشین عابد علی منگلی عوام کی سلامتی کے لیے ان نون سے سزائے موت پانے والا تھا۔

آنکھیں بہت محتاط تھا۔ وہ مقررہ وقت سے بہت پہلے ریاست میں آکر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ محل کے اندر ہم زاد زیب النساء ماروی اور عالی تھے۔ ادھر ناویدہ رکاوٹوں کے باعث نہیں جاسکتا تھا۔ محل کے باہر مسلح آرمی تھی۔ پہلے اس نے آرمی کے ایک افسر کے دماغ کو جکڑ لیا۔ اسے اپنا تابع بنا لیا۔ اسلحے کے اسٹور میں بڑی قوت کے ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ایسی جگہ نصب کرانا چاہتا تھا جہاں بلاسٹنگ کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ آرمی کے جوان مارے جائیں۔

آئے گی۔ اس اندھیرے سے باہر کی دنیا میں کسی نے میری صورت نہیں دیکھی ہے اور نہ دیکھ سکے گا۔ میں ہمیشہ کی طرح وہاں جا کر ان کی کھوپڑیوں میں گھس کر زلزلے پیدا کرتا رہوں گا تو عالی اس کا باپ اور ریاست کی فوج سب ہی بے بسی سے گھٹنے فیک دیں گے۔

بارود اٹھانے سر ہلا کر کہا۔ ”کاہن کی پیش گوئی درست ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ تم پر مصیبت کیسے آئے گی، جبکہ تم دشمن کو نظر نہیں آؤ گے۔“

”یہی تو میں کہتا ہوں۔ وہاں جاؤں گا۔ دو چار کو اپنا تابعدار بناؤں گا۔ ان کے ذریعے محل میں دھماکے کرواؤں گا۔ اگر مصیبتیں آئیں گی تو ان تابعداروں پر۔ میرا کیا جائے گا۔ میں تو مکھن کے بال کی طرح نکل آؤں گا۔“

مقدور کی ہیرا پھیری انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی سب سے قابل اعتماد ٹیلیماں مصیبت کا ذریعہ بن کر کاہن کی پیش گوئی کو درست کر دے گی۔

بارود اٹھانے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آزمائش کے طور پر محل کے اندر یا باہر ایک دھماکا کرو۔ وہاں پہلی بار ان کی قریبی ہستیاں ماری جائیں گی تو عالی اور اس کا باپ بوکھلا جائیں گے۔ ہم ان کا رد عمل دیکھیں گے کہ کیا کرتے ہیں۔ ایک بات تو طے ہے کہ وہ تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”بے شک۔ میری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہاں ایک واردات ہوئی جائے۔“

”اچانک حملہ نہ کرو۔ پہلے اسے لاکارڈ وارننگ دوئیے دہشت طاری کرو کہ اس کی ریاست کا امن و امان غارت ہونے والا ہے۔ مراد اپنی ریاست کے عوام کی سلامتی چاہتا ہے تو بیٹے کو پردے سے باہر لے آئے۔“

وہ کھارہے تھے، بول رہے تھے اور نئے منصوبے کے ہر پہلو پر بحث کر رہے تھے۔ ٹیلیماں سن رہی تھی۔ کبھی کبھی سر ہلا کر منصوبے کی تائید کر رہی تھی۔

دوسرے دن آنکھوں نے خاص چینل کے ذریعے اعلان کیا۔ ”لوگو! قیامت آرہی ہے۔ ریاست ارض اسلام میں قیامت آرہی ہے۔ پرنس عالی وہاں کے شاہی محل میں چھپا ہوا ہے۔ سنو کہ میں عدالت ہوں، میں ہی منصف ہوں۔ پرنس عابد علی منگلی کے خلاف فیصلہ سنانا ہوں۔ وہ کارمن ڈی مورا اور ڈی جان ہنٹر کا قاتل ہے۔ لہذا اسے سزائے موت دی جا رہی ہے۔ اگر وہ بارہ گھنٹے کے اندر سزا پانے کے لیے منظر عام پر نہیں آئے گا تو آج رات ٹھیک

کر رہے تھے۔ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس نے گردن دیو بچی ہے؟ اور کون ہوگا؟
دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا ہے۔ وہ عالی کے شکنجے میں ہے۔ گردن کی ہڈی ایسے دکھ رہی تھی جیسے اب تب میں ٹوٹنے والی ہو۔

وہ تکلیف کی شدت سے بول نہیں پارہا تھا۔ اس نے ایک انگلی سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا۔ عالی نے گرفت ڈراڈھیلی کردی پھر دور کھڑے ہوئے ایک افسر کو حکم دیا۔ ”اسپیشل چینل کو کال کرو ہری اب.....“

رپورٹر اور کیمرا مین وغیرہ محل کے احاطے میں ہمہ وقت رہتے تھے۔ وہ دوڑے چلے آئے۔ ایک ذرا وقت ضائع کیے بغیر لائیو پروگرام شروع ہو گیا۔ عالی اسپیشل چینل کی اسکرین پر آنکس کے ساتھ دکھائی دینے لگا۔

دیکھنے والوں کو ایک صحت مند قد آور جوان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک جوان مولوی کی گردن دیو بچ رکھی تھی۔ عالی نے کہا۔ ”میں عابد علی منگی ولد مراد علی منگی ہوں۔ یہ چہرہ جو دکھائی دے رہا ہے، یہ میک اپ زدہ ہے۔ دشمن نے مجھے بھیس بدل کر رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ناظرین تھوڑی دیر بعد میرا پیدائشی چہرہ دیکھ سکیں گے۔ ان لمحات میں مجھے دیکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ ابھی اپنے اپنے فون کے ذریعے اپنوں اور بیگانوں تک اس لائیو پروگرام کی خبر پہنچائیں۔ ابھی کچھ دیر میں بہت اہم انکشاف ہونے والا ہے۔“

ریاست ارض اسلام کے سرکاری ذرائع سے سپر پاور اور دوسرے تمام ممالک تک یہ خبر پہنچ رہی تھی۔ تمام یہودی تنظیموں نے بھی اسپیشل چینل کو آن کر دیا تھا۔ اسکرین پر بریکنگ نیوز کی تحریر کہہ رہی تھی۔ ”یہ پرنس عابد علی منگی ہیں۔ انہوں نے کس کی گردن دیو بچ رکھی ہے یہ ابھی معلوم ہوگا۔“ پھر عالی نے آنکس سے کہا۔ ”بولو تم کون ہو؟ اور میں نے تمہاری گردن کو کیوں دیو بچ رکھا ہے؟“

وہ ہچکچانے لگا۔ دنیا والوں سے بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سے کسی طرح فرار ہونا چاہتا تھا۔ عالی نے اپنی گرفت سخت کی تو وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔

عالی نے کہا۔ ”نہیں بولو گے تو ایک منٹ کے اندر گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔“

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”بول رہا ہوں میری گردن تو چھوڑو۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا۔“

اس نے گرفت ڈھیلی کی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر

وہ اپنے تابعدار کے دماغ سے کھینچنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ محل سے کچھ فاصلے پر ایک اوپن ریسٹورنٹ کی میز کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بد قسمتی سے کوئی پہچان بھی لیتا، کوئی خطرہ پیش آتا تو وہ پلٹک جھپکتے میں وہاں سے تاریک دنیا میں چلا آتا۔ اسے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ اب تک ایسی محفوظ زندگی گزار رہا تھا کہ کبھی خوف یا اندیشے اسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ وہ مطمئن تھا کہ ابھی نہ موت آئے گی نہ شامت آئے گی۔

اور شامت پیچھے لگی تھی۔ نیلماں تاریک دنیا سے اس کا پیچھا کرتی ہوئی آئی تھی۔ ٹرانسپیرنٹ ہو کر ایک جگہ چھپی ہوئی تھی پھر وہاں سے محل کے اندر عالی کے پاس آگئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آنکس جب بھی چینل کرنے اور مقابلہ کرنے تاریکی سے نکل کر آئے گا اور جہاں وہ مصروف رہے گا، وہاں عالی کو اس کے سامنے پہنچا دے گی۔

اس نے کہا۔ ”میں وعدے کے مطابق آگئی ہوں۔ محل سے کچھ فاصلے پر ایک اوپن ریسٹورنٹ ہے۔ تمہارا نادیدہ رہنے والا دشمن وہاں موجود ہے۔ فوراً چلو۔ میں اس کی صورت دکھاؤں گی۔“

وہ اسی وقت محل سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا ریسٹورنٹ کی سمت جانے لگا۔ نیلماں عبا اور نقاب میں تھی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”یاد رکھو اس کے پاس پہنچتے ہی اسے جکڑ کر نہیں رکھو گے تو وہ خطرے کو بھانپ کر اسی لمحے میں نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”میں ہاتھ آنے والے کو پھسلے نہیں دوں گا۔“

اس نے ریسٹورنٹ میں پہنچ کر پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ؟“ نیلماں نے کہا۔ ”وہ دیکھو جس میز پر گلہ ان میں سورج مکھی کے پھول ہیں۔ وہاں وہ کبخت ایک مسلمان مولوی کے بھیس میں بیٹھا ہے۔“

عالی نے اسے دیکھا۔ وہ زیر لب تسبیح پڑھ رہا تھا۔ حقیقتاً خیال خوانی کے ذریعے آرمی کے افسر کو اپنا تابعدار بنارہا تھا۔ عالی نے دبے قدموں پیچھے سے آکر اس کی گردن دیو بچ لی۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ دوسری بار کراہنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔ اس نے فوراً ہی غائب ہو کر تاریکی میں جانا چاہا لیکن نہ جاسکا۔ اس کا وجود آزاد ہوتا تو پلٹک جھپکتے ہی نجات پالیتا۔

اس کے پھیلے ہوئے دیدے دائیں بائیں حرکت

بولاً۔ ”میں..... میں ان لون ہوں۔“

تمام سننے والے دنگ رہ گئے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے پرنس کو مزائے موت دے گا، وہ پرنس کی گرفت میں بے دست و پا بیٹھا ہوا تھا۔ بل بھی نہیں سکتا تھا۔

عالی نے اس کی گردن کو ذرا جھٹکا دے کر کہا۔ ”کم آن..... اپنی ہسٹری سناؤ۔“

وہ سنانے لگا۔ لوگوں کو یہ معلوم ہونے لگا کہ اس دنیا میں ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ وہ ایک تاریک دنیا کا باشندہ ہے۔ اس کا نام آبنوس ہے۔ وہ بول رہا تھا کہ اس تاریکی میں اور بے شمار لوگ غیر معمولی اور عجیب و غریب صلاحیتوں کے حامل ہیں اور یہ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی تاریک دنیا کا جغرافیہ نہیں جانتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کہاں رہتے ہیں؟ انہیں وہاں تک جانے اور وہاں سے آنے کی ماورائی یا طلسمی قوت حاصل ہے۔ وہ پلک جھپکتے ہی ادھر سے ادھر پہنچ جاتے ہیں۔

عالی نے پوچھا۔ ”تم ٹیلی پیتھی کے خطرناک ہتھیار سے خود کو کیوں نہیں بچا رہے ہو؟“

”تمہاری آہنی گرفت نے میرے دماغ کو کمزور کر دیا ہے۔ میں اس وقت خیال خوانی کے قابل نہیں ہوں۔“

”تم اپنی طلسمی یا ماورائی قوت سے پلک جھپکتے ہی یہاں سے فرار ہو کر اپنی دنیا میں جاسکتے ہو..... پھر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟“

”تم نے مجھے جکڑ لیا ہے۔ جیسے ہی چھوڑ دوں گے، یہاں سے گم ہو جاؤں گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ تم ہماری ریاست کے امن و امان کو غارت کرنے آئے تھے۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد یہاں کی ایک عورت، ایک مرد، ایک بچہ اور ایک بوڑھے کو قتل کرنے والے تھے۔ خدا نخواستہ میں تمہارے شکنجے میں آجاتا تو تم مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ تم بھی یہاں سے زندہ اپنی تاریک دنیا میں نہیں جاؤ گے۔“

وہ چیخ کر بولا۔ ”نہیں“ میں مرنا نہیں چاہتا۔ بارودا.....! میری مدد کر۔ مجھے بچالے..... میں تیرا چیلہ ہوں، تیرا غلام بن کر رہوں گا۔“

بارودا اسے ایک فی وی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ عالی اور مراد سے لکھنا نہیں چاہتا تھا اور آبنوس کی ہلاکت بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اچانک ہی تاریکی سے نکل کر اس ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے عالی کے منہ پر

ایک گھونسا جما دیا۔ وہ غفلت میں مار کھا کر دو قدم پیچھے گیا پھر سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے سینے پر لات پڑی۔ وہ پھر لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔

اتنی مہلت کافی تھی۔ آبنوس اس کے شکنجے سے نکلنے ہی ناظرین کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بارودا بھی تاریک دنیا میں آ گیا۔ وہ شہ زور کھڑا نہ رہ سکا۔ بیڈ پر گر پڑا۔ اس نے جس پاؤں سے عالی کے سینے پر کک ماری تھی اس پاؤں کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں اور گھونسا مارنے والی انگلیاں بھی تکلیف کی شدت سے بے جان ہو رہی تھیں۔

وہ تاریک دنیا کا روبرو تھا۔ یہ دعویٰ تھا کہ اس کے جیسا جسمانی قوت رکھنے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اب تکلیف سے بے حال ہو کر سوچ رہا تھا کہ عالی کیسا طاقت ور ہوگا۔ اس نے جوابی حملہ نہیں کیا تھا۔ صرف اس کے بدن سے نکلنے کے نتیجے میں اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں عارضی طور پر ناکارہ ہو گیا تھا۔

نیلماں ریسٹورنٹ میں دوپہر چھی ہوئی تھی۔ اپنے باپ کو اچانک وہاں دیکھ کر چونک گئی تھی۔ وہ خلاف توقع آندھنی کی طرح آیا تھا اور آبنوس کو رہائی دلا کر طوفان کی طرح گزر گیا تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے تاریکی میں آئی۔ باپ نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”لعلت ہے اس پر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا فولاد کا بنا ہوا ہوگا۔“

نیلماں نے درو کو مارنے والی دوا باپ کو کھلائی۔ آبنوس بستر پر اوندھا پڑا ہوا تکلیف سے کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”گردن کی ہڈی دکھ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹوٹ رہی ہے۔ کاہن کو بلاؤ۔ وہ طاغوتی مشنروں سے آرام پہنچائے گا۔“

نیلماں ان دونوں کا حشر دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے چشم تصور میں عالی کو دیکھا۔ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا پھر اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ محل کے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ فی وی کیمرے اور صدا بندی جاری تھی۔ ایک عالم اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ سب نے دیکھا ہے جو بھی ہوا ہے، وہ اچانک میری لاعلمی میں ہوا ہے۔ وہ ناگہانی بلا کی طرح آیا اور آبنوس کو لے گیا۔ کوئی بات نہیں، دوران جنگ بازیاں پلٹ جایا کرتی ہیں۔ آج مجھے اور ناظرین کو ان کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ ہم کسی تاریک دنیا کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے لوگ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ اب تک ان لون کہلانے

علاقوں میں اس پر حملے کئے۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر بھی رہے لیکن اسے شبہ تک نہیں ہوا کہ تم ہی ٹیلی پیٹھی جاننے والے دشمن ہو۔“

وہ بولا۔ ”یہی تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے کہ اس نے اپنی ریاست ارض اسلام میں مجھے کیسے پہچان لیا؟“

”ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ارض اسلام میں کوئی ایسا روحانی عمل کیا ہے کہ کوئی بھی ان سے دشمنی کرنے میں وہاں ناکام ہو جاتا ہے۔“

آبنوس نے سر ہلا کر کہا۔ ”سپر پاور اور دوسرے طاقت ور ممالک کبھی اس ننھی سی ریاست کو اپنے زیر اثر نہ لاسکے۔ وہاں چالباز اور خطرناک مجرم بھی کوئی واردات کبھی نہ کر سکے۔ ایسا کرنے والوں تک وہ جانے کیسے پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ وہ میری گردن توڑنے پہنچ گیا تھا۔“

”اوہ مائی ماسٹر بارودا.....! ان کی روحانی قوتیں بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ان پہاڑوں کو کاٹنے کے لیے خوب سوچ سمجھ کر پلاننگ کرنی ہوگی۔“

نیلماں کبھی ان کے پاس بیٹھ کر کبھی چھپ کر ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ گہرستی کے کام سے ان کے کمرے میں آئی تو بارودا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر آبنوس سے کہا۔ ”ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا جہان کی حسینائیں پرنس کی آرزو میں پاگل ہو رہی ہیں۔“

اس نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ”ابھی ابھی ایک آئیڈیا دماغ میں آیا ہے۔ اس پرنس کو حسیناؤں کے جال میں پھانسا جائے۔ عورت کی قربت مرد کی ذہانت کو کچرا کر دیتی ہے۔ ہمیں پرنس کی جسمانی طاقت کو ہی نہیں اس کی دماغی صلاحیتوں کو بھی کھوکھلا کرنا ہوگا۔“

”تم بڑی دانائی کی بات کہہ رہے ہو۔ دماغی قوت سے ہی جسم حرکت کرتا ہے۔ دماغ بیمار ہو جائے تو جسمانی قوت بستر پر گر جاتی ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

وہ بولا۔ ”اگر ہم اپنی دنیا کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والی حسیناؤں کو عابی کے پیچھے لگا دیں تو وہ مسلمان بن کر خود کو روحانی صلاحیتوں کی حامل ثابت کر کے اس کا دل، اس کا اعتماد حاصل کریں گی اور ہماری پلاننگ کے مطابق اس پہاڑ کو چیونٹی بنا دیں گی۔“

نیلماں وہاں سے چائے کی پیالیاں اٹھا کر جانے لگی۔ آبنوس نے کہا۔ ”نیلماں حسن و جمال میں یکتا ہے۔ یہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اسے دم ہلانے والا کتا بنا دے گی۔“

والا آبنوس ہماری دنیا میں آیا تھا۔ آئندہ اور بھی آئیں گے بلائیں منتظر ہیں۔ وہ ہم پر مسلط ہو کر ہماری دنیا پر حکومت کرنا چاہیں گے۔ انہوں نے یہاں آ کر سب سے پہلے مجھے ٹارگٹ بنایا ہے۔ وہ اپنے عزائم کے راستے میں مجھے سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھ سے پسپا ہوتے آرہے ہیں۔ آج انہیں بہت ہی تلخ تجربہ ہوا ہے۔ وہ ریاست ارض اسلام میں قدم رکھتے ہی بے نقاب ہو گئے ہیں۔ ہم سب نے آبنوس کو اور اس کے مددگار کو چروں سے پہچان لیا ہے۔ آئندہ انہیں ہماری دنیا میں بھیس بدل کر آنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عزت، فتح و نصرت عطا فرما رہا ہے۔ وہ آئندہ بھی ارض اسلام میں قدم رکھیں گے تو ان کی گردنیں ہمارے شکنجے میں آجایا کریں گی۔ وہ پھر آئیں پھر آزمائیں..... موت ان کی منتظر ہے۔“

پوری دنیا میں عابد علی منگی کی دھوم مچ گئی۔ اندھیروں سے پیدا ہونے والی طاغوتی قوتیں ایک چھوٹی سی ریاست میں قیامت برپا کرنے والی تھیں۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ صرف عابد علی منگی نے اچانک ہی طاغوت کی گردن دبوچ کر پہلے سے زیادہ اپنی طاقت کا لوہا منوالیا تھا۔

بعض کینہ اور عداوت رکھنے والے دشمن بھی آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے اسے سلام کر رہے تھے۔ وہ سب پریشان ہو گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ تاریک پر اسرار قوتیں پھر حملہ کریں گی۔ وہ دہشت زدہ کر دینے والے طاغوتی حربے جانتے تھے۔ وہ اپنے ناپاک عزائم سے باز آنے والے نہیں تھے۔ آئندہ نامعلوم مدت تک عذاب بن کر رہنے والے تھے۔

عداوتوں اور عداوتوں کی مسموم ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسے وقت ہر سمت سے عشق و محبت کے مہکتے ہوئے تازہ ہوا کے جھوکے بھی آنے لگے۔ دل سے مجبور ہونے والی لڑکیاں پہلے ہی اس کی آرزو میں پاگل ہو رہی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جانتی تھی کہ عالی سے دوستی کرنے اور اس کا دل جیتنے کی خوش نصیبی نیلماں کو حاصل ہو گئی ہے اور کیوں نہ حاصل ہوتی؟ اسی نے آبنوس کو بے نقاب کیا تھا اور خون خرابے کے بغیر اسے بڑی آسانی سے اس کی گردن تک پہنچایا تھا۔ اس کا باپ بارودا اور آبنوس حیران تھے کہ عالی نے اسے کیسے پہچان لیا تھا جبکہ کبھی اس کے سائے کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

بارودا نے کہا۔ ”تم نے استنبول اور پیرس میں اور کئی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

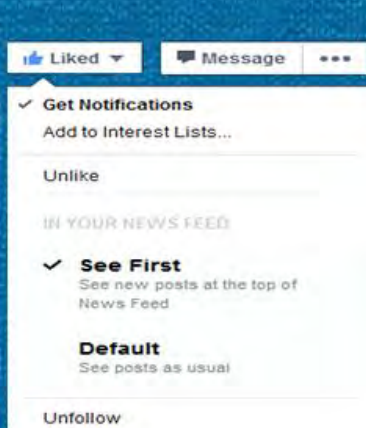
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



ہمارے کئی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے ساتھی بھی یہاں سے جائیں گے اور اس کا جینا حرام کر دیں گے۔“
”تو پھر سن لو کہ ہم مسلمان بھی روحانی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ عالی کی سلامتی کے لیے ہم بھی اس تاریک دنیا سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

پیش امام اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے جانے لگے۔ بارودا نے غصے سے کہا۔ ”جاؤ اور عالی کی دنیا میں اس کی میت اٹھانے جاؤ۔ یہ جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ اس کی زندگی مختصر ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ تم سب مارے جاؤ گے۔“

☆☆☆

بارودا اپنی پلاننگ کے مطابق عالی کو ٹریپ کرنے کے لیے لارا کو استعمال کرتا چاہتا تھا لیکن وہ حسن و شباب کا آتش فشاں تھی۔ بچے سے نہیں بچے کے باپ سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس کا دل مراد علی منگی پر آ گیا تھا۔

عالی جن دنوں ماریہ کے ساتھ سہاگ رات کا جشن منا رہا تھا، انہی دنوں لارا نے خوشیوں کے میلے میں مراد کو دیکھا تھا۔ وہ حماد کے بہروپ میں تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ جو اپنی شخصیت سے متاثر کر رہا ہے۔ وہ پرنس عالی کا باپ مراد علی منگی ہے۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولنے لگی، یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ ایک اچھی خاصی عمر والے سے کیوں متاثر ہو رہی ہے؟ بیٹا جس پپلس میں پہلی بار ازدواجی سرسری حاصل کرنے والا تھا۔ وہاں کے تمام حفاظتی انتظامات باپ نے سنبھال رکھے تھے۔ اس کی مصروفیات سے لارا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ پرنس کے قریبی قابل اعتماد لوگوں میں سے ہے۔ نام حماد ہے اور خاندانی رئیس ہے۔

یہ اس نے اوپر ہی اوپر معلومات حاصل کی تھیں۔ ٹیلی پیٹھی جانتی تھی۔ اس کے دماغ میں جانے کی کوشش کی تو اس نے سانس روک کر اپنے اندر آنے نہیں دیا۔ جہاں بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے اٹھ کر دور تک متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہاں کئی مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے۔ مراد نے اس بھیڑ میں اسے دیکھا لیکن اس پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈائننگ ہال میں حسین عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ مراد کی نظریں دور تک بھٹکنے کے بعد پھر لارا پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا مجھ پر شبہ ہو گیا ہے؟

شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ اس نے مراد کی توجہ کو کھینچ لیا تھا۔ وہ ٹھٹھکنے کے انداز میں مہمانوں سے

وہ دروازے پر رک کر بولی۔ ”بکواس مت کرو۔ میں کسی کو پھانسنے والی سستی لڑکی نہیں ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ پرنس بہت ہیڈنم ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ لیکن سو سوری..... میں کبھی دشمنی سے اس کے قریب نہیں جاؤں گی۔“
بارودا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تم جاؤ۔“
پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”میں اپنی بیٹی پر اس دشمن کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“

وہ کمرے سے باہر آ کر رک گئی۔ ان کی باتیں سننے لگی۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا۔ ”لارا بہت حسین ہے۔ غضب کی صحت اور کشش رکھتی ہے۔ ہماری طرح دماغوں میں گھسنا جانتی ہے۔ اگرچہ عالی کے دماغ میں نہیں جاسکے گی لیکن اس کے آس پاس رہنے والوں کے اندر جا کر حالات کو بدل سکے گی۔ پھر یہ کہ وہ جب چاہتی ہے اپنا روپ بدل لیتی ہے۔ وہ دوسری تیسری حسینہ بن کر اسے الو بناتی رہے گی۔“
نیلیاں سن رہی تھیں پھر بڑے اعتماد سے مسکراتی ہوئی وہاں سے کچن کی طرف چلی گئی۔

اس تاریک دنیا میں بھی خیر و شر کے درمیان جنگ جاری رہتی تھی۔ شیطان کے پجاری اور پیش امام اور مولوی حضرات امن و امان سے رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی کئی طرح کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں لیکن کوئی ٹیلی پیٹھی نہیں جانتا تھا۔ ویسے بارودا اور آبنوس کے مقابلے میں وہ سب پوگا کے ماہر تھے۔ ٹیلی پیٹھی کا حملہ ہوتے ہی سانس روک کر انہیں بچھا دیتے تھے۔

مسلمان بارودا کی جسمانی قوت کے آگے اکثر کمزور پڑ جاتے تھے۔ جب وہ پہلی بار عالی سے ٹکرا کر آیا تو یہ بات پھیل گئی کہ وہ پہلی بار کسی کے مقابلے میں زخمی ہو گیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کی ہڈیوں کو نقصان پہنچا ہے۔ کاہن اس کا علاج کر رہا ہے۔

پیش امام نے بارودا کے پاس آ کر کہا۔ ”آبنوس مغرور ہے۔ وہ ٹیلی پیٹھی جاننے کے غرور میں ارضی دنیا کا حکمران بننے گیا تھا۔ پرنس عالی نے اسے ذلت آمیز شکست دی ہے اور وہ پرنس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا تھا۔ تم اسے بچا کر لے آئے۔ اس کا مطلب ہے آئندہ دو ٹیلی پیٹھی جاننے والے عالی پر مسلط ہوتے رہیں گے۔ وہ اللہ کا نیک بندہ ہے۔ صوم و صلوة کا پابند ہے۔ میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ اس نمازی سے دشمنی نہ کرو۔“

بارودا نے کہا۔ ”دشمنی تو پکی ہو گئی ہے۔ میں زخمی ہو کر آیا ہوں۔ مجھے اپنے زخموں کا حساب لینا ہے۔ اب تو

باتیں کرتا ہوا اس کے پاس آیا پھر بولا۔ ”ہائے بے بی! تم بڑی دیر سے پلیٹ ہاتھ میں لیے کھل رہی ہو۔ کوئی چائینز ڈش پسند کرو گی؟“

وہ بولی۔ ”میں بے بی نہیں ہوں۔ اس وقت چوبیس برس چار مہینے اور دس دن کی ہوں۔“

”تعب ہے۔ لڑکیاں عمر چھپاتی ہیں..... کم سن اور نو خیز بن کر رہتی ہیں اور تم.....“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”میں بھی ایسی ہی ہوں۔ میں بھی عمر چھپاتی ہوں لیکن یہاں بارہ برس کے پرنس عالی کی ہم عمر بننے والی پاگل لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان سب کی دھڑکنوں کو سنو وہ کہہ رہی ہیں کہ پرنس ایک دلہن پر اکتفا نہ کرے۔ وہ بھی تو پڑی ہیں راہوں میں اور میں گری پڑی نہیں ہوں۔ ایسی نادان نہیں ہوں کہ بارہ برس کے بچے سے عشق کروں۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”واقعی تم نادان نہیں ہو۔ سستے عشقیہ جذبات کے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہو۔“

پھر وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام حماد علی ہے اور میں بارہ برس کا نہیں ہوں۔“

وہ ہنستی ہوئی مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میری طرح زندہ دل ہو۔ میں چار دنوں کی زندگی کو ہنستے بولتے گزارنے کی قائل ہوں۔“

”اکیلی ہو یا ٹیلی کے ساتھ آئی ہو؟“

لارا نے اپنے بوڑھے باپ سے تعارف کروایا۔ اس نے تاریک دنیا سے نکل کر ٹیلی پتھی کے ذریعے اپنی ایک فیملی بنائی تھی۔ وہ بوڑھے اس کے تابعدار بن کر رہتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی بیٹی پندرہ برس تک امریکا میں رہنے کے بعد آئی ہے۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تاریک دنیا سے لائف انجوائے کرنے وہاں آئی ہے۔ ان دنوں لارا کے ذہن میں کوئی عداوتی منصوبہ نہیں تھا۔ وہ دور رہ کر ان نون اور عالی کے عداوتی تماشوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اسے آبنوس (ان نون) سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس لیے عالی کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

وہ مراد کو بھی حماد کے روپ میں نہیں پہچان رہی تھی۔ بھرپور جوان تھی۔ عمر کا تقاضا تھا۔ اس لیے مراد پر دل آگیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حماد پرنس عالی کے معاملات میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معتمد خاص تھا۔ اس وقت لارا کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کبھی عالی کے خلاف محاذ آرائی ہوگی تو حماد کو بڑے پیار سے آلہ کار بناتی رہے گی۔

وہ شیطان کی پرستش کرتی آئی تھی۔ عالی کو زیر کرنے کے لیے کسی وقت بھی آبنوس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اس کی فطرت میں دوغلا پن بھرا ہوا تھا۔ اسے مسلمانوں سے نفرت تھی لیکن جوانی کی دھوپ حماد کی چھاؤں میں گزارنے کا ارادہ تھا۔

وہ مراد کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ٹیلی پتھی کے ذریعے ناکام ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بار سانس روک کر اسے بھگادیا تھا۔ ابھی دوسرے ذرائع تھے۔ اس کی دوسری پراسرار صلاحیت یہ تھی کہ وہ پلک جھپکتے ہی روپ بدل لیتی تھی۔ چہرہ اور حلیہ بدل جاتا تھا۔ لارا سے مونہ روزی یا میر یا بن جاتی تھی۔

ابھی مراد سے شناسائی ہوئی تھی۔ دیر تک ساتھ رہنے والی دوستی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب رہ کر اس کی پرسنل لائف کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مراد پیلس کے جس حصے میں تھا وہاں ایک کیٹی نام کی ملازمہ اور دو ملازم تھے۔ اس نے کیٹی کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے اپنے گھر میں بلایا۔ اسے تابعدار بنا کر حکم دیا کہ وہ اس گھر میں رہے گی، باہر نہیں نکلے گی۔

پھر اس نے قد آدم آئینے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو کیٹی بن چکی تھی۔ لارا گم ہو گئی تھی۔ اس طرح وہ ملازمہ بن کر کسی رکاوٹ کے بغیر پیلس میں آگئی۔ وہاں کیٹی کے جو فرائض تھے انہیں انجام دینے کے دوران مراد کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی مصروفیات کو دیکھتی رہی۔ وہ کبھی فون پر کسی سے بولتا تو چھپ کر سنتی تھی۔ اسے پہلے دن معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی سنگین معاملات پر بولتا ہے اور وہ زیادہ تر کوڈ ورڈز استعمال کرتا ہے۔

اکثر آبنوس کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس نے دوبار ماسٹر سے گفتگو کی تھی۔ لارا جرائم کی دنیا کے کسی بھی ماسٹر کو، سربراہ کو اور گاڈ فادر کو نہیں جانتی تھی۔ ویسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حماد مجرموں کے ذریعے آبنوس کو تلاش کر رہا ہے۔

دوسرے ہی دن ماریہ نے سہاگ کی بیج پر وفات پائی تو جیسے پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ شاید کسی دلہن کے ساتھ اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی چاہت میں پاگل رہنے والی حسینا عیس سہم گئی تھیں۔ پرنس عالی کی غیر معمولی جسمانی قوت کہہ رہی تھی کہ آئندہ جو بھی اس کی خلوت میں جائے گی، اس کا یہی انجام ہوگا۔

لارا کو عالی سے کسی طرح کا جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو اس کے باپ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سیاسی معاملات

کی طرف مائل تھا۔ ماہ نور کی وفات کے بعد نہ اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا نہ ہی کسی حسینہ کی طرف مائل ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد لارا کو شریک حیات بنانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

اس نے فون کا بٹن دبایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔
”ہیلو..... لارا! کہاں ہو؟ کیسی ہو؟“

اس نے شکایت کی۔ ”میسا منہ پھیر کر چلا جائے تو مریضہ کیسی ہوگی؟ یہ سمجھ سکتے ہو؟“

”سوری حالات ایسے تھے کہ فوراً استنبول آنا پڑا۔ تم سے رابطہ نہ کر سکا پھر ایک بار سوری۔“

”سوری نہ کہو۔ اسپتال مریض کے پاس نہیں آتا۔ مریض اسپتال میں آتا ہے۔ میں آگئی ہوں، اسی شہر میں ہوں۔“

”کیا واقعی؟ یا خدا.....! تمہیں یہاں آنے سے پہلے مجھے بتانا چاہیے تھا۔“

”کیا مجھے تمہارے پاس نہیں آنا چاہیے؟“

”صرف یہاں نہیں آتا تھا۔ حالات ایسے سنگین ہیں کہ میں روپوش رہتا ہوں۔ تم سے مل نہیں پاؤں گا۔ ان فون نے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسے یہاں سے کسی طرح نکالنا ہے۔ جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں، انہیں توڑنا ہے۔“

”وہ دل میں بولی۔“ ”مراد علی منگی تمہارے لیے کوئی مشکل، مشکل نہیں ہے۔“

پھر وہ فون پر بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے تم پرنس کی تمام مشکلات دور کر دو گے۔ میری فکر نہ کرو۔ میں یہاں برسوں رہ کر تمہارا انتظار کروں گی۔“

”تمہارا یہ پیارا یہ انتظار یہ ادائیں دل کو چھو رہی ہیں۔ مجھے بتاؤ کہاں ہو؟ عالی کے حالات سے نمٹتے ہی تم سے ملوں گا۔“

وہ مسکرانے لگی۔ وہ پوچھ رہا تھا..... کہاں ہو؟ جبکہ اس کے قریب ہی ایک چھت کے نیچے تھی۔ اس نے بات بنائی۔ ”یہ نہ پوچھو کہاں ہوں؟ بالکل تمہارے دل کے پاس ہوں۔ جس دن، جس وقت بلاؤ گے دوڑی چلی آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے انتظار کرو۔ ہم جلد ہی ملیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سم بدل کر اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ مراد وہاں ہوم منسٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ بات اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آتی کہ وہ انتظار نہیں کر رہی ہے، اس کے پاس ہی رہتی ہے۔

لارا نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مراد جیسا شہ زور اور

میں بھی بہت ہی گہرا بہت ہی بااثر شخص دکھائی دے رہا تھا۔ لارا نہیں جانتی تھی کہ مراد ہم زاد کے ذریعے سپر پاور اور کئی بڑے ممالک سے اپنے مطالبات منواتا تھا اور عالی کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی سہولتیں حاصل کرتا رہتا تھا۔ وہ سن کر حیران ہوئی تھی کہ وہ فون پر کن لوگوں سے بولتا رہتا ہے؟

پھر عالی ڈی موراکو سزائے موت دینے کے لیے استنبول گیا تو لارا نے دیکھا کہ حماد بھی دوسری فلائٹ سے وہاں چھپ کر جا رہا تھا۔ وہ ملازمہ کیٹی کے بہروپ سے نکل آئی۔ استنبول میں اس کی مصروفیات کو دیکھنے کے لیے قریب نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ وہاں اس کی کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ ایک نئے عارضی بہروپ میں وہاں پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ترکی حکومت بڑی رازداری سے حماد کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہی تھی۔

وہ ہوم منسٹر کے سرکاری محل میں مہمان خاص تھا۔ ترک حکام انتہائی رازداری سے اسے آنکس کے خلاف سہولتیں فراہم کر رہے تھے۔ لارا اس محل کی ایک ملازمہ کو بھی ٹریپ کر کے مراد کے قریب آگئی تھی۔ وہاں ان کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔ منسٹر اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار اس کا نام نہیں لے رہے تھے، اسے یورڈنز کہہ رہے تھے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ پرنس عالی کا باپ ہے اور وہ دور حاضر کے سب سے خطرناک شخص مراد علی منگی کو پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک دم سادھے بیٹھی رہی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جسے دل لگی بنا رہی تھی، وہ اب دل کو لگ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا تھا کہ حواس پر چھا رہا تھا۔ قبلی پیتھس کی لہروں کی طرح دماغ میں گھس رہا تھا اور دھڑکنوں کی طرح دل میں شور مچا رہا تھا۔

وہ دل میں عہد کر رہی تھی کہ اس سے سچا عشق کرے گی۔ اسے آہستہ آہستہ اپنے رنگ میں رنگے گی یا پھر اس کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ کچھ بھی کرے گی، پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

اس نے دور ایک کمرے میں آکر اپنا فون نکالا۔ اس میں وہ سم لگائی جس کے ذریعے اب تک تین بار اس سے رابطے میں رہی تھی اور مراد نے بڑے پیار سے باتیں کی تھیں۔

اس نے رابطہ کیا۔ مراد ہوم منسٹر سے بہت اہم باتیں کر رہا تھا۔ ایسے وقت کسی کا فون اٹینڈ نہیں کرتا تھا لیکن اسکرین پر لارا کا نام پڑھ کر بے اختیار مسکرانے لگا۔ وہ اس

نا قابل شکست مرد اچانک آکر اس کے حواس پر چھا جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ اس پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرے گی۔ ورنہ وہ دین دار دیانت دار اور ایمان دار ہے۔ طاغوت کی پرستار کو کبھی منہ نہیں لگائے گا۔

وہ ایمان والا ارادے کا پکا تھا۔ جو دل میں ٹھان لیتا تھا اسے کر دکھاتا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ میرے بیٹے نے جب ڈی مورا۔۔۔ کی موت کا فیصلہ سنا دیا ہے تو پھر اس کی موت لازمی ہے۔

آبنوس اسے بچانے کے لیے خود اس کے قریب موجود رہتا تھا۔ اسے ٹیلی پیٹھی کے مضبوط قلعے میں بند کر چکا تھا۔ مراد اور عالی ادھر جا نہیں سکتے تھے۔ ڈی مورا۔۔۔ تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے۔ ایسے وقت لارا نے دیکھا تھا۔ ترک فوج کے افسران نے مراد کے لیے سہولتیں پیدا کی تھیں۔ مراد ایک فوجی افسر کی وردی پہن کر اس حویلی میں گیا تھا جہاں ڈی مورا۔۔۔ کی حفاظت کے لیے فوج کا سخت پہرا تھا اور آبنوس کے مسلح تابعدار بھی دن رات الٹ رہتے تھے۔

مراد ایک آرمی افسر کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس نے فوج کے درمیان رہ کر ان کی نگرانی میں ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ بڑی رازداری سے مورا کو گولیوں سے اڑا دیا تھا۔ وہ ریاست ارض اسلام کا حکمران تھا۔ اس نے سیاسی چال بازی سے دو ملکوں کے باہمی تعاون سے مورا کی موت کو آسان بنا دیا تھا۔

یہ قصہ پرانا ہو گیا تھا۔ نیا قصہ یہ تھا کہ آبنوس نے ارض اسلام میں تباہی پچانے اور عالی کو رات بارہ بجے سے پہلے مار ڈالنے کا فیصلہ سنایا تھا۔ اس ریاست کے عوام۔۔۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک ایک کر کے مرنے والے تھے۔ ٹیلی پیٹھی کی تاریکی سے آنے والی اندھی موت کو وہ باپ بیٹے روک نہیں سکتے تھے۔ بیٹے عالی کی موت کا بھی یقین ہو گیا تھا۔ ایسے وقت لارا نے دیکھا کہ مراد ایک ذرا پریشان نہیں تھا۔ ایسے مطمئن تھا جیسے درپردہ دشمن سے نمٹنے کے انتظامات کر چکا ہو۔

لارا نے اس وقت مراد سے رابطہ کیا تھا۔ بیسی محبت سے اپنی پریشانی ظاہر کی تھی۔ ”حماد! مجھے پرنس سے ہمدردی ہے۔ ان بارہ بجے کیسے بچاؤ گے؟“ اس نے کہا۔ ”پرنس کو صرف اللہ بچائے گا۔“ وہ بولی۔ ”تمہارا عقیدہ ہے۔ ایسے وقت اللہ پر ہی بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن عقیدے سے اور اللہ پر بھروسہ

کرنے سے نہ دشمن ٹلے گا اور نہ موت ٹلے گی۔“ ”اللہ ایسے ہی وقت نور دیتا ہے۔ جب تاریکی چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ تم خدا کی شان دیکھو گی۔ رات بارہ بجے سے پہلے جنگ کا نقشہ بدل جائے گا۔“

پھر یہی ہوا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرعون بن کر عالی کی موت کا فیصلہ سنانے والا آبنوس اچانک بے نقاب ہو جائے گا اور عالی پوری دنیا کے سامنے اس کی گردن دبوچ لے گا۔

لارا نہیں جان سکتی تھی کہ نیلماں نے عالی کی محبت میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بھی مراد کی محبت میں ایسا کر سکتی تھی۔ باپ اور بیٹے کی زندگی میں جو محبوبائیں آئی تھیں، وہ تاریکی کی پروردہ تھیں۔ دونوں شیطان کی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں لیکن مزا جا ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

لارا جان گئی تھی کہ حماد کے پیچھے مراد ہے اور وہ اپنے بیٹے عالی کی جنگ لڑتا رہتا ہے۔ وہ اس جنگ میں حصہ لے سکتی تھی۔ مراد کی مشکلیں آسان کر سکتی تھی لیکن اس کے دل میں انسانی محبت نہیں شیطانی ضرورت تھی۔ مراد سے جو محبت تھی، وہ جسمانی اور فطری ضرورت کے مطابق تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ عالی، آبنوس سے مات کھائے۔ دونوں باپ بیٹے طاغوتی قوتوں کے سامنے جھکتے اور گرتے چلے جائیں۔ یہ سوچ تھی کہ مراد کو ساری دنیا کے مقابلے میں شہ زور رہنے دے۔ صرف اپنے شیطان کے آگے اسے جھکا تی رہے۔ وہ ٹیلی پیٹھی کے ذریعے اور اپنی پراسرار صلاحیتوں کے ذریعے ایسا کرنے والی تھی۔

وہ باپ بیٹے خطرناک طاغوتی حملوں سے فی الحال بچ گئے تھے۔ مراد کو ایک ذرا عافیت اور آسودگی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے لارا سے کہا۔ ”میرے دین میں حکم ہے کہ نامحرم سے دور رہو یا پھر نکاح کے بول پڑھا کر اسے محرم بنا لو۔“

”میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ میں بھی جلد سے جلد رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہتی ہوں۔“

”شادی کی شرط یہ ہے کہ میری شریک حیات مسلمان ہو اور صوم و صلوة کی پابند ہو۔“

”یہ ضروری نہیں ہے، اکثر مسلمان اپنے دین سے باہر لوکیوں سے شادی کرتے ہیں۔“

”میں دین سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اچھی طرح سوچو۔ خود کو بھی سمجھو کیا میرا دین قبول کرو گی؟“

پانچوں وقت نمازیں پڑھو گی؟ حجاب میں رہا کرو گی؟ وہ آزاد فضاؤں میں اڑنے پھرنے والی عبا اور نقاب

میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شیطان کی عبادت کرنے والی اللہ تعالیٰ کے آگے نہ جھک سکتی تھی۔ نہ بھی جھکنا چاہتی تھی۔

وہ بولی۔ ”پلیز انتہا پسند نہ ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان شادیاں ہوا کرتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی تمہارا دین تمہارے ساتھ، میرا دین میرے ساتھ رہا کرے گا۔“

”سوری“ شادی کے بعد پوری زندگی گزارنے کے لیے دریا کے دو کناروں اور ریل کی دو پٹریوں کی طرح نہیں رہوں گا۔“

”اوہ گاڈ.....! تم اتنی صاف گوئی سے بول رہے ہو۔ کیا مجھ سے محبت نہیں ہے؟“

”میری محبت پہلے اللہ سے پھر تم سے رہا کرے گی۔ میں تمہیں دیکھتا اور سمجھتا آ رہا ہوں۔ تم عیسائی ہو۔ عیسائی رہنا چاہتی ہو۔ اچھی بات ہے۔ تمہیں اپنے مذہب اپنے ماحول میں رہ کر ازدواجی زندگی گزارنی چاہیے۔“

”میں کوئی کٹر عیسائی نہیں ہوں۔ کبھی بھولے بھٹکے چرچ میں جایا کرتی ہوں۔ تمہارا دین ابھی قبول کر سکتی ہوں۔ جس طرح شادی کے بعد میکے سے تمہارے گھر آؤں گی، اسی طرح عیسائیت کے خانے سے نکل کر اسلام کے خانے میں آ جاؤں گی۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ کہیں بھی رہوں۔ شہر و عشرت سے آزادی سے رہوں۔ میں خواہ مخواہ بحث کر رہی تھی۔ مجھے منظور ہے۔ چلو ابھی مسلمان بناؤ..... کیسے بناتے ہیں؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”کیا میز کرسی بنانے کو کہہ رہی ہو؟ یہ صرف محبت نہیں ہے۔ صرف دل کا معاملہ نہیں ہے۔ عشق خداوندی ہے۔ اللہ دل سے گزرنے والی روح کی گہرائیوں میں ہے۔ ہمارے سجدوں کو وہاں تک پہنچانے کے لیے پاکیزگی اور عبادت کی سچائی لازمی ہے۔ تم میری ہوس میں کلمہ پڑھو گی اور مسلمان کہلانا چاہو گی تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”ایسا نہ کہو کہ میرے اندر پاکیزگی اور سچائی نہیں ہوگی۔ مجھ سے قسم لے لو۔ میں دل کی گہرائیوں سے تبدیل ہونا چاہتی ہوں۔“

”میں کیسے یقین کروں جبکہ تمام پابندیوں سے آزاد رہ کر عیش و عشرت سے زندگی گزارنا چاہتی ہو؟“

”میں تمہاری محبت میں اپنی دنیا بدل دوں گی۔ تم شادی کے بعد دیکھتے رہو گے۔ اگر میں تمہارے دینی احکامات کی پابند نہیں رہوں گی تو مجھے طلاق دے دینا۔ ہم الگ ہو جائیں گے۔“

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ”مجھے منظور ہے۔ میں تمہاری بڑی سے بڑی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کروں گا لیکن دینی فرائض کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تم دیکھو گے کہ میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ یہ بولو شادی کب ہوگی؟“

”جس دن کہو گی۔ اس سے پہلے ایک ضروری بات ہے۔ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں جو ہوں، وہ نہیں ہوں۔ جو نہیں ہوں، وہ ہوں۔“

لارا سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ”یہ کیا بول رہے ہو میں سمجھی نہیں؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میرا نام حماد نہیں ہے۔ میں ریاست ارض اسلام کا فرماں روا مراد علی منگی ہوں۔“

اس نے حیرت زدہ ہو کر چونکنے کی ایکٹنگ کی۔ شدید حیرانی سے چیخ کر بولی۔ ”نہیں..... تم..... تم مراد علی منگی؟ تم..... ایک ریاست کے فرماں روا ہو؟..... کیوں مذاق کر رہے ہو؟“

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا میری صورت ایسی نہیں ہے کہ کسی ریاست کا حکمران کہلا سکوں؟“

”تمہاری صورت تمہاری شخصیت ایسی ہے کہ ہفت اقلیم کے بادشاہ کہلاؤ۔ میں مانتی ہوں تم مذاق نہیں کر رہے ہو۔ تم مراد علی منگی ہو۔ یہ خوش خبری مجھے دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی بتا رہی ہے۔ کیا میں شادی کے بعد ریاست کی ملکہ کہلاؤں گی؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں وہاں میرا ہم شکل میرا ہم زاور ہوتا ہے۔ اس کی شریک حیات ملکہ کہلاتی ہے۔ میں ریاست سے باہر اپنے بیٹے کے پیچھے بھٹکتا رہتا ہوں۔ تم بے شک ملکہ کہلاؤ گی لیکن وہاں نہیں، میرے ساتھ رہا کرو گی۔“

”مجھے حکومت نہیں تمہاری محبت چاہیے۔ جیسا کہو گے ویسے رہوں گی۔ میری ایک بات مانو۔ شادی خوب دھوم دھام سے کریں گے۔ میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ میں نے ارض اسلام کے فرماں روا مراد علی منگی کو جیت لیا ہے۔“

”شادی دھوم دھام سے نہ ہو تب بھی پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پوری دنیا میں اس خبر کو اچھالتے رہیں گے۔ ہم عالی کی شادی کا جشن منا کر بہت سچے تجربات سے گزر چکے ہیں۔ دشمنوں کو کھل کر عداوت کا موقع مل جاتا

مجھے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مجھے صورت سے پہچانتا نہیں تھا۔ تعجب ہے کہ کیسے پہچان گیا؟“
بارودا نے کہا۔ ”یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے روحانی قوت سے پہچانا ہوگا۔“
”میں نے پیرس میں کئی بار اس پر حملے کیے۔ اس کے قریب سے گزرتا رہا، تب اس نے کیوں نہیں پہچانا تھا؟“

”یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔“
کاہن نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ تاریک دنیا کے کسی مسلمان نے مخبری کی ہے۔ جب آبنوس اس ریاست میں گیا تھا، تب اس مخبر نے عالی کے پاس جا کر نشاندہی کر دی کہ یہی آبنوس ہے۔“

”ہاں، کسی مسلمان مخبر نے یہی کیا ہے۔ ورنہ عالی مجھے قیامت تک پہچان نہ پاتا۔ ہماری تاریک دنیا میں یہ مسلمان آستین کے سانپ ہیں۔“
”ہم ثبوت کے بغیر انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ ویسے ان کی دشمنی کھل کر سامنے آرہی ہے۔ پچھلی بار پیش امام نے کہا تھا کہ وہ مسلمان بھی روحانی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اب وہ عالی کی سلامتی کے لیے تاریک دنیا سے باہر نکلیں گے۔“

بارودا نے کہا۔ ”ہمیں ان مسلمانوں سے غمنا ہوگا۔ بڑی مشکل ہے کہ زخمی ہو گئے ہیں۔ فی الحال کسی بھی پلاننگ پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ہمیں بڑے صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔“

ایسے وقت لارا وہاں آگئی۔ بارودا نے کہا۔ ”کہاں اڑتی پھر رہی ہو؟ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں بھی اپنی زندگی کی بہت اہم بات کہنے آئی ہوں۔“
”تو پھر تم پہلے کہو۔“

”نہیں۔ پہلے تم کہو پھر میں بولوں گی۔“
اس نے کہا۔ ”ہم نے عالی کو حسین عورتوں کے ذریعے پھانسنے کی پلاننگ کی ہے۔ تمہارا حسن لا جواب ہے۔ تم ٹیلی پیتھی بھی جانتی ہو۔ چشم زدن میں اپنی صورت اور شخصیت بدل دیتی ہو۔ عالی کو بڑی کامیابی سے ٹریپ کر سکوگی۔“

یہ سنتے ہی لارا نے قہقہہ لگایا۔ بارودا نے کہا۔ ”کیوں ہنس رہی ہو..... میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟“
وہ بولی۔ ”کیا یہ لطیفہ نہیں ہے کہ ایک بھرپور جوان لڑکی سے کہہ رہے ہو وہ بارہ برس کے بچے کو ٹریپ کرے۔“

ہے۔ وہ آبنوس مات کھانے کے بعد عارضی طور پر خاموش ہے۔ ہم اپنی شادی کی خوشیاں منا لیں گے تو وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے ضرور آئے گا۔ مجھے ابھی سے محتاط رہنا ہوگا۔“
لارا نے دل میں کہا۔ ”آبنوس سے میں نمٹ لوں گی۔ کاہن اور بارودا اسے میری خوشیاں برباد نہیں کرنے دیں گے۔“

وہ سوچ رہی تھی۔ مجھے تو ساری عمر ایک مسلمان شوہر سے غمنا ہوگا۔ دکھاوے کی نمازیں پڑھنی ہوں گی۔ حجاب میں رہنا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ نہیں رہے گا۔ میں لارا سے موتا روزی یا پامیلا بن کر آزادی سے کھلی فضاؤں میں اڑتی پھروں گی۔ واپس آ کر پھر پردہ نشین بن جایا کروں گی۔ مراد.....! میں پھول بن کر تمہیں خوشبو دوں گی۔ پھر جب چاہوں گی، پیروں تلے کانٹے بچھاتی چلی جاؤں گی۔ تمہارے فرشتے بھی نہیں جان سکیں گے کہ کون تم سے عداوت کر رہا ہے۔ میں تو محبت اور وفا کی مثال بن کر رہوں گی۔ اپنی طاقت اور حاضر دماغی سے دنیا کو نچانے والے اب میں تمہیں نچاؤں گی۔ جس محل سے دور رکھنا چاہتے ہو وہاں رہ کر اسی ریاست کی ملکہ بن کر دکھاؤں گی۔ اے اہرمن.....! اے آگ کے دیوتا مجھے بھتی دے۔“

☆☆☆

بارودا کو اپنی جسمانی قوت پر بڑا ناز تھا۔ اب عالی سے ٹکرانے کے بعد جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے گھونسا مارنے کے نتیجے میں انگلیاں جیسے ترخ گئی تھیں۔ لات مارنے کے باعث پاؤں کی ہڈی پر درم آگیا تھا۔ لنگڑا کر چلتا تھا۔ کاہن جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج کر رہا تھا۔

آبنوس کی گردن بڑی دیر تک عالی کے شکنجے میں رہی تھی۔ وہ فی الحال گردن ہلانے اور سر گھمانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نیک کالر پہن کر رہتا تھا تا کہ گردن سیدھی رہے اور اچانک جھٹکا نہ پہنچے۔ کاہن نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی گردن ہلانے کے قابل ہو جائے گا۔

موجودہ حالات میں وہ دونوں صاحب فراش تھے۔ اپنی تاریک دنیا سے باہر جانے کے قابل نہیں تھے۔ کاہن نے کہا۔ ”میں نے پیش گوئی کی تھی۔ آبنوس کو سمجھایا تھا کہ ریاست ارض اسلام میں نہ جائے۔ مصیبتیں نازل ہوں گی۔ کیا ہم تم بھی یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ عالی تمہیں پہچان لے گا؟“

آبنوس نے کہا۔ ”نہیں میں حیران ہوں۔ اس نے

بدن چھپا کر رکھو۔ شادی سے پہلے کسی سے محبت نہ کرو۔ کسی کی آغوش میں نہ جاؤ۔ ہمارا اہلیس اعظم جیوے ہی جیوے۔ اس نے ہمیں آزادی ہی آزادی دی ہے۔ شادی کی پابندی نہیں ہے۔ ہم کسی کے ساتھ بھی لائف انجوائے کر سکتے ہیں۔ جب چاہیں مرد بدل سکتے ہیں۔“

آنہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اس کے باوجود تم نے کبھی خود کو چھونے تک نہیں دیا۔“

”اور تم جبراً مجھے چھو بھی نہیں سکتے۔ میرے اہرمین میرے آگ کے دیوتا نے مجھے ایسی شکتی ایسی صلاحیتیں دی ہیں کہ دنیا کے تمام مردوں کو گنتی کا ناچ چلا سکتی ہوں اور اب سب سے شہ زور اور ناقابل شکست مرد کے ساتھ ناچنے والی ہوں۔“

بارودا نے کہا۔ ”میں اور آنہوس زخمی ہیں۔ کچھ دنوں تک ناکارہ رہیں گے۔ ہمارا اہرمین جو کرتا ہے، بہتری کے لیے کرتا ہے۔ اس نے ہمیں کسی مصلحت سے آف کر کے تمہیں آن کر دیا ہے۔ تم زبردست کامیابی حاصل کرتی ہوگی اس کی ریاست میں اس کے خاندان میں ٹھہرنے والی ہو۔“

لارا نے کہا۔ ”اے محترم کاہن! میرے لیے خاص پوجا کا اہتمام کرو۔ اہرمین سے التجا کرو۔ میں بھی کرتی رہوں گی کہ جلد ہی اس کے بچے کی ماں بن جاؤں۔ ایک بچہ اس کا صرف ایک بچہ میری کوکھ میں آجائے تو وہ بھی عابی کی طرح غیر معمولی اور بڑا ہوگا۔ میں طاغوتی حصار میں اس کی ایسی پرورش کروں گی کہ وہ آگے چل کر مسلمان باپ کے چھکے پھڑا دے گا۔“

کاہن بارودا اور آنہوس نے بیک زبان ہو کر کہا۔ ”اہرمین.....! اہرمین.....! کوئی نہ پائے تیری طاقت تیرا وزن۔ اہرمین.....! اہرمین.....! لارا کے عزائم تیرے عزائم ہیں۔ اک بچہ..... ہاں اک بچہ..... دین اور ایمان کے قدم اکھاڑے گا۔ اہرمین دے، اپنی سوغات دے۔ منتظر ہے لارا کا تن بدن۔ اہرمین اے اہرمین.....!“

وہ شیطان کی مناجات کر رہے تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ لارا کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ ان لمحات میں دعائیں مانگتی ہوئی مراد علی منگی کی سچ پر پختگی ہوئی تھی۔ شیطان میں بہکانے کی قوت با درجہ اتم ہے۔

”وہ مار یہ جیسی بھرپور لڑکی کو دلہن بنا چکا ہے۔ بچہ نہیں ہے۔“ وہ ذرا تن کر بولی۔ ”میں نے اس کے باپ کو پھانسا ہے۔ لہذا میرے لیے تو بچہ ہی ہے۔“

انہوں نے اسے بے یقینی سے دیکھا پھر کہا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ اس کے باپ کو پھانسا ہے؟ مراد علی منگی کو؟“

کاہن نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ ”ریاست ارض اسلام کے حکمران کو؟“

وہ بڑے فخر سے اک ادائے ناز سے چلتی ہوئی ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ یوں بدن کے للچانے والے خواہیے پیش کر کے بولی۔ ”میں ایسی مقتناطیس ہوں کہ پتھر کا دماغ اور فولاد کا کلیجہ رکھنے والے بھی کھینچے چلے آتے ہیں۔ وہ بہت ہی سخت دین دار ہے۔ کسی عورت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی حسینہ کو فون پر بھی منہ نہیں لگاتا۔ اہلیس معظم مجھ پر مہربان ہے۔ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ حسین عورتیں ہیں لیکن میرے حسن مجسم نے اثر کیا ہے اور وہ اسیر ہو گیا ہے۔“

کاہن نے کہا۔ ”جیوے ہمارا اہلیس جیوے۔ یہ تو کمال ہو گیا۔ تمہیں اس کے خاندان میں دور تک لہو کے رشتوں کے اندر پہنچنے کا راستہ مل گیا ہے۔ کیا وہ تم سے شادی کرے گا؟“

”وہ شادی کے بغیر بھی مجھے حاصل کر سکتا ہے اور میں راضی رہوں گی لیکن بہت ہی بے وقوف مسلمان ہے۔ محرم اور نامحرم کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ شادی کے بعد ہی مجھے ہاتھ لگائے گا۔“

بارودا نے کہا۔ ”تو پھر ہاتھ لگانے کے لیے جلد ہی شادی کرے گا۔“

”ہاں۔ کئی بیویوں کو کھا چکا ہے۔ آخری بیوی کے بعد ایک مدت سے بھوکا بیٹھا ہے۔ میرے پاس آنے کی جلدی ہے لیکن عجیب سر پھر مسلمان ہے۔ پہلے مجھے مسلمان بنائے گا پھر شادی کرے گا۔“

”وہ کب تمہیں مسلمان بنائے گا اور کیسے بنائے گا؟“

”کل صبح ایک عالم دین کے پاس لے جائے گا۔ آج اس نے پہلا کلمہ اور دوسرا کلمہ پڑھایا ہے تاکہ میں اچھی طرح یاد کر لوں تاکہ پہلے اسلام قبول کرتے وقت فر فر پڑھ سکوں۔“

کاہن نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اس کا دین متاثر کر رہا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ اس کے دین میں پابندیاں ہی پابندیاں ہیں۔ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھو۔ اپنا چہرہ اپنا

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

”میں نے یہی سوچا ہے سردار کہ کسی سمجھ دار عورت سے عقد ثانی کر لوں جو میرے بیٹوں کو اپنی اولاد اور میرے گھر کو اپنا گھر سمجھے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر غلط انتخاب کر بیٹھا تو بچے خوار نہ ہو جائیں۔“ تیس سالہ متوسط قد و قامت، سانولی رنگت اور کھردرے نقوش والا مبارک علی ابجھن کا شکار تھا۔ اس کی اہلیہ چھ ماہ پہلے سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے راہی عدم ہو گئی تھی۔ بستی کے بڑے بازار میں اس کا کپڑے کا خاصا چلتا کاروبار تھا۔ اس کا گھر ایک بڑے کشادہ کمرے، کچے صحن اور بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی کٹھری پر محیط تھا۔ پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں نے اسے بوکھلا رکھا تھا۔ بیوی کی وفات نے ذاتی تسکین میں بھی خلل پیدا کر دیا تھا۔ شب و روز پھلنے والے فطری تقاضوں نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ دوسری شادی اس کے لیے اب ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا جو اس کی سونی زندگی کی آرائش کے لیے اہتمام کرتا لہذا اس مسئلے کے حل کی غرض سے وہ بستی کے سردار کے پاس موجود تھا۔

”دیکھ مبارک علی! یہ عورت ذات زندگی سے بھی زیادہ بے اعتبار ہے۔ اپنی اولاد کے لیے طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہو جانے والی یہی عورت سوکن کی اولاد کے لیے جانے کیوں اتنی کٹھور ہو جاتی ہے۔ میرا مشورہ مان تو کسی ایسی عورت سے شادی کرنا جو پہلے ہی اس رتبے پر فائز ہو۔ کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے گا تو رب تیری اولاد کا بھی بھلا کرے گا۔“ سردار نے نئے تلے انداز میں کہا۔

”بات تو دل کو لگتی گر رہے ہو سردار! مگر میں ایسی عورت کہاں ڈھونڈوں اب۔“ وہ بے کلی سے بولا۔ اسے گھر بسانے کے لیے بس ایک عورت درکار تھی۔

”میری نظر میں ہے تو سہی ایک..... ملازمہ ہے میری بیوی کی۔ ایک کملی بیٹی ہے اس کی جس کی فکر میں ہلکان رہتی ہے۔ اگر تو ہاتھ تھام لے اس کا تو رب بھلی کرے گا۔“

”ٹھیک ہے سردار! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ مبارک علی کے بھاگوں تو چھینکا ٹوٹا تھا۔

”میں سکینہ کی مرضی بھی دریافت کر لیتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہوئی تو اگلے چاند کی دس تاریخ کو چار گواہ اور مولوی لے آتا۔“ مبارک الوداعی کلمات کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

خاکروب اپنی نشے سے مخمور آنکھوں میں بیزاری

بیچ لیں لیکن اہل خانہ کی سرچڑھی ملازمہ کے اہانت کی حد تک صاف کوتاہی سے، سماعتوں میں زہر گھول رہے تھے۔

”آئے ہائے، باجی جی! آپ کا گھر تو گندے جوہڑ جیسا لگنے لگا ہے اب۔ ان باباجی کو کہیں کسی ادارے میں داخل کروادیں نا۔“ ملازمہ بتاوتی ہمدردی لہجے میں سو کر بولی۔

”میں تو بارہا کہہ چکی ہوں ان سے مگر ان کے کانوں پر جوں رینگے تب نا۔“ بہو کی تفرزدہ آواز ابھری۔ ”بلواتی ہوں ابھی فیچے کو۔ دھلا دے گا بڈھے کو۔“

”باجی جی! خاکروب سے صاف کروائیں گی انہیں؟“ صاحب کو علم ہوا تو.....

”تو جاؤ خود کر دو جا کے تم۔ بڑی آئی ہمدرد۔“ وہ کڑوے لہجے میں بولی۔ ”پتا نہیں کب ختم ہو گا یہ عذاب۔“

اس کے شوہر نے واضح الفاظ میں ان کے لیے ایک کل وقتی ملازم رکھنے کی ہدایات جاری کر رکھی تھیں لیکن اسے اپنے پاس جدہ بلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً وہ منتقم مزاحی کی آخری حدیں چھونے لگی تھی اور سپانے کہتے ہیں انتقام لینے میں عورت اور ناگن میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

☆☆☆

لکشمی پور کی اس نواحی بستی میں فلک پہ چھائی گھنگھور گھٹائیں چھا جوں برس رہی تھیں۔ فضا میں رچی مٹی کی سوندھی خوشبو اور بارش کی دلفریب جلت رنگ دلوں میں بلا وجہ ہی ترنگ بیدار کر رہی تھی لیکن بستی کے انتہائی شمالی کونے میں موجود ایک گھر کے نقوش حسرت و یاس کے عالم میں بیٹھے اداس نظروں سے بارش کے قطروں کو زمین کی کوکھ میں سماتے دیکھ رہے تھے۔ باہر لڑکے بالے نیکر بزیان پہنے کاغذ کی کشتیاں اور جہاز بنا کر پانی میں چھپاک چھپاک کھیل رہے تھے۔ دس سالہ الیاس اور آٹھ سالہ وسیم برآمدے میں بچے تخت پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ان کے سبھی دوست بارہا انہیں بلانے آچکے تھے لیکن ان کی یاسیت دیکھ کر وہ پھر سے لوٹ جاتے۔ مبارک علی باورچی خانے میں سلین زدہ لکڑیوں پر آگ جلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ اس کی نظر ادھ ٹوٹی کھڑکی سے باہر بیٹھے بیٹوں پر پڑی تو اسی پل کئی ماہ سے چھایا تذبذب ختم ہو گیا اور ایک فیصلہ انتہائی آسان ہو گیا۔

☆☆☆

”کہتے تو تم ٹھیک ہو بھائی مبارک..... گھر تو ہمیشہ عورت ہی بناتی ہے۔ اب پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“ لکشمی پور کے سردار نے اپنی مونچھوں کو ٹیل دیتے ہوئے استفسار کیا۔

خطبہ نکاح کے بعد بستی کی اکلوتی مسجد کے مولانا نے مبارک علی کو علیحدگی میں نکل سے کہا۔

”تیرے کندھوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو چکی ہے مبارک! یتیموں کے حقوق میں اونچ نیچ کی بڑی سخت پکڑ ہے۔ دھیان رکھنا بس۔“

مبارک بے دلی سے ہوں، ہاں کرتا رہا اس کا ذہنی ارتکاز صرف اپنی نئی نوپلی بیوی کے وجود سے کشید ہونے والی مسرتوں اور کیف آمیز لمحات کے تصور میں مگن تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بھی نئی ماں کی آمد کی نوید سن کر بہت خوش تھے۔ اپنی حقیقی ماں کی جدائی سے پیدا ہونے والے جذباتی خلا اور گھریلو ذمہ داریوں سے چھٹکارا ان کے لیے باعث مسرت تھا۔

شادی کی اگلی صبح سکینہ نے بڑی چاہت سے سب کے لیے ناشتا بنا کر دسترخوان پر نبیلہ کو بھی لا بٹھایا جو حسب معمول ایک سہمی ہوئی ہرنی کے مانند بدکی ہوئی تھی۔ الیاس اور وسیم اپنی اس ”چھوٹی بہن“ کی آمد پر بہت خوش تھے۔ سکینہ اہل خانہ سے بڑے متوازن انداز میں پیش آرہی تھی لیکن نبیلہ سے ماں کی توجہ میں شراکت برداشت نہ ہوئی۔ اس نے سالن کا ڈونگا مبارک کو پکڑاتے دیکھ کر پوری قوت سے ہاتھ مارا۔ گرما گرم شور بے کے چھینے اڑ کر اس کی آنکھوں میں پڑے تو اس کے منہ سے بے اختیار مغلطات برآمد ہونے لگیں۔ نبیلہ اس غراہٹ سے نا آشنا تھی وہ چیختی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ سکینہ فوری طور پر اس کے پیچھے لگی۔ مبارک کی جلتی آنکھوں نے بڑی دور تک ان کا تعاقب کیا پھر وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

پوس کے مہینے کی اولین تاریخوں کا ٹھٹھرا ہوا چاند آسمان پر اپنے ہم جویوں کے ساتھ داستان گوئی میں مصروف تھا۔ بڑے کمرے سے نبیلہ کی چیخوں کی آواز نے کوٹھری میں موجود سکینہ کو ایک تڑپ میں مبتلا کر دیا۔ وہ بیٹی کے اس مزاج سے بخوبی واقف تھی اور اس کی وہاں موجودگی اب از حد ضروری تھی لیکن مبارک اسے ابھی وہاں سے رخصتی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی چیخ و پکار نے ماں کو بیوی کے فرائض فراموش کر دے اور وہ برہنہ پانچ بستہ فرش پر دوڑتی ہوئی کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ مبارک نے طیش کے عالم میں کف اڑاتے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ قمر کو اکب اپنی داستان گوئی روک کر بشر کے اس ”شر“ کو دیکھ کر ساکت رہ گئے جو اس وقت اپنی بیوی کی لمبی چوٹی کو جھٹکے دے رہا تھا۔

سموئے، میلے پچیلے ہاتھوں سے اس کے غلاظت میں لتھڑے کپڑے تبدیل کروا رہا تھا۔ جس کی ناگوار بدبو اس مختصر سے کمرے کی متعفن فضا کو مزید بوجھل بنا رہی تھی۔ لباس کی تبدیلی کے دوران جب فیچے کا جسم اس سے مس ہوتا تو ایک بے عنوان احساس اسے گھیر لیتا۔ اگلے ہی لمحے اس کی مفلوج زبان سے بے معنی سی کراہیں اور مخصوص الفاظ ادا ہونے لگے۔ ”لا..... لا..... لا۔“

وہ عرصہ دراز سے صاحب فراش تھا۔ داہنا ہاتھ اور ٹانگ مفلوج تھی۔ ضعیفی نے بائیں اعضا کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اس کی بات سمجھنا ایک دشوار ترین امر بن چکا تھا۔ اس کے مخصوص کلمات کو سبھی نے اسم الہی ”اللہ“ گردان رکھا تھا لیکن ایک بات تو طے تھی کہ اس کے ان الفاظ میں موجود کرب اور تڑپ گھر والوں میں عجیب سی بیزاری پیدا کرتی تھی اور سبھی اس سے مزید کھنچاؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ اس دن بھی صوتی اتار چڑھاؤ سے تنگ آ کر اس کی بہو نے کمرے کا دروازہ بڑبڑاتے ہوئے بند کر دیا۔

”ہو گئے شروع اپنے راگ الاپنے یہ..... خود کا تو پیٹا چلا گیا یہاں سے۔ میرے لیے یہ آزمائش چھوڑ گیا ہے۔ جانے کب چھٹکارا ملے گا۔“

ان الفاظ نے اس کے کرب کو مزید دوچند کر دیا۔

☆☆☆

سکینہ اپنی مجبوظ الحواس بیٹی کے تحفظ و علاج کی خاطر دوسری شادی کے لیے رضامند ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر موسیٰ بخار کی لپیٹ میں آ کر اسے بیوگی کی چادر عطا کر گیا تھا۔ حمید اس کا یتیم چچا زاد بھائی تھا جسے اس کے والد ہی نے بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ سکینہ کی شادی اس سے ہوتے ہی وہ تو جیسے اجل سے بغل گیر ہونے کا ہی منتظر تھا۔ نبیلہ کی ذہنی حالت موروثی بیماریوں کا شاخسانہ تھی۔ والد اور شوہر کی رحلت کے بعد پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے سکینہ کو گھروں میں کام کر کے گزر بسر کرنی پڑی لیکن اس کی اپنی قلیل تنخواہ میں بیٹی کی پرورش و علاج قطعی ناممکن تھا۔ سات سالہ نبیلہ ذہنی طور پر ہم عمر بچوں سے بہت پیچھے تھی۔ بستی کے اکلوتے حکیم سے ملنے والی مقوی دیسی ادویات بھی سکینہ کے لیے بہت مہنگی تھیں۔ بیٹی ہر وقت ماں کو نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی ورنہ چیخ پکار سے سارا گھر سر پر اٹھالیتی۔ ایسے میں ملازمت کے فرائض نبھانا ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اسے اپنے ساتھ لے بھی جاتی تو اپنے ارد گرد اجنبی چہروں کی موجودگی اسے مزید ہراساں کرتی تھی۔

میں ہی کھینٹنے میں وقت ضائع کرے گا۔“ وہ کامل خلوص سے بولی۔ ”لیکن وہاں وہ رہ لے گا اکیلا؟“

”تم قائل کرو گی اسے تو ضرور رہے گا۔ تمہاری بات مان لیتا ہے وہ۔“ سکینہ کی الیاس اور وسیم کے لیے محبت میں اسے چنداں شبہ نہ تھا۔

”اچھا، میں کر لوں گی بات اس سے..... لیکن وہ..... میں۔“ وہ متذبذب لہجے میں گویا ہوئی۔

”کیا کوئی مسئلہ ہے سکینہ..... کھل کے بات کر مجھ سے۔“ وہ آج کافی ترنگ میں تھا۔

”وہاں کسی بڑے اسپتال میں نبیلہ کو اگر دکھا لیتے ہم تو شاید کچھ بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی۔“

”ہوں! ٹھیک ہے دکھا لیں گے۔ کیوں فکر کرتی ہو؟“ وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا۔ نبیلہ کی بہتری میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا اور کوئی بشر اپنے مفاد سے بھلا چشم پوشی کرتا ہے؟ ستاروں کی بزم میں آج رات یہی... چہ میگوئیاں تھیں۔

☆☆☆

”آپ لوگوں نے بہت دیر کر دی بچی کے علاج میں۔ سات سال سے زیادہ عمر ہو چلی ہے اس کی۔ ابتدائی عمر میں ادویات استعمال کروائی جاتیں تو بہتر نتائج سامنے آسکتے تھے۔“ مقامی اسپتال کا ڈاکٹر انہیں نبیلہ کی میڈیکل رپورٹس کے متعلق اختصار سے بتا رہا تھا۔

”لیکن اب بھی تو کوئی صورت ہو گی نا۔ ڈاکٹر صاحب؟“ سکینہ کی امید نا حال تو انا تھی۔

”امید تو ہے، بالکل ہے لیکن علاج بہت طویل ہے۔“ ڈاکٹر خوش خلتی سے بولا۔

”کتنا طویل؟“ مبارک نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”کم از کم پانچ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ اسے ادویات باقاعدہ استعمال کروائیں اور نرمی سے برتاؤ کریں۔“ ڈاکٹر نے محتاط لہجے میں بتایا۔

مبارک کے منہ میں کڑواہٹ سی کھل گئی۔ ایک اُن چاہے وجود پر اتنے اخراجات کا تصور ہی اس کی تنگ دلی کو انتہائی ناگوار گزر رہا تھا لیکن چہرے پر مصنوعی بشارت کا نقاب اب بھی قائم تھا۔

☆☆☆

سکینہ اب مبارک علی کی مزید زیر بار ہو چکی تھی۔ بیٹی کی کامل شفا اس کا دیرینہ خواب تھی۔ وہ اپنی حیات میں ہی

”میں کہتا ہوں یہ نوشکی کب ختم ہوگی سکینہ؟ کب تک یہ لڑکی پونجی آزار بنی رہے گی۔ چار مہینے ہو گئے ہیں شادی کو لیکن کوئی دن ایسا نہیں جب یہ مجھے سکون لینے دے۔“

”وہ جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کرتی جی!“ سکینہ کی مامتا پر بڑی کاری ضرب لگی۔ ”آپ اس کی حالت جانتے ہیں۔“

سکینہ کا لہجہ یکدم رندہ گیا۔

”اس کا باپ بھی اسی کارن ہی مرا ہوگا۔ خود تو چلا گیا لیکن یہ عذاب میرے لیے چھوڑ گیا۔“ وہ تنفر سے اس کی چوٹی کو زوردار جھٹکے سے مروڑتے ہوئے بولا۔ ”اسے کسی پاگل خانے میں داخل کرو دو سکینہ۔ میں اب اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اگر یہ پاگل خانے گئی تو میں بھی چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ۔ مت بھولو میں نے اسی کے تحفظ کے لیے شادی کا طوق گلے میں ڈالا ہے۔“ اس کی زخمی مامتا پورے جلال میں آچکی تھی۔ مبارک نے جھنجھلاہٹ میں اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور دانت پیستا ہوا داپس ہولیا۔

☆☆☆

توازن اس کائنات کا حسن اور خیر قرار پایا گیا ہے جس کی عدم موجودگی بگاڑ اور طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ سکینہ کی ذات بھی اسی طوفان کی زد میں تھی۔ معذور بیٹی اور فرعونیت زدہ شوہر کے مابین اس کا وجود بری طرح پستا جا رہا تھا۔ مبارک کی موجودگی میں نبیلہ کی ہنگامہ آرائیاں مزید بڑھتی جا رہی تھیں تو دوسری جانب اسے دیکھ کر مبارک کی تیوریاں چڑھنے لگتی تھیں۔ شوہر سے علیحدگی کی صورت میں وہ معاشرے میں انسانی لبادوں میں ملبوس بھیڑیوں کے لیے انتہائی ترنوالہ ثابت ہوتی اور بیٹی کی پرورش و علاج کے اخراجات بھی اس کے بس کا روگ نہ تھے۔ بے حد سوچ بچار کے بعد اس نے شوہر سے التجا کرنے کی ٹھان لی قسمت بھی اس پر مہربان تھی کہ ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ آ ہی گیا۔

اس رات مبارک اپنے بڑے بیٹے الیاس کی پڑھائی کے متعلق بہت فکر مند انداز میں اسے بتانے لگا۔

”بستی میں مزید تعلیم کے مواقع نہیں ہیں میں سوچ رہا ہوں اسے شہر کے کسی اسکول میں داخل کروادوں۔ خود تو پڑھ نہ سکا اولاد کو تو بہتر مستقبل مل جائے گا۔“ پھر اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”تم کیا کہتی ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہاں رہ کر وہ گلی محلوں

اسے محفوظ مستقبل دے دینا چاہتی تھی لیکن پھر شوہر کے ایک مطالبے نے اسے نئے امتحان میں ڈال دیا۔
”بس اب مزید برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔ اسے کوٹھری میں منتقل کر دو تو بہتر ہوگا۔“ اس نے بے رخی سے بیوی سے کہا۔

”کوٹھری میں کیسے رہے گی وہ بھلا؟ اللہ کے واسطے کچھ تو خیال کیجیے۔“

”خیال ہی تو کر رہا ہوں سکینہ بی بی اس کا..... اور اللہ ہی کے واسطے کر رہا ہوں..... لیکن میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں تم پر؟“ وہ شاطرانہ انداز میں اس کے گرد جال بچھا رہا تھا۔

”بالکل ہیں آپ کے حقوق..... میں کب منکر ہوں۔ میں نے کب پورے نہیں کیے آپ کے حقوق؟“ سکینہ کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو چکی تھی۔

”بس بس! زیادہ ٹسوے مت بہا۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ بیٹی کی ایک پکار تجھے سب کچھ بھلا دیتی ہے۔“
”مگر آپ کی اولاد اور گھر کو تو بھی نظر انداز نہیں کیا میں نے..... پھر بھی آپ مجھ سے راضی نہیں۔“

”میں راضی تب ہوں گا سکینہ جب تو مجھے بیٹی = ”فوقیت“ دے گی۔ میں نے صاف بتا دیا ہے تجھے۔ منظور ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ خود ہی کرواتی پھرنا علاج اس کا۔“ وہ سختی لہجے میں کہہ کر باہر چلا گیا اور سکینہ موت سے بدتر سختی میں جکڑی گئی وہیں بیٹھی رہ گئی۔

نبیلہ کے بہتر مستقبل کے لیے سکینہ نے اسے کوٹھری میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مبارک علی کا مزاج قدرے بحال ہو چلا تھا۔ نبیلہ کے بے ضرر وجود سے باندھا جانے والا بیر اسے بے حس اور کسی حد تک بے ضمیر بنا چکا تھا۔ سکینہ کی الیاس اور وسیم سے بے لوث محبت نبیلہ سے زیادہ نہیں تو کم بھی ہرگز نہ تھی لیکن اب بات احساس و انسانیت کی نہ رہی تھی۔ ایک جنگ بن چکی تھی..... انا کی تسکین کی جنگ اور یہ انا وغرور ہی تو تھا جس نے ابلیس کو بھی راندہ درگاہ قرار دلوا یا تھا۔

سکینہ کی لہو لہو مامتا نے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی شوہر کے لیے ایک برف زار بنا دیا تھا۔ مبارک کے وجود میں ایک لاد اکھولنے لگا تھا۔ سمجھوتا کرنا اس کی فطرت کا حصہ کبھی نہ رہا تھا اور اب بھی وہ اس لاشعوری سرد مہری کو ہرگز معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ ☆☆☆

شب و روز کا تغیر اور فلکی نظام کی نیرنگیاں جاری تھیں۔ زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ بستی میں بننے والے ایک

ہائی اسکول کی وجہ سے وسیم کو بغرض پڑھائی شہر نہ بھیجا گیا۔ سکینہ دو ہفتوں سے شدید موسمی بخار کی لپیٹ میں تھی بیماری اور نقاہت میں گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے بعد وہ ٹھنکن سے چور ہو کر لیٹی تو صبح کی خبر ہی لاتی۔ مبارک دو دن سے دکان کے لیے مال کی خریداری اور الیاس سے ملنے کی غرض سے شہر گیا ہوا تھا۔ بیوی سے اس کے خود ساختہ ”گلوں“ کی افزائش فردوں تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

یسا کہ کے تپتے مہینے کی اس قہر برساتی رات کو وہ تھکا ہارا شہر سے گھر لوٹا تو کوٹھری کی کھڑکی سے جھانکتی دوسرا یہ آٹکھوں کی جھلک نے اسے ٹھنک کر رکھنے پر مجبور کر دیا۔ عرصہ دراز سے وجود میں پنپنے والے آتش فشاں کو بہاؤ کا فوری راستہ درکار تھا۔ اس نے دبے قدموں آہستگی سے کواڑ کھولا اور نبیلہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے خشونت زدہ انداز سے پہلے ہی خائف رہتی تھی، اسے سامنے پا کر مزید خوفزدہ ہو گئی۔ رات کی تاریکی، منہ زور نفس اور انتقامی جذبات میں

ماہنامہ

پاکیزہ

پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی ستمبر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

سکینہ کا جذباتی انحصار مبارک کی انا کو بے حد تسکین دینے لگا تھا۔ اپنے فنیج ترین فعل پر اسے فخر سا ہونے لگتا تھا۔ نبیلہ کی عدم موجودگی کا احساس اسے ہمہ وقت سرشار رکھنے لگا تھا۔

”غلاظت کی پوٹلی تھی۔ ہونہہ..... اس کے وجود سے پاک ہو کر گھر کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے اب۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے اکثر سوچتا تھا۔ گھر والوں پر اس کی نوازشات کا سلسلہ بھی کافی بڑھنے لگا تھا لیکن سکینہ کی آنکھوں میں تا حال ویرانیوں کے ڈیرے اسے اب بھی چڑاتے تھے مگر وہ خود اعتمادی سے اسے بہلانے کی بھرپور سعی میں مگن رہتا تھا۔

اس روز بھی وہ دکان جلدی بند کر کے گھر جانے کے لیے پرتول رہا تھا جب وسیم ہانپتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”اباجی..... اباجی! جلدی گھر چلیے ذرا.....“

”کیا ہوا؟ خیریت ہے تا سب؟“ وہ تیوریوں چڑھا کر بولا۔

”اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے..... بے ہوش ہو گئی ہے وہ۔“

مبارک یکدم بوکھلا گیا اور دکان بند کر کے بیٹے کے ساتھ ہولیا۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو سکینہ کا بدن کسی بھیڑی کے مانند جھلس رہا تھا۔

”صبح تے بھی کر رہی تھیں۔ میں نے بہتیرا کہا چلو حکیم صاحب کے پاس چلتے ہیں مگر مانی ہی نہیں۔ بس نبیلہ کا نام لے کر روتی رہیں۔“ وہ روہا نسا ہو رہا تھا۔

مبارک خاموشی سے دانت پیستا ہوا حکیم کے مطب میں جا کر اسے گھر لے آیا جس نے چند اشٹا کی تشخیص کے بعد اسے کچھ پڑیاں تھما دیں اور دبلیز سے جاتے وقت ایک پل کے لیے رکا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا۔

”وچھوڑے کی کوئی دوا نہیں ہوتی مبارک! یہ دکھ بڑا جان لیوا ہوتا ہے اور اس بے چاری نے تو اولاد کا وچھوڑا اور بے حرمتی کا درد ایک ساتھ سہا ہے۔ اسے اولاد کا سکھ دے۔ رب خیر کرے گا۔“ مبارک ایک گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

ماں کی بیماری کا سن کر الیاں بھی چھٹیوں میں فوری گھر آ گیا تھا۔ اس کے دونوں بیٹیوں کی سکینہ سے والہانہ عقیدت اسے اکثر ششدر کر دیتی تھی۔ سوتیلے رشتوں میں محبت کی ایسی نظیر اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس کا لاشعور سکینہ کے ظرف سے ہمہ وقت تقابلی جائزے میں الجھا رہتا تھا۔ اس بیماری نے اس کے ہونٹوں پر ایک جامد

بہہ کر وہ تمام تر اخلاقی حدود فراموش کر بیٹھا۔ نبیلہ کے منہ میں اسی کا دوپٹا ٹھونس کر اس نے وحشت و درندگی کی نئی داستانیں رقم کر ڈالیں۔ اس کی کھٹی کھٹی کر بناک آوازیں اس کے دل میں ٹھنڈک برسا کر اس کی حیوانیت کو ہمیز کر رہی تھیں۔ اسی پر تسکین نہ ملی تو اس کے ادھ موئے وجود کو ٹھوکروں کی زد میں رکھ کر اطمینان سے کپڑے جھاڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر دزدیدہ نظروں سے اس نے چاروں طرف دیکھا پھر کسی خیال کے تحت سکینہ کے کمرے کے بیرونی کواڑ سے ہلکی پھلکی جھپٹ چھاڑ کے بعد سرشار انداز میں چہرہ آسمان کی جانب اٹھا کر آنکھیں موند لیں اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ عرشی دنیا کے داستان گو... ملائک انسان کے اس مکروہ روپ کی تاب نہ لا پائے اور بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔

☆☆☆

رات بستی کے کنارے بننے والی نہر پر گزار کر وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ اپنی اس حرکت پر اسے کوئی ملال یا پشیمانی نہ تھی۔ اگلی صبح پو پھٹتے ہی وہ بڑے مگن انداز میں چھل قدمی کرتا ہوا گھر پہنچا تو وہاں حسب توقع ایک کہرام برپا تھا۔ سکینہ کے بین کی آوازیں اسے گلی کے کڑتک سنائی دے رہی تھیں۔ گھر کے اندرونی و بیرونی حصوں میں تاسف میں گھرے کئی مرد و خواتین موجود تھے۔ اس نے بھی چہرے پر مصنوعی فکر مند اور سر اسیمکی کا نقاب اوڑھ کر اپنے ہمسائے دین محمد کا بازو دبوچ لیا اور لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

”کک..... کک..... کیا ہوا بھائی؟ یہ اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہے یہاں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

دین محمد ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر ایک جانب لے گیا اور دھیمے انداز میں بولا۔

”بس اللہ کی رضا ہے بھائی مبارک۔ جس کی قضا آئی ہو اسے کون ٹال سکتا ہے مگر اس قدر بھیا تک انجام..... اللہ کی مار ہو اس درندے پر.....“

مبارک بجلی کی طرح لپک کر اندر بڑھا۔ کھلے صحن میں نبیلہ کا نیلو نیل وجود اس پر گزری قیامت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھنک کر رکا لیکن جب ہلکتی ہوئی سکینہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روئی تو اسے ناقابل بیان فرحت محسوس ہوئی۔ بیوی کے وجود پر اب اس کا مکمل تصرف تھا۔ اس خیال نے اسے ندامت کا رتی بھرا احساس نہ ہونے دیا۔

☆☆☆

مصلحت کے تحت خاموش رہا۔ ذہن کے کسی گوشے میں سکینہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال اب بھی کلبلا رہا تھا لیکن گھر کی تعمیر شروع ہوتے ہی اسے شدید بخار نے ایک بار پھر دبوچ لیا۔ وہ سارا دن چت لیٹی کوشری کی دیواروں کو خالی نظروں سے گھورتی رہتی۔ آنسو آنکھوں کی منڈیر عبور کر کے ٹپکے میں جذب ہوتے رہتے تھے۔ گھر کے اندرونی کمروں یا صحن میں اب اس کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ مبارک کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو گیا اور وہ طیش سے پھٹ پڑا۔

”بس کر دے سکینہ اب! کیا چاہتی ہے تو آخر؟“
”میں نے تو کبھی کچھ چاہا ہی نہ تھا..... بس اپنی کملی بیٹی کا تحفظ ہی تو چاہا تھا۔“ اس کے کھوئے کھوئے انداز نے مبارک کے دل میں یکدم عجیب سی بے کلی پیدا کر دی لیکن وہ بے نیازی سے بولا۔

”غلطی تیری تھی نا..... تو نے بیرونی دروازہ بند رکھا ہوتا تو کیونکر کوئی داخل ہو یا تا گھر میں؟“
”ہاں ٹھیک کہا! غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اپنی قیمتی متاع کا ضامن ایک چور کو شہر اڈالا۔ غلطی تو میری ہی تھی ہاں، میری ہی تھی۔“ وہ ہذیبانی انداز میں بولی۔

”بخار تیرے دماغ کو چڑھ گیا ہے شاید۔ کیا اتنا پ شاپ بکے جا رہی ہے؟“

”مبارک علی!“ وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔ ”کوئی پل تو ایسا آیا ہوگا جب تجھے اس پر ترس آیا ہوگا۔ کوئی تو پل آیا ہوگا۔ کیا نفرت نے تیرے دل میں ایک بار بھی رحم نہ آنے دیا تھا؟“

مبارک کے سر پر ساتوں آسمان جیسے یکدم ٹوٹ پڑے۔ ”یہ..... کک..... کک، کیا کہہ رہی ہے تو..... میں نے.....“ اس کا سارا وجود سن ہونے لگا۔

”ہاں! تم نے..... تم ہی تھے وہ درندے..... تمہی معلوم ہو گیا تھا مجھے۔ تم نے ہر پہلو پر نظر رکھ لی لیکن اپنے سامان سے ریلوے کا وہ ٹکٹ نکالنا بھول گئے جس پر تمہاری واپسی کی تاریخ درج تھی..... نہیں! بھولے کہاں تھے تم..... تم نے تو بڑی ہوشیاری سے سارا میدان سجایا تھا..... لیکن میری معصوم بچی کی آپیں وہ نیلی چھتری والا تو سن رہا تھا نا..... وہ کیسے تیرا یہ ظلم اوجھل رہنے دیتا۔ اس انصاف کرنے والے حاکم نے فراموش کروایا تجھ سے یہ۔“ وہ بے مکان بولتی چلی گئی پھر یکدم اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”یہی سوچ رہا ہے نا کہ اتنے سال میں خاموش کیوں

چپ ٹھہرا دی تھی۔ وہ کسی معمول کے مانند گھریلو ذمے داریاں سرانجام دیتی..... ہاں مگر اس کی نمازوں کے سجدے طویل سے طویل تر ہوتے جا رہے تھے۔ نبیلہ کی موت کے بعد سکینہ کا اس پر جذباتی انحصار اسے اب ایک گرم گشتہ خواب محسوس ہوتا تھا۔ جانے کیوں اس رشتے میں ایک طویل لامتناہی صحرا محیط نظر آنے لگا تھا۔ الیاس اور وسیم کا دم بھرنے والی سکینہ میں اپنی اولاد کی خواہش کی کوئی رمت موجود نہ تھی۔ مبارک نے کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اپنی تمنا کے متعلق جاننے کی کوشش کی لیکن وہ محض ایک ہی بات پر اکتفا کرتی۔

”میں ایک ناکارہ زمین ہوں۔ آپ کی نسل داغ دار نہیں کرنا چاہتی۔“

”مگر میرے بیٹے تندرست اولاد ہیں۔ تو پھر کا ہے کا ڈر۔“ وہ زچ ہو کر کہتا۔

”اللہ کے سپرد کر دیجیے۔ ضروری نہیں ہر خواہش کی ناؤ کنارے بھی لگے۔“ اس کا ساٹا انداز مبارک کے تمام الفاظ کو گنگ کر دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

مبارک علی کی خواہش کی ناؤ ساحل پر پہنچ کر ڈوب چکی تھی۔ سکینہ کے دل و دماغ کو مسخر و تابع کرنے کی تمنا لا حاصل ہی رہی اور اولاد ان کے متوازی آن کھڑی ہوئی۔ بیٹے شادی کے قابل ہوئے تو انہیں گھر کی تعمیر نو کے لیے والد سے شدید تحفظات درپیش ہونے لگے۔ وہ گھر کی بنیادیں از سر نو استوار کرنے کا خواہش مند تھا لیکن الیاس اور وسیم کو کھڑی مسامحہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ آئے روز بحث کا بازار گرم رہنے لگا۔

”مخل میں ٹاٹ کا پیوند لگتے کبھی دیکھا نہ سنا۔ تم لوگ کیوں مصر ہو اس احقانہ خیال پہ۔“ مبارک جھنجھلاہٹ کی انتہا پر تھا پھر سکینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم ہی کچھ سمجھاؤ انہیں۔“
”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں یہ۔ کوئی مضائقہ بھی نہیں ویسے اس میں۔“ سکینہ کا ٹھنڈا لہجہ اسے یک دم جھلسا گیا۔
”تم..... ساری زندگی ایک ہی جوگ لے کر بیٹھی رہیں..... نحوست ہی طاری رکھی تم نے بس۔“ وہ کف اڑاتے ہوئے بولا۔

”یہ دکھ تو ہمارے دلوں میں بھی تاحال تازہ ہے ابا جی! اور یہ تو پھر ماں تھیں اس حرماں نصیب کی۔“ الیاس سکینہ کے گرد بازو پھیلا کر بولا۔

مبارک کے وجود میں غصے کی تیز لہر ابھری لیکن وہ

ٹانگوں سے اس کی چار پائی کے پاس ڈھکے گیا۔

☆☆☆

سکینہ کے صبر کا بار اس کا وجود ریختہ کر گیا تھا۔ اسے ریشے کا مرض بری طرح لاحق ہو گیا۔ داپنے دھڑ پر فاج کے حملے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور وہ مکمل طور پر صاحب فراش ہو گیا۔ ہرگز رتا دن اس کی حالت بد سے بدتر کر رہا تھا۔ بیٹوں نے اپنی پسند سے بیاہ دیا چاہیے لیکن بہوؤں کو اس کا وجود باعث آزار محسوس ہوتا تھا۔ شوہروں کی ہدایات کے باوجود وہ اس سے تغافل برتی تھیں۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہرائی محسوس ہو رہی تھی۔

الیاس صبح کا گبارات کو گھر آتا تھا۔ وہ اس کی ادویات و علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا لیکن اس کا حقیقی مددگار تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ وسم کی سلسلہ ملازمت جدہ منتقلی کے بعد اس کی بیوی کے تشغیر و انتقام نے مبارک کے وجود کو تختہ مشق بنا ڈالا۔ اس کے قوی اس قدر نہ حال ہو چکے تھے کہ رفع حاجت کی اب مکمل محتاجی درپیش تھی جس کے باعث اسے اسی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا گھناؤنا ماضی ہر پل اسے عذاب مسلسل میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن گویائی بے سکت تھی۔ کرب حد سے سوا ہوتا تو نبیلہ کے خیالی ہیولے کی منت سماجت کرتا لیکن زبان سے لا..... لا..... لا کے سوا کچھ بھی ادا نہ ہو پاتا۔ صبر کا ایندھن اسے سوختہ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

ہر رات کی طرح بھادوں کی وہ شب بھی اس کے لیے عذاب بن کر نازل ہوئی تھی۔ نبیلہ کا ہیولا اسے چھت کی کڑیوں سے جھانکنا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے وجود سے اٹھنے والے لعن نے اس پر دیوانگی طاری کر دی۔ اس نے پوری قوت لگا کر اپنے وجود کو گھسیٹنا اور چار پائی سے نیچے گر گیا۔ اس کا بالائی دھڑ دلمیز سے باہر جا پڑا۔ اب مزید حرکت کی سکت تھی نہ ہمت۔ اس کی نظریں آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں معافی کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

قمر و کو اکب کی بزم میں آج اداسیوں کا راج تھا۔ داستان گوئی کا ایک خاموشی و سکوت کے لبادے میں کھو گئی۔ قمر نے تاسف سے ٹھنڈی آہ بھری اور ہم نشینوں سے مخاطب ہو کر گویا ہوا۔

”قسم ہے زمانے کی! بے شک انسان خسارے میں ہے..... بے شک انسان خسارے میں ہے.....“

رہی..... کیوں نہ چھوڑ گئی تھی؟“ اس کے ہاتھوں میں بخار کی حدت کے بجائے برف کی سی ٹھنڈک نے مبارک کا سارا وجود منجمد کر دیا۔ ”میں چلی جاتی تو کوئی دوسری سکینہ لے آتا تو اور کوئی دوسری نبیلہ روندی جاتی۔ میں چاہتی تو تیری اولاد بھی بربادی کے راستے پر ڈال دیتی لیکن میں نے اللہ کو گواہ بنا کر کیے گئے عقد کی پاسداری کی۔ اپنے حصے کی ایمانداری نبھا دی۔ تیری اولاد سنوار دی۔ اپنی بچی کے آخری سفر کی آسانیوں کا لالچ مجھے تیری سطح تک نہ لا سکا لیکن میں تجھے کبھی معاف نہ کر پائی۔ تو نے عورت کے من میں نفس کی آنکھ سے جھانکا بس..... میں تو تیرے پاؤں دھو دھو کر پیتی اگر تو ایک بار میری بچی کو اپنا لیتا۔“ وہ بولتے ہوئے ہانپنے لگی۔

”میں نے ایسا کچھ.....“ وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

”چپ رہ بس..... آج مجھے بولنے دے.....“ مبارک کو اس دھان پان سی عورت سے یکفخت خوف محسوس ہونے لگا تھا لیکن وہ آج تمام تر حساب چکنا کر دینا چاہتی تھی۔

”میں نے تیرے بیٹے پال کر جوان کر دیے اور تیرے لیے اپنے صبر کا ایندھن چھوڑے جا رہی ہوں۔ اسے سنبھالے رکھنا بس اور یہ کبھی مت سوچنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گی۔“

اچانک ایک خدشہ اس کے ذہن میں کلبلایا اور اس کے وجود کو شل کر گیا مگر نہ جانے کیوں اس کے اندر پیدا ہونے والی ہر سوچ کسی عکس کی طرح سکینہ کے سامنے جھلک رہی تھی تبھی وہ ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ سے بولی۔

”نہیں! میں تیری طرح نہیں بن سکی۔ کچھ نہیں بتایا تیری اولاد کو..... مگر چاہ ضرور رکھی دل میں..... کہ تو اپنی بوئی فصل کا اناج ضرور چکھے۔“

مبارک علی کی برداشت اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خوفزدہ انداز میں اٹنے پیروں وہاں سے نکل آیا اور سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دے کر دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ خالی الذہنی کے عالم میں جانے کب تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ہوش تو تب آیا جب الیاس نے اس کے کندھے کو ہتھکڑ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”اماں چلی گئی ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر۔“

”چلی گئی..... ایسے کیسے چلی گئی؟ میری سن تو لیتی ایک بار۔ ایک بار تو بولنے دیتی مجھے بھی۔“ وہ پھٹے ہوئے لہجے میں بولا اور بھاگ کر کوٹھری میں داخل ہوا تو سکینہ کے چہرے پر طاری ابدی سکون نے اسے یکدم پکرا کر رکھ دیا۔ وہ بے جان

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

عفریت

شرعباس

بعض اوقات خاموش طبع انسان اپنے اندر کسی بہت بڑے طوفان کا شور لیے پھرتا ہے... اسے باہر کا نہ کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے، وہ تو بس سارے مذاکرات اپنے اندر کے انسان سے کر رہا ہوتا ہے۔ وہ بھی کسی ایسی ہی مہم میں مصروف تھا اور اس کے سنائے تک کو خبر نہ تھی کہ ایک دن وہ کیا دھماکا کرنے والا ہے... مگر تقدیر نے اچانک بازی پلٹ دی۔

انسانی خون سے پیاس بجھانے والے
ایک عفریت کا ماحبرا

لڑکوں سے ایک سال چھوٹی تھی اور گزشتہ دنوں اس کی گیارھویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ دونوں جڑواں لڑکوں میں سے ایک نے جیب سے چرایا ہوا سگریٹ نکال کر سلگایا لیکن پہلا کش لیتے ہی اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور اس نے بے حال ہو کر وہ سگریٹ پھینک دیا۔
ڈیوی اور ڈینس مقامی لڑکے تھے اور وہ اپنے ساتھیوں

پورے چاند کی روشنی نے ماحول کو سحر انگیز اور رومان پرور بنا دیا تھا۔ وہ چاروں جھیل کے کنارے ایک تنے پر بیٹھے بیئر سے شغل فرما رہے تھے جو مسٹر گالٹ کے فریج سے چرائی گئی تھی۔ ان کے دونوں جڑواں لڑکے اور رابرٹ باری باری بیئر کا کین ایک دوسرے کو دے رہے تھے جبکہ سینڈی کوک سے دل بہلا رہی تھی۔ وہ ان تینوں

ڈیوی نے اپنی آواز دھیمی کر دی جیسے سرگوشی کر رہا ہو اور وہ سب اس کے قریب ہو کر سننے لگے۔ جیسے ہی ڈیوی نے بولنا شروع کیا تو رابرٹ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کا احساس ہونے لگا۔

”یہ مکان اس قصبے سے باہر واقع ہے۔“
یہ سنتے ہی سینڈی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ اسے لگا جیسے پرانی کہانی ایک بار پھر دہرائی جا رہی ہے۔

”نہیں، یہ حقیقت ہے۔“ ڈیوی زور دیتے ہوئے بولا۔ ”وہاں مسٹر بیلڈن رہتے ہیں۔ تمہیں اس کے قریب جانے کی ضرورت ہے۔ وہ قصبے کو جانے والی سڑک سے ہٹ کر جنگل کے سرے پر واقع ایک فارم ہاؤس ہے جس میں ایک گودام اور بہت بڑا کھیت ہے۔ لوکس بیلڈن واقعی پر اسرار شخصیت ہے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس برس ہوگی جبکہ اس کی بیوی دس سال پہلے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر چکی ہے لیکن لوگوں کا خیال کچھ اور ہے۔ اس کی بیوی ایک بد مزاج عورت تھی اور بیلڈن کی ہر بات پر اعتراض کیا کرتی تھی۔ وہ اس سے تنگ آچکا تھا لہذا اس نے جان چھڑانے میں ہی غافیت سمجھی۔“

”ہمارے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ مسٹر بیلڈن وہاں اس وقت سے رہ رہے ہیں جب وہ سب بچے تھے۔ ڈیڈی نے ان کے ساتھ اسکول میں پڑھا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ لوکس بیلڈن بچپن سے ہی پر اسرار واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا سارا وقت کھیل کود کے بجائے لائبریری میں گزارتا تھا۔ اس کی کسی لڑکے سے دوستی نہیں تھی۔ اس کے ڈیڈی انہیں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ چلے گئے تھے اور ماں نے اس کی پرورش بڑے مشکل حالات میں کی تھی۔ وہ اپنے کھیت میں پیدا ہونے والی سبزیاں اور پھل بازار میں فروخت کرتی اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جو لوگ یہاں آتے، ان کے کپڑے دھو کر کچھ پیسے کماتی تھی۔ ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتی اور لوکس پر چلاتی رہتی تھی۔ حالات کی تکلی نے اسے حد درجہ بد مزاج بنا دیا تھا۔“

”کہانی کے اصل حصے کی طرف آؤ ڈیوی۔“ اس کے بھائی نے لقمہ دیا۔

”لوکس بیس سال کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور اس کے فوراً بعد ہی لوکس نے شادی کر لی۔ وہ عورت بہت مال دار تھی اور اس کے مرنے کے بعد وہ ساری دولت کا مالک بن گیا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس کے پاس لاکھوں ڈالرز کے اثاثے ہیں مگر اس نے دوسری شادی

کو مقامی کہانیاں سنا کر محظوظ کر رہے تھے۔ ہر کہانی کا آغاز ایک ہی انداز سے ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ مکان قصبے سے باہر تھا یا یہ کہانی شمال میں واقع ایک قصبے سے تعلق رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ رابرٹ اور سینڈی لارنس کا تعلق نیویارک سے تھا اور وہ اپنے والدین کے ہمراہ تعطیلات منانے یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ سب کہانیاں پہلے بھی سن رکھی تھیں اس لیے وہ اس وقت کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔

”ایک منٹ.....“ رابرٹ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”جب وہ کار چلاتے ہوئے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ گاڑی کے دروازے کے ساتھ ایک ہک لنگ رہا ہے۔“

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور کہانی یہیں پر ختم ہو گئی۔ رابرٹ اور سینڈی کا کوئی اور کہانی سننے کا موڈ نہیں تھا لیکن ڈینس بھی رکنے والا نہیں تھا۔ اس نے نئی کہانی شروع کر دی۔ ”کانج کے لڑکے ایک پارٹی میں جا رہے تھے کہ انہیں سڑک کے کنارے ایک خوب صورت لڑکی ملی۔ انہوں نے اسے اپنی کار میں بٹھالیا.....“

اس سے پہلے کہ ڈینس کہانی کا اگلا حصہ بیان کرتا، سینڈی اچانک بول پڑی۔ ”وہ ڈانس کرتے وقت سردی سے ٹھہر رہی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکے نے اسے اپنا سویٹر پہننے کے لیے دے دیا۔ دوسرے دن وہی سویٹر انہیں قبرستان سے ملا جو اس کی قبر کے سرہانے کتبے پر بڑی صفائی سے تہ کر کے رکھا گیا تھا۔ یہی کہانی ہے نا؟“

ڈینس نے اسے گھور کر دیکھا اور ریڑر کے کین کی طرف ہاتھ بڑھا دیا لیکن اس کے بھائی نے آگ کے شعلوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بالکل سچی کہانی ہے اور یہ واقعہ یہیں ٹھیل کے کنارے پیش آیا تھا۔“ اس نے اپنی بات میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے وقفہ لیا اور بولا۔ ”درحقیقت ایسے واقعات اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔“

یہ سنتے ہی سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ رابرٹ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے دس بج چکے تھے۔ ویسے تو انہیں دس بجے تک اپنے کیمپ میں واپس پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ڈیڈی نے انہیں رعایت دے دی تھی۔ وہ اس پر خوش تھے کہ ایک ہفتے تک بور ہونے کے بعد گزشتہ روز ان بچوں کی ملاقات مقامی لڑکوں سے ہو گئی تھی لہذا انہوں نے کیمپ فار کو ایک گھنٹا آگے بڑھانے کی اجازت دے دی تھی اور اس طرح انہیں ایک اور طویل کہانی سننے کے لیے وقت مل گیا تھا۔

”بس اس کے بعد ہم کوئی اور کہانی نہیں سنیں گے۔“ رابرٹ نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

دوبارہ سنیما میں جا کر بیٹھ گیا ہوگا۔“

رابرٹ نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ اس فضول کہانی کے انجام سے متفق نہیں تھا لہذا بولا۔

”جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ ایک عورت ڈوب گئی یا کسی مرد کے ساتھ جنگل میں گئی اور اس نے اسے مار دیا اور تم لوگوں نے فوراً ہی اس کا الزام لوکس بیلڈن پر عائد کر دیا۔ یہ بالکل احمقانہ سی بات لگتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ عورت کو کیوں قتل کرے گا؟“

”تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ ڈینس نے کہا۔

ڈیوی نے اپنے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”ابھی یہ کیانی ختم نہیں ہوئی۔ بہت کچھ باقی ہے۔ وہ واحد عورت نہیں تھی جو یہاں سے پراسرار طور پر غائب ہوئی۔ گزشتہ چند سالوں میں دو عورتیں مل قتلہ اور ایک اسٹالس بری سے غائب ہو چکی ہے۔“

”پائسن ڈیل.....“ اس کے بھائی نے تصحیح کی۔

”اچھا اچھا۔ وہی، اس کے علاوہ ایک اور عورت گرین ٹری سے بھی غائب ہوئی تھی۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ سب گمشدہ عورتیں طوائفیں تھیں۔“

”تمہارا مطلب ہے ہو کر۔“ سینڈی چلائی۔

ڈیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بھول گیا تھا کہ تم لوگ نیویارک سٹی کے رہنے والے ہو۔ ٹھیک ہے تم انہیں ہو کر، کہہ سکتی ہو۔ ان میں سے کسی کی لاش نہیں ملی لیکن یہاں سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان واقعات کے پیچھے بیلڈن کا ہاتھ ہے۔“

رابرٹ نے سر ہلایا۔ اس کے اور سینڈی کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے ڈیڈی وکیل تھے اور وہ سارا دن عدالت میں اپنے موکلوں کا دفاع کیا کرتے تھے لہذا وہ بھی بہت سی باتوں کو سمجھتے تھے۔ ان کی ماں ایک دو مرتبہ انہیں مقدمے کی کارروائی دکھانے کے لیے عدالت لے گئی تھی جہاں انہوں نے اپنے ڈیڈی کو دلائل دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

رابرٹ نے اپنے باپ کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ کئی سالوں کے دوران چار طوائفیں مختلف مقامات سے غائب ہو گئیں جن کی نہ تو لاشیں ملیں اور نہ ہی کوئی ثبوت لیکن اس کے باوجود یہاں ہر شخص کا خیال ہے کہ انہیں لوکس بیلڈن نے قتل کیا ہوگا کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتے جبکہ ان میں سے ایک عورت جب غائب ہوئی تو دیکھا تھا۔“

ڈیوی نے جواب دیا۔ ”شیرف فوے نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ اس رات وہ قصبے کے سنیما گھر میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی تصدیق تھیرٹر کے عملے نے بھی کر دی جو اسے اچھی طرح جانتے تھے لیکن میرے ڈیڈی کو شبہ ہے کہ وہ فلم کے دوران اٹھ کر آ گیا ہوگا اور اس عورت سے ملنے کے بعد فلم ختم ہونے سے پہلے

نہیں کی اور اپنے فارم پر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنی پرانی پک اپ میں بیٹھے میں ایک بار کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے قصبے کا رخ کرتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ می کہتی ہیں کہ وہ جس انداز میں دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اسے جانوروں سے بڑی محبت ہے۔ اس کے پاس ایک کتا، کچھ بلیاں، گائے، مرغیاں اور دو عدد گھوڑے بھی ہیں۔“

”گھوڑے!“ سینڈی بے اختیار چلائی۔ ”مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”شش.....“ ڈیوی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے لیکن چند سال پہلے ایک عورت یہاں سے غائب ہوئی تو بیلڈن کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔“

ڈیڈی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ڈانسر تھی اور نیویارک سٹی سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک رات اپنے کیمپن سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی..... اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی غوطہ خور اس کی لاش ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم لوگ جس کیمپن میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے مالک مسٹر سامن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس عورت کو آخری بار جھیل کے کنارے کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے اور سبے تکلفی کی حد تک ایک دوسرے سے چپے ہوئے تھے۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ مرد کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ لوکس بیلڈن تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ جنگل کی طرف چلے گئے پھر اس عورت کو دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا۔“

وہاں گہری خاموشی تھی اور رابرٹ ٹھنکی باندھے ڈیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سینڈی کھسک کر اس کے مزید قریب آ گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

”پھر کیا ہوا؟ کیا اسے گرفتار کر لیا گیا؟“

”نہیں۔“ ڈیوی نے جواب دیا۔ ”شیرف فوے نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ اس رات وہ قصبے کے سنیما گھر میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی تصدیق تھیرٹر کے عملے نے بھی کر دی جو اسے اچھی طرح جانتے تھے لیکن میرے ڈیڈی کو شبہ ہے کہ وہ فلم کے دوران اٹھ کر آ گیا ہوگا اور اس عورت سے ملنے کے بعد فلم ختم ہونے سے پہلے

نہیں کی اور اپنے فارم پر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنی پرانی پک اپ میں بیٹھے میں ایک بار کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے قصبے کا رخ کرتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ می کہتی ہیں کہ وہ جس انداز میں دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اسے جانوروں سے بڑی محبت ہے۔ اس کے پاس ایک کتا، کچھ بلیاں، گائے، مرغیاں اور دو عدد گھوڑے بھی ہیں۔“

”گھوڑے!“ سینڈی بے اختیار چلائی۔ ”مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”شش.....“ ڈیوی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے لیکن چند سال پہلے ایک عورت یہاں سے غائب ہوئی تو بیلڈن کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔“

ڈیڈی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ڈانسر تھی اور نیویارک سٹی سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک رات اپنے کیمپن سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی..... اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی غوطہ خور اس کی لاش ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم لوگ جس کیمپن میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے مالک مسٹر سامن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس عورت کو آخری بار جھیل کے کنارے کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے اور سبے تکلفی کی حد تک ایک دوسرے سے چپے ہوئے تھے۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ مرد کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ لوکس بیلڈن تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ جنگل کی طرف چلے گئے پھر اس عورت کو دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا۔“

وہاں گہری خاموشی تھی اور رابرٹ ٹھنکی باندھے ڈیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سینڈی کھسک کر اس کے مزید قریب آ گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

”پھر کیا ہوا؟ کیا اسے گرفتار کر لیا گیا؟“

”نہیں۔“ ڈیوی نے جواب دیا۔ ”شیرف فوے نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ اس رات وہ قصبے کے سنیما گھر میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی تصدیق تھیرٹر کے عملے نے بھی کر دی جو اسے اچھی طرح جانتے تھے لیکن میرے ڈیڈی کو شبہ ہے کہ وہ فلم کے دوران اٹھ کر آ گیا ہوگا اور اس عورت سے ملنے کے بعد فلم ختم ہونے سے پہلے

نہیں کی اور اپنے فارم پر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنی پرانی پک اپ میں بیٹھے میں ایک بار کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے قصبے کا رخ کرتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ می کہتی ہیں کہ وہ جس انداز میں دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اسے جانوروں سے بڑی محبت ہے۔ اس کے پاس ایک کتا، کچھ بلیاں، گائے، مرغیاں اور دو عدد گھوڑے بھی ہیں۔“

”گھوڑے!“ سینڈی بے اختیار چلائی۔ ”مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”شش.....“ ڈیوی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے لیکن چند سال پہلے ایک عورت یہاں سے غائب ہوئی تو بیلڈن کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔“

ڈیڈی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ڈانسر تھی اور نیویارک سٹی سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک رات اپنے کیمپن سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی..... اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی غوطہ خور اس کی لاش ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم لوگ جس کیمپن میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے مالک مسٹر سامن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس عورت کو آخری بار جھیل کے کنارے کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے اور سبے تکلفی کی حد تک ایک دوسرے سے چپے ہوئے تھے۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ مرد کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ لوکس بیلڈن تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ جنگل کی طرف چلے گئے پھر اس عورت کو دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا۔“

وہاں گہری خاموشی تھی اور رابرٹ ٹھنکی باندھے ڈیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سینڈی کھسک کر اس کے مزید قریب آ گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

”پھر کیا ہوا؟ کیا اسے گرفتار کر لیا گیا؟“

”نہیں۔“ ڈیوی نے جواب دیا۔ ”شیرف فوے نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ اس رات وہ قصبے کے سنیما گھر میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی تصدیق تھیرٹر کے عملے نے بھی کر دی جو اسے اچھی طرح جانتے تھے لیکن میرے ڈیڈی کو شبہ ہے کہ وہ فلم کے دوران اٹھ کر آ گیا ہوگا اور اس عورت سے ملنے کے بعد فلم ختم ہونے سے پہلے

نہیں کی اور اپنے فارم پر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنی پرانی پک اپ میں بیٹھے میں ایک بار کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے قصبے کا رخ کرتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ می کہتی ہیں کہ وہ جس انداز میں دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اسے جانوروں سے بڑی محبت ہے۔ اس کے پاس ایک کتا، کچھ بلیاں، گائے، مرغیاں اور دو عدد گھوڑے بھی ہیں۔“

”گھوڑے!“ سینڈی بے اختیار چلائی۔ ”مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”شش.....“ ڈیوی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے لیکن چند سال پہلے ایک عورت یہاں سے غائب ہوئی تو بیلڈن کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔“

ڈیڈی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ڈانسر تھی اور نیویارک سٹی سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک رات اپنے کیمپن سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی..... اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی غوطہ خور اس کی لاش ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم لوگ جس کیمپن میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے مالک مسٹر سامن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس عورت کو آخری بار جھیل کے کنارے کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے اور سبے تکلفی کی حد تک ایک دوسرے سے چپے ہوئے تھے۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ مرد کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ لوکس بیلڈن تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ جنگل کی طرف چلے گئے پھر اس عورت کو دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا۔“

وہاں گہری خاموشی تھی اور رابرٹ ٹھنکی باندھے ڈیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سینڈی کھسک کر اس کے مزید قریب آ گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

گے جو ونڈر لینڈ کے نام سے مشہور ہے۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟“

”زبردست!“ ڈیوی بولا۔ ”اگر تمہارے مئی، ڈیوی ساتھ جا رہے ہیں تو پھر ہمیں بھی اجازت مل جائے گی۔“

”یقیناً!“ اس کے بھائی نے کہا۔

اچانک ہی رابرٹ کی جیب میں رکھے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ماما کا فون تھا جو کہہ رہی تھیں کہ دس بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ اب انہیں واپس آ جانا چاہیے۔

”اب ہم چلتے ہیں۔“ رابرٹ نے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہوگی۔“

”خدا حافظ دوستو!“ سینڈی جاتے ہوئے بولی۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سینڈی نے کہا۔ ”میں گھوڑے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”انگلیوں میں کھنچاؤ۔“ رابرٹ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”واقعی یہ عجیب و غریب جگہ ہے اور یہاں کے لوگ بھی بڑے عجیب ہیں۔“

”یہ بات تو سچ ہے کہ انہیں قانون کے بارے میں کچھ علم نہیں۔“ سینڈی بولی۔ ”میں گھوڑے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”مجھے بھی انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہے۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”گھر جا کر ڈیوی سے کچھ مت کہنا۔ میں خود انہیں پوری بات بتاؤں گا۔“

دوسری صبح وہ لوگ اپنے کیبن کے باہر بیٹھے ہوئے تھے جب رابرٹ نے ڈیوی کو یہ قصہ سنایا۔ اس وقت تک وہ دونوں ناشتے کے برتن دھو چکے تھے جبکہ میز کے دوسرے سرے پر اپنا لپ ٹاپ لے لیے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے کافی کا مگ رکھا ہوا تھا۔ تینوں جانتے تھے کہ جب وہ کچھ لکھ رہی ہوں تو انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اس لیے وہ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔

”تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ ڈیوی نے پوچھا۔

”گزشتہ شب ہم کیب فائر پر گئے تھے۔ وہیں ڈیوی اور ڈینس نے ہمیں اس شخص کے بارے میں بتایا۔“

رابرٹ نے اس کے پہلو میں کہنی سے ٹھوکا دیا اور تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”وہ ہمیں ایک ڈراونی کہانی سنا رہے تھے۔ ان کے خیال میں قاتل اسی جنگل کے کنارے رہتا ہے۔“

ڈیوی نے ایک نظر ساحل کے ساتھ بنے ہوئے کیبنوں

اسے ایک بوڑھے شخص نے ایک ایسے بندے کے ساتھ دیکھا جو دور سے مسٹر بیلڈن جیسا نظر آ رہا تھا جبکہ وہ اس وقت قصبے کے سینما میں فلم دیکھ رہا تھا اور اس کی گواہی کئی لوگ دے چکے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس پر شک کرنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔“

سینڈی مسکرائی اور اپنے گرد کھل لپیٹے ہوئے بولی۔

”تم تو بالکل ڈیوی کی طرح بول رہے ہو۔“

دونوں جڑواں بھائی آگ پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے پھر ڈینس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بظاہر تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی کی حرکت ہے۔ وہ انتہائی گھٹیا شخص ہے۔“

”وہ درمیان میں فلم چھوڑ کر سینما سے آ سکتا ہے۔“

ڈیوی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اور اس عورت کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ سینما واپس جاسکتا ہے۔“

”چلو، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تمہارا موقف پسند آیا۔ واقعی یہ ایک عمدہ کہانی ہے لیکن تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ بیلڈن ان عورتوں کو قتل کرنا چاہتا تھا؟“

اس سوال کا دونوں بھائیوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈیوی بولا۔ ”میرے ڈیوی کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو ان کی انگلیوں میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ اسے دور کرنے کے لیے کوئی حرکت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا!“ رابرٹ زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ واقعی یہ عجیب و غریب جگہ تھی لیکن اسے یہ لڑکے اچھے لگے تھے اور وہ ان سے کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ انہیں ابھی ایک ہفتہ اور یہاں قیام کرنا تھا۔ ڈیوی مچھلیاں پکڑنے میں مشغول تھے اور ماما اپنی نئی کتاب پر کام کر رہی تھیں۔ اس لیے ان دونوں بہن بھائیوں کو زیادہ وقت انہی لڑکوں کے ساتھ گزارنا تھا۔ وہ چہرے پر بے بسی لاتے ہوئے بولا۔

”کل صبح تم دونوں کیا کر رہے ہو؟“

”صبح اسکول جانا ہے۔“ ڈینس اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہماری چھٹی دو بجے ہو جاتی ہے۔ تم چاہو تو تین بجے جھیل پر ملاقات ہو سکتی ہے پھر ہم تیرا کی کے لیے جا سکیں گے۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”شام کو ہم مئی، ڈیوی کے ساتھ ہائی وے پر واقع تفریحی پارک بھی جا سکیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



”ٹھیک ہے پھر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرو۔“

دکان دار بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

آنس کریم کی دکان پر کھڑی ہوئی عورت نے بھی ان کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ انہیں کون دیتے ہوئے بولی۔

”وہ لیڈی کلر کے نام سے مشہور ہے اور وہ لوگوں کا آنا پسند نہیں کرتا۔ کچھ لڑکے وہاں جا کر اس کے گھر پر پتھر اڑا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو وہ ان لڑکوں کے پیچھے شاٹ گن لے کر بھاگا تھا۔ شاید یہ وہی گن ہوگی جس سے اس نے ان عورتوں کو قتل کیا تھا۔ تم لوگ اس جگہ سے دور رہو۔ اس کا دامنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا اس نے ان عورتوں کو گولی ماری تھی؟“ رابرٹ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ وہ عورت بولی۔ ”کہ اس نے ان عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ بالکل یاگل ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم آنس کریم کھاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہک کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ لیڈی کلر سے اس کی کیا مراد تھی۔“ رابرٹ واپس جاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ وہ عورت اس کے لیے غلط لفظ استعمال کر رہی تھی۔“

”یہ ہے وہ سنیما۔“ سینڈی نے ایک فلم کے پوسٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک جانب اپنا سر گھمایا اور بولی۔ ”یہاں سے جھیل تک پیدل جانے میں کتنا وقت لگے گا؟“

رابرٹ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ ”تقریباً دس منٹ۔“

وہ اپنا ہونٹ چباتے ہوئے حساب لگانے لگی۔ ”دس منٹ آنے اور دس منٹ جانے کے۔ اگر اس نے ایک گھنٹا بھی اس عورت کے ساتھ گزارا تو اس کے پاس کافی وقت تھا کیونکہ زیادہ تر فلمیں تقریباً دو گھنٹے کی ہوتی ہیں۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”لوکس بیلڈن کی۔ ڈیوی نے بتایا تھا کہ اس رات وہ فلم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ کیا تم نے اس قصبے میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا سنیما دیکھا؟“

رابرٹ نے خالی سڑک پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔ ”کیا تم مذاق کر رہی ہو؟“

”یہی وہ سنیما ہے جہاں وہ فلم دیکھنے آیا تھا۔ وہ درمیان میں ہی فلم چھوڑ کر چلا گیا اور عورت کو قتل کر کے واپس آ گیا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں تین یا چار عورتیں ماری گئیں۔“

پرڈالی پھر جھیل میں تیرتی ہوئی کشتیوں کو دیکھا اور بولے۔

”بچو! آج تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

سینڈی کچھ کہنے والی تھی کہ رابرٹ اس سے پہلے بول اٹھا۔ ”آج ہم قصبے کی سیر کریں گے اور سہ پہر میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ تیراکی کریں گے۔“

ڈیڈی سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”ان کا فون نمبر ضرور نوٹ کر لیتا۔ میں ان کے والدین سے انہیں ونڈر لینڈ لے جانے کی بات کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ رابرٹ نے کہا اور اپنی بہن کے ہمراہ سڑکیوں کی جانب بڑھنے لگا۔

”ایک منٹ۔“ ڈیڈی بولے۔ ”اگر تم شہر جا رہے ہو تو میری لیے تھوڑی سی ٹانکوں کی ڈوری لیتے آنا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے پرس سے پیسے نکالے اور رسی کی خالی جھنجی انہیں تھماتے ہوئے بولے۔ ”باقی پیسے تم دونوں رکھ لیتا۔ لیکن خیال رہے کہ تمہاری واپسی دو پہر بارہ بجے تک ہو جانی چاہیے۔ میں زیادہ انتظار کرنا پسند نہیں کروں گا۔“

”ایسا ہی ہوگا سر!“ رابرٹ نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں دوڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد رابرٹ سانس لینے کے لیے رکا اور بولا۔ ”اب تو ہمیں واقعی شہر جانا ہوگا۔ چلو اس بہانے کچھ پیسے تو ہاتھ آجائیں گے۔ میرا دل تو کوئی اچھی سی چیز کھانے کو چاہ رہا ہے۔“

”ہم بچے ہوئے پیسوں سے آنس کریم کون خرید سکتے ہیں۔“ سینڈی بولی۔ ”واپسی میں گھوڑے بھی دیکھ لیں گے۔“ انہوں نے وہاں سے گزرتے ہوئے لوکس بیلڈن کے فارم پر نظر ڈالی لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔

☆☆☆

وہ دونوں ٹانکوں کی ڈوری خریدنے کے لیے دکان پر پہنچے تو وہاں بھی سینڈی گھوڑوں کی ہی بات کر رہی تھی۔ دکان دار نے سن لیا اور بولا۔ ”تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لوکس بیلڈن کی طرف جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ وہ بہت عجیب شخص ہے۔“

رابرٹ نے ڈوری اور بقیہ پیسے لیے اور بولا۔ ”ہم انہیں بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ میری بہن صرف ان گھوڑوں کو دیکھنا چاہتی ہے جبکہ یہاں قریب میں کوئی دوسرا فارم بھی نہیں ہے۔“

ہوئے بولی۔ "اگر ہم دبے پاؤں مکان کے پاس سے گزرتے چلے جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔"

"یقیناً۔" وہ بولا۔ "ہم ان درختوں کے درمیان سے رینگتے ہوئے آگے بڑھیں گے اور گودام کے عقب میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ہمیں اندر کا منظر نظر آسکے گا اور ہم گھوڑے بھی دیکھ سکیں گے۔"

سینڈی نے اب بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی اور بولی۔ "اگر اس نے ہمیں پکڑ لیا تو کیا ہوگا؟"

رابرٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارا پیچھا کرے گا لیکن ہمیں پکڑ نہیں سکتا۔"

"وہ ہم پر گولی چلا سکتا ہے۔" سینڈی نے ممکنہ خطرے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، وہ ایسا کیوں کرے گا۔ ہم اس کے گھر پر پتھراؤ کرنے نہیں جا رہے۔ اس لیے وہ ہم پر گولی نہیں چلائے گا۔"

سینڈی ایک بار پھر اپنا ہونٹ چبانے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں۔"

رابرٹ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اب انہیں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے درمیان سے گودام کی پچھلی طرف جانا تھا کہ اچانک انہیں گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز آئی۔

☆☆☆

سڑک کے دوسری جانب ایک طویل باڑھ نظر آرہی تھی اور اس کے پیچھے مکان کے برابر میں ایک وسیع و عریض چراگاہ تھی۔ اس کے عین وسط میں ایک شخص پرانی جینز اور ڈنیم کی قمیص پہنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔ اس کے برابر میں ایک بڑا سا شکاری کتا ٹہل رہا تھا اور کچھ فاصلے پر دو گھوڑے آزادانہ دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑا گہرے بھورے رنگ کا تھا جبکہ دوسری گھوڑی تھی اور اس کا رنگ سفید تھا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے باڑھ کی دوسری طرف جا رہے تھے۔

سینڈی انہیں دیکھ کر خوشی سے چلائی اور تیزی سے باڑھ کی جانب بڑھی جبکہ رابرٹ قدرے محتاط تھا اور اس کی آنکھیں مسلسل اس شخص کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قد میں اس کے ڈیڑی سے بھی زیادہ تھا حالانکہ وہ بھی چھ فٹ دو انچ کے تھے۔ اس نے کروٹ انداز میں اپنے سفید

رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "جب میں ڈیڑی کی طرح وکیل بن جاؤں گا تو تمہیں اپنا سراغ رساں رکھ لوں گا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے ان عورتوں کو مارا ہوگا؟"

سینڈی نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا اور تمہیں بھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ عورتیں مر چکی ہیں۔ یہاں کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سیاح خاتون بھی طوائف نہیں بلکہ ایک ڈانسر تھی۔"

ان کی آنکس کریم ختم ہو چکی تھی۔ اچانک ہی رابرٹ چلتے چلتے رک گیا اور اپنی بہن کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

"سنو!"

وہ بھی رک گئی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا؟"

"یہ آوازیں کیسی ہیں؟"

وہ دونوں آنکھیں بند کر کے ان آوازوں کو سننے لگے۔ یوں لگا جیسے ہزاروں کھیاں بھنہنا رہی ہوں۔ انہوں نے ایسی آوازیں شہر میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان کی نظر فارم ہاؤس پر گئی جو سڑک کے دوسری جانب پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ رابرٹ نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا۔ دفتوں کی نظریں آپس میں ملیں اور پھر انہوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

"گودام مکان کے پیچھے ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"گھوڑے وہیں ہوں گے۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے پرائیویٹ پراپرٹی میں داخل ہونا ہوگا۔"

اگر ڈیڑی کو اس منصوبے کا علم ہو جاتا تو وہ یقیناً انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے۔ اس لیے رابرٹ نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں قانون کتنا سخت ہے اور بچوں کو بھی کسی کی ذاتی رہائش گاہ میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر انہیں کم عمر ہونے کی وجہ سے جیل نہ بھیجا جاتا تب بھی کوئی مشقت ضرور برداشت کرنا پڑتی۔ ڈیڑی کہا کرتے تھے کہ کم سن مجرموں کو کسی ایسے کام پر لگا دیا جاتا ہے جس میں بہت زیادہ مشقت ہو۔ اس کے باوجود رابرٹ نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس شخص کو دیکھنا چاہ رہا تھا جس نے پورے قصبے کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔

سینڈی چلتے چلتے رک گئی اور فارم ہاؤس پر نظر ڈالتے

ہوتے ہال ترشوار کھے تھے لیکن رابرٹ اس کی عمر کا اندازہ نہ لگا سکا۔ البتہ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ انہیں کسی کی پرائیویٹ پر اپرٹی میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور وہ باڑھ کے باہر سے ہی کھڑے ہو کر گھوڑوں کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا جس پر انہیں گرفتار کیا جاتا۔ اس شخص نے اپنے ہونٹوں سے ایک مخصوص قسم کی سیٹی بجائی۔ دونوں گھوڑے فوراً ہی پلٹے اور اس جانب دوڑنے لگے جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ رابرٹ نے گھبراہٹ میں قدم پیچھے ہٹائے اور باڑھ سے دور ہٹ گیا لیکن سینڈی نے رینگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگے کی طرف جھک کر اپنا دایاں بازو گھوڑوں کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گھوڑے اس آدمی کے پاس سے ہوتے ہوئے ان کی جانب بڑھے اور باڑھ کے قریب پہنچ کر ان کی رفتار سست ہو گئی پھر وہ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئے۔ براؤن گھوڑے نے اپنے سر کو جھکا دیا اور قدم مضبوطی سے زمین پر جمادیے لیکن سفید گھوڑی آگے بڑھتی رہی۔ لگتا تھا کہ ایک لڑکی کو وہاں دیکھ کر اس کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ وہ نزاکت سے چلتی ہوئی سینڈی کے قریب آئی اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو سونگھنے لگی۔

”ہیلو!“ سینڈی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”رابرٹ! دیکھو یہ مجھے پیار کر رہی ہے۔“

رابرٹ آگے بڑھا اور گھوڑی کو دیکھنے لگا جو اپنی زبان سے سینڈی کا ہاتھ چاٹ رہی تھی۔ رابرٹ مسکرایا اور پیار سے اس کی ناک پر ہاتھ پھیرا۔ اچانک ہی ایک مضبوط ہاتھ ان کی جانب بڑھا۔ رابرٹ کی سانس سینے میں ہی اٹک گئی جبکہ سینڈی کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخ برآمد ہوئی۔ ان کی نظریں اوپر اٹھیں۔ لوکس بیلڈن کا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا جیسا کہ ڈیوی نے بتایا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑی کا ہم عمر تھا۔ اس نے کلین شیو کر رکھا تھا اور اس کی آنکھیں گہری بھوری تھیں۔ وہ باڑھ کی دوسری جانب اپنے گھوڑوں کے درمیان کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی وہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ رابرٹ کو اس کا چہرہ بے تاثر لگا۔ وہ ڈیڈی کی طرح پینڈسم نہیں تھا لیکن اس کا شمار بد صورتوں میں بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ محض ایک عام شخص تھا۔ رابرٹ نے یہی سب کچھ سوچ کر سکون کا سانس لیا۔

اس شخص نے رابرٹ کو دیکھ کر سر ہلایا پھر وہ سینڈی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دو۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جس پر شکر کے دوڑ لے رکھے ہوئے تھے۔ سینڈی نے بھائی کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر کانپتی انگلیوں سے اس کے ہاتھ پر سے وہ ڈالے اٹھالیے۔

”ان کے نام کیا ہیں؟“ اس نے آدمی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ اس کی نظریں گھوڑوں پر تھیں۔ ”یہ پرنس ہے۔“ وہ بھورے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اور دوسری کا نام پرنس ہے۔“

”ہائے پرنس، ہائے پرنس۔“ سینڈی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت خوب صورت ہو۔“ اس نے ایک ٹکڑا دونوں ہتھیلیوں پر رکھا ہوا تھا۔ دونوں گھوڑوں نے انہیں اٹھانے کے لیے اپنے سر نیچے کر دیے۔ وہ آدمی خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

رابرٹ نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے رگڑ کھا رہی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ شکاری کتا اپنی ناک باڑھ سے نکال کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا تاکہ وہ اس کی انگلیوں پر لگی ہوئی آئس کریم چاٹ سکے۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ شخص بولا۔

”یہ کنگ ہے۔“

”ہیلو کنگ!“ رابرٹ نے اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ کتے نے اس کی جانب اداس آنکھوں سے دیکھا اور رابرٹ سمجھ گیا کہ وہ اتنی خاموشی سے کیوں بیٹھا ہوا ہے اور وہ دو اجنبی چروں کو دیکھ کر کیوں نہیں بھونکا۔ دراصل وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دوڑنے اور بھونکنے کے دن گزر چکے تھے۔

اب رابرٹ نے فارم ہاؤس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ پرانا ضرور تھا لیکن اس کی ٹھیک ٹھاک دیکھ بھال کی گئی تھی اور دیکھنے سے لگتا تھا کہ حال ہی میں اس پر رنگ و روغن کیا گیا ہے۔ مکان کے پیچھے گودام کا جو کونا نظر آ رہا تھا، اس پر سرخ اور سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ لان کی گھاس ہوار تھی جبکہ درختوں اور جھاڑیوں کی بھی فالتو ٹہنیاں اور شاخیں کاٹ دی گئی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ جگہ سرسبز و شاداب نظر آرہی تھی۔ گھوڑوں اور کتے کی دیکھ بھال بھی بہت اچھے انداز میں کی جا رہی تھی۔ خود وہ شخص بھی دیکھنے میں گھٹیا نظر

نہیں آ رہا تھا۔ رابرٹ نے بہت تھوڑے وقت میں یہ سب باتیں پھانپ لیں اور کنگ کے سر پر چھکی دیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”ڈیڈی نے کہا تھا کہ بارہ بجے تک واپس آ جانا۔“ اس نے اپنی بہن کو یاد دلایا جو ابھی تک گھوڑوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ”ہمیں اب چلنا چاہیے۔“ سینڈی مسکراتے ہوئے اس شخص سے بولی۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔“

بیلڈن نے سر ہلایا اور گھوڑوں کو لے کر گودام کی طرف بڑھ گیا۔ کتابھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ رابرٹ... اور اس کی بہن انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے پھر سڑک پار کر کے اپنے کیمپن کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیے۔ ”کتنے خوب صورت گھوڑے ہیں۔“ سینڈی نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ شخص قاتل ہو سکتا ہے۔“ ”ہاں۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”وہ بہت دولت مند ہے اور لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔ اس طرح کے چھوٹے قصوں میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے بہت جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی لیے وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ یہاں کے لوگوں کی نظروں میں معتب ہے اور وہ اپنی نفرت کا اظہار اس کے گھر پر پتھر اوڑھنے کی صورت میں کرتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کہیں ڈیوی اور ڈینس بھی ان پتھر مارنے والے لڑکوں میں شامل تو نہیں ہیں۔“

”وہ غیر مہذب ضرور ہیں لیکن دل کے اچھے ہیں۔ میں انہیں پسند کرتی ہوں۔“ ”میں بھی مسٹر بیلڈن کو بہت پسند کرتا ہوں۔“ رابرٹ بولا۔ ”لیکن ہمیں دوبارہ ان کو زحمت نہیں دینا چاہیے کیونکہ ہم گھوڑے دیکھ چکے ہیں۔“ ”ہاں۔“ سینڈی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔ کتنے پیارے گھوڑے تھے۔“

”وہ تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔“ رابرٹ چلایا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں نے دوڑ لگا دی۔ رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا تو سینڈی بری طرح جھینپ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گھوڑوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولی۔ ”اب رفتار آہستہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوڑتے رہو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ڈیڈی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

رابرٹ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کے

لیے عدالت میں بیلڈن جیسے شخص کا دفاع کرنا کتنا آسان ہوگا۔ کوئی بھی چوری لیک ویو میں رہنے والوں کی بکواس پر یقین نہیں کرے گی۔ اسے اور سینڈی کو ایک ہفتہ مزید یہاں گزارنا تھا پھر وہ اپنے اسی بڑے شہر چلے جاتے جہاں کے وہ رہنے والے تھے لیکن آج موسم بہت اچھا تھا اور وہ اپنے دوسرے پروگرام کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوڑتے ہوئے جھیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

لوکس بیلڈن انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے سڑک پر دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ لوکس یہ منظر دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے گھوڑوں کو گودام میں بند کیا اور ان بچوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یہاں کے لڑکوں سے بالکل مختلف تھے جو اس کے گھر پر پتھر اوڑھتے اور آوازے نکستے تھے۔ وہ دونوں شہر سے آئے ہوئے سیاح لگ رہے تھے جن کی پرورش بڑے اچھے انداز میں ہوئی تھی۔

اس نے گھوڑوں کو چار اور بانی دیا پھر خود کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آج کی رات بہت مناسب رہتی۔ ویسے بھی گزشتہ واردات کو ایک سال ہو گیا تھا اور اس کی انگلیوں میں دوبارہ انہیں شروع ہو گئی تھی۔

رابرٹ اور سینڈی اپنے کیمپن میں پہنچے تو وہاں ایک بالکل مختلف منظر دیکھنے میں آیا۔ ڈیڈی نے سارا سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا اور شاید انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ بولے۔ ”جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہونا ہے، تمہارا لٹچ پیک کر دیا ہے۔ راستے میں کھا لیتا۔“

”مگر کیوں؟“ رابرٹ نے احتجاج کیا۔ ”ہمیں تو مزید ایک ہفتہ یہاں رکنا تھا؟“

”اب پروگرام بدل گیا ہے۔“ ڈیڈی نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ”مجھے ایک اہم مقدمے کے سلسلے میں کل کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ہم ایک دن بھی نہیں رک سکتے۔“

ڈیڈی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ انہوں نے رابرٹ اور سینڈی کو بیلڈن کے فارم ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بیلڈن کی شہرت کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ یہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اپنے بچوں کو اس عفریت سے بچانا ان کی پہلی ذمہ داری تھی۔



چھٹی صدی ہجری میں دو خاندانوں نے بخارا سے ہجرت کی اور برصغیر کا رخ کیا۔ یہ دونوں خاندان سادات کے تھے۔ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی پھر معلوم نہیں... کیوں، دونوں خاندان والے لاہور سے بھی اکٹھا گئے اور یوپی کے شہر بدایوں میں جا بسے۔ ان میں سے ایک خاندان کے بزرگ خواجہ علی نے اپنے صاحبزادے سید احمد کو دوسرے خاندان کے بزرگ خواجہ عرب کی صاحبزادی زلیخا سے رشتہ مناکحت سے جکڑ دیا۔ اس طرح یہ دونوں خاندان آپس میں رشتے دار بھی

محبوب الہی

ضیائے نسیم بلگرامی

ولیعوں کا پیدا ہونے کے لیے گھرانوں کا انتخاب... اور پھر ان کی تربیت اور پرورش کے لیے انسانوں کا انتخاب... اس کے بعد حالات اور تعلیم کا سلسلہ... اگر غور کیا جائے تو یہ تمام مراحل عام انسانوں سے کس قدر مختلف اور دشوار ہوتے ہیں۔ گویا اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہونے کے لیے آزمائشیں اور کٹھن مرحلے پہلے سے کاتب تقدیر لکھ دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کون اس کے امتحان پر پورا اترتا ہے وہی اس کا برگزیدہ بندہ کہلائے گا... خواجہ نظام الدین سے کون واقف نہیں... کیا شان ہے آپ کی... تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی نامور اولیا سے ہوتے ہوئے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے عنایات کی بارش کے بعد کہا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“ اور پھر حضرت بختیار کاکی کی دستار اور اپنا عصا بھی عطا فرمایا۔ اللہ کے مقبول بندوں کی یہی تو نشانیاں ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے شیب و فراز



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

ہو گئے۔ سید احمد کو بادشاہ نے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا۔

پھر ان دونوں کے ہاں 27 صفر 636 ہجری میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دادا نے اس بچے کا نام محمد رکھ دیا۔

یہ بچہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تار ابن گیا۔ باپ اپنے بچے سے اتنی زیادہ محبت کرتا تھا کہ جب وہ اپنے گھر سے باہر ہوتا تو اس کے خیال میں مست و مگن رہتا لیکن یہ بچہ ابھی پانچ ہی سال کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا اور ماں نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مدر سے میں داخل کر دیا۔ ان دنوں بدایوں میں جن اساتذہ کا شہرہ تھا ان میں علاء الدین اصولی سرفہرست تھے۔ انہوں نے بچے کو قدوری پڑھائی۔ قدوری پڑھا چکنے کے بعد مولانا اصولی نے ایک تقریب منعقد کی اور اپنے ہم عصر علما و مشائخ کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

محفل تقریب میں آخری سرے پر مولانا اصولی اپنے ہونہار اور سعادت مند شاگرد کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہر بھر کے علما اور مشائخ جمع تھے۔ مولانا اصولی نے کھڑے ہو کر پہلے تو اپنے شاگرد کی تعریفیں کیں اور حاضرین کو بتایا کہ ان کا شاگرد محمد کتنا ذہین ہے اور سعادت مند بھی۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ میں اس کے دستارِ فضیلت باندھنا چاہتا ہوں۔ کئی عالموں نے اس بچے کا امتحان بھی لیا۔ انہوں نے اپنی دانست میں اس بچے سے کئی ایسے مشکل سوالات کیے جن کے جواب اس بچے کے بس کی بات نہیں تھے لیکن ذہین بچے نے ان کے شاندار جواب دے کر ان علما کو خاموش کر دیا۔ علما کے بعد مشائخ کی باری آئی اور وہ بھی بچے کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے۔

اس کے بعد مولانا اصولی نے انہیں کتب متداولہ اور علم لغت کا درس دیا۔ آخر انہوں نے ان کی والدہ کے پاس جا کر عرض کیا۔ ”محترمہ! اس بچے کو مجھ سے جو کچھ بھی پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب اگر اسے مزید تعلیم دلوانی ہے تو آپ کو اس بچے کے ساتھ دہلی جانا پڑے گا۔“

ماں اپنے بیٹے کو مزید پڑھانا چاہتی تھیں، بولیں۔ ”ہاں، میں اپنے بچے کو مزید پڑھانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں دہلی کا سفر بھی کروں گی بس آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ دہلی کے کسی لائق استاد کا نام بتادیں۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”مولانا شمس الدین دامغانی۔ ان کے فضل و کمال کا کوئی جواب نہیں۔ بادشاہ نے انہیں شمس الملک کا خطاب دے رکھا ہے۔“

اس وقت محمد کی عمر سولہ سال کی تھی۔ ماں انہیں لے کر دہلی چلی گئیں اور کوشش کر کے اپنے بیٹے کو مولانا شمس الدین کے شاگردوں میں داخل کر دیا۔

مولانا ناغہ کرنے والے شاگردوں سے بہت چڑتے تھے لیکن یہ نیا شاگرد آیا تھا کہ ناغہ کرتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اس نئے شاگرد نے دیکھا کہ مولانا کئی دن غیر حاضر رہنے والے ایک شاگرد سے نہایت طنز اور سادگی سے فرما رہے ہیں۔ ”صاحبزادے! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم کئی دن سے غیر حاضر ہو، مجھے تم میرا قصور بتا دو تا کہ میں پھر وہی قصور کروں اور تم درس میں نہ آسکو۔“

نئے شاگرد نے ڈرتے ڈرتے مولانا سے سوال کیا۔ ”حضرت! یہ آپ کیا فرمایا کرتے ہیں؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟“

مولانا نے نہایت شفقت سے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! میں بد مذاق اور بے پروا شاگردوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لیے یہ چاہتا ہوں کہ جن کو پڑھنے کا شوق نہ ہو میرے حلقہ درس میں نہ آئیں۔“

انہوں نے مولانا سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔

دہلی میں ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے جو حجرے بنے ہوئے تھے، محمد انہی میں سے ایک میں رہا کرتے تھے۔ ان کے پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکل نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان کے توکل اور استغنا کا لوگوں میں بڑا چرچا تھا۔ محمد بھی ان سے بہت متاثر تھے اور اس تاثر نے انہیں متوکل کی صحبت میں پہنچا دیا۔ یہاں پتا چلا کہ متوکل بابا فرید الدین گنج شکر کے بھائی ہیں۔ یہ اپنے بھائی گنج شکر کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ محمد کو ان کی صحبت میں پہنچنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

ادھر مولانا شمس الدین کا درس ختم ہوا اور محمد نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا کمال الدین کا کلمہ اختیار کیا۔ مولانا کمال الدین نہ صرف جید عالم تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سلطان بلبن نے ان کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنے دربار میں بلوایا مگر مولانا نہیں گئے اور کہلا دیا۔ ”میرے پاس نماز کے سوا کوئی چیز نہیں اور آپ اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔“

سلطان ملین اس جواب سے مرعوب ہو گیا اور اس نے پھر کبھی نہ بلایا۔
محمد نے مولانا کمال الدین سے علم حدیث حاصل کیا اور اس میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے مشاہیر سے رجوع کیا اور علم ہیئت، فقہ، علم تفسیر، اصول اور ہندسہ میں مشق بہم پہنچائی۔
محمد کا متوکل کی صحبت میں آنا جانا جاری رہا اور یہاں ہر روز ہی بابا فرید الدین گنج شکر کا ذکر ہوتا تھا۔ آخر ایک دن یہ بے قابو ہو گئے اور متوکل سے کہا۔ ”میں بابا فرید سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ”اس کے لیے تمہیں اجودھن پاک کا سفر کرنا ہوگا۔“
محمد نے کہا۔ ”میں اجودھن پاک تو کیا، بابا فرید کی خاطر سات سمندر پار بھی جاسکتا ہوں۔“
شیخ متوکل کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے۔ ”بسم اللہ، پھر دیر کیوں؟ یہ تامل کیسا؟“
محمد نے بابا فرید کے لیے اپنے دل میں ایک کک سی محسوس کی، وہ اجودھن پاک جانے کے لیے بے چین رہنے لگے۔
رات کو سوتے تو خواب بھی بابا فرید ہی کا دیکھتے۔ ایک دن علی الصباح مسجد کے منایے سے موزن کی آواز سنی تو تلملا گئے۔ آپ اذان بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جب اذان ختم ہو گئی تو موزن نے قرآن پاک کی یہ آیت نہایت پرسوز لہجے میں پڑھی۔
ترجمہ: کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کے دل ذکر الہی سے جھک جائیں۔
اس آیت نے آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ فوراً مسجد تشریف لے گئے۔ نماز فجر ادا کی اور ادھر ادھر شیخ متوکل کو تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہ آئے تو سیدھے ان کے گھر پہنچے۔ شیخ متوکل رات سے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ محمد نے جاتے ہی سوال کیا۔ ”حضرت! آج آپ مسجد تشریف نہیں لائے؟“
بابا متوکل نے جواب دیا۔ ”ہاں، آج میری طبیعت خراب تھی۔“
محمد کچھ دیر کھڑے بابا متوکل کی صورت دیکھتے رہے۔ بابا متوکل نے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا کسی کا انتظار ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی اجازت کا منتظر ہوں۔“
شیخ متوکل نے فرمایا۔ ”میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ اور اسی وقت جاؤ۔“
محمد نے نہ تو زور دیا نہ کچھ اور شیخ متوکل کی صحبت سے اٹھے اور پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پڑاؤ پر گئے وہاں کئی قافلے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں ایک قافلہ ملتان کی طرف جا رہا تھا۔ محمد نے اس قافلے میں شامل ہو کر سفر شروع کر دیا۔

جب یہ اجودھن پہنچے تو شوق دید اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا..... بدھ کا دن تھا۔ چھ رجب چھ سو چھپن ہجری۔ یہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے روبرو پہنچے تو انہوں نے دیکھتے ہی فارسی کا ایک شعر پڑھا۔
اے آتش فراق دل ہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاق جاں ہا خراب کردہ
پھر فرمایا۔ ”اے نظام احمد بدایونی! میں تیرا انتظار ہی کر رہا تھا۔“
انہوں نے شرما کر عرض کیا۔ ”بابا! میرا نام محمد ہے۔“

بابا فرید نے جواب دیا۔ ”اس نام کی حرمت کر۔ تو نظام بدایونی ہے۔ نظام الدین بدایونی۔ میں اور اللہ کی مخلوق تجھے نظام نام سے پہچانے گی۔“

اس کے بعد محمد ابن سید احمد نظام الدین اور بعد میں نظام الدین اولیا اور محبوب الہی ہو گئے۔
بابا فرید یہ فرما کر اٹھے اور اپنی کلاہ چارتر کی نظام الدین کے سر پر رکھ دی اور خرقة خاص اور نعلین چوبیس (غالباً کھڑاؤں) بھی عطا فرما دیں۔ یہ چیزیں دے کر فرمایا۔ ”نظام! میں نعمت سجادہ اور ولایت ہند کسی کو دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں کئی نام میرے ذہن میں تھے مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ تم راستے میں ہو اور میرے پاس آ رہے ہو، میں رگ گیا، پھر ہاتھ غیبی نے مجھے مطلع کیا... فرید! ظہر جاؤ، نظام بدایونی آ رہا ہے یہ ولایت اسے دینا۔“

نظام الدین پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ اپنے اشتیاق کا حال بابا سے عرض کریں مگر قوت گویائی جواب دے گئی۔ بابا فرید کا دبہ قوت گویائی پر غالب آ گیا۔ بابا فرید نے خود ہی فرما دیا۔ ”بابا نظام! تم جتنا اشتیاق ظاہر

کرتے ہو یہ اس سے کہیں زیادہ ہے اس لیے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد بابا فرید نے نظام الدین کو اپنے پاس ہی رکھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ بابا فرید کی مالی حالت بڑی خراب تھی اور خانقاہ میں عسرت اور تنگدستی کا راج تھا۔ بابا کے مریدوں میں سے چند نے اپنے ذمے کوئی نہ کوئی خدمت لے رکھی تھی۔ مولانا بدر الدین لنگر خانے کے لیے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ شیخ جمال الدین بھی جنگل سے لکڑیاں لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا بھی پکا دیا کرتے تھے۔ حسام الدین کابل کے سپرد پانی کی ذمہ داری تھی۔ برتنوں کی صفائی بھی انہی کے ذمے تھی۔ نظام الدین کے سپرد سبزی پکانے کا کام کر دیا گیا۔

ایک دن خواجہ نظام الدین سب کے لیے سبزی پکانے کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ نمک تو ہے ہی نہیں فکر مند ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ پیسے بھی پاس نہیں تھے۔ بابا فرید سے کہنے میں شرم محسوس کر رہے تھے۔ قریب ہی بیٹے کی دکان تھی۔ نظام الدین اس کی دکان پر گئے اور نمک ادھار لے لیا۔ کھانا پک گیا سب کے لیے نکالا گیا۔ مولانا بدر الدین اسحاق، شیخ جمال الدین بانسوی اور خواجہ نظام الدین تینوں ایک ہی پیالے میں کھا رہے تھے۔ بابا فرید نے پیالے میں ہاتھ ڈالا تو آپ نے اس میں گرائی سی محسوس کی اور آپ سے لقمہ اٹھ نہیں سکا، فرمایا۔ ”ازیں بوئے اسراف می آید (اس میں سے اسراف کی بو آتی ہے)“ خواجہ نظام الدین سکتے میں آ گئے۔ بابا فرید نے پوچھا۔ ”نظام! یہ نمک کہاں سے آیا تھا؟“

خواجہ نظام پر بابا فرید کے سوال سے لرزہ طاری ہو گیا، سہم کر جواب دیا۔ ”ادھار لیا تھا۔“ بابا فرید نے فرمایا۔ ”درویش قاتلے سے مر جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی سے قرض لے۔ توکل اور قرض میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو اگر مقروض درویش کو اچانک موت آجائے تو قیامت کے دن قرض کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی رہے گی۔“ اس کے بعد آپ نے سبزی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

خواجہ نظام اپنی اس کوتاہی پر اتنے نادم ہوئے کہ تنہائی میں جا کر آنسو بہاتے رہے اور دل میں یہ عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی بھی کسی سے قرض نہیں لیں گے۔ بابا فرید اچانک ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں وہ کھلی بھی تھی جس پر وہ بیٹھتے تھے۔ کھلی خواجہ صاحب کو دے دی اور فرمایا۔ ”نظام! انشاء اللہ آئندہ تمہیں بھی قرض کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ بابا فرید نے انہیں اپنے پاس تقریباً ساڑھے سات ماہ رکھا۔ اس دوران ان کی شاندار تربیت فرمائی۔ ایک دن بابا فرید نے قریط جوش میں فرمایا۔ ”خواجہ نظام! جو چاہو مانگ لو۔“

خواجہ نظام نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں استقامت کا طالب ہوں۔“ بابا فرید نے فرمایا۔ ”دیا۔“ پھر فرمایا۔ ”اپنا منہ کھولو۔“ خواجہ نظام نے منہ کھول دیا۔ بابا فرید نے اپنا لعاب دہن ان کے ہونٹوں سے مس کر دیا۔ فرمایا۔ ”تم کلام پاک حفظ کرو گے؟“

خواجہ نظام نے وعدہ کیا۔ ”ضرور حفظ کروں گا۔“ بابا فرید نے مزید فرمایا۔ ”خواجہ نظام! اللہ نے تمہیں دنیا و دین دونوں ہی دیے ہیں یہاں سب موجود ہے لہذا تم ہندوستان کا ملک لو۔“ پھر خلافت عطا کر کے فرمایا۔ ”خواجہ نظام! اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم عقل اور عشق بخشا ہے اور جس میں یہ تینوں صفتیں موجود ہوں، وہی خلافت کا حق دار ہے اور سنو، خوب غور سے سنو۔ قرض سے بچنا اور اگر کسی مجبوری سے قرض لینا ہی پڑ جائے تو اسے جلد لوٹا دینا۔ اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ انہیں دکھ نہ دینا اور نہ ہی انہیں ناراض کرنا۔“

یہ دور بیچ الاول 656 ہجری کا ذکر ہے۔ بابا فرید کی صحبت میں اہل صفا موجود تھے، ان میں خواجہ نظام الدین بھی شامل تھے۔ بابا فرید نے ان سب کی موجودگی میں فرمایا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“

خواجہ نظام الدین نے سر جھکا لیا اور پھر ز میں بوس ہو گئے۔

بابا فرید نے حکم دیا۔ ”بابا نظام! سراو پراٹھاؤ۔“

خواجہ نظام الدین نے جیسے ہی سراٹھایا، بابا فرید نے اپنی دستار اتار کر ان کے سر پر رکھ دی، فرمایا۔ ”بابا نظام الدین

یہ دستار حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔ پھر اپنا عصا بھی دے دیا اور اپنے ہاتھ سے خرقہ پہنایا اور فرمایا۔ ”بابا دو گانہ ادا کرو۔“

خواجہ نظام الدین قبیلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ بابا فرید نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”بابا! میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔“

اس کے بعد انہیں دہلی واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

خواجہ نظام الدین نے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی پہنچ کر وہ اپنے ایک عزیز کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے اپنے اس عزیز سے ایک کتاب مستعار لے رکھی تھی مگر یہ کتاب کم ہو گئی تھی۔ آپ نے اپنے عزیز سے کہا۔ ”افسوس کہ آپ کی کتاب مجھ سے کم ہو چکی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کتاب کو کسی سے حاصل کر کے نقل کر دوں۔“

عزیز نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کو معاف کر دیا۔“ آپ نے اپنے اس عزیز کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ کو یاد آیا کہ انہوں نے ایک بزاز سے ادھار کپڑا لے رکھا ہے۔ آپ سیدھے اس بزاز کے پاس پہنچے۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ رقم موجود تھی۔ آپ نے بزاز سے فرمایا۔ ”بھائی! میں تمہارا مقروض ہوں اس وقت میرے پاس کچھ رقم موجود ہے، اسے قبول فرما کر مجھے شکرگزاری کا موقع دیجیے۔“

بزاز نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اصرار کیا، فرمایا۔ ”تمہیں مجھ سے یہ رقم لینے ہی پڑے گی۔“ جب آپ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بزاز نے کہا۔ ”حضرت، میں ایک شرط پر یہ رقم لوں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کون سی شرط؟“

بزاز نے جواب دیا۔ ”اگر میں آپ سے یہ رقم لوں گا تو آپ بقیہ رقم کی واپسی پر مصر نہیں ہوں گے۔“

خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ادھار کی رقم تو بہر حال ادا کروں گا۔“

بزاز نے عرض کیا۔ ”تب پھر میں یہ رقم بھی نہیں لوں گا۔“

خواجہ نظام الدین نے بڑے کل سے کہا۔ ”بھائی! اگر تو اتنا ہی ضدی ہے تو میں بھی خاموش ہوا جاتا ہوں۔“

بزاز نے تھوڑی سی رقم لے کر انہیں معاف کر دیا۔ آپ نے بزاز کا شکریہ ادا کیا۔

آپ نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا قیام شہری آبادی کے بیچ میں تھا۔ لوگوں نے حاضریاں دینا شروع کر دیں اور اس میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑنے لگا۔ آپ نے ان لوگوں سے دور رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب قرآن پاک کو حفظ کرنے کا وقت آتا، آپ جنگل کی طرف چلے جاتے۔

آپ قرآن پاک کی چند آیتیں حفظ کرنے کے بعد جنگل سے شہر کی طرف جانے ہی والے تھے کہ ایک درویش نے آپ کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ ”نظام الدین! کہاں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”شہر واپس جا رہا ہوں۔“

درویش نے کہا۔ ”بابا! شہر میں فسق و فجور کا زور ہے، اس حال میں شہر میں رہ کر کیا کرو گے؟“

آپ نے پوچھا۔ ”پھر میں کیا کروں؟“

درویش نے کہا۔ ”میں کیا جانوں کہ تم کیا کرو۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ شہر میں رہنے سے ایمان خطرے میں رہتا ہے۔“ آپ اس وقت تو شہر چلے گئے لیکن درویش کی باتوں پر مسلسل غور کرتے رہے آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ شہر میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اسی وقت شہر چھوڑ دیا اور شہر کے باہر موضع غیاث پور چلے گئے۔ اس کے پاس ہی جانا بہرہ رہی تھی۔ آپ نے اپنے درویش ساتھیوں کی مدد سے چند جھونپڑیاں بنائیں اور ان میں رہنے لگے۔

آپ کی والدہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔ معاشی حالات بہت خراب تھے۔ کئی گنی دن فاقے سے گزر جاتے۔ ایک دن کسی ارادت مند نے آپ کی والدہ سے پوچھا۔ ”اس وقت گھر میں کچھ کھانے کے لیے ہے یا نہیں؟“

والدہ نے جواب دیا۔ ”آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔“

ماں کا یہ فقرہ آپ کو بہت پسند آیا اور جس دن گھر میں آسودگی پائی جاتی، آپ افسوس کرتے کہ آج میری ماں یہ پُر لطف فقرہ نہیں کہہ سکیں گی کہ آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔

آپ کی عسرت اور تنگ دستی کی خبریں مشہور ہونے لگیں۔ سلطان جلال الدین خلجی آپ کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ جب اس نے یہ خبر سنی تو آپ کی خدمت میں کہلا بھیجا۔ ”اگر حضور اجازت دیں تو خدمت گزاروں کی بسراوقات کے لیے چند گاؤں آپ کی نذر کر دوں۔“

اس وقت جو چند درویش آپ کے پاس موجود تھے، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر دریافت فرمایا۔ ”بادشاہ کی اس پیشکش کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟“

درویشوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور آخر کار ان سب کی طرف سے ایک نے جواب دیا۔ ”حضرت! موجودہ حالات میں تو ہم آپ کے ہاں بھی کبھی روٹی کھا لیتے ہیں لیکن اگر آپ نے بادشاہ کے یہ گاؤں قبول کر لیے تو ہم سب آپ کے ہاں کا پانی پینا بھی گوارا نہ کریں گے۔“

آپ کو درویشوں کا یہ جواب بہت پسند آیا اور سلطان کی پیشکش کو ٹھکرادیا۔ آپ کے ساتھ جو درویش رہتے تھے ان میں شیخ برہان الدین غریب اور شیخ کمال الدین یعقوب جیسے عظیم بزرگ بھی شامل تھے۔ فاقوں نے ان کا حال بھی برا کر رکھا تھا۔ ان پر ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ انہیں چار دن تک فاقے سے رہنا پڑا۔ ان کے بڑوں میں ایک ایسی خاتون بھی رہ رہی تھیں جو خواجہ نظام الدین سے بیعت تھیں جب ان خاتون کو درویشوں کے فاقے کا علم ہوا تو کچھ آٹا ان کی خدمت میں بھجوا دیا۔

شیخ کمال الدین یعقوب نے یہ آٹا مٹی کے ایک برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ اتنے میں درویشوں کے لباس میں ایک مسافر وارد ہوا اور ان سے کھانا مانگا۔ خواجہ نظام الدین پاس ہی موجود تھے۔ انہوں نے برتن اٹھا کر درویش کے سامنے رکھ دیا۔ کھانا بہت گرم تھا۔ درویش نے گرم گرم لقمے ہی منہ میں ڈال لیے اور پھر برتن کو زمین پر منچ دیا۔ خواجہ نظام الدین اور دوسرے درویش یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔

ایک درویش نے پوچھا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟“
درویش نے جواب دیا۔ ”شیخ فرید الدین گنج شکر نعمت باطن شیخ نظام الدین اولیا ارزانی داشت و من و یک فقر ظاہری او شکستہ حال سلطان ظاہری و باطنی شدی (شیخ فرید الدین گنج شکر نے تمہیں نعمت باطنی دی اور ہم نے تمہارا فاقہ توڑا) کہتے ہیں اس کے بعد ان کی معاشی حالت بالکل بدل گئی۔ عسرت کا دور جاتا رہا۔ خوشحالی نے ڈیرہ ڈالا۔“

☆☆☆

آپ کو مال و زر کی کوئی کمی نہ رہی، لنگر جاری کر دیا گیا۔ امرا آپ کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے اور آپ انہیں مسترد فرما دیتے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو نصیحتیں فرما رہے تھے کہ کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ ایک امیر باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ”حاضر کیا جائے۔“
اس امیر کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ امیر کے پیچھے پیچھے اس کا خدمت گار بھی تھا۔ خدمت گار نے ایک پوٹلی کا ندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خدمت گار کو حکم دیا کہ پوٹلی خواجہ نظام الدین کے قدموں میں ڈال دی جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور خدمت گار نے آپ کے قدموں میں تنکوں (اس عہد کے سکے) کا ڈھیر لگا دیا۔

آپ نے امیر سے پوچھا۔ ”کیا تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک! میں یہ نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں واپس لے جا۔“

امیر نے عاجزانہ گزارش کی۔ ”حضرت! میری اس حقیر نذر کو قبول فرمائیں، میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اسے اس لیے قبول نہیں کر رہا ہوں کہ کل یہ تیرے کام آئے گا۔ میرے پاس اور مال ہے۔“ پھر آپ نے اس سے فرمایا۔ ”ذرا اپنی بائیں سمت تو دیکھ۔“

امیر نے اپنے بائیں جانب جو دیکھا تو وہاں اشرفیوں کا ڈھیر نظر آیا۔ وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنا نذرانہ

2016

ستمبر

سپنس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

واپس لے گیا۔

دور دور سے لوگ آرہے تھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ انہی دنوں اٹاوہ کے قصبے پٹیالی کے ایک امیر سیف الدین محمود نے اپنے دونوں بیٹوں کا ہاتھ پکڑا اور خواجہ نظام الدین کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ امیر اپنے دونوں بیٹوں کو خواجہ نظام الدین کی مریدی میں دینا چاہتا تھا لیکن امیر کا چھوٹا بیٹا اس پر تیار نہیں تھا۔ جب امیر خواجہ نظام الدین کے دروازے پر پہنچ گیا تو چھوٹے بیٹے نے اپنے باپ سے دریافت کیا۔ ”باوا جان! آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تیرے بڑے بھائی کو حضرت نظام الدین کی بیعت میں دے دوں۔“
چھوٹے بیٹے نے عرض کیا۔ ”تب پھر آپ دونوں اندر تشریف لے جائیں۔ میں باہر آپ دونوں کا انتظار کروں گا۔“
باپ نے اندر چلنے پر اصرار کیا۔ ”تو بھی اندر چل، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

لیکن چھوٹا بیٹا اندر نہیں گیا۔ جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو چھوٹے بیٹے نے بیٹھے بیٹھے دو شعر موزوں کیے اور اپنے دل میں کہا کہ اگر خواجہ نظام الدین کامل ہیں تو اپنے تور باطن سے دونوں شعروں کا حال معلوم کر لیں گے اور میرے دونوں شعروں کا جواب شعروں سے دے کر مجھے طلب فرمائیں گے پھر میں اندر جا کر بیعت کر لوں گا لیکن اگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو میں اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ پٹیالی واپس چلا جاؤں گا۔

چھوٹے بیٹے نے درج ذیل شعر موزوں کیے۔

تو	آں	شا	ہے	کہ	بر	ایوان	قصر
کیوتر	مگر	نشیند	باز	گرد			
غریبے	مستندے	بر	درآمد				
بیاید	اندروں	یا	بازگرد				

(تو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کیوتر بیٹھے تو وہ تیری برکت سے باز بن جائے۔ ایک غریب حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے۔ وہ اندر آجائے یا واپس چلا جائے)

ابھی یہ شعر موزوں کر کے بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے ایک شخص آیا اور کہا۔ ”صاحبزادے! مجھے میرے مرشد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ باہر ایک ترک زادہ بیٹھا ہے اسے میرے دو شعر سنا کر واپس آجاؤ۔“ اس کے بعد اس نے دونوں شعر سنا دیے۔

بیاید	اندروں	مرد	حقیقت
کہ	یک	ہم	مرد
اگر	بود	آں	مرد
ازاں	راہے	کہ	آمد،
			بازگرد

(حقیقت کے میدان کا مرد اندر چلا آئے تاکہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراہ بن جائے۔ اگر وہ آنے والا نادان اور نا سمجھ ہے تو جس راستے سے یہاں آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے)

امیر کا چھوٹا بیٹا دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر داخل ہو گیا۔ خواجہ نے اسے نہایت محبت بھری نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھا۔ یہ آپ کے قدموں میں گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”آجا آجا اے مرد حقیقت اور ذرا سی دیر کے لیے میرا ہمراہ بن جا۔“

سامنے امیر سیف الدین اور ان کا بڑا بیٹا اس عجیب منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شاعر بیٹے نے عاجزی سے درخواست کی۔ ”حضور! میں شرف بیعت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں تیار ہوں۔“

آپ نے اس شاعر کو اسی وقت بیعت فرمالیا، بعد میں یہ شاعر جمیع اوصاف قرار پایا اور دنیا آج بھی اسے امیر خسرو کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

جب سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کر کے علاء الدین خلجی برصغیر کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی خواجہ نظام الدین محبوب الہی

سپنس ڈائجسٹ ۲۰۱۶ ستمبر

ہے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ آپ ایک بار اس کے پاس حاضر ہو جائیں تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی مگر آپ اس پر کبھی تیار نہ ہوئے۔

ایک دن بادشاہ کا ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! بادشاہ نے فرمایا ہے کہ حضور کم از کم ایک بار تو دربار میں حاضر ہو جائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جا اپنے بادشاہ سے کہہ دے کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں اور تیرا کچھ بھی نہیں لگاڑ رہا۔ میں یہاں سے بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں اگر بادشاہ نے میری حاضری پر اصرار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

بادشاہ کا آدمی واپس گیا اور آپ کے جواب سے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔
بادشاہ نے کہا۔ ”تو دوبارہ ان کی خدمت میں جا اور ان سے کہہ دے کہ اگر وہ خود تشریف نہیں لاتے تو نہ لائیں میں خود ہی آپ کے دربار میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

جب بادشاہ کا یہ پیغام آپ تک پہنچا تو آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ”اے شخص! بادشاہ سے کہہ دے کہ وہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کرے۔ میں یہیں سے بادشاہ کے لیے دعا گو ہوں۔ بادشاہ سے کہہ دے کہ غیب کی دعا زیادہ پُر اثر ہوتی ہے اور بادشاہ کو یہ بات بھی بتا دے کہ فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، فقیر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔“

بادشاہ آپ کے اس جواب سے ناراض نہیں ہوا۔ خاموش ہو گیا اور جب تک زندہ رہا اس کوشش میں رہا کہ محبوب الہی اگر شرفِ ملاقات نہیں بخشے تو اس کے نذرانے ہی قبول فرمائیں مگر آپ نے اس کے نذرانے بھی قبول نہیں فرمائے۔
آپ کے مقبول ترین مریدوں میں سید محمد امام نامی ایک بزرگ بھی تھے، جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے وہ ان کا سہارا لیتے۔ ایک دن ایک پریشان حال اور حواس باختہ شخص آپ کے در پر آیا اور سید محمد امام سے عرض کیا۔ ”جناب! میں اسی وقت پیر و مرشد سے ملنا چاہتا ہوں۔“

سید محمد امام نے پوچھا۔ ”کسی غرض سے یا یونہی؟“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”جناب میں ایک غرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔“
سید محمد نے اس شخص کو اندر پہنچا دیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟“
اس شخص نے کہا۔ ”حضور! میری جاگیر کی سند کم ہو گئی ہے۔ میں نے بادشاہ کے اہل کاروں سے اس کی نقل مانگی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اب آپ ہی فرمائیں میں کیا کروں؟“

آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”پھر میں کیا کروں؟ معاملہ تو بادشاہ اور اس کے اہل کاروں سے تعلق رکھتا ہے۔“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ دعا تو کر سکتے ہیں۔“
آپ بہت خوش تھے ازراہ مذاق فرمایا۔ ”میں خالی خولی دعا نہیں کرتا، اگر تو مجھے گرم حلوا کھلا دے تو میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔“

غرض مند باؤلے نے فوراً جواب دیا۔ ”حضرت! میں ابھی لایا، آپ کے لیے حلوا۔“
یہ شخص بھاگا بھاگا حلوائی کی دکان پر پہنچا اور آپ کے لیے حلوا خریدا۔ حلوائی نے حلوے کے لیے کاغذ جو اٹھایا تو اس شخص کی اس پر نظر پڑ گئی۔ یہ اس کی جاگیر کی سند تھی۔ اس نے کہا۔ ”بھائی یہ کاغذ مجھے دے دو اور حلوا کسی دوسرے کاغذ میں دے دو۔“

حلوائی نے یہ کاغذ اس شخص کو دے دیا اور حلوا کسی اور کاغذ میں باندھ دیا۔
اس شخص نے حلوا تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور جاگیر کی سند کی بابت کہا۔ ”حضرت! میری سند مجھے مل گئی اس وقت میں بہت خوش ہوں۔“

آپ نے تجاہل عارفانہ سے فرمایا۔ ”سند؟ یہ کہاں چلی گئی تھی؟“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں نے جب حلوائی سے حلوا خریدا تو میری سند رومی کاغذات میں پڑی دکھائی دی چنانچہ میں نے حلوائی سے اپنی سند مانگ لی۔“

آپ نے پوچھا۔ ”حلو، کہاں ہے؟ میرا حلو؟“

اس نے حلو آپ کے سامنے رکھ دیا، کہا۔ ”حاضر ہے تناول فرمائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں حلو کیا کھاؤں گا اسے اپنے گھر لے جاؤں اور حضرت شیخ العالم کی نیاز دے کر بچوں میں تقسیم کر دے۔“

وہ شخص خوش خوش اپنے گھر چلا گیا اور ہمیشہ کے لیے آپ کا مرید ہو گیا۔

ان دنوں علاء الدین خلجی کا نامور سپہ سالار ملک کا فور دکن کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ دکن کی دیوگڑھ ریاست کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ راجا کا خاندان تتر بتر ہو چکا تھا۔ ریاست کا راج کمار مہندر ہر دیو تباہ حال دہلی پہنچا، اتفاق سے اس کی ملاقات امیر خسرو سے ہوئی۔ امیر خسرو دہلی دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ خسرو نے اس آوارہ وطن کو اپنا مہمان بنالیا۔

مہندر ہر دیو نے خواجہ نظام الدین کا شہرہ سنا تھا اور وہ ان سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ خسرو نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے پیر و مرشد سے ضرور ملوادیں گے۔

رات کو دیر تک خسرو اور مہندر ہر دیو میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ خسرو راجا کمار کو چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور مہندر ہر دیو اپنے بستر پر۔ راج کمار کو اتنی گہری نیند آئی کہ دیر تک سوتا رہا۔ دن چڑھے بیدار ہوا تو خسرو کے نوکروں نے بتایا کہ خسرو دربار جا چکے ہیں کیونکہ وہاں کوئی جشن ہو رہا ہے۔

مہندر ہر دیو کے رشتے دار ایک دوسری جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجا کمار نے سوچا اب خسرو سے ملاقات مشکل ہے اس لیے اپنی قیام گاہ پر چلنا چاہیے۔

مہندر ہر دیو اپنی قیام گاہ جاتے ہوئے اس بازار سے گزرا جہاں بخارا، ترکستان اور ایران کا سامان بکتا تھا۔ اس بازار میں کپڑے، پوششیں، کمبل، قالین، ڈھالیں، تلواریں، خنجر اور تیر کمانوں کی دکانیں تھیں۔ مہندر ہر دیو ایک ترک کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں خنجر، تلواریں اور ڈھالیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس دکان کا ملازم ہندوستانی تھا۔

مہندر ہر دیو نے ہندوستانی ملازم سے باتیں شروع کر دیں۔ ملازم نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو اور کون ہو؟“ راجا کمار نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ”دولت اور ریاست آئی جانی چیزیں ہیں، یہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتیں، اس لیے میں اپنی قسمت یا فاتح کی چیرہ دستیوں کی کوئی شکایت نہیں کرتا۔“

ملازم نے پوچھا۔ ”یہاں دہلی میں کیا کر رہے ہو؟“ راجا کمار نے جواب دیا۔ ”ابھی تک میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔ خسرو سے میری دوستی ہو گئی ہے، میں خسرو کے توسط سے حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں، آگے کا حال معلوم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جو قسمت میں ہے پیش آئے گا۔“

ملازم نے کراہیت سے منہ بنایا، بولا۔ ”تم کس کے پاس جاؤ گے؟ نظام الدین دکاندار کے پاس؟ ارے بھائی تم اس دنیا دار بے دین سے ملو گے جو علانیہ گانا سنتا ہے۔ خسرو تو بے دین ہے ہی، اس کا پیر بھی اس سے کم نہیں۔“ راجا کمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولا۔ ”جناب! اس سے آگے نہ بڑھیں اور اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ میں ان دونوں کے خلاف مزید نہیں سن سکتا۔“

ملازم نے سر سے پیر تک اسے حیرت سے دیکھا، بولا۔ ”لیکن تم نے تو مجھے ابھی یہ بتایا تھا کہ ہندو ہو۔ اگر تم ہندو ہو تو تمہیں ان بے دین مسلمانوں سے کیا دلچسپی؟“

مہندر ہر دیو نے جواب دیا۔ ”جناب! میں نے دکن سے دہلی تک کا سفر محبوب الہی کے لیے کیا ہے، میں امیر خسرو اور محبوب الہی کی بابت ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں یہ دونوں کچھ بھی ہوں مگر ان میں مکر و فریب نہیں پایا جاتا۔“ ملازم نے جل کر کہا۔ ”چونکہ تم ہندو بت پرست ہوتے ہو اس لیے تمہیں یہ دونوں بت پرست اچھے لگے، اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“

مہندر ہر دیو نے جواب دیا۔ ”میں ایک کمزور نو جوان ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں کیوں ٹھہرا۔“ ملازم ہنس کر بولا۔ ”تم ایک مسافر اور اجنبی ہو، ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ تم اس کے ذمی ہو اس لیے میں

تھیں برائی سے روکنا چاہتا تھا۔“ مہندر نے پوچھا۔ ”یہ ذمی کیا ہوتا ہے؟“

دکاندار نے جواب دیا۔ ”جس کی حفاظت مسلمان حکومت کے ذمے ہوتی ہے، اسلامی شریعت میں اسے ذمی کہتے ہیں۔“

مہندر نے خوش ہو کر کہا۔ ”شکریہ، تم نے ایک لفظ کا مطلب سمجھا کر مجھ پر احسان کیا ہے میں تمہیں اپنا استاد مانتا ہوں، میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں جس طرح تم نے مجھے ایک برائی سے روکنا چاہا ہے اسی طرح میری خواہش ہے کہ تم بھی ایک غلط فہمی سے پیدا ہونے والے گناہ سے بچ جاؤ۔ تم ایک بار محبوب الہی کی مجلس میں ضرور جاؤ اور پھر کوئی رائے قائم کرو۔“

دکاندار نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اچھا، میں کل رات کو وہاں ضرور جاؤں گا۔“

مہندر نے کہا۔ ”میں تم کو وہیں ملوں گا۔“

دکاندار نے کہا۔ ”تب پھر تم ایک وعدہ کرو، وہاں تم اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے کیونکہ اس طرح میں یہ جانتا

چاہتا ہوں کہ خواجہ نظام الدین کو میرے خیالوں کی خبر ہوتی ہے یا نہیں۔“

مہندر نے کہا۔ ”تب پھر ایسا کرو کہ کل کے بجائے آج ہی چلو، میں دکان پر رکا جاتا ہوں، شام کو ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے اس طرح تم کو یقین رہے گا کہ میں نے اس ملاقات اور بات چیت کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔ میں مجلس میں کسی ایسی جگہ بیٹھوں گا جہاں حضرت کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔“ دکاندار راضی ہو گیا۔

شام کو ان دونوں نے ایک ساتھ محبوب الہی کی بارگاہ کا رخ کیا۔ دونوں خانقاہ میں داخل ہوئے وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ مہندر نے دکاندار کا ساتھ چھوڑ دیا اور سب سے پیچھے بیٹھ گیا۔ دکاندار گستاخانہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ محبوب الہی کے بالکل قریب چلا گیا اور السلام علیکم کہہ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ پوری مجلس اس گستاخی پر مشتعل ہو گئی، لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔

آپ نے اس دکاندار کو خوش اخلاقی سے اور زیادہ قریب کر لیا۔ پوچھا۔ ”غالباً تم اسی شہر کے رہنے والے ہو؟“

دکاندار نے جواب دیا۔ ”ہاں میں اسی شہر کا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور ہر مسلمان اس دنیا میں مسافر ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے مجھے حدیث یاد دلائی مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میں بھی جب گانا سنتا ہوں تو رسول اللہ کی وہ حدیث یاد آ جاتی ہے کہ ایک بار رسول مقبول ﷺ دو لڑکیوں کا دف پر گانا سن رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے اور انہوں نے ان لڑکیوں کو گانے سے روکا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ عمر! ان لڑکیوں کو گانے بجانے سے مت روکو۔ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ان لڑکیوں کی عید کا دن ہے۔“

دکاندار نے گھبرا کر مہندر کو تلاش کیا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

آپ نے مزید فرمایا۔ ”ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو یاد رکھے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور قرآن پاک میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔ یہ دونوں خبریں قرآن پاک میں موجود ہیں مگر ایسا کوئی حکم قرآن پاک میں نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کسی کے سامنے ایسا تعظیمی سجدہ نہیں کرنا چاہیے جیسا فرشتوں نے آدم کو، یعقوب علیہ السلام پیغمبر نے اپنے بیٹے کو کیا تھا۔ یوں بھی عبادت کے سجدے اور تعظیمی سجدے میں فرق ہوتا ہے۔ ادب اور تعظیم سے اطاعت پیدا ہوتی ہے۔ ہم درویشوں کے مسلک میں ادب اور تعظیم ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب امر ہوں، ان کی اطاعت کرو۔“

دکاندار آپ کی باتیں نہایت انہماک سے سنتا رہا۔ اس کے بعد ایک چیخ مار کر آپ کے قدموں میں گر گیا، روتے ہوئے کہا۔ ”حضرت مجھے معاف کر دیجیے۔ میں بڑی گمراہی میں تھا۔“

آپ نے سید امام کو بلا کر حکم دیا۔ ”اس کو پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ کیونکہ یہ بہت پریشان نظر آتا ہے۔ اس کے لیے حلو الاؤ کیونکہ اس نے ایک حدیث سنائی ہے۔“

اس کے بعد آپ نے پوچھا۔ ”میرا ہندو مہمان ہر دیو کہاں ہے اس کو میرے پاس لاؤ۔“

مہندر نے آپ کی آواز سنی تو ادب سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر دور ہی سے عرض کیا۔ ”حضرت! میں یہاں ہوں، حاضر ہوں۔“

آپ نے مہندر کی طرف انگلیاں آنکھوں سے دیکھا۔ ”مہندر! ہم سب خدا کے ذقی ہیں، کوئی انسان کسی انسان کا ذقی نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی انسان کو حفاظت کی خدا جیسی قدرت حاصل نہیں ہے۔“

دکاندار نے پھر ایک پیچ ماری اور تڑپنے لگا۔

سید محمد امام کھانا، پانی اور حلوائے آئے۔ آپ نے دکاندار کو اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ کھلایا۔ اس کی طبیعت ٹھہر گئی۔ اس کے بعد دکاندار نے اپنے ہاتھ سے کھایا پیا، حلوا بھی کھایا اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے بیعت کر لیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سید محمد امام میرے پیر کا نواسا ہے تم اس سے بیعت کرو پھر میرے پاس آنا۔“ اس کے بعد سید امام سے کہا۔ ”تم اس کو اپنے گھر لے جاؤ اور تعلیم دو۔“ مہندر سے کہا۔ ”اور تم بھی ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ۔“

مہندر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور پھر یہ تینوں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

رات کو خواجہ نظام الدین نے حکم دیا۔ ”خواجہ حسن سنہری، امیر خسرو، خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اپنی بہن کے پوتے سید محمد رفیع الدین بardon اور دیو گڑھ کے مہندر ہردیو، سنہیل دیو، چیتل دیو اور ستین دیو کو نام بنام میرے پاس بلا لاؤ۔“

آپ کے حکم کی دیر تھی کہ یہ سارے آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا۔ ”جانتے ہو میں نے تم لوگوں کو کیوں بلایا ہے؟“ پھر خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ ”یہ بات کون نہیں جانتا کہ اب اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر رہنا ہے لیکن دونوں کے لیے زبان کا مسئلہ دشواری کا سبب بنا ہوا ہے۔ باہر کے مسلمان یہاں کی مقامی زبان نہیں سمجھتے اور مقامی لوگ مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھ پاتے لیکن میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔“

امیر خسرو نے پوچھا۔ ”ارشاد، ہمارے لائق جو کام ہو، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر سے آئے ہوئے مسلمان آپس کی بات چیت اور لین دین میں کام میں لائیں۔“ اس کے بعد آپ نے امیر خسرو اور خواجہ سید محمد کی طرف دیکھ کر بطور خاص فرمایا۔ ”میں تم دونوں سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکا ہوں۔“

خواجہ سید محمد نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو پہلے ہی سرگرم عمل ہوں۔“

امیر خسرو نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے اس مقصد کے پیش نظر بچوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھنا شروع کر دی ہے اور کتاب کا نام خالق باری تجویز کیا ہے۔“

اس کے بعد امیر خسرو نے خالق باری کے چند شعر بھی سنائے۔ آپ نے انہیں پسند فرمایا اور بولے۔ ”یہ بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں بھی ایسے اشعار لکھو کہ لوگ انہیں یاد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔“

خواجہ نظام الدین نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مزید فرمایا۔ ”آج کل ہماری فارسی اور خسرو کی ترکی زبانوں کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے لفظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور مجلسوں میں بھی ہندی کے الفاظ بولنے لگے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو فارسی اور عربی اور ترکی میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت سمجھ سکیں اور یہ اس وقت ہوگا کہ وہ ضد کو چھوڑ دیں اور ہندی بول چال کا پرچار بڑھائیں۔“

آپ کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ امیر خسرو نے اس سمت میں خاص کام کیا۔ ان کی کہہ مکرانیاں، پہیلیاں، باہل اور دوسرے علاقائی گیت اتنے عام ہوئے کہ وہ آج بھی عام ہیں اور ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جو آج اردو کہلاتی ہے اور ہندوستان میں ہندوستانی۔

جب اس موضوع پر گفتگو ختم ہو گئی تو کافی دیر بعد مہندر نے کہا۔ ”حضرت! میں مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”جب تو خدا کو ایک مان لے گا اور رسول ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لے گا تو، تو مسلمان ہو جائے گا۔“

مہندر نے عرض کیا۔ ”حضرت اگر مسلمان ہونا اتنا ہی آسان ہے تو مجھے اسی وقت مسلمان کر لیجیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مسلمان کرنا اور چیز ہے اور مسلمان ہونا اور چیز۔“

مہندر نے پوچھا۔ ”ان دونوں میں کیا فرق ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مسلمان کرنے کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا جبر، دباؤ، لالچ یا ذاتی غرض شامل ہے

اور مسلمان ہونا ان سب سے بے لوث ہے۔ اس کے لیے کسی ایجاب و قبول کی کوئی ضرورت نہیں..... مثلاً آج اس وقت تو اس بات کا یقین کر لے کہ اللہ بس ایک ہی ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں تو اس یقین کے ساتھ ہی تو مسلمان ہو جائے گا۔“

مہندر گھبرا گیا۔ ”بیشک، مجھے پورا یقین ہے کہ خدا ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو بس تو مسلمان ہے۔“

مہندر نے کہا۔ ”مجھے بیعت بھی کر لیجیے۔“

فرمایا۔ ”ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور نہ ہی ابھی اس کی ضرورت ہے کہ تو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ تیرا نام بدلا جائے البتہ تو محمد امام سے وضو سیکھ لے اور وہی تجھے نماز بھی سکھا دیں گے۔“

اس بات کو کئی دن گزر چکے تھے۔ آخر ایک دن مہندر نے پھر وہی درخواست کی۔ ”حضرت! مجھے بیعت فرمالیں۔“

آپ نے اسے بیعت فرمایا اور کلاہ چارتر کی مہندر کے سر پر رکھ دی۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد مہندر نے عرض کیا۔ ”حضرت! اب میں دیو گڑھ اپنے والدین کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

آپ نے جانے کی اجازت دی، فرمایا۔ ”تو جاسکتا ہے اور اگر تیرے ماں باپ اجازت دیں تو واپس آ جانا اور اگر وہ تیرے ساتھ آنا چاہیں تو انہیں اپنے ساتھ دہلی لے آنا۔“

مہندر نے دیو گڑھ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک ایک خواجہ سید محمد کا خادم مع مہندر کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”کو تو ال علاء الملک کا ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

مہندر نے جواب دیا۔ ”میں یہاں اکیلا ہوں، اسے یہیں بلا لو۔“

جب کو تو ال کا آدمی اندر داخل ہوا تو مہندر اس کی شکل دیکھتے ہی سہم گیا۔ وہ مسلح تھا، لمبی ڈاڑھی اور خوشنور صورت۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خوشنور نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا پھر مہندر کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہندر سے پوچھا۔ ”کیا ہر دیو مہندر تیرا ہی نام ہے؟“

مہندر نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہر دیو مہندر میرا ہی نام ہے آپ کون ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں کو تو ال کا آدمی ہوں۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا تو اجیر، ہانسی، ملتان، لاہور اور بدایوں بھی گیا تھا؟“

مہندر ہر دیو نے کہا۔ ”ہاں، میں نے ان مقامات کی سیاحت کی ہے مگر کیوں؟ کیا سیاحت کرنا جرم ہے؟“

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”سیاحت جرم نہیں ہے البتہ سلطان کے خلاف بگو اس کرنا جرم ہے۔“ پھر کہا۔ ”میں کو تو ال کا حکم لے کر آیا ہوں اور اس وقت تجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

مہندر ہر دیو کا برا حال تھا، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ بمشکل جواب دیا۔ ”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے سلطان کے خلاف کہیں بھی کوئی بات کی ہے لیکن انسان بات چیت کے وقت بے اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن ہے میری زبان سے کوئی ایسی بات نکلی ہو جس میں سلطان کا ذکر ہو۔“

اتنے میں خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اور مولانا احمد نیشاپوری بھی آگئے۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کا جائزہ لیا اور مہندر کی پریشانی کو محسوس کر لیا۔ کو تو ال کا نمائندہ ترک تھا۔ مولانا نیشاپوری نے اس سے ترکی میں باتیں شروع کر دیں۔

انہوں نے کہا۔ ”یہ ہمارا مہمان ہے اور حکومت کا ذاتی ہے اس کے علاوہ یہ حضرت کا مرید بھی ہے اور دیو گڑھ حکومت کے شاہی خاندان کا فرد ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر تمہیں میری رائے درکار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ تم کو تو ال کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ خود آ کر سلطان المشائخ سے بات کر لے۔“

کو تو ال کا آدمی بالکل اجڑا تھا۔ اس نے نہایت کرخست لہجے میں کہا۔ ”یہ باغی ہے اس نے کئی شہروں میں ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے کہا کہ میرے راجہ، رام دیو کو علاء الدین نے لوٹا تھا۔ ہندوؤں کو علاء الدین سے انتقام لینا چاہیے۔ ایسے سنگین جرم کی سزا موت ہے۔“

اسی وقت خواجہ نظام الدین کا خادم خاص خواجہ اقبال اندر داخل ہوا۔ اس نے کو تو ال کے آدمی سے کہا۔ ”حضرت نے فرمایا ہے کہ ہم ہر دیو کو نہیں جانے دیں گے، اپنے کو تو ال کو ہمارے پاس بھیج دو تا کہ اس سے ہر دیو کا جرم معلوم کیا جائے۔“

کو تو ال کے آدمی نے جواب دیا۔ ”مگر یہ تو بتا کہ تیرے حضرت کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ میں ہر دیو کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟“

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ ”حضرت روشن ضمیر ہیں۔“
 کوتوال کے آدمی نے برا سامنہ بنایا۔ ”میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ وہ کوتوال کے پیر ہوں یا وزیر کے پیر ہوں مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ میں تو شاہی مجرم کو لینے آیا ہوں۔ میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں مجرم اور اس کے حمایتیوں کے سر لے جاؤں گا۔“
 خواجہ سید محمد نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”کس کی مجال ہے کہ ہمارے مہمان کو ہمارے حضرت کی اجازت کے بغیر یہاں سے لے جائے۔“

کوتوال کے آدمی نے تلوار کھینچ لی۔ سید محمد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تلوار چھین لی۔ مولانا نیشاپوری نے سید محمد کی مدد کی۔ کوتوال کے آدمی کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ دونوں مرید بھائیوں نے اسے بے بس کر کے بٹھا دیا۔

اسی وقت علاء الملک کوتوال اپنے دس بارہ ہتھیار بند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے خواجہ سید محمد کو ادب سے سلام کیا۔ اس کی نظر جو نبی اپنے نائب پر پڑی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پوچھا۔ ”یہ کیا قصہ ہے؟“
 سید محمد نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ کوتوال نے اپنے نائب سے کہا۔ ”تم نے میرے پیر کی شان میں گستاخی کی، بہت برا کیا۔ میں نے پہلے بھی تمہاری شکایتیں سنی ہیں۔ تم کوتوالی واپس جاؤ، اگر آئندہ تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو تم نوکری سے الگ کر دیے جاؤ گے۔“

کوتوال کے آدمی اس کو لے کر چلے گئے، اب کوتوال ہردیو سے مخاطب ہوا۔ ”تو نے ملتان، لاہور اور اجیر میں فلاں فلاں ہندوؤں سے سلطان کے خلاف باتیں کیں یا نہیں؟“
 ہردیو نے جواب دیا۔ ”میں نے ملتان کے سوا کسی شہر میں کسی ہندو سے ملاقات نہیں کی اور چونکہ وہ میرے ہم وطن تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطان کے اس حملے کا ذکر کیا جو سلطان نے بادشاہ ہونے سے پہلے دیو گڑھ پر کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ حکومتوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کیا ہمارے ہندو راجا دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ ایسا نہیں کرتے؟“
 کوتوال نے کہا۔ ”تو سچا معلوم ہوتا ہے ملتان کے وہ ہندو گرفتار کیے جا چکے ہیں جنہوں نے تجھ سے باتیں کی تھیں وہ سب دہلی لائے جا چکے ہیں تم مجھے ہر بات سچ سچ بتا دو۔ میں تمہیں بچا لوں گا کیونکہ تم میرے پیر بھائی بھی ہو۔“
 ہردیو نے جواب دیا۔ ”میں نے سچ بات ہی کہی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔“
 کوتوال ہردیو کو خواجہ نظام الدین کے پاس لے گیا بولا۔ ”حضرت.....“

آپ نے فرمایا۔ ”علاء الملک کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے آدمیوں کو ستانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہردیو پاک دل اور پاک عمل ہے۔“
 کوتوال نے عرض کیا۔ ”آپ نے جو کچھ فرمایا ہے میں سلطان سے عرض کر دوں گا لیکن سلطان ہردیو کو دیکھنا بھی چاہتا ہے اس لیے میں اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”لے جاؤ ہردیو کو، سلطان اس کو دیکھ لے ہم سلطان کو دیکھ لیں گے۔“
 آپ کے تند و تیز لہجے نے کوتوال پر کچھ طاری کر دی۔ وہ ہردیو کے ساتھ اٹنے قدموں چل کر باہر نکلا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ہردیو کو بھی ایک گھوڑا پیش کر دیا گیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔
 شاہی محل کے قریب کوتوال نے گھوڑے سے اتر کر ہردیو کو بھی اتارا، اپنے آدمی سے تلوار لے کر ہردیو کے گلے میں ڈالی ہردیو کی پگڑی بھی اس کے گلے میں ڈال دی۔ اس حال میں وہ ہردیو کو لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔
 اس وقت بادشاہ ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوتوال نے ہردیو سے کہا۔ ”تو یہاں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔“

ہردیو نے جواب دیا۔ ”میں نے عرض جو کیا، میں بے گناہ ہوں۔“
 کوتوال نے سب کچھ سلطان کے گوش گزار کر دیا۔

علاء الدین کچھ دیر تو خاموش رہا، پھر ترکی زبان میں کوتوال سے کہا۔ ”اس کا چہرہ بھی اس کے دل ہی جیسا ہے۔ میں حضرت نظام المشائخ کی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ شخص پاک دل اور پاک اعمال ہے۔“

اس کے بعد سلطان نے ہردیو کے لیے ایک خلعت طلب کی اور اس کے لیے ملازمت کا اعلان کر دیا۔ کہا۔ ”اس کو ملازم رکھ لیا جائے کیونکہ حضرت نظام الدین نے اس کو بے گناہ کہہ دیا ہے۔“ پھر کہا۔ ”ہاں، میں دیو گڑھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

کوتوال نے عرض کیا۔ ”مجھے حضرت نے بتایا ہے کہ ہردیو اپنے والدین سے ملنے کے لیے دیو گڑھ جانا چاہتا ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”یہ اپنے ماں باپ کو دہلی بلوالے۔“ پھر اپنا فیصلہ سنایا۔ ”ملتان کے ہندوؤں کو بدایوں دروازے پر ہاتھیوں کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔“

بادشاہ نے یہ فیصلہ ترکی زبان میں سنایا تھا۔ کوتوال نے ہردیو کو فارسی میں سمجھایا۔ ”اب جب کہ تو رہا ہو چکا ہے، ادب سے بادشاہ کے روبرو جھک جا۔“

پھر خلعت بھی آگئی، وہ جسم پر موجود لباس ہی پر پہنا دی گئی۔ ہردیو نے ادب سے جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ بادشاہ نے اپنے وزیر خطیر الدین کو حکم دیا۔ ”ہردیو کے مناسب حال کوئی اچھی سی نوکری دی جائے۔“ کچھ دیر بعد کوتوال ہردیو کے ساتھ باہر آگیا مگر کوتوال نے ہردیو کو کھڑا کر کے دوبارہ دربار کا رخ کیا جب واپس آیا تو ہردیو نے اس سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ دوبارہ دربار میں جانے کا مطلب؟“

کوتوال نے جواب دیا۔ ”میں اپنے نائب کی بابت سلطان کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ میرے نائب کو بھی ہندوؤں کے ساتھ ہی بدایوں دروازے کے سامنے ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا جائے۔“

کوتوال ہردیو کو لے کر خواجہ نظام الدین کی خدمت میں پہنچا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ کچھ پریشان ہو گئے، فرمایا۔ ”علاء الملک! تو سلطان کے پاس واپس جا اور میری طرف سے سلطان کو بتا دے کہ سلطان کی حفاظت خود خدا کرے گا، سلطان ہر شر سے محفوظ رہے گا۔ رہ گیا انتقام، تو خدا خود مستقیم حقیقی ہے وہ خود بدلہ لے لے گا۔ وہ ہندوؤں کو ہلاک نہ کرے، بس دہلی سے جلا وطن کر دے اور ہندوؤں کے ساتھ تیرے نائب کو بھی معاف کر دیا جائے۔“ کوتوال نے عرض کیا۔ ”میں حضور کا ارشاد بادشاہ تک اسی وقت پہنچا دوں گا۔ بادشاہ جو جواب دے گا حضور تک پہنچا دوں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں جواب نہیں چاہتا، تم سے جو کچھ کہا گیا ہے ویسا ہی ہوگا، میں عمل چاہتا ہوں۔“ کوتوال چلا گیا تو آپ نے ہردیو سے کہا۔ ”بادشاہ کی مرضی ہے کہ تم دہلی میں رہو، بادشاہ کے لیے بھی ٹھیک ہے اور تمہارے لیے بھی۔ جاؤ سید محمد کے پاس رہو۔“

ہردیو نے عرض کیا۔ ”بادشاہ نے مجھے لباس بھی دیا ہے اور اشرفیاں بھی، ان کی بابت آپ کا کیا حکم ہے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”جو جس کا حصہ ہے اس کے پاس رہنا چاہیے۔ اشرفیاں اپنے والدین کو بھیج دو تاکہ وہ دہلی آجائیں۔“

بادشاہ نے خواجہ نظام الدین کی بات مان لی اور سب کو معاف کر دیا۔ ہردیو کو کوئی ملازمت نہیں مل سکی۔

بادشاہ اپنے سپہ سالار ملک کافور سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ملک کافور مذہباً ہندو تھا۔ اس نے سلطان کی صحبت میں رہ کر پورے ملک پر ہندو حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ ملک کافور نے سلطان کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور سلطان کے سات سالہ بیٹے شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ملک کافور اس بچے کی آڑ میں پورے ملک پر خود حکومت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ زیادہ دن حکومت نہیں کر سکا۔ علاء الدین خلجی کے بڑے بیٹے قطب الدین خلجی نے ملک کافور کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ملک میں یہ سارے ہنگامے برپا تھے اور آپ ایک گوشے میں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

سیرالاولیاء، امیر خورد۔ سیرالعارفين، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث فوائد الفواد، امیر حسن سنجرى۔ گلزار ابرار، محمد غوث مانڈوی۔ خیرالمجالس، ملفوظات چراغ دہلی

غیر ملکی کہانیاں

منظرِ امام

ہر مصنف اپنے دور... اپنے معاشرے اور اپنی رسم و روایات کی عکاسی کرتا ہے... منظرِ امام نے بھی جانے کتنی ہی ایسی یادگار کہانیاں تخلیق کیں۔ زیرِ نظر تحریر میں بھی غیر ملکی حالات و معاشرت کی جھلک نمایاں ہے۔ دنیا میں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مصنف انہیں سمیٹنے اور محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

انتہائی مختصر..... مگر جامع پر لطف تحریر..... ایک منفرد انداز

ہیں۔ پہلی کہانی ہے ”سب دسے“ یہ کہانی ہے اتھوئی ماسٹرو کی۔ اس میں آپ کہانی کے انجام پر دیکھی ہو جائیں گے اور آپ یہ جان لیں گے کہ موجودہ دور نے انسان کو کتنا بے بس اور کتنا مظلوم کر دیا ہے۔

غیر ملکی ادیبوں میں ویسے تو بے شمار نام ہیں جنہوں نے کمال کی تحریریں لکھی ہیں اور وہ انگریزی یا کسی اور زبان کے ادب میں کلاسیک کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ میں نے ایسی ہی کچھ کہانیوں کے ترجمے اپنے باذوق قارئین کے لیے کیے



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”سب وے۔۔۔ انتھونی ماسٹرڈ“

اس پر۔۔۔۔۔ بے شمار ذمے داریاں تھیں۔ ایک بیمار ماں، دو بہنیں، ایک بھائی جو ذہنی طور پر ایسا رمل تھا اور ہر مہینے اس کی مہنگی دوائیں آیا کرتی تھیں۔

باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر کی یہ ساری ذمے داریاں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لی تھیں۔

اس کے پاس کوئی خاص ملازمت بھی نہیں تھی۔ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ کچھ مہینوں تک اس فیکٹری کی تنخواہ سے گھر کا کام چلتا رہا اور پچھلے دو مہینوں سے فیکٹری کی جاب بھی ختم ہو گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ گھر کی ذمے داریاں اس کی مجبوری دیکھ کر تو ختم نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہیں تو ہر حال میں اپنی ڈیمانڈ پوری کروانی تھی۔

مکان کرائے کا تھا۔ اس لیے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کرایہ بھی درکار تھا۔ گیس اور بجلی کے بل بھی آیا کرتے اور وہ ان محکموں میں جا کر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ دیکھو بھائیو۔ میں ایک بے روزگار انسان ہوں۔ ابھی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

ماں، دونوں بہنوں اور اس پائل بھائی کو بھوک بھی لگتی تھی۔ مفلسی بڑھ جائے تو پھر کھانے کی ہوس بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور خود اس کا بھی اپنا پیٹ تھا۔ اپنے اخراجات تھے، یہ سب کچھ کیسے پورے ہوتے۔ پھر ایک دن اچانک کسی فرم سے اس کے موبائل نمبر پر کسی کی کال آ گئی۔

”مجھے مسٹر نعمان سے بات کرنی ہے۔“

”جی۔ میں نعمان ہی بول رہا ہوں۔“

”آپ کل صبح میڈورا پہنچ جائیں۔“ دوسری طرف

سے کہا گیا۔ ”یاد رکھیں ٹھیک نو بجے۔ ہمارے یہاں لیٹ ہونے والوں کو برداشت نہیں کیا جاتا۔“

”لیکن جناب۔ یہ میڈورا۔“

”آپ شاید بھول رہے ہیں۔ آپ نے دو مہینے پہلے

اپنی سی وی بھیجی تھی۔ اس میں آپ کا موبائل نمبر بھی تھا۔“

”اوہاں۔ جی جناب۔“ نعمان کو اچانک یاد آ گیا

تھا۔ ”جی جناب، یاد آ گیا۔“

”کل صبح نو بجے۔“ پھر کہا گیا۔ ”اور ہمارے منجر

درانی صاحب کو رپورٹ کریں۔“

نعمان چپک اٹھا تھا۔ یہ کیسی خبر تھی؟ اتنی بڑی خبر

اچانک مل گئی تھی۔ وہ تو میڈورا والوں کو سی وی دے کر بھول

ہی گیا تھا اور اب وہ اسے بلارہے تھے۔

اس نے جب اپنے گھر والوں کو اس بارے میں بتایا تو

ان سب کی بھی ہوئی آنکھوں میں چراغ سے جل اٹھے تھے۔

اس کی ماں تو اسی وقت شکرانے کی نماز ادا کرنے بیٹھ

گئی تھی۔ اس کی دونوں بہنوں نے گنگنا شریوع کر دیا تھا۔

ایسے حالات میں اگر اچھی خبر مل جائے کہ اب گھر میں فاقے

نہیں ہوں گے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے بارش کے بعد

پودے لہلہانے لگتے ہیں۔ یہ مر جھائے ہوئے چہرے اس خبر

ہی سے شاداب ہو گئے تھے۔ بس کچھ دنوں کی بات اور تھی۔

تنخواہ ملتے ہی سب ٹھیک ہو جاتا۔ اب ایک امید تو ہو چکی تھی

اور جب امید زندہ ہو جائے تو پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دوسری صبح وہ سات بجے ہی گھر سے نکل گیا۔ پہلا

دن تھا اور اسے بڑی سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نو بجے

تک اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جائے۔

نو بجنے میں ابھی بہت دیر تھی، وہ بہت آرام آرام

سے پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت بس اسٹاپ پر صرف دو آدمی تھے

اور اب وہ تیسرا ان میں جا کر شامل ہو گیا تھا۔

اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے موبائل جیب سے نکال کر نمبر دیکھا۔ یہ فون

افشاں کا تھا۔ اس کی دوست، جس کے ساتھ مل کر اس نے

زندگی کے خواب دیکھے تھے۔

افشاں کو یہ امید تھی کہ بہت جلد نعمان کے حالات

درست ہو جائیں گے۔ اسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے

گی اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

نعمان کو یاد آیا کہ وہ افشاں کو اپنی جاب کی خبر دینا

تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ ان دونوں آدمیوں سے ہٹ کر کچھ

فاصلے پر ایک درخت کے پاس آ گیا اور اچانک اس درخت

کی آڑ سے ایک شخص نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ نعمان

اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔

وہ شخص سیدھا نعمان کے پاس آ گیا۔ وہ بہت جلدی

میں اور گھبراہٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نعمان نے اس کے

ہاتھ میں تیز چمکتے ہوئے چاقو کی جھلک دیکھ لی تھی۔

”لا جلدی یہ موبائل دے۔“ وہ آدمی کسی سانپ کی

طرح پھنکارا۔

”کیا.....!“ نعمان ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اس ناگہانی

سچویشن کو سمجھ ہی نہیں پایا تھا اور سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔

اس آدمی نے وہ تیز چمکتا ہوا چاقو نعمان کے بازو میں

اتار دیا تھا۔ نعمان ایک چیخ کے ساتھ گرنے لگا۔

صرف ایک لمحہ۔ اس ایک لمحے میں اس شخص نے

نعمان کے ہاتھ سے موبائل چھین کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

رہی تھی اور مرد وہاڑ رہا تھا۔ وہ عورت کو غلیظ... گالیاں دے رہا تھا۔

وہ بچہ ایک صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔ شاید یہاں کوئی اس کو نہ دیکھ سکے لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ وہ یہاں بھی زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکے گا۔ پہلے وہ عورت چنتی، روتی ہوئی باہر نکلے گی۔ پھر وہ آدمی دھاڑتا ہوا اس کے پیچھے کمرے سے برآمد ہوگا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ ہوگی جس سے وہ عورت کو بری طرح مار رہا ہوگا۔ پھر اس آدمی کی نگاہ صوفے کے پیچھے جائے گی اور وہ اسے دکھائی دے جائے گا۔ وہ اس عورت کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکے گا اور بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لاؤنج کے وسط میں لے آئے گا اور اب چمڑے کی بیلٹ سے اسے مارنا شروع کر دے گا۔ بہت بری طرح مارے گا۔

وہ مار کھاتا جائے گا اور روتا جائے گا۔ اس کو بچانے کے لیے وہ عورت بے تاب ہو کر آگے بڑھے گی لیکن وہ شخص اسے پھر سے مارنا شروع کر دے گا۔ وہ مار کھانے اور چیخنے والی عورت اس بچے کی ماں ہے اور یہ بے رحم شخص اس کا سوتیلہ باپ ہے۔

اپنے پہلے شوہر کی موت کے بعد اس عورت نے بہت مجبور ہو کر اس شخص سے شادی کر لی تھی کیونکہ اس کے پاس خود کھانے اور اس بچے کو کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ شروع کے چند دنوں تک وہ دوسرا شوہر ٹھیک ٹھاک رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی بے رحمی سامنے آتی چلی گئی تھی۔ اس نے بے تحاشا شراب نوشی شروع کر دی۔ پھر مار دھاڑ شروع کر دی تھی۔

بہتے میں کم از کم تین چار دن ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کو بری طرح مارتا اور گالیاں دیتا ہوا گھر سے باہر چلا جاتا۔ اس کے جانے کے بعد وہ عورت بچے کو لپٹا لیا کرتی۔ دونوں روتے اور سسکتے رہتے۔ آج بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔ وہ لڑکا بہت بری طرح خوفزدہ تھا۔ کمرے سے شور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ کسی وقت بھی وہ دونوں باہر آجاتے۔ پھر وہی سب کچھ ہوتا۔

اس لڑکے کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی سوائے اس دوسرے کمرے کے۔ اس سے پہلے کہ کمرے کا دروازہ کھلتا، وہ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور یہاں آتے ہی وہ آوازیں اچانک ختم ہو گئیں۔ سنانا اور تنہائی۔ سامنے ایک بڑا آئینہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ وہ اب ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔

اسٹاپ پر کھڑے ہوئے وہ دونوں شخص بھی صورت حال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ نعمان کی چیخ نے انہیں متوجہ کیا تھا۔ نعمان کی پوری قمیص خون آلود ہو رہی تھی۔ خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بے پناہ تکلیف کی شدت سے اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے بہت مضبوطی سے اپنے زخم کو زور سے پکڑ لیا تھا۔

”ارے کیا ہوا؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔
”وہ۔ وہ میرا موبائل۔ چاقو مار کر لے گیا۔“
”او خدا۔ ایسے لوگ غارت کیوں نہیں ہو جاتے۔“
دوسرے نے کہا۔

اس دوران اور بھی دو چار لوگ وہاں آگئے تھے۔ اس حادثے نے ان سب کو ہی پریشان کر دیا تھا۔ وہ سب اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔

نعمان کا خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اب اندھیرا اچھانے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے خون کو اس بے دردی سے ضائع ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔
”پولیس کو بلاؤ جلدی۔“ کوئی زور سے چیخا۔

”ارے۔ ایسپولینس کو فون کرو۔ اس کو اسپتال پہنچاؤ۔ اس کا خون ضائع ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے اور گاڑھے ہونے لگے۔

اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ لہراتا ہوا ڈھیر ہو گیا اور اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ صرف ایک پریشانی تھی۔

اگر اسے دفتر میں دیر ہو گئی تو پھر..... پھر کیا ہوگا؟
یہ تھی ایک کہانی۔ انسان کے ساتھ کسی مجبور یاں ہوتی ہیں۔ اب یہ ہے دوسری کہانی۔ نیویارک ٹائمز نے اس کہانی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ خوب صورت کہانی ہے۔ اس کہانی کا عنوان ہے ”شور“ اور اسے لکھا ہے ”گرین۔ بے۔ نے۔“

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا اور اس گھر کا وہ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ اس لاؤنج کے ساتھ دو کمرے تھے۔

وہ آواز ایک کمرے سے آرہی تھی۔ چیخنے چلانے کی آواز۔ کسی عورت کے رونے کی آواز..... پھر ایسی آواز جیسے کوئی کسی کو مار رہا ہو۔

وہ بارہ تیرہ برس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ چھپ جانا چاہتا تھا۔ کہاں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے کمرے سے عورت کے رونے اور چیخنے کی آوازیں میں شدت آگئی تھی۔ وہ بلبلاتا

اس سے چھن گئی تھی۔ اس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی اظہار نہیں کیا۔ بس اندر ہی اندر سلگتا چلا گیا۔ چھ مہینے گزر گئے اور اس دوران اس لڑکی نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کی زندگی میں آنے والا یہ نیا لڑکا اتنا مخلص نہیں ہے جتنا مخلص وہ تھا۔ جو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ محبت کہتے کسے ہیں۔

اس نے بہت جھجکتے ہوئے اس لڑکے کو فون کیا۔ ”سنو۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے لڑکے سے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”پلیز۔ اسی پارک میں آ جاؤ جہاں ہم ملا کرتے تھے۔“

”ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔“ پہلے کی طرح آج بھی وہ لڑکا وقت سے پہلے آیا ہوا تھا۔ لڑکی اس کے سامنے شرمندگی سے گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں بتاؤ، کیا بات ہے؟“ لڑکے نے پوچھا۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”مجھے تمہاری محبت کی طاقت کا احساس ہو گیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔“

لڑکا حیرت زدہ سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لڑکی بولے جا رہی تھی۔ ”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں جان گئی ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ تم نے مجھ سے کتنی محبت کی ہے۔“

”سنو۔“ لڑکا کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے اپنے جس کردار اور جس قسم کی بے وفائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد کوئی بے وقوف ہی تم پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ سمجھیں؟“ لڑکی سکتے میں رہ گئی۔ لڑکے کا جواب اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ جانے لگی تھی کہ لڑکے نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”اور ایک بات اور سنتی جاؤ۔“

لڑکی رک گئی۔ وہ لڑکے کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ لڑکا اس کے پاس آ گیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ کوئی بے وقوف ہی تم پر بھروسہ کر سکتا ہے اور وہ بے وقوف میں ہوں۔ سمجھیں؟“ لڑکی نے حیران ہو کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر روئے جا رہے تھے۔

جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ جس کے کپڑے اس کے نحیف جسم پر جھول رہے تھے۔ وہ آوازیں اس کے ماضی کی تھیں۔ جب وہ بارہ تیرہ برس کا تھا اور اس کے ساتھ یہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ وہ اب ساٹھ برس کا ہو چکا تھا لیکن وہ آوازیں اس کے تعاقب میں آج بھی تھیں۔ وہ جب بھی کام سے شام کو گھر واپس آتا، گزرے ہوئے دن زندہ ہو کر اس کے سامنے آ جاتے۔ وہ ساٹھ برس کا بوڑھا نہیں، بارہ تیرہ برس کا بچہ ہو جاتا۔ ڈرا اور سہا ہوا بچہ۔ کمرے سے ماں کے چیخنے اور اس کے سوتیلے باپ کے دھاڑنے کی آوازیں آنے لگتیں اور وہ خوفزدہ ہو کر صوفے کے پیچھے چھپ جایا کرتا۔

”بے وقوف۔ مار تھا۔“

دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ خاص طور پر لڑکا۔ جس کی زندگی وہ لڑکی ہو کر رہ گئی تھی۔ دن بھر میں جب تک وہ ایک بار اسے دیکھ نہیں لیتا، اسے سکون نہیں ملتا تھا۔

دونوں الگ الگ دفاتروں میں کام کرتے تھے۔ پانچ بجے دفتر آف ہوتے ہی دونوں اپنے مقررہ مقام پر پہنچ جاتے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ لڑکا کبھی دیر سے پہنچا ہو۔ عام طور پر وہ لڑکی سے پہلے موجود ہوتا تھا۔ پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قریبی پارک کی طرف چلے جاتے۔ بہت دیر تک پارک کی سیر کرتے رہتے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک خواب تھا۔ ایک چھوٹا سا اپنا فلیٹ، خوبصورت فرنیچر، ہلکی پھلکی پیار بھری زندگی۔ اسی لیے دونوں اپنی اپنی جگہ کام کیے جا رہے تھے۔ ایک بہتر آنے والے کل کے لیے۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے لیکن کب؟ اس کی تاریخ ابھی طے نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اشیاء کے لیے تنگے اکٹھے کیے جا رہے تھے۔ پھر اچانک کچھ ہو گیا۔

ایک ایسا واقعہ جو اس لڑکی کے مقدر میں ہی نہیں ہوگا۔ شاید اس لڑکی نے یہی سوچا ہوگا کہ وہ کب تک اس کے انتظار میں رہے گی۔

اس نے کسی اور سے دوستی کر لی۔ اب وہ کسی اور پارک میں کسی اور کے ساتھ جایا کرتی کیونکہ اس لڑکے کا مستقبل شاندار تھا۔ وہ انجینئر بننے جا رہا تھا۔

وہ لڑکا اس لڑکی کی بے وفائی سے بکھر کر رہ گیا۔ اس بے چارے کی زندگی میں بس وہی ایک خوشی تھی اور اب وہ خوشی بھی

مجھے فوراً ہی الیاس کی حالت کے بارے میں اندازہ ہو گیا۔
”آئیے!“ ثریا نے آنسو صاف کرنے یا چھپانے کی
نا کام سی کوشش کی۔ ”وہ اندر ہیں۔“

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ لاؤنج
عبور کر کے ہم اندر داخلے کے کمرے کے دروازے
پر پہنچے۔ ثریا نے پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس
کے عقب میں کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے بستر پر میرا دوست
لیٹا ہوا تھا، پروفیسر الیاس صدیقی۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی
کہ اس کا کمین شدید علالت سے دوچار ہے۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر
دواؤں کی شیشیوں کا انبار تھا۔ کمرے میں وہی بے ترتیبی اور
بوجھل پن تھا جو کسی بیمار کے گھر میں ہوتا ہے۔ ثریا چند لمحوں
چپ چاپ کھڑی رہی، پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔

کال ٹیبل کے جواب میں اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ
ڈر اساکھلا۔ ایک رنگین آفیل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور پھر
ایک نسوانی آواز آئی۔

”کون صاحب ہیں؟“

”بھائی! میں ظہیر احمد ہوں، الیاس کیسے ہیں؟“
”اوہ، ظہیر بھائی!“ ایک دہی ہوئی تسکین سی ابھری۔
”اتنے دن بعد آئے آپ!“

دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ میرے سامنے ثریا کھڑی
تھی۔ بال بکھرے، لباس اچھا خاصا لیکن بے ترتیب۔ اندازہ ہوتا
تھا کہ تین چار دن سے تبدیل نہیں کیا۔ چہرہ زرد اور پریشانی کا
منظر، آنکھوں میں نمی کی جھلک۔ میں نے بے غور اس کا جائزہ لیا۔
بیوی کی حالت، خاوند کی حالت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ثریا کو دیکھ کر

آب حیات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آب حیات پانے کے لیے انسان کو مقصدِ حیات پر توجہ دینا
ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر انسان دائمی زندگی حاصل کر پاتا
ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد ہر ایک کا نام زندہ نہیں رہتا مگر جس
کا رہتا ہے وہ یقیناً منزلِ پانے کی جستجو میں ایک لمبی
مسافت طے کرتا ہے۔

موت کے بعد زندگی پانے والے ایک حساس دل کا قصہ



”اب تو کھنٹوں سوتے رہتے ہیں کچھ ہوش نہیں رہتا۔“

میں نے ثریا کو چپ رہنے کا اشارہ کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بیمار دوست کے آرام میں خلل آئے۔

اسی دوران میں ثریا نے وہ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ مجھے اسے روکنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ شاید وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ کچن میں جا کر پہلے دل بھر کر روئے گی پھر چائے بنا کر لائے گی۔ لہذا میں ذرا جم کر بیٹھ گیا اور گہری نیند سونے ہوئے الیاس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

پروفیسر الیاس صدیقی عمر کے ڈھلتے ہوئے حصے میں تھا۔ نحیف و خازاتوں وہ گویا پیدائشی تھا۔ کالج کے شریروں نے اس کا نام ”پروفیسر سینک سلائی“ رکھ چھوڑا تھا۔ یہ نام سب کو معلوم بھی تھا لیکن جب ”پروفیسر سینک سلائی“ کو اپنے اس لقب پر اعتراض نہیں تھا تو مجھے کیا ہوتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر جو سکون اور اطمینان تھا وہ بے حد غیر معمولی تھا، ورنہ بہت سے لوگ تو ذرا بھی بیمار پڑتے ہیں تو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن پروفیسر الیاس صدیقی کے پرسکون اور گہری طمانیت میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خون کے سرطان میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی شاید سال بھر سے زیادہ کی نہیں رہے گی تھی۔

ثریا کو بھی احساس تھا کہ اس کا سہاگ زندگی کے آخری کنارے پر ہے لیکن اس مرحلے پر دعا کے سوا اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر انسان کو اپنی وقعت معلوم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر الیاس صدیقی کا نہایت پرسکون اور معصوم سا چہرہ، میرے سامنے تھا اور میں خود نقش حیرت بنا اسے تنک رہا تھا۔

ہم دونوں یعنی میں، ظہیر احمد طبعیات (فزکس) کا پروفیسر اور الیاس صدیقی، کیمیا (کیمسٹری) کا پروفیسر ایک ہی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہمارے شعبے بالکل مختلف تھے لیکن کالج کی دن بھر کی رفاقت اور آپس میں ایک خاص قسم کی ذہنی قربت اور ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ یوں تو کالج میں اور بھی پروفیسرز تھے لیکن میری زیادہ دوستی، الیاس سے ہی تھی، یہی وجہ تھی کہ بہت سارے معاملات جن میں الیاس کسی اور سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا، مجھ سے بلا تکلف بیان کر دیتا تھا یہی صورت حال میری تھی، ہماری دوستی کسی ہم رازی کی حدود میں پہنچ چکی تھی۔

..... الیاس ایک قابل کیمیا دان تھا۔ اس کا بیشتر وقت تدریس کے بعد کیمیا کی تجربہ گاہ میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے نئے تجربات سے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا جو کبھی میری سمجھ میں آتے، کبھی بالکل نہیں۔ بہر حال میں اپنے دوست کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا تھا کہ یہ بھی دوستی کے فرائض میں سے ایک ہے۔

الیاس ایک محبت کرنے والی، وفادار اور سلیقہ شعار بیوی کا خاوند بھی تھا۔ البتہ اس کی زندگی میں ایک کمی تھی کہ اس کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ثریا کو عورت ہونے کے ناتے، اس کا شدید احساس تھا لیکن بہر حال وہ خاوند کے ساتھ خوش تھی اور وہ اس کے ساتھ شاید اس خلا کو پر کرنے کے لیے وہ لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا یا پھر شاید خود اس کے اندر خدا داد صلاحیت نے سر اُبھارا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ مجھے اپنے افسانے اور کہانیاں پڑھنے کے لیے دیتا جن میں سے بعض ادبی رسائل و اخبارات میں بھی چھپیں۔ اس لحاظ سے وہ تھوڑا بہت جانے پہچانا جاتا تھا لیکن باضابطہ طور پر کسی ادبی حلقے میں نہ وہ خود گیا، نہ اس نے کسی ادبی جریدے سے وابستگی اختیار کی۔ اسے وقت گزاری کا ایک مشغلہ کہا جاسکتا تھا۔ یہ تھا اس کی کل زندگی کا خاکہ۔

ایک سیدھا سادہ بلکہ آج کل کے حساب سے بدصوم کا پروفیسر جس میں کوئی نیاپن، کوئی رنگینی، کوئی رعنائی کم ہی تھی۔ اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا جو شاید صرف مجھے ہی معلوم تھا۔ غالباً ثریا کو بھی اپنے خاوند کی شخصیت کے اس پہلو کا پوری طرح اندازہ نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ شاید اس موضوع پر اپنی بیوی سے بھی بات نہیں کرتا ہوگا۔ وہ پہلو یہ تھا کہ اس کی سوچ کا دھارا اکثر فطرت کی مخالف سمت بہتا تھا۔ اس وجہ سے کالج کے دوسرے ساتھی اساتذہ اسے خطی سمجھتے تھے۔ ممکن تھا کہ میں بھی اسے ایسا ہی سمجھتا لیکن اس سے میری ذہنی قربت مجھے اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ میں اسے خطی نہ سمجھوں، بلکہ اس کی گفتگو کی تہ میں اتر کر دیکھوں جو عام لوگوں سے ہٹ کر ہوتی تھی۔

شاید پورے کالج میں، میں ہی واحد شخص تھا جو اس... پُر اسرار سے اچھے ہوئے پیچیدہ شخص کی گفتگو غور سے سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ پروفیسر الیاس صدیقی میرا دوست جو اپنی ذات میں شاید کسی پیچیدہ کیمیائی فارمولے کی طرح ہی تھا جو ایک نظر میں ممکن ہے بہت سے لوگوں کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ لیکن جب گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس میں کسی انوکھی تخلیق کے اجزائے ترکیب پاتے نظر آجائیں، شرط صرف حسن نظر کی ہوتی ہے اور یہ خود میری ہی کمزوری تھی کہ میں ابھی

اس نے یہ غور مجھے دیکھا اور بولا۔ ”ظہیر..... تم نے زندگی کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح میں کرتا ہوں مگر اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں ہے۔ تم فزکس کے پروفیسر ہونا اس لیے زندگی کو بھی ایک مادے..... محسوس مادے کی طرح سمجھتے ہو۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو رہا اور میں اس کی بات سے کچھ اخذ کرنے کی سعی میں لگ گیا۔

مجھے خاموش پا کر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
”اب تم یہی دیکھ لو..... میں کیمسٹری کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اپنی ذاتی رائے اور نظریے کے مطابق زندگی کے لیے ایک الگ تعریف رکھتا ہوں جس کے تحت زندگی کچھ ایسے عناصر کی ترتیب کا نتیجہ ہے جو باہم مل کر کپاؤنڈ بناتے ہیں اور پھر ایک مضبوط اور مکمل بانڈ بناتے ہیں۔“

میں نے اس کی ابھی ہوئی سی گفتگو کو کسی نتیجے پر پہنچانے کی غرض سے کہا۔ ”چلو..... یہ قول تمہارے، زندگی کو دوام مل جائے تو یہ اور حسین ہو جائے گی..... مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ زندگی جیٹھی پالے؟“

”ممکن ہے..... میں اسے ممکن بناؤں گا۔“ وہ بے ساختہ بولا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ پرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

”میں کچھ ایسے طاقت ور عناصر کو کبائٹ کرنا چاہتا ہوں جن سے انسانی زندگی کو بیشک عطا ہو جائے اسے کبھی موت نہ آئے..... میں ایک ایسے ہی سربستہ راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں..... ایک انوکھی ایجاد کرنا چاہتا ہوں جو میری زندگی کو دائمی بنا دے اور مجھے کبھی موت نہ آئے۔“

”گویا تم آپ حیات قسم کی کوئی چیز ایجاد کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”قطعاً طور پر۔“ وہ یکدم بولا اور میں اس کی اس نامعقول بات سے آج کے جدید اور سپر سائیک سائنسی دور کا موازنہ کرنے لگا۔ میرے اندر کھد بدی ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا۔

”یار! کیا بات کر رہے ہو تم، خود تم سائنس کے پروفیسر ہو اور ایسی بات پر بھی یقین رکھتے ہو..... یہ مقام حیرت نہیں؟ یہ تو پرانے وقتوں کی قصے کہانیوں کا موضوع رہا ہے۔“

”نہیں..... قطعاً نہیں۔“ وہ فوراً اختلاف کرتے ہوئے قدرے زوردار لہجے میں بولا۔

”ظہیر! دور آفرینش سے، جب انسان کی عقل نے ستاروں پر کندیس نہیں بھینکی تھی تو وہ سورج، چاند کو دوتا مانتا تھا اور آگ کی بھی پوجا کرتا تھا، حتیٰ کہ کرہ ارض پر ہونے والی

تک اس کے بھید کو نہیں پاسکا تھا۔ ہاں اس کی تہ میں اترنے کی کوشش ضرور کرتا تھا جبکہ باقی لوگوں کے لیے وہ ایک خطی پاگل اور سودا کی تھا۔

اسے مزید سمجھنے کے لیے میں نے اس کی تحریریں بھی پڑھی تھیں۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں میری سمجھ میں آ جاتی تھیں مگر افسانے تو میرے سر سے گزر جاتے تھے، یا پھر شاید میری اپنی ذہنی سطح اس مقام تک نہیں پہنچی تھی، تاہم اس ضمن میں اس کا کہنا تھا کہ ہمارے ادبی جنگادوں نے علامتی افسانے کو لامتی بنا کر ہی چھوڑا اور اس میں کہانی ڈال دی، جبکہ دیکھا جائے تو ہمارا اردو ادب علامتی افسانے سے مشہور ہوا۔ اس کے استعاروں میں آگہی، شعور اور وسعت خیال کی جھلک ملتی ہے۔ نئی پریم چند کا افسانہ کفن، ندیم کا الحمد للہ اور ”ابا پہلے کیوں نہیں مر گئے“ جیسے افسانوں کی بھی اس نے مجھے مثالیں دیں مگر مجھے اردو ادب سے کہاں دلچسپی تھی۔ میں اس کی باتوں پر سر ہی دھنسا۔

”ثیلا چائے لے کر آگئی۔ اتنی دیر میں، میں یہ سب کچھ گویا پل بھر میں سوچ چکا تھا۔

الیاس بہ دستور محو خواب تھا۔ ”ثیلا نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے تھما دی اور دوسری خود سنبھال لی۔ میں نے ایک نظر اسے دوبارہ دیکھا اس کا چہرہ غم و اندوہ اور فکر سے ستا ہوا تھا۔ میں نے رمی تسلی کے چند کلمات ادا کرنے کے بجائے اس کے گھرانے یعنی میکے کی باتیں شروع کر دیں۔ توفع کے مطابق پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور وہ مجھے اپنی والدہ اور بھائیوں کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی۔

چائے کے بعد ”ثیلا برتن سمیٹ کر لے گئی تو میں الیاس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ مجھے سرما کی وہ صبح یاد آگئی جب گرم دھوپ میں ہم دونوں کالج کے ایک الگ گوشے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے توجہ دلانے پر گفتگو کا آغاز اسی نے کیا تھا۔

”یار ظہیر! زندگی واقعی بہت خوب صورت ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ اس کا گہری سوچ میں ڈوبا چہرہ کسی انوکھے تاثر کا حامل تھا۔

”بے شک۔“ میں نے مختصر کہا۔

”لیکن ظہیر! اگر اس خوب صورت زندگی کو دوام مل جائے تو کیا اس کے حسن میں مزید اضافہ نہیں ہو جائے گا۔“ اس نے پرسوچ انداز میں کہا۔

”قطعاً نہیں۔“ میں نے بلا تعویق و تامل کہا۔ ”پھر یہ زندگی حسین نہیں بلکہ سنگین ہو جائے گی۔“

آنکھیں میچ لیں میرے تیسری بار آواز دینے پر اس نے اب باقاعدہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی نامعلوم سے تاثر کا ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا پھر اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ابھری اور وہ ”تم“ کہتے ہوئے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے فوراً ہی اسے سہارا دے کر زبردستی لٹا دیا۔

”الیاس! تم نے یہ کیا کیا..... مجھے بھی خبر تک نہیں دی تم تو ثریا کے ساتھ ایسے غائب ہوئے کہ میں جب بھی آیا تمہارے اپارٹمنٹ پر تالا ہی ملا۔ کوئی خط تک نہیں لکھا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی! میں نے شکایات کا دفتر کھول دیا۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

”بس یار! معاف کر دو، ایسے چکروں میں تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکا۔ تم کچھ خیال نہیں کرتا۔“ اس نے رک دک کر کہا۔ ”اور تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے، ثریا کا خیال بھی نہیں کیا۔ اس کا کون ہے تمہارے بعد؟ اتنے بیمار تھے تو اطلاع کرتے، ہم لوگ کچھ کرتے.....“ میں نے دوستانہ غصہ دکھایا۔

میری بات پر وہ نقاہت بھرے انداز سے مسکرا دیا۔ ”ظہیر..... کچھ نہیں ہوا مجھے..... کچھ بھی نہیں ہوگا مجھے یار.....!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ مجھے اس کے لہجے میں وہی ہٹیلاپن اور اسی روایتی خود اعتمادی کی جھلک محسوس ہوئی جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بیماری وغیرہ کے بارے میں اس سے استفسار کرنا محض روایتی اور فرسودہ ہی نہیں بلکہ بار بار اسے ایک ہی کڑوی گولی کھلانے کے مترادف ہوگا لہذا میں ماحول کی کدورت کو دور کرنے کی غرض سے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... ہاں یار! مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بھلا ایسے انسان کو کیا ہو سکتا ہے جس نے بذاتِ خود موت کو شکست دینے کی ٹھان رکھی ہو۔“

میں نے غیر محسوس طریقے سے اسے ایک پرانے موضوع کی یاد دلا دی تھی اور شاید وہ بھی میرا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا اب اس کے پرشمرہ چہرے پر زندگی کے اجلے رنگ بکھر گئے تھے۔

”میں جانتا تھا ظہیر کہ تم ضرور آؤ گے بلکہ میں یہ بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم میری عیادت کے لیے نہیں..... کسی اور مقصد کے لیے آئے ہو۔“

”ہاں! شاید تم درست کہہ رہے ہو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اچھا مجھے بتاؤ کہ وہ تمہارا ”آبِ حیات“ والا فارمولا کیا ہوا؟“ میں نے گہرے تجسس سے پوچھا۔

تبدیلی آب و ہوا کو بھی پوچتا..... لیکن پھر جیسے جیسے عقلِ انسانی شعور کی بلندیوں تک پہنچنے لگی تو کائنات کے راز ہائے سربستہ اس کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے گئے..... یہ آبِ حیات بھی بے شک گئے وقتوں کا ایک سربستہ راز ہے لیکن ہنوز آج تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اسے محض قصے کہانیوں کا موضوع سمجھتے ہوئے جھٹلایا جاتا رہا..... لیکن میں اسے ایک دن ضرور بے نقاب کروں گا۔“

چاروں طرف جیسے ایک گھبر خاموشی چھا گئی تھی۔ چند ثانیے بعد الیاس مجھ سے راز دارانہ لہجے میں بولا۔

”دیکھو دوست! اس بات کو انجی اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اگر میں آپ حیات بنانے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکو گے..... کیونکہ تم میرے دوست ہو..... ایک اچھے اور سنجیدہ دوست۔“

وہ آخر میں عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر بولا اور پھر جانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی اور جب میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو عقب سے اس کے قہقہے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔

زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چلی جا رہی تھی۔ وہی صبح کا لُج جانا، واپسی پر گھر کے فرائض..... پھر اگلے دن کا سورج وہی پیغام لاتا لیکن اب ایک تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ الیاس اب کچھ زیادہ ہی مصروف اور مجھ سے بھی کچھ دور دور رہنے لگا تھا۔ دوسرے ساتھی اساتذہ پہلے ہی اسے زیادہ منہ لگانے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ رکی سلام دعا سے زیادہ اس کی بات چیت کسی سے بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب تو وہ اکثر پھر دیتے ہی کالج سے گھر چلا جاتا۔ پھر ایک دن کالج سے لمبی رخصت لے کر چلا گیا اور اس دوران میں اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

لگ بھگ دو ڈھائی ماہ کا عرصہ خاموشی سے گزر گیا پھر ایک دن الیاس کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور یہ اطلاع ملتے ہی آج میں اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ گہرے سکوت کی چادر اوڑھے میرے سامنے لیٹا تھا۔ یکن سے برتن دھونے کی آواز خاموش ہو چکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے الیاس کو جگانے کی ہمت نہیں ہو پارہی تھی لیکن صرف چن رہ کر بھی تو عیادت نہیں کی جاسکتی۔

”اے..... الیاس.....“

آخر میں نے اس کا شانہ ہولے سے ہلا کر اسے آواز دی۔ دو تین بار ہلانے اور آواز دینے پر اس نے اپنی خوابیدہ آنکھیں دھیرے سے کھولیں اور بے اختیاری کے عالم میں

ٹی۔ میں اور کالج کے دیگر افراد اور لیکچرار اور بہت سے طلباء الیاس صدیقی کی تدفین میں شریک ہوئے۔ سوئم میں بھی کالج سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد خاصی تھی۔ ایک دو روز تک الیاس صدیقی کا تذکرہ ہوتا رہا پھر ایسا لگا کہ لوگ اسے بھول بھال گئے۔ انسان کا حال یہی ہے، اپنے قریب ترین عزیز کی موت پر خوب روتا چلاتا ہے لیکن کچھ ہی دنوں بعد زندگی کی دیگر دلچسپیوں میں گھو کر گویا اپنا غم بھول جاتا ہے۔

☆☆☆

اس دن موسم خاصا خوشگوار تھا مگر میری طبیعت پر جانے کیوں قنوطیت سی طاری تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات تھیں۔ فارغ بیٹھنے کے لیے ایک لگے بندھے معمول کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اکتاہٹ مارے ڈالتی ہے۔

میں پونہی ایک دن شہر کے مرکزی بازار آ گیا۔ ایک مہک اسٹال سے کوئی اخبار خریدتے ہوئے اچانک نظر شیشے کے شلف میں رکھی ایک کتاب پر پڑی اور میں چونک گیا۔ میں نے وہ کتاب نکلوائی اور یہ غور اس کے سرورق کو دیکھنے لگا جس پر جلی حروف میں کتاب کا عنوان ”آب حیات“ اور نیچے مصنف کا نام پروفیسر الیاس صدیقی تحریر تھا۔ یہ کوئی ضخیم ناول تھا جو میرے مرحوم دوست الیاس صدیقی ہی کا تحریر کردہ تھا۔ میں وہیں کھڑا ہو کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

مذکورہ ناول کا فلیپ ایک بڑے کہنہ مشق ادیب اور تنقید نگار کا تحریر کردہ تھا جس میں انہوں نے فاضل مصنف کی کتاب پر اپنی مستدرائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

”زیر نظر ناول ”آب حیات“ کو حال ہی میں اگرچہ ایک بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا ہے، جو اپنی جگہ ایک بڑا اعزاز سہی..... لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق بذات خود یہ ناول اردو ادب کے لیے ایک بیش قدر انعام ہے جو مرحوم الیاس صدیقی کا رہن منت ہے۔ بے شک فاضل ادیب کا یہ ناقابل فراموش ناول خود مصنف کے لیے ”آب حیات“ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جسے پی کروہ ہمیشہ کے لیے امر اور زندہ وجاوید ہو گیا۔“

میں نے کتاب بند کی، اس کی قیمت چکانی اور جب واپس گھر کی جانب لوٹنے لگا تو میری آنکھیں نم ہونے لگیں اور میں بے اختیار رونا لہجے میں بڑ بڑایا۔

”بے شک میرے دوست! تم اپنے تجربے میں کامیاب رہے..... تم نے واقعی ”آب حیات“ دریافت کر لیا۔ تمہارا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔“



”ظہیر! میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مگر مجھے اس کی ذرا بھی فکر نہیں..... اس لیے کہ میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔ میں اب موت سے خائف نہیں ہوں۔“

”اچھا..... تو گویا یہ آب حیات بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔“ میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ ”ہاں ظہیر! میں نے آب حیات کی تخلیق مکمل کر لی ہے۔“ اس کا لہجہ سنسنی خیزی لیے ہوئے تھا۔ ”بس! اب ایک تجربے کی دیر ہے۔ تم انشاء اللہ عنقریب میری کامیابی کی ایک حیران کن خبر سنو گے۔“

اس کی سانس پھولنے لگی تھی، اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا، جوش اور ایک خاص قسم کے یقین نے اس کے زرد پڑتے چہرے کو توانا کر دیا تھا۔ میرا سو یا ہوا جس ایک بار پھر جاگنے لگا تھا۔

”تو..... تو پھر تم اب تک اس تکلیف دہ حالت میں کیوں ہو..... تم اپنے فارمولے کو خود پر آخر کب آزماؤ گے؟ تمہیں تو واقعی اب کسی آب حیات ہی کی ضرورت ہے جو تمہیں فوراً زندگی کی طرف لوٹا سکے۔“

”دھیرج..... میرے ہم راز..... میرے دوست..... ہر دیر پا دوا کا اثر دیر ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔“

میں سوچنے لگا۔ یہ پاگل تو نہیں ہو گیا یا واقعی اس سگی اور خطی کیا کرنے ”آب حیات“ تخلیق کر لیا ہے؟ بہر حال میں نے رسی خوشی کا اظہار کیا۔

”یار میرے! اگر تم اپنے تجربے میں واقعی کامیاب ہو گئے ہو تو یقیناً جانو مجھے سب سے زیادہ خوشی تمہارے آب حیات کے فارمولے کی کامیابی پر نہیں بلکہ تمہارے زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آنے پر ہوگی..... میں تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔“

یہ کہتے کہتے میں یکدم دل گیر سا ہو گیا تھا۔ اس پر مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ اچانک یہ مجھول سا شخص مجھے کیوں بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

”میرے دوست! مجھے ضرور کامیابی ہوگی، انشاء اللہ مجھے یقین ہے کہ موت کو بالآخر شکست کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔“

وہ پھولی ہوئی سانس اور یقین کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے اس پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور تسلی و تسفی کے چند الفاظ کہہ کر رخصت لی۔ ثریا کی آنسو بھری آنکھیں دیر تک میرے خیالات پر چھائی رہیں۔

اس کے چند دن بعد مجھے الیاس صدیقی کے انتقال کی خبر

رخِ تقدیر

سلیم و ساروق

بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپا... ہر انسان مختلف دور میں مختلف حالات کا شکار رہتا ہے... یہ کوئی اتنی اچنبھے والی بات نہیں ہے مگر... اچانک گہرے اندھیرے میں کوئی ہزارواٹ کا بلب روشن کر دے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں اور یہی حال اس کا بھی ہوا جس کی جیب میں ایک روٹی کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اور اچانک ہی گویا اسے بیٹھے بٹھائے چھپن کروڑ کی ایک چوتھائی مل گئی... اب آنکھیں چندھیا چندھیا کر بند نہ ہونے لگیں تو کیا ہو اور بند آنکھوں سے کب کسی نے درست منزل پائی ہے... لہذا اسے بھی ٹھوکر لگی اور ایسی لگی کہ منہ کے بل گرتے ہوئے اس نے دنیا کے تمام رنگوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھ لیا۔ ہر رنگ کا کھوج لگاتے لگاتے وہ اس انتہا تک پہنچ گیا تھا جہاں ایک چوتھائی کیا پورے چھپن کروڑ بھی اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ بس جناب تقدیر اسی کو کہتے ہیں جیسے تیز ہوا میں کوئی پتنگ اونچی اڑان بھرتی جائے اور پھر اچانک دوز کھتے ہی وہ ادھر ادھر ڈولتی، بے سمت کسی بھی دروازے پر گر جائے۔

زمین سے اٹھ کر آسمان پر بیٹھنے والے ایک ذرے کی حقیقتوں کی عکاس داستان

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**





**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

آفتاب غنی ہوٹل سے باہر نکلا تو بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی نوجوان اور خوب صورت بیوی اسے سہارا دیے کر لے جا رہی تھی۔ آفتاب غنی کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ خاصا خوب رو اور باوقار شخص تھا لیکن مسلسل شراب نوشی نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔

”جب برداشت نہیں کر سکتے ہو تو اتنی پیتے کیوں ہو؟“ اس کی بیوی نورین نے کہا۔

”سٹ اپ!“ آفتاب دھاڑا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہارے سہارے چل رہا ہوں۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آفتاب نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

اچانک ہوٹل سے ارشد زبیری باہر نکلا اور ان کی طرف لپکا۔ وہ آفتاب غنی کا قانونی مشیر اور اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ”آفتاب! تم ابھی تک یہیں ہو؟“

”ہاں، نورین کو اندر شاپس سے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔“ آفتاب نے کہا۔ ”اسی میں دیر ہوگئی۔“

”تم کوئی ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے؟“ زبیری نے کہا۔ ”تم اس حالت میں ڈرائیونگ کر نہیں سکتے، نورین بھابی کو بھی ڈرائیونگ نہیں کرنے دیتے ہو۔ آخر تم نے سوچا کیا ہے؟“

”ارے یا راب تم بدمذمت کرو۔“

”اوہو!“ زبیری نے کہا۔ ”میں اپنا سیل فون اندر ہی بھول آیا۔“

وہ جانے کے لیے مڑا تو آفتاب طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ”بھول آئے تو اب اسے بھول جاؤ۔ ان بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں آنے والے معزز لوگ ایماندار نہیں ہوتے۔“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی زبیری اندر جا چکا تھا۔ آفتاب نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور پھر سڑک پار کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا کیونکہ اس کی گاڑی سڑک کے دوسری طرف پارک تھی۔ نورین نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن آفتاب نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔ ”میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ اس کے باوجود اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ نورین اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی اور غصے میں ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ آفتاب نے دونوں طرف دیکھا۔ دور سے ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس چمک رہے تھے لیکن وہ اس وقت خاصے فاصلے پر تھی۔

آفتاب ٹریفک دیکھ کر سڑک کر اس کرنے لگا۔ اس کی رفتار اگر معمول کے مطابق ہوتی تو وہ آسانی سے سڑک پار کر لیتا لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا جا رہا تھا تاکہ نورین کو یہ محسوس نہ ہو کہ اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

آنے والی گاڑی کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ وہ اچانک آفتاب کے سر پر آ پھنسی۔ ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ سڑک پر ٹائروں کی رگڑ سے چرچراہٹ کی آواز آئی۔ اس کے باوجود ڈرائیور گاڑی پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

قریب تھا کہ آفتاب گاڑی سے کچلا جاتا، اچانک ایک نوجوان اس کی طرف جھپٹا اور اسے گاڑی کی زد سے بچالیا۔ اس کے باوجود گاڑی کا دایاں حصہ خفیف سا آفتاب سے ٹکرا گیا۔ گاڑی کی اس ہلکی سی ٹکڑ سے بھی آفتاب اچھل کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نوجوان بھی گرا لیکن فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے آفتاب کے پاس پہنچا۔ ”آپ ٹھیک ہیں سر؟“ اس نے پوچھا پھر اس کی نظر آفتاب کے پیر پر پڑی جس سے خون نکل رہا تھا لیکن آفتاب ہوش میں تھا۔ گاڑی والا آفتاب کو ٹکڑ مارنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔

”میں کوئی گاڑی دیکھتا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔ ”ایمبولینس کے آنے میں تو دیر لگے گی۔ آپ کا خون بہہ رہا ہے۔“

”ڈونٹ وری بوائے۔“ آفتاب نے نقاہت بھری آواز میں ہنسنے کی کوشش کی۔ ”وہ سامنے میری گاڑی کھڑی ہے۔“ اس نے ایک لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟“

”جی سر!“ نوجوان نے جواب دیا۔ آفتاب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر گاڑی کی چابی نکالی اور نوجوان کو دے دی۔ نورین ابھی تک سڑک کی دوسری جانب کھڑی ادھر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت تک زبیری بھی لوٹ آیا تھا۔

نوجوان نے پھرتی سے آفتاب کو اٹھایا اور گاڑی کی طرف دوڑا۔ اس نے آفتاب کو عقبی نشست پر لٹایا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ نورین اور زبیری اسے آوازیں ہی دیتے رہ گئے لیکن نوجوان کے کانوں تک ان کی آوازیں نہیں پہنچیں۔ وہ لمحوں میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”مجھے فوراً آغا خان اسپتال لے چلو۔“ نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی انتہائی مہارت اور تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔

”گاڑی کی اسپید کچھ کم کر دو۔“ آفتاب نے کہا۔
 ”مجھے جھٹکے لگنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔“
 ”سوری سر!“ تو جوان نے کہا۔
 ”کیا نام ہے تمہارا؟“ آفتاب نے پوچھا۔
 ”میرا نام اسد ہے سر۔“ تو جوان نے جواب دیا۔
 ”اسٹوڈنٹ ہو؟“ آفتاب نے پوچھا۔ شاید وہ
 باتیں کر کے تکلیف سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔
 ”میں نے گریجویشن کیا ہے سر!“ اسد نے کہا۔
 ”آج کل ملازمت کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔“
 اس وقت تک وہ آغا خان ہینچ چکے تھے۔ آفتاب کو
 فوری طور پر ایمرجنسی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اسپتال
 کے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد آفتاب کو
 کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور ڈاکٹر نے بتایا۔ ”پریشانی کی
 بات نہیں ہے۔ سیٹھ صاحب کی بائیں پنڈلی میں معمولی سا
 فریکچر ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے مل سکتے ہیں۔“
 اسد، آفتاب کے کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب بیڈ
 کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔
 ”آؤ بھائی آؤ۔“ آفتاب نے ہنس کر کہا۔ ”تم نے تو
 بالکل فلمی ہیرو کے انداز میں انٹری دی ورنہ اس وقت میری
 لاش کسی سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔
 تمہارا بہت بہت شکریہ۔“
 ”سر! اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا
 بس اس وقت مجھے یہی خیال آیا کہ ایک انسانی جان
 خطرے میں ہے اور.....“
 ”اگر میرے ساتھ ساتھ تم بھی گاڑی کی لپیٹ میں
 آ جاتے تو.....؟“
 ”تو پھر میری لاش بھی وہیں پڑی ہوتی۔“ اسد نے
 کہا۔ ”اور اچھا ہی ہوتا میں سر جاتا..... کم از کم اس دنیا کے
 مسائل سے تو جان چھوٹ جاتی۔“
 ”ارے بھی، تم ابھی تو جوان ہو، قابل رشک صحت
 کے مالک ہو، تمہاری شخصیت بھی خاصی پرکشش ہے پھر ایسی
 مایوسی کی باتیں کیوں؟“
 ”سر! اس دنیا میں ماں کے سوا میرا کوئی بھی نہیں تھا۔
 ماں نے محنت مشقت کر کے، لوگوں کے کپڑے سی کر اور گھر
 گھر برتن مانجھ کر مجھے پالا، پوسا، اچھی تعلیم دلائی لیکن میں
 ایسا بد نصیب بیٹا ہوں کہ اپنی ماں کی خدمت بھی نہ کر سکا۔
 میں ملازمت ہی تلاش کرتا رہا اور وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ
 گئی۔ اب میں جیوں بھی تو کس کے لیے؟“ اسد کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔
 ”مجھے افسوس ہوا۔“ آفتاب نے کہا۔ ”سوری
 ہوئے، میں نے تمہیں افسردہ کر دیا۔“
 ”میں خوش ہی کب تھا جو آپ مجھے افسردہ کریں
 گے۔“ پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو تکلیف
 ہو رہی ہوگی۔ مجھے کسی کا نمبر بتائیں تاکہ میں آپ کے گھر
 والوں کو اطلاع دے سکوں۔“
 ”کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے اسد
 میاں۔“ آفتاب نے کہا۔ ”جب وہ گاڑی مجھ سے ٹکرائی تھی
 تو میری بیوی سڑک کی دوسری جانب موجود تھی۔ اس نے بھی
 یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا لیکن اسے تو میری پروا
 ہی نہیں ہے، ورنہ وہ اب تک آچکی ہوتی۔ وہ جانتی ہے کہ
 میں آغا خان اسپتال کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتا۔“
 اسی وقت دروازہ کھلا اور نورین اندر داخل ہوئی۔
 اس کے پیچھے پیچھے زبیری بھی تھا۔
 ”آپ خیریت سے تو ہیں آفتاب؟“ نورین نے
 تشویش سے پوچھا۔
 ”اگر خیریت سے نہ ہوتا تو اس وقت میں یہاں نہیں
 اسپتال کے آئی سی یو میں ہوتا۔ بس پیر میں ہلکا سا فریکچر ہے۔“
 نورین، اسد کی جانب مڑی۔ ”آپ کا بہت بہت
 شکریہ۔ آپ نے میرے شوہر کی جان بچائی۔“
 ”شوہر؟“ اسد نے حیرت سے سوچا، یہ کم عمر اور
 خوب صورت لڑکی اس بوڑھے سیٹھ کی بیوی ہے؟
 اچانک آفتاب نے کہا۔ ”ارے، تم بھی زخمی ہو۔
 تمہاری ایک آستین خون میں تر ہے۔ میں بھی کیسا خود غرض
 ہوں، میں نے.....“
 ”نٹ پاتھ پر گرنے سے میری کلائی میں معمولی سی
 خراشیں آئی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“
 آفتاب اس وقت تک نرس کو بلانے کے لیے بٹن دبا
 چکا تھا۔ فوراً ہی نرس کمرے میں داخل ہوئی اور آفتاب کی
 ہدایت پر اسد کو باہر لے گئی۔
 ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ زبیری نے پوچھا۔
 ”طبیعت تو تمہارے سامنے ہے، میرے پیر پر
 پلاسٹر تو تمہیں بھی نظر آ رہا ہوگا؟“ آفتاب نے جواب دیا۔
 ”ٹھیکس گاڈ! اگر وہ لڑکا تمہیں نہ ٹھینتا تو.....“
 ”تو میں اس گاڑی سے کچل کر مر جاتا۔“ آفتاب
 نے کہا۔
 تھوڑی دیر بعد اسد بھی پٹی وغیرہ کرا کے آگیا اور

فیشن تھا۔

اس نے سوچا، رات میں اسپتال کے پارک میں گزار دوں۔ کوئی سکیورٹی گارڈ پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ میں سیٹھ آفتاب کے ساتھ ہوں۔

وہ ایک بیٹج پر بیٹھ گیا لیکن اسے اپنے سوا کوئی فرد وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ اینڈرنٹ کے رہنے پر پابندی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ٹھہرتا ہوا آ خان کے جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ وہاں پارک کی بیچوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک بیٹج پر بیٹھ گیا۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

اسے اپنی حالت پر ہنسی آگئی۔ اس کی جیب میں پانچ لاکھ روپے کا چیک تھا لیکن چیک کیش کرانے کے لیے اسے صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔ اس نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا اس وقت تین بج رہے تھے۔ گویا صبح ہونے میں ابھی پانچ چھ گھنٹے تھے۔ اس وقت تک اسے بھوکا رہنا تھا۔

اس کے برابر میں بیٹج پر موجود دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ جانے وہ اپنے مریض کو کتنے جتن کر کے اس مہنگے ترین اسپتال میں لے کر آئے ہوں گے۔ اچانک ان میں سے ایک بولا۔ ”بیچا! یہاں تو نزدیک کھانے کا کوئی ہوٹل بھی نہیں ہے۔ اسپتال کے کیفے ٹیریا میں کھانا بہت مہنگا ہے۔“

”باہر دیکھو، شاید کوئی چنے والا کھڑا ہو؟“ بیچا نے کہا۔ ”چنے والا؟“ نوجوان نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہاں تو سکیورٹی والے زیادہ دیر تک رکشا اور ٹیکسی کو نہیں رکنے دیتے۔ میں موٹر سائیکل پر جاتا ہوں اور کھانا لے کر آتا ہوں۔“

”اس وقت کھانا ملے گا کہاں؟“

”کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گا۔“ نوجوان نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”سنیے۔“ اسد نے کہا۔ ”ایک روٹی میرے لیے بھی لے آئے گا۔“ اس نے دس روپے کا آخری نوٹ نکال کر نوجوان کو دے دیا۔

”اور سالن؟“ نوجوان نے پوچھا۔ ”بازار کا سالن میں نہیں کھاتا۔ کسی نہ کسی طرح پانی سے روٹی ٹنگ لوں گا۔“

نوجوان کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ نہاری اور روٹیاں لے آیا تھا۔ ان لوگوں نے اسد کو بھی کھانے میں شامل کر لیا۔ پھر کچھ اونگھتے اور جاگتے صبح ہو گئی۔

”بس کر بولا۔“ آپ نے فضول میں اتنی تکلیف کی سر..... ہاکی کھیلتے ہوئے، دوڑتے ہوئے تو اس سے زیادہ چوٹیں لگی ہیں مجھے۔“

زبیری نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور اسد کی طرف بڑھا دیے۔ ”لو یہ رکھ لو۔“

”نور وھاٹ سر؟“ اسد نے پوچھا۔

”ارے بھی رکھ لو، تم نے میرے دوست کی جان بچائی ہے۔“

”شکریہ سر۔“ اسد نے کہا۔ ”میں نے کسی لالچ میں سر کی جان نہیں بچائی۔“

”کم ہیں تو اور لے لو۔“ نورین نے کہا اور اپنا اینڈ بیگ کھولا۔

”رہنے دو نورین۔“ آفتاب نے کہا پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکالی، گھٹنے پر رکھ کر چیک لکھا اور اسد کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ لے لو۔ یہ میری جان بچانے کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ دیکھو، اب انکار مت کرنا۔“

”لیکن سر.....“ اسد نے کچھ کہنا چاہا۔

”تو۔“ آفتاب نے اسے ٹوک دیا۔ ”اسے رکھ لو۔“

اسد نے بے بسی سے آفتاب کو دیکھا پھر چیک لے کر جیب میں رکھ لیا۔

”تمہارا بہت شکریہ۔“ نورین نے کہا۔ ”بس اب تم جاؤ۔“

اسد خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ کوریڈور سے نکل کر لفٹ میں سوار ہوا اور گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا کر جیب سے

چیک نکال کر دیکھنے لگا۔ چیک دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پانچ لاکھ روپے کا چیک تھا۔ اس وقت اسد کی جیب میں صرف دس بارہ روپے پڑے تھے۔ گزشتہ ہفتے

مالک مکان نے اس سے مکان بھی خالی کر لیا تھا۔ کیونکہ گزشتہ چھ مہینے سے اس نے کرایہ نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنا مختصر سامان اٹھا کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر میں رکھ

دیا تھا اس کا مکان بھی چھوٹا سا تھا اس لیے وہاں سامان تو کسی نہ کسی طرح آگیا تھا لیکن اسد کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ اب اس کے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی اور مزید چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ یوں بھی گزشتہ کئی دن سے وہ فٹ پاتھوں اور مختلف پارکوں میں

سورہا تھا۔ اس کے جسم پر جینز اور گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ تھی اس لیے اس کا لباس زیادہ برا نہیں لگتا تھا۔ شیو تو آج کل اچھے گھرانوں کے لڑکے بھی نہیں بناتے تھے، یہ بھی

پراثر تحریروں اور رنگارنگ سلسلوں سے مرصع ستمبر 2016ء کا دلہن نمبر حاضر ہے

STAY TUNED TO

کراچی

PAKSOCIETY پاک سوسائٹی .COM

رفعت سراج پہ کہاں بچیں کہ دل ہے کی نئی قسط

انجم انصار و در ثمن بلال کے پُر لطف ناولوں کی نئی اقساط

فاخرہ گل کا اثر انگیز مکمل ناول محبت ہے سمندر سی

نیلو فر عباسی کی زندگی کے فسانے کا خوب صورت بیان رضوانہ پرنس کے مشاق قلم سے

دلہن نمبر کے لیے شائستہ زریں

پاکیزہ کے مہمان میں تعارف کرائیں

گی شگفتہ یاسمین اور ان کے دولہا کا

عقیلہ حق ، نگہت اعظمی اور سعدیہ رئیس کی اچھوتی تحریریں دلہن نمبر کے لیے

اس کی جلاوہ

عذرا فردوس، ہاجرہ ریحان، طیبہ عنصر مغل، ہالہ احمد، نظیر فاطمہ،
سلمیٰ غزل، فرح طاہر قریشی و دیگر مایہ ناز مصنفات کی مسحور کن تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ پڑھیے دلچسپ مستقل سلسلے وہ بھی صرف آپ جیسے باذوق پڑھنے والوں کے لیے

بینک کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ اسد نے سوچا، سب سے پہلے میں مالک مکان کا کرایہ اس کے منہ پر ماروں گا۔ پھر اس نے سوچا، اس منحوس کو بقیہ کرایہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس نے جس توہین آمیز انداز میں اپنے مکان سے نکالا تھا، وہ انداز تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ لعنت بھیجوں اس کے بقایا جات پر۔ میں کسی اچھے علاقے میں کوئی مکان لوں گا اور عیش سے زندگی گزاروں گا۔ نگے ہاتھوں کوئی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بھی خرید لوں گا۔ پھر اطمینان سے ملازمت تلاش کروں گا۔

پھر اسے خیال آیا کہ میں بھی کیا خیالی پلاؤ پکا رہا ہوں۔ اس سیٹھ نے صرف پانچ لاکھ تو دیے ہیں۔ یہ پانچ لاکھ کتنے دن کام آئیں گے؟ یہ سوچ کر اس کا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

دن کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس نے جیب سے چیک نکال کر دیکھا۔ وہ شہر کے ایک بڑے بینک کا چیک تھا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ سیٹھ نے چیک کی رقم صرف ہندسوں میں درج کی تھی۔ الفاظ والا کالم سادہ تھا۔ وہ مجرمانہ ذہنیت کا حامل نہیں تھا لیکن حالات کی سختیوں اور لوگوں کے روئے کے باعث ذہن میں کبھی کبھی مجرمانہ خیالات بھی جنم لینے لگتے تھے۔

اس نے دوبارہ چیک پر نظر ڈالی۔ آفتاب نے چیک کا اندراج سیاہ پوائنٹر سے کیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے حق میں تھی۔ اس کی جیب میں بھی ایک سیاہ پوائنٹر تھا۔ اس نے جیب سے پوائنٹر نکالا اور اپنی جیب سے پرس نکالا جس میں سوائے فضول کاغذات اور وزینگ کارڈز کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک وزینگ کارڈ کی پشت پر اپنا نام لکھا اور اپنے پوائنٹر کی انک سے چیک میں درج شدہ انک کا موازنہ کیا، دونوں کا رنگ یکساں تھا۔ اب اسے اس رقم میں صرف ایک صفر کا اضافہ کرنا تھا۔ آفتاب نے اندراج بھی اتنی بے پردائی سے کیا تھا کہ اس میں ایک چھوڑ دو دو صفر کی منجائش تھی۔ اس نے کارڈ کی پشت پر آفتاب کی طرح صفر لکھنے کی کوشش کی اور دو تین بار لکھنے کے بعد وہ اسی کی طرح صفر لکھنے لگا۔

پھر اس نے دل کڑا کر کے رقم میں ایک صفر کا مزید اضافہ کر دیا۔ پھر اس نے آفتاب کے دستخط پر غور کیا۔ اس نے ”آفتاب“ لکھنے کے لیے الٹا ”ایف“ لکھا اور دو چار دفعہ پریکٹس کی پھر ہمت کر کے چیک میں ”fifty lac only“ کا اضافہ کر دیا۔

اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دیا کہ اگر اب میں نے یہ چیک کیش نہ کرایا تو اس پانچ لاکھ کی رقم سے بھی جاؤں گا جو مجھے ملنے والی ہے۔

پھر اس نے چیک جیب میں رکھا اور اسپتال سے باہر نکلے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر آفتاب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ اگر وہ جاگ رہا ہو تو اس کی مزاج پر سی ہی کر لے۔ اسپتال کے پرائیویٹ ونگ میں ملنے والوں کے مخصوص اوقات نہیں ہوتے ہیں۔

اسد نے ڈرتے ڈرتے آفتاب کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ فوراً ہی اندر سے آفتاب کی بھاری آواز سنائی دی۔ ”میں کم ان۔“

اسد اندر داخل ہو گیا۔ آفتاب حسب سابق تکیوں کے سہارے بیڈ کی پشت سے فیک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ اسد کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ”تم..... تم اب تک یہیں ہو؟“

”سر! میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جاسکتا تھا۔“ اس نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”تم کیا رات بھر باہر لان میں بیٹھے رہے؟“ آفتاب نے حیرت سے پوچھا۔

”جی سر! یہاں وارڈ میں تو بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے نہیں۔ ایک برآمدہ ہے جہاں سکیورٹی گارڈز بیٹھنے نہیں دیتے۔“ ”تم بہت اچھے لڑکے ہو۔“ آفتاب نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا کہ یہی اچھا لڑکا آپ کے اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ نکالنے کا پلان بنا رہا ہے۔ ”سر! اس وقت تو آپ کی طبیعت اللہ کے کرم سے بہت بہتر ہے، اب مجھے اجازت دیں۔“ ”میرا چھوٹا سا ایک کام کرو گے؟“ آفتاب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ضرور سر! آپ حکم دیں۔“ آفتاب نے کہا۔ ”تو پھر ایسا کرو، مجھے دو بوتلیں شراب کی لادو۔ میں رات بھر بے چین رہا ہوں۔ مجھے ایک دن بھی یہ مشروب نہ ملے تو میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔“ ”سر! آپ شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ اسد نے کہا۔

اس کی بات پر آفتاب نے قہقہہ لگایا۔ ”میری بیوی بننے کی کوشش مت کرنا۔ اب تو میں اس کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ شاید میرے جسم میں خون کی جگہ بھی شراب ہی گردش

آفتاب بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسد نے بوتلوں والا شا پر اس کے حوالے کرنے کے بعد بقیہ رقم اسے دینا چاہی تو اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”ارے رکھو یا ر، تم نے تو اس وقت لاکھ روپے کا کام کیا ہے۔“

اسد نے گاڑی کی چابی، گاڑی کا انٹری کوپن اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ”اب مجھے اجازت دیں۔“

آفتاب اس وقت تک بوتل کھول چکا تھا۔ اس نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ”اگر تم ماسٹرنہ کرو تو میری ایک آفر ہے۔“

”میں سمجھا نہیں سر۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس جاب کرو۔ میرے پرسنل اسسٹنٹ، ڈرائیور اور کیئر ٹیکر کی حیثیت سے۔ جب تک میرے پاؤں پر پلاسٹر ہے، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم پڑھے لکھے ہو، ذہین ہو اور یہ ملازمت تمہاری صلاحیتوں کے مطابق نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔“

”سر! میں.....“

”دیکھو، اگر تمہیں کوئی بھی جاب مل جائے تو یہ جاب چھوڑ دینا۔ میں فی الحال تمہیں پچاس ہزار ماہانہ دوں گا، تمہیں میرے بچکے کے آؤٹ ہاؤس میں رہنا پڑے گا۔“

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟“

”جی سر! میں کام چلانے کے لیے تھوڑا بہت پکا لیتا ہوں۔“

”یہ مت سوچنا کہ میں تم سے اپنا کھانا بھی پکواؤں گا۔ اصل میں نورین کو ملازموں سے جانے کیوں الرجی ہے۔ وہ کھانا پکانے سے لے کر گھر کی صفائی بھی خود کرتی ہے۔ دو سال پہلے میں نے اس سے شادی کی تھی۔ وہ اس وقت اتنی تلخ مزاج نہیں تھی۔ گھر میں کئی ملازم بھی تھے۔ چھ مہینے پہلے اس نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کی چھٹی کر دی۔“

”کیوں سر؟“ اسد نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تو اس کی وجہ جانتا ہوں۔ تم بھی جان جاؤ گے۔ وہ تمہاری بھی مخالفت کرے گی لیکن تم اس کے کہنے پر جاب چھوڑ کر چلے مت جانا۔“

اچانک اسد کو خیال آیا کہ اس نے آفتاب کے پانچ لاکھ کے چیک کو پچاس لاکھ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایسے بینک سے معلوم ہو جائے گا کہ اس تاریخ کو اتنی بڑی رقم نکالی گئی ہے۔ وہ تو بری طرح پھنس جائے گا۔ اسے رہ رہ کر

”سر! میں نے آج تک شراب نہیں خریدی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ملک میں اس پر پابندی کے باوجود یہ اب بھی کہاں فروخت ہوتی ہے۔“

”تم فکر مت کرو، ایڈریس میں تمہیں سمجھا دوں گا اور دکان کے مالک روٹی کو کال بھی کر دیتا ہوں ورنہ اتنی صبح سویرے تو اس کی دکان بھی نہیں کھلتی لیکن وہ میرا نام سن کر تمہیں دکان کھول کر بوتلیں دے دے گا۔“ پھر اسے کچھ خیال آیا اور بولا۔ ”ایسا کرو، تم میری گاڑی لے جاؤ۔ یارک بھی تو تم نے ہی کی تھی۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کہاں گھڑی ہے۔ اس کا انٹری کوپن بھی شاید تمہارے پاس ہوگا یا گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھا ہوگا تم نے۔“

آفتاب نے اس کی طرف گاڑی کی چابیاں بڑھا دیں اور اسے اس شخص کے گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا جس سے اسے مطلوبہ مشروب لانا تھا۔

وہ گاڑی کی چابی لے کر دروازے کی طرف بڑھا تو آفتاب نے کہا۔ ”گھبرو، یہ پیسے اسے دے دینا۔ اس نے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔“

”یہ سب پیسے انہیں دے دوں؟“

”نہیں، وہ بوتلوں کے پیسے لے کر باقی پیسے تمہیں دے دے گا۔ تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا۔ واپسی میں ناشتا بھی کر لیتا۔“

اسد پارکنگ میں پہنچا۔ گاڑی کا انٹری کوپن اس کی جیب میں تھا۔ اس کا تو اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ گاڑی لے کر مطلوبہ سوسائٹی پہنچا۔ وہ شخص وہیں رہتا تھا اور بے وقت جگائے جانے پر جھلایا ہوا لگ رہا تھا لیکن شاید آفتاب اس کا مستقل گاہک تھا اس لیے اس نے اپنی جھلاہٹ کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ”کچھ بوتلیں میں اس قسم کی ایمرجنسی کے لیے اپنے گھر میں بھی رکھتا ہوں۔ تم گھبرو، میں لے کر آتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ بوتلیں لے آیا۔ اس نے اسد سے صرف ساڑھے پانچ ہزار روپے لیے، رسمی طور پر آفتاب کی طبیعت پوچھی اور بوتلوں کا شا پر اس کے حوالے کر کے گھر میں چلا گیا۔

اسد نے واپسی پر طارق روڈ پر ایک ہوٹل پر گاڑی روکی اور ناشتا کرنے کے بعد اس نے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خرید لیا۔ اسد سگریٹ کا عادی تھا لیکن تین دن سے اسے سگریٹ نہیں ملے تھے اس لیے اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دو سگریٹ پھونک دیے پھر انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ

اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔
 ”تم نے ابھی وہ چیک تو کیش نہیں کرایا ہوگا جو رات
 میں نے تمہیں دیا تھا؟“
 ”نہیں سر۔“ اسد نے جواب دیا۔ اسے لگا جیسے
 آفتاب اس کا ذہن پڑھ رہا ہے۔
 ”وہ چیک مجھے واپس کر دو، مجھے ابھی خیال آیا ہے
 کہ اس اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں ہے۔ تمہیں گھر جا کر
 دوسرے بینک کا چیک دے دوں گا۔“
 ”سر..... وہ چیک تو..... میں نے رات ہی میں پھاڑ
 کر پھینک دیا تھا۔“

”کیوں بھی؟“ آفتاب نے حیرت سے پوچھا۔
 ”میں نے کل آپ کی سز سے بھی کہا تھا اور وکیل
 صاحب سے بھی کہ میں نے آپ کی جان پیسوں کے لیے
 نہیں بچائی تھی۔ آپ کے اصرار پر میں نے چیک لے ضرور
 لیا تھا لیکن باہر جا کر اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔“
 ”لیکن اب گھر جا کر جو چیک میں تمہیں دوں گا، وہ
 مت پھاڑ دینا۔“ آفتاب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
 ”اب جاؤ، اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔“
 ”سر! میرا سامان ہی کیا ہے، دو تین جوڑے کپڑے
 اور کچھ برتن۔“ اسد نے غصے سے کہا۔

”نو پر اہلم، تمہیں سب کچھ یہیں مل جائے گا۔“
 اسد کا بھی یہی خیال تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا
 اور نورین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نفرت بھرے
 انداز میں اسد کو دیکھا اور بولی۔ ”تم ابھی تک یہیں ہو؟“
 ”اسے میں نے روکا ہے۔ میں نے اسے کیئر ٹیکر کی
 جاب دے دی ہے۔ یہ بہت اچھا ڈرائیور بھی ہے۔“
 ”ہمیں کسی کیئر ٹیکر یا ڈرائیور کی ضرورت نہیں
 ہے۔“ نورین نے کہا۔

”لیکن مجھے ہے۔ اسد اب ہمارے بیچلے کے آؤٹ
 باؤس میں رہے گا۔“

”وہاٹ؟“ نورین دہاڑی۔

”آہستہ بولو۔“ آفتاب نے اسے جھڑک دیا۔ ”یہ
 تمہارا بیڈ روم نہیں ہے جو تم جینچ پکار کر رہی ہو۔“
 ”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ نورین نے فوراً
 موضوع بدل دیا اور پوچھا۔ ”آپ نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟“
 ”میں نے ناشتا کر لیا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔
 ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ نورین نے پوچھا۔
 ”میں چاہوں تو ڈاکٹر مجھے ابھی ڈسچارج کر دیں۔“

”مجھے اب صرف آرام کی ضرورت ہے۔“
 ”اور وہ آپ کریں گے نہیں۔“
 ”ارے، اب تو آرام ہی کروں گا۔“ آفتاب نے کہا۔
 ”اب میں گالف کھیل سکتا ہوں، نہ ریس کورس جاسکتا ہوں۔
 زیادہ سے زیادہ زبیری کے ساتھ شطرنج کھیل سکتا ہوں۔“
 اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایڈووکیٹ
 زبیری اندر آ گیا۔ ”ہیلو آفتاب، کیسے ہو؟“
 ”پہلے جیسا ہی ہوں۔“ آفتاب مسکرایا۔ ”بس اب
 کچھ دن تک دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جاؤں گا۔“
 اچانک زبیری کی نظر اسد پر پڑی۔ وہ ناگواری سے
 بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”یہ اب میرا پرسنل اسسٹنٹ ہے۔“ آفتاب نے کہا۔
 ”کیسا؟“ زبیری نے بھی نورین کی طرح پوچھا۔
 ”ایک سڑک چلتے آدی نے تمہاری جان کیا بچائی کہ تم نے اسے
 اپنا پی اے بنا لیا۔ تم اس کے بارے میں جانتے کیا ہو؟“
 ”جاننا ضروری نہیں ہے لیکن میں چند گھنٹوں میں اس
 کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔“
 ”چائے یا کافی ہو گے؟“ آفتاب نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”فارگا ڈسک آفتاب! یہ تمہارا ڈرائنگ روم نہیں
 ہے بلکہ اسپتال ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”میں ڈراڈاکٹر
 سے مل کر آتا ہوں۔“

نورین نے اچانک پوچھا۔ ”یہ بوتل تمہیں کہاں سے
 مل گئی؟“

”یہ تو ہر جگہ مل جاتی ہے، اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟“
 زبیری لوٹ آیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر زکھہ
 رہے ہیں، فریکچر زیادہ پریشان کن نہیں ہے۔ بس دو ہفتے
 تک تمہیں اپنے اس پیر پر زور ڈالنے سے احتیاط کرنا ہو
 گی۔“ پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”اوہو، دس بج رہے ہیں،
 مجھے کورٹ بھی جانا ہے۔ میں شام کو آؤں گا۔“

تھوڑی دیر بعد نورین بھی چلی گئی۔ اسد نے محسوس کیا
 کہ آفتاب اور نورین کے درمیان وہ بات نہیں ہے جو ایک
 شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتی ہے۔ آفتاب اس کے ساتھ
 انتہائی تلخ لہجے میں بات کرتا تھا۔ نورین کے لہجے میں بھی
 آفتاب سے بات کرتے ہوئے سردمہری بلکہ ناگواری سی
 محسوس ہوتی تھی۔ آفتاب کے مقابلے میں نورین کم عمر،
 خوب صورت تھی۔ حسین اور پرکشش عورتوں کے تو لوگ ناز
 اٹھاتے ہیں لیکن اسد نے محسوس کیا تھا کہ آفتاب کو نورین کی
 ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔

اب آفتاب کو صرف آرام کرنا تھا اس لیے وہ رات ہی کو اسپتال سے گھر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔
”میں گاڑی وارڈ کے سامنے لے کر آتا ہوں۔“ اسد نے کہا۔ اس نے آفتاب کا سامان پہلے ہی سمیٹ لیا تھا۔
وہ لوگ شام کو آٹھ بجے گھر پہنچ گئے۔ آفتاب کا بنگلا ڈیفنس میں تھا۔ بنگلے کی شان و شوکت دیکھ کر اسد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس قسم کے بنگلے تو اس نے صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ بنگلے کا لان اتنا وسیع و عریض تھا کہ وہاں کرکٹ کھیلی جاسکتی تھی۔ لان کی مزید بھال ایک مانی کرنا تھا جو ہفتے میں ایک دن آتا تھا۔ بنگلے کے گیراج میں بھی تین گاڑیاں تھیں اور تینوں ہی انتہائی قیمتی اور شاندار تھیں۔ چوتھی گاڑی آفتاب کے استعمال میں تھی۔ اسپتال سے واپسی پر آفتاب نے ایک وہیل چیئر بھی خرید لی تھی۔

اس وقت نورین گھر میں موجود نہیں تھی۔ دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔ اسی نے گیٹ کھولا۔ اسد کو حیرت ہوئی تھی کہ جب نورین نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کو نکال دیا تھا تو وہ چوکیدار کیسے موجود تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بیگم صاحبہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی گاڑی میں کہیں گئی ہیں۔
”کلب گئی ہوگی۔“ آفتاب نے تلخ لہجہ میں اسد سے کہا پھر بولا۔ ”آؤ، میں تمہیں تمہارا کمر دکھا دوں۔“
آفتاب اس وقت وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اسد وہیل چیئر دھکیلتا ہوا آؤٹ ہاؤس کی طرف لے گیا۔ آؤٹ ہاؤس اصل عمارت کے دوسرے سرے پر تھا اور کافی فاصلے پر بنا ہوا تھا۔

اپنا کمرادیکھ کر بھی اسد حیران رہ گیا۔ بیڈروم میں انتہائی قیمتی بیڈ تھا، کھڑکیوں پر قیمتی اور دبیز پردے تھے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ خاصا قیمتی صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ دیوار میں ایل ای ڈی ٹی وی نصب تھا۔ کمپیوٹر ٹیبل پر کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ اس کے کمرے میں انٹرکام بھی موجود تھا۔ بیڈروم میں چھوٹا سا ایک فریج بھی تھا۔ باتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

”اب تم مجھے میرے بیڈروم میں چھوڑ دو اور خود آرام کرو، تھک گئے ہو گے۔“ آفتاب نے کہا۔

اسد واقعی تھک گیا تھا۔ پوری رات اس نے اسپتال کے لان میں جاگ کر گزاری تھی، پھر صبح سے وہ آفتاب کے ساتھ مصروف تھا۔ اسے تو کمر ٹکانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ آفتاب اسد کا سہارا لے کر اوپر اپنے بیڈروم میں پہنچا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ بنگلے کی طرح اس کا بیڈروم بھی

بالی ووڈ کی کسی فلم کے بیڈروم کی طرح آراستہ تھا۔ اسد نے نیچے لگا کر آفتاب کو احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے کہنے پر اسے سی بھی آن کر دیا۔ اسد جانے لگا تو آفتاب نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اس میں سے چیک بک نکال کر چیک لکھنے لگا۔ پھر وہ چیک اسد کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری امانت..... اب اسے بھی مت پھاڑ دینا ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔“

اسد نے چیک لے کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس مرتبہ اس نے رقم ہندسوں میں بھی لکھی تھی اور الفاظ میں بھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے آفتاب کو دیکھا۔
”کیا ہوا؟“ آفتاب نے بھاری آواز میں پوچھا۔
”رقم کچھ کم لگ رہی ہے؟“
”نہیں سہرا وہ اصل میں آپ سائن کرنا بھول گئے ہیں۔“ اسد نے کہا۔

”اوہ..... یہ میرا حافظہ۔“ آفتاب خوش دلی سے مسکرایا پھر چیک لے کر اس پر سائن کر دیے۔
”مجھے ایک بوتل کھول دو اور ڈرنک بنا دو۔“ آفتاب نے کہا۔ ”آؤ کیوبس فریج میں ہوں گے۔“
اسد نے گلاس تیار کیا، فریج سے آؤس کیوبس نکال کر اس میں ڈالے اور گلاس آفتاب کی طرف بڑھا دیا۔
”تم نے کبھی ڈرنک کی ہے؟“ آفتاب نے ایک گھونٹ لے کر پوچھا۔

”نوسر! میں اب تک اس ”چیز“ سے محروم ہوں۔“ اسد نے کہا۔
”تو پھر آج ٹرائی کرو۔“

”آپ کی دیکھ بھال کے لیے میرا ہوش میں رہنا ضروری ہے۔“ اسد مسکرایا۔ ”ورنہ میں ضرور آپ کا ساتھ دیتا۔“
”یار! میں تو عرصے سے اکیلا ہی پی رہا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ زبیری آجاتا ہے تو وہ میرا ساتھ دے دیتا ہے لیکن جاتے ہوئے کم بخت نصیحت ضرور کرتا ہے کہ ڈرنک کو ڈرنک کی طرح پیا کرو، پانی کی طرح نہیں۔“

اچانک دروازہ کھلا اور نورین اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسد نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ بڑے بڑے پارسا کا بھی ایمان ڈانواں ڈول ہو سکتا تھا۔
اسے دیکھ کر آفتاب کی پیشانی پر پل پڑ گئے۔ لمحوں

میں اس کی شخصیت ہی بدل گئی اور وہ اچانک سیٹھ آفتاب غنی بن گیا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟“

”میں آپ کو دیکھنے اسپتال گئی تھی۔“ نورین نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”جھوٹ مت بولو۔“ آفتاب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”جب تم جھوٹ بولتی ہو تو تمہاری یہ خوب صورت آنکھیں تمہارا ساتھ نہیں دیتیں۔“

”میں اصل میں جم کے لیے مڑ گئی تھی۔ میں نے وہاں سے اسپتال فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم گھر جا چکے ہو۔“ نورین نے سرد لہجے میں کہا پھر اسد کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ذہانت دو یو مین، کیا کر رہے ہو؟“ آفتاب انتہائی سخت لہجے میں بولا۔ ”تم جانتی نہیں ہو کہ اسد میرا پی اے ہے اور.....“

”اب تمہارے پاس ہے کیا جو تمہیں پی اے کی ضرورت پڑ گئی؟“ نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب تم کہہ رہی ہو کہ میرے پاس کیا ہے؟ نورین نیگم ہاتھی مر کے بھی سوال کا ہوتا ہے۔“

نورین پیر پختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ”اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ نورین اپنے کمرے میں بند ہو گئی ہوگی۔“

”اپنے کمرے میں؟“ اسد نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہاں، گزشتہ ایک سال سے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں سو رہے ہیں۔“

اسد نے اپنی کھوپڑی سہلائی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

اسد نیچے لاؤنج میں پہنچا تو نورین کو دیکھا۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ڈھیلی سی ایک ٹی شرٹ میں ملبوس تھی اور صوفے پر نیم دراز کسی سے سیل فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کی پشت اسد کی طرف تھی لیکن پشت سے بھی اس کا جسم اتنا ہیجان خیز لگ رہا تھا کہ اسد اسے دیکھتا رہ گیا۔

”ہاں، وہ ابھی کچھ دیر پہلے اسپتال سے گھر آیا ہے..... ہاں، کچھ سوچوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کیا اور زاویہ بدلتا تو اس کی نظر اسد پر پڑی۔

اسد اسے دیکھ کر کچھ بوکھلا گیا۔ ایک تو اس کے

بچہ کے تاثرات، پھر نورین نے ایسی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی کہ اسد کا ذہن سنسن کر رہ گیا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ نورین نے نخوت بھرے انداز میں پوچھا۔

”میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔“ اسد نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”سیٹھ صاحب آرام کر رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ.....“

”آرام کر رہے ہیں یا ڈنک کر رہے ہیں؟“ نورین کے لہجے میں تلخی تھی۔

اسد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

”ظہر ہو۔“ نورین کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ وہ نورین کی طرف گھوما۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے خلاف معمول نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

اسد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تم مجھے خاصے ذہین اور تعلیم یافتہ لگتے ہو۔“ نورین نے کہا۔ ”ہینڈ سم بھی ہو۔“

”جی..... میں.....“

”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس جھکی آدمی کی باتوں میں آ کر تم اپنا مستقبل داؤ پر کیوں لگا رہے ہو۔ وہ شراب کے نشے میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور صبح کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔“

”میں نے اس جاب کو کیریئر نہیں بنایا ہے میڈم۔“ اسد نے کہا۔ ”سیٹھ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی اچھا چانس ملے، تم یہ جاب چھوڑ سکتے ہو۔“

”تمہارے گھر میں کتنے افراد ہیں؟“ نورین نے پوچھا۔ ”کوئی بھی نہیں۔“ اسد نے جواب دیا۔ ”ماں کے انتقال کے بعد سے میں بالکل تنہا ہوں اور نزدیک کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔“

”اوہ، ویری سیڈ۔“ نورین نے کہا۔ ”تمہاری کوئی گرل فرینڈ تو ہوگی؟“ نورین نے قدرے بے تکلفی سے پوچھا اور صوفے کے ہتھے پر اس انداز میں نیم دراز ہوئی کہ اسد نے گہرا کر بے اختیار اپنی نظریں جھکا لیں۔

”میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔“ اسد نے جواب دیا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

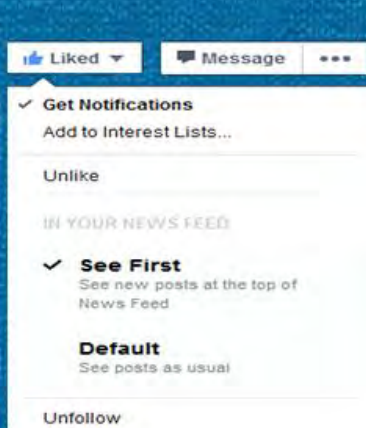
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



”حیرت ہے۔“ نورین بڑبڑائی۔ ”تم خاصے خوبو اور پرکشش آدمی ہو۔ لڑکیاں تو تم پر مرتی ہوں گی؟“

”مجھے حالات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ مجھے کسی کے مرنے اور جینے کا علم ہوتا۔“

”اس وقت تم خاصے تھکے ہوئے لگ رہے ہو، جاؤ جا کر آرام کرو۔“

اسد اپنے کمرے میں آگیا اور جوتے اتار کے بیڈ پر گر گیا۔ واقعی اسے بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

انٹرکام کی مسلسل بجنے والی گھنٹی پر اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ گویا وہ مسلسل چھ گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر انٹرکام کا ریسپور اٹھا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہیلو۔“

”اسد!“ دوسری طرف سے آفتاب کی آواز آئی۔

”فریش ہو کر میرے پاس پہنچو۔“

”اوکے سر!“ اسد نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، میں نے نورین سے کہہ دیا تھا۔ وارڈروب میں تمہارے لیے کپڑے موجود ہوں گے۔“ یہ کہہ کر آفتاب نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسد نے وارڈروب کھول کر دیکھی، اس میں کئی جوڑے موجود تھے۔ شوز ریک میں انتہائی مہنگے جوتے بھی موجود تھے۔

”حیران مت ہو۔“ اسد، نورین کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ ”ان سب چیزوں کی رسیدیں میرے پاس موجود ہیں۔ ان کی قیمت تمہاری تنخواہ میں سے کاٹ لی جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ ٹھٹھکی ہوئی لان کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

آفتاب خاصا ہشاش بشاش لگ رہا تھا اور اس وقت وہ خلاف توقع خراب نہیں بلکہ کافی پی رہا تھا۔

”مجھے پیچھے لان میں لے چلو۔“ اس نے اسد سے کہا۔ ”میں کچھ دیر کھلی فضا میں وقت گزارنا چاہتا ہوں۔“

اسد اسے سہارا دے کر نیچے لایا، پھر وہیل چیئر میں بٹھا کر باہر لان میں لے گیا۔ اسے لان میں چھوڑ کر اسد پلٹ کر واپس آیا، کچن کے ایک ریک میں انتہائی مہنگے مشروب کے کئی کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بوتل اٹھا کر ٹرے میں رکھی، ایک باؤل میں آئس کیوبس لیے، ٹرے میں ایک گلاس رکھا اور دوسری پلیٹ میں تلی ہوئی مونگ پھلی، کاجو اور نمکو وغیرہ لے کر باہر نکلا۔ لاؤنج میں رکھی ہوئی چھوٹی میز پر اس نے ٹرے رکھی اور میز اٹھا کر باہر لان میں لے گیا۔

پھر اس نے وہاں سے جانا چاہا لیکن آفتاب نے اسے روک لیا اور بولا۔ ”بیٹھو۔“ اسد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد نورین اندر سے نکلی، اس وقت وہ لمبی فرائیڈ اور ٹائٹس میں ملبوس تھی۔ اس پر یہ لباس سجتا تھا۔

”آفتاب! میں کلب جا رہی ہوں۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ آپ کھانا کھا لیجیے گا۔ میں نے بنا کر فریج میں رکھ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا پرس جھلاتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

آفتاب نے برا سا منہ بنایا اور مشروب کا ایک گھونٹ لے کر نورین کی گاڑی کو دیکھنے لگا جو پورچ سے باہر نکل رہی تھی

پھر وہ اسد سے مخاطب ہوا۔ ”نورین سے تمہاری بات ہوئی؟“

پہلے تو اسد نے سوچا کہ جھوٹ بول دے لیکن اس جھوٹ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی سر! جب میں دوپہر کو سونے جا رہا تھا تو وہ مجھے لاؤنج میں ملی تھیں۔“

”تمہیں اس نے برا بھلا تو نہیں کہا؟ وہ اوپر سے جتنی خوب صورت ہے، اندر سے اتنی ہی زہریلی ہے۔“

”نورین! برا بھلا کہنے کے بجائے وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ تم ذہین اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود یہاں جاب کر کے اپنا مستقبل برباد کر رہے ہو۔“

آفتاب طنزیہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ ”اگر تم مجھے یا نچ سال پہلے ملے ہوتے تو میں تمہیں اپنی گروپ آف کمپینز میں بہت بہترین جاب دے دیتا۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“

”میں سمجھا نہیں سر؟“ اسد نے حیرت سے پوچھا۔

”میری اربوں روپے کی دولت ریس کے گھوڑے، حسین عورتیں اور شراب کھا گئی۔“

”ریس کے گھوڑے؟“ اسد نے پھر حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”ہاں، ریس کے گھوڑے۔“ آفتاب نے ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا اور اسد کو دوسرا پیگ بنانے کا اشارہ کیا۔ ”تم کبھی ریس کورس گئے ہو؟“

”یہ تو دولت مندوں کے شوق ہیں سر! میں نے تو ریس کورس کا صرف نام سنا ہے یا پھر فلموں میں گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”میں ریس تو کھیلتا ہی تھا، میں نے اپنے ذاتی گھوڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک گھوڑا لاکھوں روپے کا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر بھی لاکھوں روپے ماہانہ خرچ ہوتے تھے۔ میرے دس بہترین گھوڑے

تھے... جو مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ پھر میری زندگی میں حسین عورتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک جاتی تو دوسری آجاتی تھی۔ میں ان عورتوں کو قیمتی تحائف دیتا، نئی اور شان دار گاڑیاں گفٹ کرتا اور دل بھرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیتا۔ آہستہ آہستہ میرا بینک بیلنس سکڑتا چلا گیا۔ اب بڑے بڑے بینکوں میں میرے اکاؤنٹس تو ہیں لیکن ان میں بیلنس نہیں ہے۔ مشکل سے میرے تمام اکاؤنٹس میں مجموعی طور پر ڈیڑھ کروڑ روپے ہوں گے۔ میں نے ایک ایک کر کے کمپنی کے شیرز بھی بیچ دیے اس لیے اب اپنی ہی گروپ آف کمپنیز پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔“

”لیکن سر! آپ کاربن بن، آپ کے اخراجات اور.....“

”سب کچھ قرض پر چل رہا ہے۔“ آفتاب تلخ لہجے میں بولا۔ ”کاروباری حلقوں میں آج بھی میری گڈول ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آفتاب غنی ایک مرتبہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لے گا۔ اسی گڈول پر نہ صرف بڑے بڑے بزنس مین بلکہ بینکس بھی مجھے قرض دے دیتے ہیں۔ انہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا یہ شاندار بنگلا بھی کئی کروڑ میں گروی ہے۔“

”سر! آپ اب بھی ہمت کریں تو سب کچھ دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔“ اسد نے کہا۔ ”میں نے بزنس منجمنٹ میں گریجویشن کیا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں۔ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپے بھی ہوتے تو میں ان سے اب تک پچاس لاکھ بنا چکا ہوتا۔ آپ کو تو بینک اب بھی قرض دے دیں گے۔“

اس کی بات سن کر آفتاب نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں نے اپنی زندگی کی ہر خواہش پوری کر لی، دنیا گھوم لی۔ دنیا بھر کی حسین عورتوں کا قرب بھی حاصل کر لیا۔ اب مجھے کچھ بھی کرنے کی تمنا نہیں ہے۔ ہاں، میں تمہیں اتنا پیسا تو دے ہی سکتا ہوں کہ تم اپنا چھوٹا موٹا بزنس شروع کر سکو۔“

”مجھے اپنی پردا نہیں ہے سر۔“ اسد نے کہا۔ ”مجھے تو کہیں نہ کہیں کوئی معقول ملازمت مل ہی جائے گی۔ پھر موقع ملا تو میں کوئی بزنس بھی شروع کر لوں گا لیکن آپ نے میڈم نورین کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”اس سے شادی ہی تو میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ میں اس کے غیر معمولی حسن پر پاگل ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ مس ورلڈ کے مقابلے میں حصہ لیتی تو مس ورلڈ بن سکتی تھی۔ وہ میری ایک پروڈکٹ کی ماڈل تھی۔ میں اس کے حسن پر مر مٹا تو وہ میری اربوں

روپے کی دولت پر سمجھ گئی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک معروف گروپ آف کمپنیز کا ارب پتی چیئرمین اب اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت رئیس کے گھوڑوں اور حسین عورتوں پر نچھاور کر دی ہے اور جو ہر ماہ لاکھوں روپے کی شراب پی جاتا ہے۔ اس حسین عورت کو کوئی بھی خوبہرہ... اور دولت مند نوجوان اچک سکتا تھا۔ میں نے اس شاطر لڑکی سے شادی کر لی۔

سال بھر تک تو ہماری زندگی جنت بنی رہی۔ ہم نے دنیا بھر کی سیر کی، میں نے جی بھر کے نورین کو شاپنگ کرائی، اس کے ناز اٹھائے لیکن جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ میں گلے گلے تک قرض کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہوں تو اس کا رویہ بھی مجھ سے بدل گیا۔ ہمارے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں اور آج یہ حالت ہے کہ ہم دونوں الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نورین اب مجھ سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ مجھے جان سے بھی مار دے لیکن مار نہیں سکتی۔“

”سر! مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں بولنے کا حق تو نہیں ہے لیکن.....“

”کہو کہو..... تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔“

”آپ میڈم نورین کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”دو باتیں ہیں۔“ آفتاب نے مشروب کا گھونٹ لے کر کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے بعد میرے ہی سامنے کسی دوسرے کے ساتھ رنگ رلیاں منائے۔ دوسری بات یہ کہ اگر میں اسے طلاق دوں گا تو خود فٹ پاتھ پر آ جاؤں گا۔ جانتے ہو اس کا حق مہر کتنا ہے؟ دس کروڑ روپے۔ وہ حق مہر کا مطالبہ کرے گی تو میں اسے دس کروڑ روپے کہاں سے دوں گا؟ آخر کورٹ اسے میرا بچا کھچا بینک بیلنس دلا دے گی۔ میرا جو بھرم دنیا کی نظروں میں اب تک قائم ہے، وہ ٹوٹ جائے گا اور مجھے اس بنگلے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔ پھر میں کسی فٹ پاتھ پر فقیروں کی طرح سسک سسک کر مر جاؤں گا۔“ پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”رات بہت ہو گئی ہے۔ تم مجھے کمرے میں پہنچا دو اور خود بھی جا کر آرام کرو۔“

”سر! آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ آپ کمرے میں چلیں، میں آپ کے لیے کھانا گرم کر کے لاتا ہوں۔“

☆☆☆

دوسرے دن اچانک ہی شدید بارش ہو گئی۔ کراچی

دے دیا۔ ”یہ تمہاری چھ مہینے کی تنخواہ کا چیک ہے۔ بعد میں جانے حالات کیا رخ اختیار کریں۔“
”اُس اوکے سر۔“ اسد نے کہا۔ ”مجھے فوری طور پر ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اب میری بات غور سے سنو۔ دس سال پہلے میں نے لندن میں ایک انشورنس کمپنی سے پچاس کروڑ کی پالیسی لی تھی۔ اس وقت شائستہ میرے ساتھ تھی۔ میں نے وہ پالیسی اس کے نام کر دی تھی لیکن بعد میں جب نورین میری زندگی میں آئی تو میں نے اس کی حسن اور اداؤں سے متاثر ہو کر وہ پالیسی اس کے نام کر دی۔ اس پالیسی کے تحت اگر میں نورین کے ہاتھوں مارا جاؤں گا تو اسے ایک ماہی بھی نہیں ملے گی، ہاں جیل کی ہوا ضرور کھانا پڑے گی۔ اگر میں خودکشی کر لوں تب بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اب میری موت کی دو ہی صورتیں اس کے حق میں جاتی ہیں۔ یا تو کوئی مجھے قتل کر دے یا میں طبعی موت مر جاؤں یا کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن میں اس پالیسی میں سے ایک پیسا اسے دینے کا روادار نہیں ہوں کیونکہ میں خودکشی کر دوں گا۔“

”سر! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ تو بے تحاشا ڈرنک کرنے کے بعد بھی نہیں ہنستے پھر.....“
”میں نشے میں نہیں ہوں بلکہ پورے ہوش و حواس میں یہ کہہ رہا ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔ ”میں خودکشی کر لوں گا تو اسے یہ مکار اور شاطر عورت قتل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پیسے کے لیے آخری حد تک جاسکتی ہے۔ یہ میری خودکشی کو قتل ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گی۔ ممکن ہے یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو بھی جائے لیکن اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ میں نے زبیری کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں خودکشی کر رہا ہوں، اس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ یہ حرام زادی اور تم دونوں قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے۔ اس کے بچنے سے زیادہ مجھے یہ فکر ہے کہ یہ اپنی مکاری سے کہیں تمہیں اس قتل میں ملوث نہ کر دے اور خود پچاس کروڑ پیسے کی رقم ہڑپ کر لے۔ یہ خط اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میں نے خودکشی کی ہے۔“

”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے..... آپ.....؟“

آفتاب نے ایک دم جیب میں ہاتھ ڈال کر پستل نکال لیا۔

”سر! پلیز ایسا نہ کریں۔“ اسد نے کہا۔

کی سڑکیں تو ذرا سی بارش میں جل جلی ہو جاتی ہیں۔ اس دن نورین گھر ہی پر تھی۔ اسد، آفتاب کو لان میں لے کر گیا تھا لیکن بارش کی وجہ سے وہ لاؤنج میں آ گیا تھا۔ اسد نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

”مجھے ذرا رائٹنگ پیڈ اور پین دے دو۔“ اسد نے اسے رائٹنگ پیڈ، پین اور کلپ بورڈ دے دیا اور آفتاب اشہاک سے کچھ لکھنے لگا۔ وہ تقریباً دس، بارہ منٹ تک لکھتا رہا پھر لفافہ لے کر وہ کاغذ اس میں رکھا، اس پر کسی کا نام لکھا اور اسد سے بولا۔ ”تم یہ خود ایڈووکیٹ زبیری تک پہنچا دینا۔“

اسد نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے جیب میں رکھ کر جانے کے لیے پلٹا تو آفتاب نے کہا۔ ”ابھی نہیں، اسے بعد میں پہنچا دینا۔ تم بیٹھو، میں تمہیں ایک تماشہ دکھانا چاہتا ہوں۔“

اسد اُلجھے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ آفتاب نے چند لمحوں کے وقفے میں پھر چیخ کر بولا۔ ”نورین!..... نورین!.....“
”کیا بات ہے؟“ اوپر سے نورین کی آواز سنائی دی۔
”نیچے آؤ۔“ آفتاب نے گرج کر کہا۔

”میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں اس وقت.....“
”نورین!“ اس مرتبہ آفتاب پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا۔ ”ابھی اور اسی وقت نیچے آؤ، کم آن۔“
نورین اسی ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ڈھیلی شرٹ میں نمودار ہوئی۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہی بھی رہی تھی۔

”کیا پرالیم ہے؟“ نورین نے درشت لہجے میں پوچھا۔
”ادھر بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“
نورین نے اسد کی طرف دیکھا۔ ”یہ یہیں رہے گا۔“
آفتاب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

نورین تھماتی ہوئی بیٹھ گئی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم میری موت چاہتی ہو۔ تمہارا بس چلے تو تم کسی دن مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو لیکن تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اب تک میری محبت میں نہیں، اپنی مجبوری میں میرے ساتھ گزارہ کر رہی ہو۔“

”یہ ان باتوں کا کون سا موقع ہے؟“ نورین بگڑ کر بولی۔ ”وہ بھی ایک ملازم کے سامنے۔“

”شٹ اپ۔“ آفتاب گرج کر بولا۔ ”اسد میرا پی اے ہے اور پی اے کو ہر بات معلوم ہونا چاہیے۔“ آفتاب نے جیب سے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھ کر اسد کو

”ایسا مت کریں آفتاب۔“ نورین چیخی۔ ”ابھی حالات اتنے نہیں بگڑے ہیں کہ.....“

”گڈ بائے۔“ آفتاب نے کہا اور پستل کی نال اپنی کن پٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ اس دوران --- ہی بادل زور سے گرجے۔ اس کی آواز میں فائر کی آواز دب گئی۔

ویسے بھی اس کی آواز کو سننے والا کون تھا۔ ڈیفنس کا وہ علاقہ ابھی اتنا آباد نہیں تھا۔ چوکیدار مین گیٹ پر ہوتا تھا جو اقامتی حصے سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس تک آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی اس وقت وہ شدید بارش کی وجہ سے اپنی کوٹھڑی میں ہو گا۔ آفتاب بری طرح تڑپا اور صوفے سے لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ فوراً ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔

”اوہ مائی گاڈ.....!“ نورین بڑبڑائی۔ ”یہ کیا ہو گیا؟“

”میں پولیس کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ اسد ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

”نہیں۔“ نورین چیخی۔ ”ابھی پولیس کو کال مت کرو، مجھے کچھ سوچنے دو۔“

اسد خود بھی سوچ رہا تھا پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میری ذہن میں اسے قتل ثابت کرنے کا ایک آئیڈیا ہے۔“

”کیسا آئیڈیا؟“ نورین نے پوچھا۔

اسد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”آئیڈیا تو ہے لیکن پہلے ہمیں ایک ڈیل کرنا پڑے گی۔“

”ڈیل کیسی؟“ نورین چونک کر بولی۔

”انشورنس کی رقم ففتی ففتی ہوگی۔“ اسد نے سنجیدگی سے کہا۔

”پچیس کروڑ تمہارے اور پچیس کروڑ میرے۔“

”تم رہنے دو، میں خود ہی کچھ سوچ لوں گی۔“

”تم سوچتی رہو، میں پولیس کو ٹیلی فون کرنے جا رہا ہوں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”پاکل ہو گئے ہو۔“ نورین نے کہا۔ ”تم شاید بھول گئے کہ آفتاب کے ہاتھ سے پستل تم ہی نے نکالا تھا۔“

”ہاں تو؟ وہ پستل تو اب بھی میری جیب میں ہے۔“

اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”پولیس کو تم کیا ٹیلی فون کرو گے، میں خود ٹیلی فون کروں گی اور بتاؤں گی کہ تم نے میرے شوہر سے بلینک چیک پر سائن لیے، پھر اسی کے پستل سے اسے ہلاک کر دیا۔ پستل تمہارے قبضے میں ہے۔ اس پر تمہاری انگلیوں

کے نشانات بھی ہوں گے اور میرے پاس آفتاب کا دستخط کیا ہوا ایک بلینک چیک بھی ہے۔ میں پولیس کو بتاؤں گی کہ میں نے تم سے وہ چیک چھین لیا۔ اب تم میری جان بھی لینا چاہتے ہو۔ میں نے اپنے کمرے میں بند ہو کر اپنی جان بچائی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فاتحانہ انداز میں اسد کی طرف دیکھا۔

”ویری گڈ!“ اسد نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”تم تو بہت اچھی کہانی کار ہو۔ تم فلموں اور ٹی وی ڈراموں کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ لیکن تمہاری کہانی میں دم نہیں ہے۔ پولیس یہ ضرور پوچھے گی کہ تم نے مجھ سے وہ

بلینک چیک کیسے چھینا؟ آفتاب کا پستل تو اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھا، میں اسی وقت تمہیں بھی ہلاک کر سکتا تھا۔“ اسد مسکرایا۔ ”اور میڈم! آپ یہ کیوں بھول گئیں

کہ میرے پاس آفتاب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے جو اس نے زبیری کے نام لکھا ہے جس میں اس نے اپنی خودکشی کا اعتراف کیا ہے۔ تم پولیس کو کال کرو، میں زبیری سے بات کرتا ہوں۔“

نورین غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔

”یو بلڈی بلیک میلر۔“ وہ غصے میں چیخی۔

”یہ بلیک میلنگ نہیں بلکہ ڈینگ ہے۔ تمہیں پچیس کروڑ کم لگ رہے ہیں؟ ویسے تم غصے میں زیادہ محسوس لگتی ہو۔“

”بکو اس کرو گے تو تھپڑ مار دوں گی۔“

”زیادہ سنی ساوتری بننے کی کوشش مت کرو ڈارلنگ! ممکن ہے تمہارے اس قیامت خیز حسن سے متاثر ہو کر میں

اپنے حصے کے پچیس کروڑ تمہیں دے ہی دوں۔“

”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہوں۔ میرے حسن کی تعریف بعد میں کرتے رہنا۔“

”صرف تعریف؟“ اسد مسکرایا۔

”ارے پہلے اس لاش کا تو کچھ کرو۔“

اسد اٹھ کر کچن کے کوریڈور میں آیا۔ وہاں بڑا سا ایک ڈیپ فریز رکھا تھا۔ اس نے نورین سے پوچھا۔ ”اس

ڈیپ فریز میں کیا ہے۔ کچھ ہے تو اسے خالی کرو۔“

”یہ خالی ہی ہے۔“ نورین نے کہا۔

”ہم آفتاب کی لاش کو اس فریزر میں رکھ دیں گے۔ فریزر میں رکھنے کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا وقت ثابت نہیں ہو سکے گا۔ پھر ہم کسی مناسب موقع کا انتظار کریں گے اور آفتاب کی موت کو قتل ثابت کرنے کے لیے

”بس، اب مجھ سے مزید محنت نہیں ہوگی۔“ نورین نے کہا۔

”پچیس کروڑ اتنی آسانی سے نہیں ملتے میڈم۔“ اسد ہنس کر بولا پھر وہ اچانک بولا۔ ”اپنے کپڑے اتارو۔“

”کک..... کیا مطلب؟“ نورین گھبرا کر بولی۔

”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ.....“

”ارے لعنت بھیجو مطلب پر۔“ اسد جھنجھلا گیا۔

”تمہارے کپڑوں پر بھی خون کے دھبے ہیں۔ یہ اس وقت لگے ہوں گے جب ہم نے آفتاب کی لاش کو ڈیپ فریزر میں رکھا تھا۔ کپڑے مجھے دو تا کہ میں انہیں جلا دوں۔“

کپڑے اور خون میں تر تو لیا جلانے کے بعد اسد دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔ وہ ہاتھ روم سے نکلتا تو نورین بھی نہادھو کر فریش ہو چکی تھی۔

”اب کافی لاؤ۔“ اسد نے یوں کہا جیسے نورین اس کی ملازمہ ہو۔

نورین نے گھور کر اسے دیکھا۔

”بلکہ کافی چھوڑو۔“ اسد نے کہا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے ہم کھانا کھا لیتے ہیں، پھر اطیمینان سے کافی پیئیں گے اور سوچیں گے کہ آفتاب کی خودکشی کو قتل کیسے ثابت کیا جائے۔“

”وہ خط مجھے دے دو جو آفتاب نے زبیری کے نام لکھا ہے۔“ نورین نے کہا۔

”کیا میں شکل سے تمہیں اتنا ہی احمق نظر آ رہا ہوں؟“ اسد نے کہا۔ ”یا تمہارے خیال میں میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے؟ میڈم جی، وہ خط ہی تو ہماری اور خاص طور پر میری بے گناہی کا ثبوت ہے، کل کلاں خداخواستہ پولیس معاملے کی تک پہنچ گئی تو وہ خط ہی ہماری بے گناہی کا ثبوت ہو گا پھر یہ کہ وہ ایک طرح سے میرا ضمانت نامہ بھی ہے۔ اگر آفتاب کا قتل ثابت ہو جائے تو انشورنس کی رقم تو تمہیں ملے گی۔ تم مجھے میرا حصہ دینے سے انکار کرو گی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں، وہ خط میرے پاس ہوا تو میں وہ خط انشورنس کمپنی کے حوالے کر دوں گا، پھر تمہیں وہ لوگ ایک پانی بھی نہیں دیں گے۔“

”تم انتہائی کمینے آدمی ہو۔“ نورین نے کہا۔

”اس تعریف کا شکریہ لیکن تم بھی کم ذلیل اور گھٹیا نہیں ہو۔ چلو اب کھانا لاؤ لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ڈرنک بنا دو تا کہ میرے اعصاب کو کچھ سکون مل سکے۔“

کھانے کے بعد برتن سیٹھے ہوئے نورین نے کہا۔

اسے کہیں اور پھینک دیں گے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گا، یہ بعد میں سوچیں گے۔ فوری طور پر تو ہمیں لاش کو اس فریزر میں رکھ دینا چاہیے تا کہ وہ خراب ہونے سے محفوظ رہے۔“

نورین اور اسد نے آفتاب کی لاش اٹھانے سے پہلے اس کے سر پر ایک تولیا لپیٹ دیا تا کہ خون کسی دوسری جگہ نہ گرے۔ خون ابھی جتنا شروع نہیں ہوا تھا۔ آفتاب کی لاش کو ڈیپ فریزر میں رکھنے کے بعد اسد نے آفتاب کے چہرے کے گرد لپٹا ہوا تولیا نکال لیا جو خون میں تر تھا۔ نورین نے ڈیپ فریزر آن کر دیا اور اسے لاک کرنے لگی۔

”اسے لاک مت کرو۔“ اسد نے کہا۔ ”اگر خدا نخواستہ پولیس گھر تک آگئی یا کوئی بھی یہاں آیا تو وہ اس ڈیپ فریزر کو لاک دیکھ کر خواخواہ تجسس میں مبتلا ہو جائے گا اور ضرور پوچھے گا کہ اس میں کیا ہے۔ وہ اسے کھولنے پر اصرار کرے گا۔“

”اور لاک نہ ہوا تو؟“ نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ آرام سے ڈیپ فریزر کھولے گا اور آفتاب کی لاش برآمد کر لے گا۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔“ اسد مسکرایا اور ارد گرد دیکھا۔ اسے شراب کی خالی بوتلوں کا ایک انبار نظر آیا۔ اس نے ایک ایک کر کے ڈیپ فریزر میں بوتلیں بھر دیں اور بولا۔ ”اب کوئی بھی ڈیپ فریزر کھولنے سے پہلے بوتلوں کے اس انبار کو ہٹائے گا۔ جب اسے بتایا جائے گا کہ یہ ڈیپ فریزر خالی ہے تو وہ بوتلوں کے اس انبار کو ہٹانے کی مشقت نہیں کرے گا۔“

”تم تو بہت ذہین ہو۔“ نورین نے توصیفی انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ پچاس کروڑ میں سے تیس کروڑ میں لوں اور.....“

”زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔“ نورین منہ بنا کر بولی۔ ”میں کافی بناتی ہوں۔ اس محنت میں خاصی شگن ہو گئی ہے۔“

”او میڈم!“ اسد نے چٹکی بجا کر کہا۔ ”ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ صوفے اور فرش پر آفتاب کے خون کے دھبے موجود ہیں۔ پہلے فرش اور صوفہ اچھی طرح صاف کرو۔ میں پیٹرول کا کین لے کر آتا ہوں۔ صوفہ اور فرش پانی سے صاف کرنے کے بعد اسے پیٹرول سے بھی رگڑ کر صاف کرنا ہو گا تا کہ معمولی سا دھبہ بھی نہ رہنے پائے۔“

آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد ان دونوں نے مل کر ہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں خون کا معمولی سا قطرہ بھی تھا۔

”تم نے ایڈووکیٹ زبیری کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ وہ کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے اور وہ آفتاب سے ملنے کی کوشش بھی کرے گا۔“

”ہم کہہ دیں گے کہ آفتاب کسی سلسلے میں لاہور یا اسلام آباد گیا ہے۔ شہر سے باہر تو وہ جاتا ہی ہوگا؟“
”وہ گزشتہ چھ سات مہینے سے کراچی سے باہر نہیں نکلا۔“ نورین نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب بھی نہیں نکلے گا۔ میں نے اسے دوبارہ بزنس اسٹیلش کرنے پر قائل کر لیا تھا اور اس سلسلے میں وہ اسلام آباد چلا گیا۔“

”زبیری بہت تیز اور ذہین آدمی ہے۔“ نورین نے کہا۔ ”وہ ہماری اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہ آفتاب اپنے جانے کی اطلاع اسے ضرور دیتا اور وہ کون سا پروجیکٹ ہے جس کے لیے آفتاب کا اسلام آباد جانا ضروری تھا؟ وہ تمہارے مشورے پر اسلام آباد گیا ہے اور تمہیں نہیں چھوڑ گیا؟“ نورین کے لہجے میں طنز تھا۔

”ایک سپورٹ بیورو کے چیف سیکریٹری سے اس کی مینٹگ ملے ہو چکی تھی۔ عین وقت پر میں بیمار پڑ گیا اس لیے وہ مجبوراً اکیلا ہی چلا گیا۔“

”مجھے تو اس کہانی میں جھول نظر آرہا ہے۔ اب زبیری سے تم ہی بحثنا۔“ نورین نے کہا اور برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ دونوں مزید کچھ دیر بیٹھے منصوبہ بندی کرتے رہے، پھر نورین بولی۔ ”میرے خیال میں اب سو جانا چاہیے۔“

”بارش ابھی تک تھمی نہیں ہے۔“ اسد نے کہا۔ ”آؤٹ ہاؤس تک جاتے جاتے میں بھیگ جاؤں گا اور میں اس وقت بھیگنے کے موڈ میں نہیں ہوں اس لیے یہیں سو جاتا ہوں۔“

”جو مرضی آئے کرو۔“ نورین نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ اسد اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا رہا، پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اٹھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا اور نورین کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔

نورین باریک ناکی پہنے واش روم سے نکل رہی تھی۔ وہ اسد کو دیکھ کر چونکی اور بولی۔ ”اب کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اسد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بھی سونے آیا ہوں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ نورین بگڑ کر بولی۔ ”تم یہاں سوؤ گے، میرے بیڈ روم میں؟“

”ہاں بلکہ اس بیڈ پر۔“ اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو باہر نکلو یہاں سے۔“

”دیکھو، مجھے پیسے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی تمہیں ہے۔ میں یہاں سے نکل کر پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گا اور زبیری کو بھی بلا لوں گا۔“

”تم بہت ہی گھنیا درجے کے بلیک میلر ہو، اس وقت میں مجبور ہوں۔ کرو اپنی من مانی لیکن پہلے کمرے کی لائٹ آف کر دو۔“

”آفتاب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تم انتہائی گھنیا درجے کی عورت ہو۔ پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔ میں صرف تمہیں آزمارہا تھا ورنہ مجھے تمہارے اس حسین تھوڑے سے کوئی دلچسپی تھی بھی تو اب نہیں رہی۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنی اس توہین پر نورین غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، پھر بستر پر گر گئی۔ وہ تھوڑی دیر لیٹی بیچ و تاب کھاتی رہی پھر اپنا سیل فون اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولی۔ ”ہیلو ڈیز..... ہاں، میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بس تمہاری آواز سننے کو ٹیلی فون کیا تھا۔“

اسد وہاں سے نکل کر آفتاب کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اچانک اس کی نظر آفتاب کے سیل فون پر پڑی۔ اس نے چونک کر ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس پر کوئی بھی مس کال یا ایس ایم ایس نہیں تھا۔ اسد نے سکون کا سانس لیا اور سیل فون آف کر دیا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ خاصا بے ترتیب تھا۔ اسد نے اسے جوں کا توں چھوڑ دیا پھر اچانک اس کی نظر الماری میں رکھے ہوئے ہینڈ کیمری پر پڑی۔ اس نے ہینڈ کیمری میں آفتاب کے کچھ کپڑے رکھنے کا ارادہ کیا، پھر اسے خود ہی مسترد کر دیا۔ زبیری جانتا ہوگا کہ آفتاب کون سا سامان لے کر شہر سے باہر جاتا ہے۔ ہینڈ کیمری پر تو ایک معروف انٹر لائن کا ٹیگ موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک سوٹ کیس پر بھی اسی انٹر لائن کا ٹیگ تھا۔ اس نے وہ سوٹ کیس اور ہینڈ کیمری اٹھایا اور اسے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ پھر اس نے فلائٹ انکوائری کو فون کر کے اس انٹر لائن کی فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا۔ اسے بتایا گیا کہ انٹر لائن کی وہ فلائٹ صبح دس بجے اسلام آباد جاتی ہے۔ وہ یہ ساری معلومات زبیری کے سوالات کے لیے اکٹھی کر رہا تھا۔ وہ وکیل تھا اور یہ ضرور پوچھتا کہ آفتاب کس انٹر لائن سے اسلام آباد گیا ہے اور کس وقت؟

”اور کیا تیسرا چیک میں لے جاؤں؟“ نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ اسد کو خیال آیا کہ اس نے وہ چیک بھی ابھی تک ضائع نہیں کیا تھا جسے اس نے پانچ لاکھ سے پچاس لاکھ میں تبدیل کیا تھا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم نے جو کچھ بھی میری جیب سے نکالا ہے، وہ میرے حوالے کر دو ورنہ وہ چیک پچیس کروڑ سے زیادہ تو نہیں ہیں۔“

”یو بلڈی بلیک میلر۔“ نورین نے بھنا کر کہا اور چیک اس کے بیڈ پر پھینک دیے۔

”رک جاؤ۔۔۔۔۔“ اسد غرا کر بولا۔

نورین جھنجھلا کر پلٹی تو اس کی آنکھیں خوف سے کھلی رہ گئیں۔ اسد کے ہاتھ میں پسل تھا اور اس کا رخ نورین کی طرف تھا۔ وہ ہکا کر بولی۔ ”تت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔“

”ہاں، اگر تم نے آئندہ اپنی یہ گندی زبان قابو میں نہ رکھی تو میں تمہیں گولی مار کے یہاں سے نکل جاؤں گا بلکہ گولی بھی ضائع نہیں کروں گا۔ تمہاری گردن مروڑ کے تمہیں بھی ڈیپ فریئر میں ٹھونس دوں گا۔ حرام زادی، مجھے گالیاں دیتی ہے۔ جو بد چلن عورت پیسے کے لیے خود کو کسی دوسرے کے حوالے کرنے کے لیے آمادہ ہو، میرے نزدیک وہ جانور سے بھی بدتر ہے۔ اب دفع ہو جا یہاں سے۔“

”صبح ہوتے ہی میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا، پھر تو جانے اور آفتاب کی لاش جانے۔ تو کم سے کم مجھ پر تو قتل کا الزام نہیں لگا سکتی ہے کیونکہ میرے پاس آفتاب کا خط موجود ہے۔“

”سنو اسد!“ نورین نے نرم لہجے میں کہا۔ ”آئی ایم سوری، آئندہ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ ہم دونوں کو مل کر کام کرنا ہے تو پھر ہم آپس میں کیوں لڑیں جھگڑیں۔“

”یہ بات بہت دیر سے تمہاری سمجھ میں آئی میڈم۔“ اسد نے کہا۔ ”او کے اب جاؤ اور مجھے سونے دو۔“

چوکیدار نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو وہ جانے ہمارے بارے میں کیا سوچے؟“

”چوکیدار یہاں کہاں سے آئے گا۔ گیٹ بالکل مخالف سمت میں ہے اور یہاں سے اس کا فاصلہ بھی بہت ہے۔“ نورین نے کہا اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

اسد نے تینوں چیک اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھے اور اس مرتبہ دروازہ اندر سے بولٹ کر کے سو گیا۔ صبح اس کی

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اسد آڈٹ ہاؤس میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ آفتاب کی خودکشی کے بعد وہ خود بھی ذہنی طور پر منتشر ہو گیا تھا۔ اس نے فضول میں اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اسے آفتاب نے اب تک آٹھ لاکھ روپے دیے تھے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ پولیس کو اطلاع کرتا اور خاموشی سے نکل جاتا۔ آٹھ لاکھ کی رقم سے وہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس تو کر ہی سکتا تھا۔ اب پچھتا تا بے کار تھا۔ اب تو وہ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا، پچیس کروڑ روپے کی رقم بھی تو کم نہیں ہوتی۔ میں یہ رقم لے کر امریکا یا کینیڈا شفٹ ہو سکتا ہوں اور اپنی ایک نئی اور تباہ کن زندگی کا آغاز کر سکتا ہوں۔

اسے پوری طرح نیند نہیں آئی تھی کہ ہلکی سی ایک آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے بیڈروم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفتاب کا پسل اس کے پاس تھا۔ اس نے نیچے کے نیچے سے پسل نکالا اور اسے ہاتھ میں لے کر دائیں طرف چھپا لیا۔

دروازہ کھلا تو اسے نورین کا ہیولا نظر آیا کیونکہ کمرے میں ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اسد نے آنکھیں موند لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہے۔

نورین دبے پاؤں اس کے بیڈ کی طرف بڑھی۔ غور سے اس کا جائزہ لیا پھر کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسد کی جیکٹ سامنے ہی کرسی پر پڑی تھی۔ اسد نے خفیف سی آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ اس کی جیکٹ کی تلاشی لے رہی تھی۔ اسد دل ہی دل میں ہنسا، نورین کو یقیناً اس خط کی تلاش بھی جو آفتاب نے زیری کے نام لکھا تھا۔ اسد اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ وہ خط اس نے بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا رکھا تھا۔

نورین نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسے خط نہ ملا تو اس نے وہ دونوں چیک نکال لیے جو آفتاب نے اسے دیے تھے اور جنہیں کیش کرانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

نورین دونوں چیک لے کر دروازے کی طرف پلٹی تو اسد نے کہا۔ ”ہیلو میڈم!“

نورین یوں چونک کر پلٹی جیسے اس کا پیر دکھتے ہوئے انکارے پر پڑ گیا ہو۔

”مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں وہ خط جیکٹ کی جیب میں رکھوں گا۔ تمہاری اس خوب صورت کھوپڑی میں دماغ ہے ہی نہیں لیکن میرا دماغ ابھی کام کر رہا ہے۔ خاموشی سے وہ دونوں چیک میرے حوالے کر دو۔“

سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھا سکتا ہوں۔“ اسد کا لہجہ بھی تلخ تھا۔ اسے زبیری کے طرزِ خطاب پر طیش آ گیا تھا۔ ”وہاٹ ڈویو مین؟“ زبیری بھٹا کر بولا۔ ”کیا میں اتنا ہی جاہل ہوں کہ بزنس کے کسی پلان کو نہ سمجھ سکوں۔ میں آفتاب کا لیگل ایڈوائزر بھی ہوں۔“

”ابھی ہمیں کوئی لیگل پر اہم نہیں ہے۔“ اسد نے کہا۔ ”ویسے میں نے انہیں گارج کی ایکسپورٹ کا مشورہ دیا ہے۔“

”گارج کی ایکسپورٹ؟“ زبیری نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ کون سی ایکسپورٹ ہے پی اے صاحب؟“

”سر! شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ صرف کراچی میں ہی ٹنوں کے حساب سے گارج ہوتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کوریا کی ایک کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔ وہ لوگ اس پر راضی ہیں۔ اب مسئلہ ہے صرف ایکسپورٹ لائسنس کا۔ آفتاب صاحب اسی سلسلے میں اسلام آباد گئے ہیں۔“ اسد نے کہا۔

اس نے دیکھا کہ اس جواب سے زبیری کچھ مرعوب ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”پھر تو پی اے کی حیثیت سے تمہارا جانا بھی ضروری تھا؟“

”میں بھی جا رہا تھا لیکن کل اچانک مجھے تیز بخار ہو گیا۔ اس وقت تو مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ سر کا جانا ضروری تھا اس لیے وہ مجھے ساتھ لیے بغیر ہی چلے گئے۔“

”وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا۔“ زبیری نے کہا پھر سیل فون نکالتے ہوئے بولا۔ ”میں آفتاب ہی کو کال کر لیتا ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ نورین نے کہا۔ ”صبح سے کئی مرتبہ میں کوشش کر چکی ہوں۔ ان کا نمبر مسلسل آف ہے۔ یا تو وہ میٹنگ میں ہیں یا پھر ان کے سیل فون کی بیٹری لو ہو گئی ہے۔ چار جرتو وہ یہیں بھول گئے ہیں۔“

”یہ کوئی ایشیو نہیں ہے بھابی۔“ زبیری نے کہا۔ ”آفتاب کسی جنگل میں نہیں ہے۔ وہ سیل فون کا چارجر ہی کیا سیل فون بھی خرید سکتا ہے۔ اتنی معمولی سی بات تو اس کی عقل میں بھی آ جانا چاہیے تھی۔“

”زبیری بھائی! آپ ان کی عادت تو جانتے ہیں۔ کہیں جا کر انہیں گھر کی فکر کب ہوتی ہے۔ اب کوئی ضرورت پڑے گی تو وہ کال کرنے کے لیے چارجر بھی خرید لیں گے اور نیا سیل فون بھی۔ وہ تو لینڈ لائن پر بھی کال کر سکتے ہیں۔“ نورین کے لہجے میں تلخی تھی۔

”ہاں، اس کی عادت تو میں جانتا ہوں۔“ زبیری نے

آنکھ دیر سے کھلی۔ وال کلاک میں دس بج رہے تھے۔ وہ تیار ہو کر بنگلے کے لاونچ میں پہنچا تو نورین پہلے سے نکھری نکھری بیٹھی تھی۔ وہ اسد کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ”لگتا ہے، رات بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ چلو، اب ناشتا کر لو۔ تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔“

وہ دونوں ناشتے کے بعد کافی پی رہے تھے کہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ”زبیری آ گیا۔“ نورین بوکھلا کر بولی۔

”ٹیک اٹ ایزی بی بی۔“ اسد نے کہا اور اپنا کافی کا کپ اٹھا کر کچن میں لے گیا اور خود واپس آ کر نورین سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی، پھر زبیری اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر اس وقت سیاہ کوٹ تھا۔

”ہیلو مزر آفتاب۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ نورین نے سنبھل کر جواب دیا۔

”السلام علیکم سر!“ اسد نے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ زبیری نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔ زبیری نے اسد کو نظر انداز کر کے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا پھر بولا۔ ”ویز از دیٹ اولڈ یگ مین؟“ وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا وہ اب تک سو رہا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

”وہ اسلام آباد میں ہیں زبیری صاحب۔“ نورین نے جلدی سے کہا۔

”کیا؟“ زبیری نے حیرت اور بے یقینی سے نورین کو دیکھا۔ ”اسلام آباد کیوں گیا ہے وہ؟“

”سر! انہیں ایکسپورٹ ڈیپارٹمنٹ کے چیف سیکریٹری سے ملنا تھا۔ اصل میں انہیں میں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ اپنی لائف ایکٹو کریں۔“

”تم نے مشورہ دیا تھا..... تم نے؟“ زبیری نے حقارت سے کہا۔ ”تم جیسا ڈرائیور بھی آفتاب کو کوئی مشورہ دے سکتا ہے؟“

”سر! میں ڈرائیور نہیں ہوں۔“ اسد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں آفتاب سر کا پی اے ہوں اور بزنس مینجمنٹ کی ڈگری ہے میرے پاس۔“

”بزنس مینجمنٹ؟“ زبیری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور وہ مشورہ کیا تھا؟“

”سر! آپ ایڈووکیٹ ہیں صرف قانونی نکات ہی

طویل سانس لے کر کہا۔ ”گزشتہ بیس سال سے اسے جانتا ہوں۔ خدا کرے کہ اس کا موجودہ پروجیکٹ کامیاب رہے۔“

”ہاں، اگر اسدان کے ساتھ رہا تو ممکن ہے وہ پھر سنبھل جائیں۔“ نورین نے کہا۔

”اوکے بھابی۔“ زبیری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی ہائی کورٹ جانا ہے۔ آفتاب اگر رابطہ کرے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔“

”آپ چائے تو پی لیں۔“ نورین نے کہا۔ ”میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“

”ارے بھابی! چائے کو چھوڑیں، میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں اور میں کوئی مہمان تو ہوں نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی اسد نے پگن سے ڈسٹر اٹھا کر اسے پانی سے گیلایا اور لاؤنج کی طرف دوڑا۔ نورین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی جس صوفے پر آفتاب نے خود کشی کی تھی، اس کے پائے پر بہت خفیف سا دھبہ تھا۔ وہ دھبہ بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی نظر آ رہا تھا۔ اسد نے رگڑ رگڑ کر وہ دھبہ پانی سے صاف کر دیا۔ پھر بہت غور سے صوفے کے ایک ایک حصے کا جائزہ لیا۔ فرش کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ پگن میں چلا گیا۔ اسد نے وہ کپڑا بھی پگن میں جا کر جلا دیا۔

وہ دوبارہ لاؤنج میں آ کر بیٹھا تو نورین نے کہا۔ ”اب اس مصیبت کا کیا کریں گے؟ زبیری تو کل پرسوں پھر نازل ہو جائے گا۔ اب جلد ہی کچھ سوچو ورنہ زبیری آفتاب کو تلاش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دے گا۔ وہ اسلام آباد میں موجود اپنے دوستوں سے مدد کرنے کو کہے گا۔ ممکن ہے وہ خود بھی اسلام آباد چلا جائے۔ کچھ سوچو۔“

اسد..... کچھ سوچو۔

”تم خاموش ہو گئی تو میں کچھ سوچوں گا نا۔“ اسد نے کہا۔ ”اگر سوچنے کی تھوڑی سی زحمت تم بھی کر لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔“ اسد کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”خود کشی کی ہے تمہارے شوہر نے..... انشورنس کی رقم تمہیں ملے گی، میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟“

”تمہیں پچیس کروڑ مل تو رہے ہیں۔“ نورین نے کہا۔ ”میں اب تیس کروڑ روپے لوں گا۔ زبیری جیسے گھاگ انسان سے نمٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ابھی تو میں نے جھوٹ بول کر اسے شہلا دیا ہے۔“ پھر اسد کو خود ہی ہنسی آگئی۔ ”گارینج کی ایکسپورٹ..... ایسی کسی

ایکسپورٹ کا وجود نہیں ہے۔ کوریا، چائنا اور دوسرے ملکوں کی کمپنیز گارینج ٹھکانے لگانے اور صاف کرنے کے ٹھیکے ضرور لیتی ہیں لیکن وہ اس کا معاوضہ لیتی ہیں۔ وہ ہم سے کوڑا خریدتی نہیں ہیں۔“

اسد کی بات پر نورین بھی ہنسنے لگی۔

”دانت مت نکالو۔“ اسد نے چڑ کر کہا۔ ”وہ اگر ایکسپورٹ کے کسی آدمی سے بات کرے گا تو میرا جھوٹ فوراً پکڑ لے گا۔ ایک تو وہ آدمی مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ بہت ذہین ہے، اوپر سے وہ وکیل بھی ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ کچھ سوچو۔“ نورین نے کہا۔ اسد کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”ایک پلان تو ہے لیکن اس کے لیے ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کی ضرورت پڑے گی گواہی کے لیے۔“

”تیسرا آدمی۔“ نورین نے چونک کر کہا۔ ”نودے، اس کی وجہ سے کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔“

”پہلے تم پلان سن لو، تیسرا فرد اس کے لیے لازمی ہے۔ کوئی ایسا سیدھا سادہ اور گاؤں دی لڑکا یا لڑکی جو عقل سے پیدل بھی ہو۔“

”پلان کیا ہے؟“ نورین نے پوچھا۔

”کل آفتاب صاحب اسلام آباد سے واپس آ جائیں گے بلکہ آج ہی لوٹ آئیں تو بہتر ہے۔“ اسد نے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ نورین نے کہا۔

”یار! پوری بات سنے بغیر مت ٹوکا کرو۔“

”اچھا بولو، اب نہیں ٹوکوں گی۔“ نورین نے کہا۔

”آفتاب صاحب اسلام آباد سے لوٹیں گے تو ان کی طبیعت بہت خراب ہوگی۔ نزلہ، بخار، کھانسی اور کچھ دوسری شکایات۔ وہ زیادہ وقت سو کر گزاریں گے۔ خاص طور پر زبیری کی آمد کے وقت وہ سو رہے ہوں گے اور انہیں زبیری صاحب سے ملنے نہیں دیا جائے گا۔ البتہ وہ اس ملازم یا ملازمہ کی موجودگی میں جاگ رہے ہوں گے اور انتہائی چڑچڑے ہوں گے۔ چیخیں گے، چلائیں گے، برتن اٹھا کر پھینک دیں گے۔ دوا کھانے سے انکار کریں گے اور تمہیں دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال دیں گے۔ ایسا صرف اس لیے ہوگا کہ وہ ملازمہ یا ملازم ان کے زندہ ہونے کی تصدیق کر سکے۔ پھر ہم ایک رات انہیں آغا خان اسپتال لے جائیں گے کیونکہ ان کی حالت بہت بگڑ جائے گی۔ اس کی گواہی بھی وہ تیسرا فرد دے گا جو یہاں موجود ہوگا۔“

”لیکن آفتاب صاحب ہیں کہاں؟ کیا انہیں ڈیپ

فریزر سے نکال کر لے جاؤ گے؟“

اسد نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ ”تم اگر خاموش بیٹھی رہو تو زیادہ حسین لگتی ہو اور دل میں بہت اچھے اچھے خیالات آتے ہیں۔“ اسد کا لہجہ طنزیہ تھا۔
”سوری..... اب نہیں بولوں گی۔“

”آفتاب صاحب کا گیٹ اپ میں کروں گا اور تم مجھے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اتار دو گی۔ ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہوگی۔ تم نے بتایا تھا کہ رات کو سوتے وقت روشنی ان کی آنکھوں کو چھپتی ہے۔ لائٹ آن ہو تو وہ بہت غصہ کرتے ہیں۔“

”اس بات کی گواہی تو زبیری بھی دے گا۔“ نورین نے کہا۔ ”وہ بھی آفتاب کی اس عادت سے واقف ہے۔“

”اس لیے ہم زینے میں اندھیرا کھیں گے۔ گھر میں موجود گواہ کے مطابق میں یعنی آفتاب صاحب کا پی اے تم سے اجازت لے کر اپنے کسی ذاتی کام سے نکل جاؤں گا۔ آفتاب کی طبیعت بگڑے گی تو تم مجھے بلاؤ گی لیکن میری گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو جائے گا اور مجھے آنے میں تاخیر ہو گی۔ گھبرا کر تم خود ہی آفتاب کو اسپتال لے جاؤ گی، ٹوکنہ مت۔“ اسد نے نورین کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ”میں یہاں سے کچھ فاصلے پر کسی ایسی جگہ گاڑی پارک کر دوں گا جہاں دوسری گاڑیاں بھی پارک ہوں گی، پھر میں کسی ٹیکسی یا رکشا کے ذریعے یہاں پہنچوں گا اور ایک بلاک پہلے ہی اتر کے پیدل یہاں تک آؤں گا۔ بنگلے کے عقبی حصے سے باؤنڈری وال پھلانگ کے میں اندر آؤں گا اور سیوریج پائپ کے ذریعے آفتاب کے بیڈ روم کی کھڑکی تک پہنچوں گا۔ تم کمرے کی کھڑکی اندر سے کھلی رکھنا بس پھر میں آفتاب کا میک اپ کروں گا اور تم مجھے آفتاب بنا کر یہاں سے لے جانا۔ کوشش کرنا کہ گواہ تمہیں اور آفتاب صاحب کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ تم مجھے وہیں چھوڑ دو گی جہاں میں نے دوسری گاڑی پارک کی ہوگی۔ ہم دونوں الگ الگ گاڑیوں میں ایک اسکول تک جائیں گے۔ وہ اسکول بھی میں نے منتخب کر لیا ہے۔ وہاں چوکیدار بھی نہیں ہوتا ہے۔ چوکیدار صبح ڈیوٹی پر آتا ہے اور صفائی وغیرہ کراتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہیں اسکول کے ایک کمرے میں ڈال دوں گا اور وہاں سے واپس آ جاؤں گا۔ صبح ہوتے ہی اسکول کا چوکیدار وہاں پہنچ جائے گا۔ تمہاری کہانی یہ ہوگی کہ تم آفتاب صاحب کو لے کر اسپتال کے لیے نکلی تھیں۔ راستے میں تم لوگوں کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے اس اسکول میں لایا گیا اور

ڈاکو تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں وہیں چھوڑ گئے اور آفتاب صاحب کو لے گئے۔ اب یہ معما پولیس حل کرے گی کہ ڈاکوؤں نے آفتاب صاحب کو کیوں اغوا کیا؟ وہ یہی سمجھیں گے کہ انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ جب تم گھر آ جاؤ گی تو میں تمہیں کہیں سے کال کروں گا اور دس کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کروں گا۔ جو ظاہر ہے کہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ ڈاکو تاوان نہ ملنے پر آفتاب صاحب کو ہلاک کر کے کہیں پھینک دیں گے، کچھ گھنٹے یا ایک آدھ دن بعد پولیس کو آفتاب صاحب کی لاش مل جائے گی۔ لاش ڈیپ فریزر میں رکھی ہے اس لیے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں وقت کا تعین نہیں ہو سکے گا کہ موت کب واقع ہوئی۔ ہاں، میں ان کا یہ پٹل بھی کہیں پھینک دوں گا تاکہ آئندہ قتل بھولے سے بھی یہاں سے دستیاب نہ ہو سکے۔ ان کا قتل ثابت ہوتے ہی تم انشورنس کمپنی کو نکلیں کہہ سکتی ہو۔ پھر ہم اپنے اپنے حصے کی رقم لیں گے اور الگ ہو جائیں گے۔“

”اپنی اپنی رقم یعنی فنی فنی؟“ نورین نے وضاحت چاہی۔

”چلو فنی فنی ہی سہی۔“ اسد نے فراخ دلی سے کہا۔

”تمہیں بھی آفتاب کی بیوی کا کردار نبھانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ رونا دھونا پڑے گا، پولیس کو قاتل کرنا پڑے گا۔“

”اوکے۔“ نورین نے کہا۔ ”پلان تو قابل عمل ہے

لیکن اسلام آباد سے واپسی پر آفتاب کی بیماری ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ زبیری پوچھے گا کہ جب آفتاب کی طبیعت اتنی خراب تھی تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر کیوں نہیں گئے؟“

”میں شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا

اور اسے آفتاب کی حالت کے بارے میں بتاؤں گا پھر

اسے ساتھ چلنے پر مجبور کروں گا بلکہ ڈاکٹر کو تم لے کر آنا۔ مجھے

تو یہاں آفتاب کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میں آفتاب کے گیٹ

اپ میں اس کے بیڈ پر لیٹ جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر سے بھی

بدسلوکی کروں گا۔ اسے گالیاں دوں گا اور بے ہوش ہو

جاؤں گا۔ تم شدید کھانسی کی شکایت کرنا، بلڈ پریشر ہائی

رہنے کی بات کرنا اور اس قسم کی دوسری شکایات بیان کرنا۔

ڈاکٹر مجھے سکون آدرا اور کچھ امیٹی باؤنٹک دوائیں دے گا اور

اپنی فیس لے کر گالیاں کھاتا ہوا چلا جائے گا۔ اس کے بعد

اس تیسری ہستی کی آمد ہوگی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ کیسی

اداکاری کرتی ہو۔ آفتاب کے کمرے میں برتن توڑنا،

شراب کی بوتل دیوار سے دے مارنا اور کمرے سے باہر نکل

کر اس کی خوشامدیں کرنا کہ پلیز دوا تو لے لیں۔ گواہ یہ سمجھے

گاڑی رکنے کی آواز سنی۔ پھر زینے پر قدموں کی آہٹ ہوئی اور اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ دوسرے ہی لمحے نورین کی آواز آئی۔ ”آئیے ڈاکٹر صاحب! پیشینہ کو دیکھ لیں۔“

”یہاں آپ نے اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟“ اسے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔

”میرے اسپینڈ کو بیماری میں روشنی سے الرجی ہو جاتی ہے۔“

”ہوازدیر؟“ اسد نے بالکل آفتاب کے انداز میں چیخنے کی کوشش کی۔

”میں ہوں ڈارلنگ!“ نورین نے محبت کرنے والی نیروی کی طرح کہا۔

ڈاکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ ”ہیلو سر! آئی ایم ڈاکٹر اشفاق۔“

”گیٹ لاسٹ ڈاکٹر، میں مر نہیں رہا ہوں۔“

”سر! پلیز مجھ سے کوآپریٹ کریں۔ میں آپ کو زیادہ دیر ڈسٹرب نہیں کروں گا۔“ ڈاکٹر نے ہمت کر کے اسد کی نبض پکڑ لی۔

اسد جانتا تھا کہ شراب کے دو پیگ پی کر اس کا کہ بیلڈ پریش بڑھ جاتا ہے اس لیے وہ کبھی ایک پیگ سے زیادہ نہیں پیتا تھا۔ اسد اس وقت تکے کے سہارے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شراب کا گلاس اٹھایا اور تیسرا پیگ بھی ایک سانس میں خالی کر دیا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر نورین سے بولا۔

”اس حالت میں ڈرنک کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔“

”اس حالت میں؟“ نورین نے مغموم لہجے میں کہا۔

”یہ تو گزشتہ کئی سال سے مسلسل پی رہے ہیں۔ ہر وقت نشے میں رہنا چاہتے ہیں۔“

”آپ ان کی شراب نوشی کی عادت چھڑا نہیں سکتیں؟“

”شٹ اپ یور اسکل۔“ اسد چیخا۔ ”تم کون ہوتے ہو میری شراب چھڑانے والے۔ ایڈیٹ..... اپنی فیس لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”آپ کا چیک اپ کر لوں تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ڈاکٹر نے ضبط کر کے کہا۔ نورین نے راستے میں شاید ڈاکٹر کو بریف کر دیا تھا۔ اس نے اسٹیٹھو اسکوپ نکال کر کان سے لگایا اور اسد کی پیٹھ پر رکھ کر بولا۔ ”ذرا گہری سانس لیں۔“

اسد نے اس کا بندوبست بھی پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔

گا کہ صاحب نے بے عزت کر کے بیگم صاحبہ کو کمرے سے نکال دیا ہے۔ ایسے میں زبیری ضرور آئے گا۔ اسے کمرے میں جانے سے روکنا اور ہینڈل کرنا تمہارا کام ہے۔ کہہ دینا کہ آفتاب رات بھر سوئے نہیں ہیں، ابھی سوئے ہیں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”اوکے، میں سمجھ گئی۔“ نورین نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”لیکن آفتاب تو ڈیپ فریزر میں پڑا ہی رہ جائے گا۔“

”نہیں، تمہارے اغوا کے بعد میں دو تین دن بعد مناسب موقع دیکھ کر اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا اور کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دوں گا۔ کوڑے کا وہ ڈھیر آبادی کے نزدیک ہو گا تا کہ پولیس کو فوراً ہی اس کی لاش مل جائے۔“

”اوکے ڈن۔“ نورین نے کہا۔

”تو پھر تم ابھی کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ میں آفتاب کا گیٹ اپ کر لیتا ہوں۔“

”پہلے تم گیٹ اپ تو کر لو۔“ نورین نے کہا۔

اسد، آفتاب کے کمرے میں آیا۔ آفتاب کا قد اسد کے مقابلے میں کچھ کم تھا۔ اسد نے اس کا سیلپینگ گاؤن پہنا، سر پر اونی ٹوپی پہنی، کلائی پر آفتاب کی قیمتی رویکس گھڑی باندھی اور کمرے میں ٹائٹ بلب روشن کر دیا۔ اس نے شراب کی آدھی بوتل اور گلاس نہ صرف رکھ لیا بلکہ ایک پیگ بھی لے لیا۔

نورین مطمئن ہو کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ اسد سوچ رہا تھا کہ یہ ایک جوا ہے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو پچیس کروڑ روپے دھوکا دہی کے الزام میں چند ماہ کی جیل اور صرف اٹھاون لاکھ۔ وہ چیک اسد کی جیب میں اب بھی موجود تھے۔ اس نے سوچا کہ کل موقع ملتے ہی اسے بینک سے کیش کرا لے گا۔

اگر منصوبہ ناکام بھی ہو گیا تو جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کے ذہن میں بزنس کے کئی پلان تھے۔ اس سے پہلے بھی اسے ملازمت کی نہیں بلکہ کسی فنانسر کی تلاش تھی جو اس کے بزنس میں سرمایہ لگا سکے۔ وہ اپنی ماں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے کسی بھی منصوبے کے شروع ہونے سے پہلے ہی چل بسی۔ اسد مجرمانہ ذہنیت کا مالک تو نہیں تھا لیکن ہاتھ آیا ہوا یہ موقع گنانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ دیر تک سوچوں میں گم رہا، اس نے وقت گزاری کے لیے شراب کا ایک اور پیگ لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ذہن ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اسی وقت اس نے پورچ میں

نورین بہت ادا سے مسکرائی اور نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بچن کی طرف چلی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کافی پی رہے تھے کہ زبیری آگیا۔ نورین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”آفتاب کی کوئی خبر؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔
”واپس آگئے ہیں لیکن شدید بیمار ہیں۔“ نورین نے کہا۔ ”انہیں شدید نزلہ ہے، بخار ہے۔ ابھی ابھی ڈاکٹر انہیں دیکھ کر گیا ہے۔ اسد دوائیں لینے جا رہا تھا۔“
”کس ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟“

”ڈاکٹر اشفاق احمد کو..... جو جوان ڈاکٹر ہے لیکن ہائی کوالیفائیڈ ہے۔ اس کے پاس مریضوں کا رش تھا، بہت مشکل سے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا۔ اسد کے ساتھ تو وہ آنے سے ہی انکار کر دیتا لیکن میری خوشامد پر آگیا۔“ نورین نے اسے دواؤں کا پرچہ دکھایا۔

زبیری نے بہت غور سے دواؤں کا پرچہ دیکھا۔ پھر بولا۔ ”میں ذرا اس سے مل لوں۔“ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔
”زبیری صاحب! اسد نے کہا۔“ لگتا ہے وہ کل سے نہیں سوئے تھے، ڈاکٹر نے انہیں نیند کا انجکشن دیا ہے۔“
”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“ نورین نے کہا۔

”اوکے، اوکے۔“ زبیری نے کہا۔ ”میں اب دو دن تک تو شاید نہ آسکوں۔ مجھے ایک کیس کے سلسلے میں لاہور جانا ہے۔ بھابی آپ میری طرف سے پوچھ لیجیے گا اور ان کا خیال رکھیے گا۔“

”میں سوچ رہی ہوں کہ عارضی طور پر کوئی ملازمہ رکھ لوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آفتاب بیماری میں کتنے چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھے ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہاں، میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کوئی ملازمہ رکھ لیں۔“
”میں دوائیں لے کر آتا ہوں۔“ اسد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی اب چلوں گا۔“ زبیری نے کہا۔
”ارے، آپ تو بیٹھیں۔“ نورین نے کہا۔ ”میں آپ کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔“
”ہاں، کافی تو میں ضرور پیوں گا۔“ زبیری نے کہا۔
اسد دوائیں لینے چلا گیا۔ نورین نے اسے دواؤں کے پیے بھی دیے تھے۔ وہ دوائیں لے کر واپس آیا تو بیٹنگلے

اس نے شرٹ کے نیچے سینے سے لے کر کمر تک ایسا شاپر لپیٹ لیا تھا جس میں سے ہاتھ لگاتے ہی کھڑکھڑکی آوازیں آتی ہیں۔

اسد نے لباس اس لیا تو ڈاکٹر نے گھبرا کر پہلے اسد کی طرف پھر نورین کی طرف دیکھا۔ دوبارہ اس نے اٹھتھو اسکوپ اسد کے سینے پر رکھا۔ پھر وہی کھڑکھڑکی تیز آوازیں سنیں تو ڈاکٹر چکر کر رہ گیا۔

”لگتا ہے، نزلے کی وجہ سے ان کا سینہ بالکل جکڑ گیا ہے۔ اینٹی بائیوٹک دینا پڑے گی اور آپ انہیں نیولائزر بھی لگوائیں۔“

”نیولائزر میرے پاس ہے۔ آپ پلیز جلدی کریں۔ انہیں پھر غصہ آگیا تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر نے جلدی سے اسد کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کا بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کا چیک اپ کر کے ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا اور بولا۔ ”ان کی حالت تو واقعی بہت خراب ہے۔ میں کچھ دوائیں اور انجکشن لکھ رہا ہوں۔ انجکشن لگانے کے لیے میں اپنے ڈسپنسر کو بھیج دوں گا۔“

”آپ زحمت نہ کریں ڈاکٹر۔“ نورین نے کہا۔
”مجھے آئی ایم اور آئی وی دونوں طرح کے انجکشن لگانے آتے ہیں۔ میں انہیں خود لگا لوں گی۔“
”اوکے، آپ فوری طور پر دوائیں منگوائیں۔“

نورین نے ڈاکٹر کا پرچہ اپنے بیگ میں رکھا اور بولی۔
”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ میرا ڈرائیور اصل میں ان ہی کے ایک ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔“
نورین کے جاتے ہی اسد نے اوٹی ٹوپی اتار پھینکی۔
آفتاب کا سلیپنگ گاؤن اتار کر اپنے کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر آگیا۔

تھوڑی دیر بعد نورین بھی لوٹ آئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”ویری گڈ پرفارمنس اسد۔ تم نے تو دل خوش کر دیا۔“
”اب تمہاری پرفارمنس کی باری ہے۔“ اسد نے کہا۔ ”تمہیں بھی بھرپور اداکاری کرنا پڑے گی۔“

”میں کر لوں گی۔ میں نے کئی سال ماڈلنگ کی ہے۔“
”ماڈلنگ میں اور اداکاری میں بہت فرق ہے مائی ڈیر نورین۔“ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر نورین کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا۔ اس مرتبہ نورین نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

”یار! اب کچھ کھلاؤ پلاؤ گی یا میں تمہارا ہاتھ پکڑے ہی بیٹھا رہوں۔“

مالک ہے لیکن کھوپڑی میں دماغ کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہے۔ اسے ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔ میں کل ہی اسے لے آؤں گا۔“

”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ نورین نے چونک کر پوچھا۔
”وہ میرے محلے میں رہتی ہے اور مجھ سے عشق کرتی ہے۔“

”لڑکی تیز طرار تو نہیں ہے نا؟“

”اسے عشق کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا۔ ہمیں

اس سے کون ساعقل کا کام لینا، صرف گواہ ہی تو چاہیے۔

پسماندہ علاقے میں رہتی ہے اس لیے اتنے بڑے گھر میں

آکر وہ یوں بھی مرعوب ہو جائے گی۔ پھر تم بھی اس کے

ساتھ اپنا روٹیہ ذرا سخت رکھنا تو سہی ہوئی رہے گی۔“

”لیکن وہ کچن کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں

سوئے گی۔“ نورین نے کہا۔

”اس کا وہاں ہونا ضروری ہے ورنہ وہ گواہی کیسے

دے گی؟“ اسد مسکرایا۔ ”دن میں کسی وقت وہ آؤٹ ہاؤس

میں آجایا کرے گی۔ آخر وہ مجھ سے عشق بھی کرتی ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نورین نے کہا۔

”کیوں؟“ اسد نے پوچھا۔ ”کیا اسے عشق کرنے کا

حق نہیں ہے۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ وہ عشق میں الجھ کر بالکل ہی

عقل سے پیدل ہو جائے گی۔“

نورین اسے صرف گھور کر رہ گئی۔ دوسرے دن اسد

اس لڑکی کو گھر لے آیا۔ اس کا نام تو شبانہ تھا لیکن وہ شبو کے

نام سے مشہور تھی۔

نورین نے اسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ لڑکی واقعی

حسین تھی۔ پرکشش چہرہ، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور ریشمی

سیاہ بال جو اس کی سفید رنگت پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ نورین نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”میرا نام شبانہ ہے جی۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ سب مجھے شبو

کہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کچھ پڑھی لکھی بھی ہو؟“ نورین نے پوچھا۔

”میٹرک پاس ہوں بیگم صاحبہ۔“ شبو نے جواب

دیا۔ ”کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور صفائی ستھرائی کرنا تو مجھے

خوب آتا ہے کیونکہ اماں نے بچپن سے ان ہی کاموں میں

لگا دیا تھا۔“

”تمہارا کام ہے کھانا پکانا، برتن دھونا اور صفائی کرنا۔

صاحب آج کل بیمار ہیں، اوپر مت جانا۔ وہ غصے کے بہت

تیز ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔“

کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ زبیری چوکیدار پر برس رہا تھا۔
”تم یہاں چوکیداری کرتے ہو یا چرس پیتے ہو۔ تمہاری
آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں اور کمرے میں چرس کا دھواں بھرا
ہوا ہے۔“

”کیا کرے صاحب، یہ خانہ خراب پیچھا ہی نہیں

چھوڑتی۔“ پھر وہ اکڑ کر بولا۔ ”لیکن صاحب! ام چرس پی

کر بھی بالکل ہوش میں ہوتا ہے۔“

”شٹ اپ!“ زبیری چیخا۔ ”اپنا بوریا بستر سمیٹو اور

دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”اس دفعہ معاف کر دو صاحب! ام۔۔۔۔۔“

”یکو اس بند کرو۔“ زبیری چیخا۔ ”اور نکلو یہاں سے۔“

چوکیدار بو جھل قدموں سے اپنی کوشھری میں گیا اور

تھوڑی دیر بعد ٹین کا ایک ٹرنک لے کر باہر نکلا۔

”کتنے پیسے بنتے ہیں تمہارے؟“ زبیری نے پوچھا۔

”امارا آٹھ تو بیس ہزار ہے لیکن۔۔۔۔۔ ابھی۔۔۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔ ابھی مہینہ پورا ہونے میں بارہ دن

باقی ہیں۔“ اس نے جیب سے اپنا پرس نکالا اور بیس ہزار

روپے گن کر چوکیدار کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”ام کو بھیک مت دیں صاحب۔“ چوکیدار نے کہا

اور پیسے۔۔۔۔۔ زبیری کو واپس کر دیے۔ ”ہمارا سامان کا

تلاشی بھی لے لیو، کبھی آپ یہ سوچے کہ نور خان ادھر سے کچھ

چوری کر کے لے گیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ زبیری نے کہا۔

چوکیدار تیزی سے باہر نکل گیا۔ زبیری نے نورین

سے کہا۔ ”بھابی، آپ فکر مت کریں۔ میں واپس آتے ہی

کسی دوسرے چوکیدار کا بندوبست کر دوں گا۔“

”یہ ہمارا بہت پرانا ملازم تھا اور۔۔۔۔۔“

”چرس پی کر چوکیداری کرتا تھا۔“ زبیری نے طنزیہ

لہجے میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جاتے

جاتے نورین سے بولا۔ ”بھابی پریشان مت ہوئے گا اور

آفتاب کا خیال رکھیے گا۔ میں دو روز بعد لوٹ آؤں گا۔ مجھے

امید ہے کہ آفتاب اس وقت تک صحت یاب ہو چکا ہوگا۔“

اس نے گاڑی کا انجن اشارت کیا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

اسد نے گیٹ بند کر دیا اور بولا۔ ”اس وکیل نے تو

ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمیں چوکیدار کا بھی کوئی نہ کوئی

بندوبست کرنا پڑتا۔ زبیری نے خود ہی اسے نکال دیا۔“ پھر

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”میری نظر میں ایک لڑکی ہے۔ پڑھی

لکھی لیکن بالکل بوگنی ہے۔ خوب صورت چہرے اور جسم کی

”جی بیگم صاحبہ... تنخواہ کتنی ملے گی؟“ شبو نے بھول پن سے پوچھا۔

”تیس ہزار ملے گی لیکن تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملے گی۔ تمہارا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں آئے گا۔“

”مجھے اسد نے ساری باتیں پہلے ہی سمجھا دی ہیں۔“ اس نے محبت پاش نظروں سے اسد کو دیکھا پھر بولی۔ ”میں اپنا سامان لے آؤں؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نورین نے کہا۔ ”میرے پاس بہت کپڑے ہیں، ان میں سے جو بھی پسند آئے لے لیتا۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں یہاں مل جائے گی۔“

”آپ کا بہت شکریہ بیگم صاحبہ۔“ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”لیکن کھانا..... میں.....“

نورین کو ہنسی آگئی۔ ”بھئی جب تم یہاں رہو گی تو کھانا بھی یہیں کھاؤ گی۔“

”پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ شبو خوش ہو کر بولی۔ اب انہیں اپنے دوسرے اور سب سے بڑے پلان پر عمل کرنا تھا۔ اسد چاہتا تھا کہ یہ کام زمیری کے آنے سے پہلے ہی ہو جائے۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ شبو اس وقت کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔

”یہ بوتلیں ڈیپ فریزر پر کیوں رکھی ہیں بیگم صاحبہ؟“ شبو نے اس ڈیپ فریزر کی طرف اشارہ کیا جس میں آفتاب کی لاش تھی۔ یہ کہہ کر وہ ایک ایک کر کے بوتلیں ہٹانے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ نورین چیخ کر بولی۔

شبو سہم کر رہ گئی۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے ایک بوتل گر کے ٹوٹ گئی۔

”معاف کروں بیگم صاحبہ، میں.....“

”کوئی بات نہیں۔“ نورین نے کہا۔ ”یہ بوتلیں صاحب نے رکھی ہیں۔ وہ انہیں ہمیشہ یہیں رکھتے ہیں۔ انہیں یہاں سے ہٹانے کی کوشش مت کرنا۔“

”نہیں کروں گی بیگم صاحبہ۔“ شبو نے کہا۔ ”لیکن ڈیپ فریزر رکھنے کے لیے تو انہیں ہٹانا ہی پڑتا ہوگا نا؟“

”ڈیپ فریزر خالی ہے شبو۔“ اسد نے کہا۔ ”پھر موضوع بدل کر بولا۔ ”تمہیں کافی بنانا آتی ہے؟“

”یہ بات تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟“ شبو نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں نے کئی دفعہ تو تمہیں بھی کافی بنا کر پلائی ہے۔“ پھر وہ نورین سے بولی۔ ”بیگم

صاحبہ! میں نے کچھ دن ایک پچھلے میں بھی کام کیا ہے۔ کافی بنانا میں نے وہیں سیکھی ہے۔ ایسی کافی بناؤں گی کہ آپ کو بھی بہت پسند آئے گی۔“

”چلو، پھر بناؤ۔“ نورین نے ہنس کر کہا۔

دس منٹ کے اندر اندر شبو کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے واقعی بہترین کافی بتائی تھی۔

”دوپہر کے کھانے میں آپ کیا کھائیں گی بیگم صاحبہ؟“ شبو نے پوچھا۔

”دوپہر میں تو صرف میں کچھ سلائس اور کافی لیتی ہوں۔ اسد صاحب البتہ کھانا کھاتے ہیں۔ ان سے پوچھو، یہ کیا کھائیں گے؟“

”میں جانتی ہوں جی ان کی پسند۔“ شبو ہنس کر بولی۔

”میں بھی وہی کھا لوں گی جو اسد کھائے گا۔“

”یہ تمہارا محلہ نہیں ہے شبو۔“ نورین نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اسد صاحب ہمارے صاحب کے پی اے ہیں۔ ان کا نام یہاں عزت سے لو۔“

”فلنگ ہو گئی اسد صاحب۔“ شبو نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم ایسا کرو، پہلے اچھی طرح نہادھو کر کپڑے بدل لو۔“ نورین نے کہا۔ ”آؤ میں تمہیں کپڑے دے دوں۔“

دوپہر کے کھانے کے بعد اسد نے کہا۔ ”اب ہمارا کام تورات تک شروع ہوگا۔“

”اتنی جلدی مت کرو اسد۔“ نورین نے کہا۔ ”یہ کام ہم کل کریں گے۔“ پھر وہ انگریزی میں بولی۔ ”اس گھامز کو بھی یہاں کے ماحول سے مانوس ہونے دو۔ ابھی تو اسے یہ یقین بھی دلانا ہے کہ آفتاب اپنے کمرے میں موجود ہے۔ زمیری کی فکر مت کرو۔ وہ تین دن سے پہلے نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو میں اسے اوپر نہیں جانے دوں گی۔“

”اوکے۔“ اسد نے کہا۔ پھر نورین کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے اس نے شبو سے کہا۔ ”نہادھو کر اور بیگم صاحبہ کے کپڑے پہن کر تو تم پہچانی ہی نہیں جا رہی ہو۔ تم تو کچھ زیادہ ہی خوب صورت نظر آ رہی ہو۔“

شبو نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نورین کی تیوریوں پر البتہ بل پڑ گئے تھے لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

”شبو۔“ اسد نے کہا۔ ”ذرا میرے کمرے کی صفائی بھی کر دو۔ بیگم صاحبہ تواب سوئیں گی۔“

”تمہارا..... میرا مطلب ہے کہ آپ کا کمر کون سا ہے اسد صاحب؟“ شبو نے پوچھا۔

”آؤ، میں تمہیں اپنا کمر دکھا دوں۔“ اسد نے اٹھتے

استعمال کرتا ہوں بس اب تم کام کرو۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا تو اسے نورین نظر آئی جو تیزی سے اقامتی عمارت کی طرف جارہی تھی۔

"عجیب عورت ہے۔" اسد نے سوچا۔ "ابھی یہ بیوہ ہوئی ہے اور اسے ذرہ برابر افسوس نہیں ہے۔ ایسی عورتیں صرف ہوس کی غلام ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی صرف اس لیے لگاؤ سے بات کرتی ہے کہ اسے پچیس کروڑ کا لالچ ہے..... اونہ۔"

اسد دوبارہ لاؤنج میں پہنچا تو نورین صوفے پر بیٹھی کسی سے سیلفون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے اتنی ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی کہ اس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ ٹیلی فون سے فارغ ہو کر اس نے اسد کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تم واپس کیوں آگئے؟ تم تو سونے گئے تھے۔" "تم وہاں میری ٹوہ لینے گئی تھیں؟" اسد نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔" نورین نے آہستہ سے کہا۔ "کہ تم کسی اور لڑکی کے ساتھ....." "کیوں.....؟" اسد نے اسے گھورا۔ "اس لیے..... کہ..... میں..... تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔" نورین نے کہا۔

اس کی بات پر اسد نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔" "میں جانتی ہوں کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔" نورین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اچھا۔" اسد نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ "پھر ایسا کرو، آفتاب کے انشورنس کی پوری رقم مجھے دے دو۔" ایک لمحے کے لیے نورین کے چہرے کا رنگ بدلا، پھر وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔ "چلو، یہ بھی منظور ہے۔ پوری رقم تم لے لو بلکہ میرے پاس لاکھوں روپے کے جو زیورات ہیں وہ بھی لے لو لیکن میری بات کا یقین کرو۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

لاکھوں روپے پر اسد کو یاد آیا کہ اس نے ابھی تک آفتاب کے دیے ہوئے چیک کیش نہیں کرائے ہیں۔ اس نے نورین سے کہا۔ "میں آفتاب کے دیے ہوئے چیک کیش کرا کے آتا ہوں۔ اس وقت تک شبو فارغ ہو جائے گی۔ تم اسے سنانے کو کچھ ایسا ڈراما کرنا کہ اسے آفتاب کی

ہوئے کہا۔ "لڑکی بہت معصوم ہے اسد۔" نورین نے کہا۔ "اس کی عزت کا خیال رکھنا۔" اس نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

"اس کی عزت کا خیال رکھوں، تم مجھے اپنے برابر کا نہیں سمجھتی ہو، میں آخر کروں کیا؟" "میں نے کب تمہیں برابر کا نہیں سمجھا؟" نورین نے کہا۔

"تو پھر مجھے وہاں کیوں جانا پڑتا ہے؟" اسد نے کہا۔ "تم اپنی مرضی سے وہاں سوتے ہو یا ر۔" نورین ہنس کر بولی۔ "تم چاہو تو یہاں سو جاؤ۔" نورین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں مذاق کر رہا تھا۔" اسد نے کہا۔ "مجھے کہیں بھی سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے زندگی نے کبھی عیاشی کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں تو فرش پر بھی سو کر خوش رہتا ہوں۔" اسد سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں زندگی نے موقع نہیں دیا؟" نورین نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ "تم ڈرنک کرتے ہو، محلے کی لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہو اور....."

"میں نے زندگی میں صرف دو تین بار ہی پی ہے۔" اسد نے کہا۔ "دو دفعہ کالج کے زمانے میں چند دوستوں کے مجبور کرنے پر اور تیسری دفعہ یہاں۔ میری ماں اس معاملے میں بہت سخت تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو وہ تو صدے سے مرجاتی۔ لڑکیاں چاہتی ہیں کہ میں ان سے فلرٹ کروں لیکن میں نے کبھی کسی لڑکی کو دھوکا نہیں دیا۔"

"واؤ....." نورین ہنسی۔ "تم تو بہت بارسا ہو۔" "تم تو خوب انگریزی بولتے ہو۔" شبو نے کہا۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ "مجھے بھی انگریزی پڑھا دیا کرو۔" "تم یہاں کام کرنے آئی ہو۔" نورین نے آنکھیں نکالیں۔

"آؤ، میں تمہیں اپنا کمراد کھا دوں۔" اسد نے شبو سے کہا اور آؤٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے شبو کو آؤٹ ہاؤس دکھایا تو وہ حیرت سے بولی۔ "یہ تو پورا گھر ہے اسد۔ ہمارے گھر سے بھی بڑا ہے۔ تم یہاں کیا جاب کرتے ہو؟ تمہاری تنخواہ تو بہت زیادہ ہو گی۔ تمہارے پاس گاڑی بھی ہے۔"

"وہ گاڑی میری نہیں ہے۔ میں کام کے لیے

کمرے میں موجودگی کا یقین ہو جائے۔“

میں ہیں اور فوری طور پر ایک پروجیکٹ شروع ہو چکا ہے۔“
”اس لیے وہ اپنا فکس ڈیپازٹ ختم کر رہے ہیں۔“
منیجر نے کہا۔

اس دوران میں خالد مطلوبہ رقم لے کر آ گیا۔ اس نے
رقم منیجر کی ٹیبل پر رکھ دی۔

”سر! ہماری کچھ فارملیٹیز ہوتی ہیں، آپ بھی جانتے
ہوں گے۔ ہمیں آپ کے این آئی سی کی ایک کاپی اور چیک
کی پشت پر آپ کے سائن بھی چاہئیں۔“

”شیور۔“ اسد نے کہا اور جیب سے اپنا شناختی کارڈ
نکال کر منیجر کے حوالے کر دیا۔ ”اس وقت میرے پاس کاپی
نہیں ہے۔“ اسد نے کہا۔

”نو پراBLEM۔“ منیجر نے کہا۔ ”میں ابھی کاپی کرواتا
ہوں۔“ اس نے اسد کا دیا ہوا چیک اس کے سامنے رکھ
دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا پین بھی دے دیا۔

اسد نے چیک کی پشت پر اپنے دو سائن کیے اور
چیک منیجر کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت پیون اسد کا شناختی
کارڈ لے آیا۔ اسد نے رقم بریف کیس میں رکھی اور منیجر کا

شکریہ ادا کر کے بینک سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
آفتاب کا کوئی فکس ڈیپازٹ بھی تھا۔ شاید اس لیے اس نے
مجھے دوسرے بینک کا چیک دیا تھا۔ وہ فکسڈ ڈیپازٹ ختم
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ رقم بھی کروڑوں میں ہوگی جیسی تو
یہ چیک کیش ہو گیا۔ وہ منیجر سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ
فکسڈ ڈیپازٹ میں کتنی رقم ہے؟

وہ واپس پہنچا تو شبو ابھی ہوئی لاؤنج میں کھڑی تھی اور
اوپر سے نورین کی آواز آرہی تھی۔ ”آفتاب، پلیز دوالے
لو۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ اس کے ساتھ ہی چھنکا کے کی آواز آئی۔

شاید نورین نے گلاس دیوار پر دے مارا تھا۔ وہ غصے میں
کمرے سے باہر نکلی اور چیخ کر بولی۔ ”اب میں تمہیں
زبردستی دوا کھلاؤں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے غصے سے
میں ڈر جاؤں گی۔ میں ابھی اسپتال سے دو میل نرسوں کو
بلائی ہوں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی نیچے آ گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے نورین کو دیکھا۔ وہ اس وقت
غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ شبو ابھی تک سبھی ہوئی
کھڑی تھی۔

”ہونا کیا ہے؟“ نورین نے کہا۔ ”وہ موصوف دوا
نہیں کھا رہے ہیں۔ پانی کا گلاس مجھ پر دے مارا۔ میں اگر
بچ نہ جاتی تو میری پیشانی زخمی ہو جاتی۔“

”آپ فکر مت کریں میڈم!“ اسد نے کہا۔ ”میں

اسد نے آفتاب کا بہترین سوٹ پہنا، ٹائی لگائی اور
وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو نورین اسے دیکھتی رہ گئی۔
اس کے ہاتھ میں خوب صورت سا ایک بریف کیس بھی تھا۔
وہ بینک والوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ رقم اس کے لیے
معمول کی بات ہے۔

وہ چیک تین مختلف بینکوں کے تھے۔ وہ ڈیفنس کے
کمرشل ایریا میں پہنچا تو کچھ فاصلے پر اسے وہ بینک نظر
آ گئے۔ پہلے بینک میں اس نے پانچ لاکھ کا چیک دیا جو چند
منٹ میں کیش ہو گیا۔ وہاں سے رقم لے کر اسد دوسرے
بینک میں گیا۔ وہاں سے تین لاکھ روپے کا چیک بھی کیش ہو
گیا۔ اس کے بریف کیس میں آٹھ لاکھ روپے کی خلیہ رقم
موجود تھی۔ اس نے اتنی رقم بھی ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔
پچاس لاکھ روپے کے لیے وہ تیسرے بینک میں
داخل ہوا اور سیدھا منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”یس سر!“ منیجر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔
”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مجھے ایک چیک کیش کرانا ہے۔“ اسد نے کہا اور
جیب سے پچاس لاکھ روپے کا چیک نکال کر منیجر کے سامنے
رکھ دیا۔

”یہ تو مسٹر آفتاب کا چیک ہے۔“ منیجر نے چیک
دیکھتے ہی کہا۔

”جی ہاں، میں ان کاپی اے ہوں۔“
”اوکے، آپ تشریف رکھیں۔ کیا لیں گے آپ۔۔۔۔۔“
”کولڈ ڈرنک یا کافی؟“

”نو تھینکس۔“ اسد نے کہا۔ ”میں ڈرا جلدی میں
ہوں۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔“

منیجر نے انٹرکام پر کسی کو بلایا اور بولا۔ ”آفتاب
صاحب نے تو بہت دن سے چکر ہی نہیں لگایا، کیا وہ آج کل
بہت مصروف ہیں؟“

”مصروف تو وہ ہمیشہ ہی ہوتے ہیں۔“ اسد نے
انگریزی میں جواب دیا۔

اسی وقت بینک کا کوئی ملازم اندر داخل ہوا۔ ”خالد!
یہ چیک فوراً کیش کرادو۔“ منیجر نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”لگتا ہے
آفتاب صاحب نے کوئی نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے ورنہ وہ
یہ چیک نہ دیتے۔“

”جی ہاں۔“ اسد نے کہا۔ ”ایک دو پروجیکٹ پائپ لائن

”میں کچھ دن صبر کر لوں گا، پھر تو تم پورے پچاس کروڑ مجھے دے ہی دو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے نورین کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

”ہاں، ہاں..... وہ پورے پچاس کروڑ تم لے لیتا لیکن مجھے.....“

”اب تم نے یہ لیکن اور اگر مگر کیا شروع کر دیا؟“ اسد نے منہ بنا کر کہا۔

”میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے کوئی جگہ ہے؟“

اسد نے پہلی دفعہ اس نظر سے نورین کو دیکھا۔ نورین کے چہرے پر اس وقت معصومیت تھی۔ اس نے سوچا، نورین جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ پچاس کروڑ تو مجھے دے ہی دے گی لیکن کیا واقعی وہ میری محبت میں اتنی پاگل ہو چکی ہے؟

”کیا سوچ رہے ہو اسد؟“ نورین نے پوچھا۔

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم.....“

”میرے پاس تقریباً ستر اسی لاکھ کے زیورات اور میرے اکاؤنٹ میں بھی اتنی ہی رقم ہے۔“ وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسد کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے الماری کھول کر اپنی چیک بک نکالی اور ہلینک چیک پر سائن کر کے چیک اسد کو دے دیا، پھر بینک لا کر کی چابی نکالی اور بولی۔ ”ذرا میرے ساتھ بینک تک چلو۔“

”کیوں؟“ اسد نے حیرت سے پوچھا۔

”چلو تو سہی۔“ نورین نے کہا۔

وہ دونوں نیچے آئے۔ شبو کچن میں تھی۔ نورین نے اسے آواز دے کر بلایا اور کہا۔ ”شبو! میں اسد صاحب کے ساتھ ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ تم صاحب کے کمرے کی طرف مت جانا اور کوئی آئے تو کہہ دینا کہ میم صاحب کام سے باہر گئی ہیں۔“ پھر وہ اسد سے بولی۔ ”ایک منٹ! میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ اوپر گئی اور فوراً ہی واپس آ گئی۔ ”کسی کا ٹیلی فون آئے تو مت اٹھانا۔“ اس نے شبو سے کہا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

بینک پہنچ کر اسد وزینگ ایریا میں بیٹھا رہا۔ نورین منیجر کے کمرے میں چلی گئی۔ آتے وقت وہ ایک بڑا بیگ لے کر آئی تھی۔ چند منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے اسد سے کہا۔ ”میں نے منیجر سے معلوم کر لیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً چالیس لاکھ روپے ہیں۔ لاؤ

انہیں دوا کھانے پر راضی کر لوں گا۔“

”تمہیں تو وہ تھپڑ مار دیں گے۔“

”نو پر اہلم۔ وہ بیمار ہیں اور اس وقت غصے میں ہیں۔ انہیں دوا کھلانا تو ضروری ہے، لائیے مجھے دیں۔“

”تمہیں اپنا سر تڑوانے کا زیادہ شوق ہے تو ضرور جاؤ۔“ نورین نے منہ بنا کر کہا اور پلیٹ میں رکھی ہوئی دو تین ٹیمپلٹس اور پانی کا ایک گلاس اس کے حوالے کر دیا۔

”اسد..... صاحب..... ذرا سنبھل کر جائیے گا۔“

شبو نے کہا۔

اسد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا، کمرے کا دروازہ کھولا اور بولا۔ ”سر! کل آپ کو اسلام آباد جانا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تو آپ جا نہیں سکیں گے۔“

پھر وہ آفتاب کی طرح آواز نکال کر چیخا۔ ”شٹ اپ، اینڈ گیٹ لاسٹ۔“

”دوا تو میں آپ کو کھلا کر جاؤں گا۔ پلیز سر۔“ اندر پھر ایک گلاس ٹوٹا، کچھ گھس پھس کی آوازیں آئیں۔ اسد نے کہا۔ ”گڈ، اب پانی بھی پی لیں۔“ اس نے ٹیمپلٹس ڈسٹ بن میں پھینکیں۔ پانی کی بوتل اٹھا کر کچھ پانی اپنے چہرے اور کپڑوں پر ڈالا، بال بکھرائے اور آفتاب کے کمرے سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ تھکا تھکا سا نیچے آ گیا۔

”کیا ہوا؟“ نورین نے پوچھا۔ شبو اب بھی وہاں سہی ہوئی کھڑی تھی۔

”دوا کھلا کر آیا ہوں۔ بہت مشکل سے دوا کھلائی ہے۔ میں نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے دوا نہ کھائی تو میں ابھی اور اسی وقت ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ بس اس بات پر وہ رام ہو گئے۔“ اسد نے نورین کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا۔

نورین نے شبو کی طرف دیکھا۔ پھر درشت لہجے میں بولی۔ ”تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اپنا کام کرو۔“

شبو جلدی سے کچن میں چلی گئی۔

”یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔“ نورین نے احتیاطاً انگلش میں کہا۔ ”اب وہ قسمیں کھا کر بتائے گی کہ کل تک صاحب گھر میں موجود تھے۔“ پھر وہ اسد سے بولی۔ ”تمہارا کام ہوا؟“

”نہیں یار! آفتاب کے اکاؤنٹ میں رقم ہی نہیں ہے۔ تینوں چیک واپس ہو گئے۔“

”تمہیں فی الحال کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟“

نورین نے پوچھا۔

وہ چیک مجھے دو۔“

اسد نے نورین کا دیا ہوا چیک اسے واپس کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ منیجر کے کمرے کی طرف چلی گئی اور چند منٹ بعد لوٹ آئی۔

☆☆☆

جب وہ گھر پہنچے تو شبو جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ اس نے بتایا کہ نہ کوئی آیا تھا، نہ ہی کوئی ٹیلی فون آیا۔ صاحب کے کمرے سے کوئی آواز بھی نہیں آئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھوں صاحب سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ کھلا نہیں۔ شاید صاحب نے اندر سے لاک کر لیا ہے۔ ”تم اوپر کیوں گئی تھیں؟“ نورین نے پھر کر کہا۔

”وہ..... جی..... میں نے..... سوچا.....“

”سٹ اپ۔“ نورین غصے میں دھاڑی۔ ”تم منع کرنے کے باوجود اوپر گئیں..... کیوں؟“

”معاف کر دیں بیگم صاحبہ، غلطی ہو گئی۔ میں تو صاحب کے لیے سوپ.....!“

”صاحب وہی سوپ تمہارے سر پر الٹ دیتے اور غصے میں تمہاری گردن دیوچ لیتے۔“ پھر وہ اسد سے بولی۔ ”اس لڑکی کو فارغ کرو، اس کا حساب کرو اور اسے گھر چھوڑ آؤ۔“

”اس دفعہ معاف کر دیں بیگم صاحبہ!“ شبو خوشامد بھرے لہجے میں بولی۔ ”آئندہ آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔“

”میڈم!“ اسد نے کہا۔ ”شبو غلط لڑکی نہیں ہے۔ اس دفعہ اسے معاف کر دیں۔ آئندہ اگر یہ کوئی ایسی حرکت کرے گی تو میں خود اسے گھر چھوڑ آؤں گا۔“

”اوکے۔“ نورین نے کہا۔ ”اب جا کر ہمارے لیے کافی بناؤ۔“

نورین، اسد کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی اور بیگ میں سے زیورات کے ڈبے نکال کر اسد کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

”ان کا کیا کرتا ہے؟“ اسد نے حیرت سے کہا۔

”یہ سب تمہارا ہے اسد۔“ پھر اس نے بیگ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اسد کے حوالے کر دیں۔ ”میں نے اپنی جمع پونجی تمہارے حوالے کر دی۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے دولت کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم اب بھی میری محبت کا یقین نہیں کرو گے؟“

اسد نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں اس کی محبت محسوس کی۔ اس کے لہجے کی سچائی نے بھی اسد کو بہت متاثر کیا تھا۔ ”اگر تمہیں اب بھی میری بات کا یقین نہیں ہے تو اوپر چھت پر چلو، میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسد ابھن آمیز انداز میں اس کے پیچھے پیچھے سڑھیاں چڑھنے لگا۔ نورین کی اشتعال انگیز چال ایک مرتبہ پھر اسد کے دل میں اتھل پھل کرنے لگی۔

چھت کے اوپری حصے میں چار فٹ کی باؤنڈری وال بنی ہوئی تھی۔ نورین باؤنڈری وال کے ایک سرے پر ٹھہر گئی۔ اسد ابھن آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اب نورین اسے کیا دکھانے والی ہے؟

”اس کی بلندی زمین سے کتنی ہوگی اسد؟“ نورین نے پوچھا۔

”کیا اوٹ پٹانگ سوالات کر رہی ہو؟“ اسد جھنجھلا گیا۔

”یہ اوٹ پٹانگ سوال نہیں ہے۔“ نورین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، یہ چھت زمین سے کتنی بلندی پر ہے؟“

”میرا اندازہ ہے کہ پینتالیس فٹ تو ہوگی۔“

”اب اگر کوئی یہاں سے کسی کو دھکا دے دے تو کیا وہ زندہ بچے گا؟“ نورین نے دوسرا سوال کیا۔

اسد نے نیچے دیکھا۔ وہ ہنگامے کا عقبی حصہ تھا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ وہاں نیچے کی طرف پختہ فرش تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ ہم آفتاب کی لاش اوپر لاکر یہاں سے پھینک دیں تو اس کے زندہ بچنے کے امکانات بالکل نہیں ہیں لیکن.....“

”میں آفتاب کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باؤنڈری وال پر چڑھ گئی۔ ”میں اپنے زیورات اور تمام جمع پونجی تمہیں دے چکی ہوں۔ اب میرے پاس صرف میری جان ہے اگر تمہیں اب بھی میری محبت کا یقین نہیں ہے تو میں ابھی یہاں سے کود جاؤں گی۔ بولو، تم مجھ پر یقین کرتے ہو یا نہیں؟ مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔“

”تم اس دیوار سے تو نیچے اترو۔“ اسد گھبرا کر بولا۔

”گر جاؤ گی۔“

”میری بات کا جواب دو اسد، یس یا نو۔“ نورین کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ ”اگر تم نے فوراً ہی جواب نہ دیا تو میں تمہارا جواب سنے بغیر ہی کود جاؤں گی۔“

اسد نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ اس نے عجیب سے

دے جو شہو کے کانوں تک پہنچ جائے۔ شہو کم عقل ضرور تھی لیکن پاگل نہیں تھی کہ ان کی باتیں نہ سمجھ سکتی۔

”او کے پاس..... ایڑیوش۔“ نورین جھوم کر بولی۔ پھر نورین نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی لیکن انگلش میں۔ اس نے اسد کی بات کو گویا گرہ میں باندھ لیا تھا۔

”میں نے جب پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا تو مجھے تم سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔“ نورین ترنگ میں بولی۔

”کیوں؟“ اسد نے چونک کر پوچھا۔

”آفتاب اس وقت اچھا خاصا مر رہا تھا۔ وہ اس وقت مرجاتا تو میرے لیے کوئی پر اہم ہی نہ رہتی۔ اس کی حادثاتی موت کے بے شمار گواہ ہوتے لیکن تم نہ جانے کہاں سے انسانیت کا درد لے کر وہاں آ گئے اور آفتاب کو مرنے سے بچا لیا۔ پھر جب آفتاب نے تمہیں ملازم رکھ لیا تو مجھے تم سے مزید نفرت ہو گئی لیکن پھر یہ نفرت نہ جانے کب محبت میں تبدیل ہوئی۔ تم آہستہ آہستہ میرے دل میں گھر کرتے چلے گئے۔ آفتاب کی خودکشی کے بعد تم نے جس انداز میں میرا ساتھ دیا، اس نے تو مجھے تمہارا انعام بنا دیا۔“

”میرے خیال میں اب تم آرام کرو نورین۔“ اسد نے کہا۔

”نہیں اسد، مجھے بولنے دو۔ میں جانتی تھی کہ تم مجھے

ایک لالچی اور خود غرض عورت سمجھتے تھے اور میں بھی ایسی

لیکن تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا۔ اب تک بہت سے

مردوں سے سابقہ پڑا ہے میرا۔ وہ سب میرے جسم کے

طلب گار تھے۔ جس نے بھی مجھ پر نظر ڈالی، بری ہی نظر

ڈالی۔ حتیٰ کہ آفتاب بھی میرے حسن کا خریدار تھا۔ وہ بھی

مجھے کھلونا سمجھتا تھا۔ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب اس نے

اپنی انشورنس پالیسی میرے نام کر دی تھی۔ وہ ذہنی مریض

تھا۔ عورتوں پر ظلم کر کے نہ جانے اس کے کون سے جذبے

کی تسکین ہوتی تھی۔ میں اس کی تیسری بیوی تھی۔ اس کی

پہلی بیوی نے خودکشی کر لی تھی، دوسری بیوی پاگل خانے میں

ہے۔ اپنے اسی ذہنی مرض میں ہر وقت شراب کے نشے میں

دھت رہتا تھا۔ اس کا اربوں کا کاروبار بہت تیزی سے سکڑ

رہا تھا اور اس کے منیجرز، ڈائریکٹرز اور پارٹنرز دونوں

ہاتھوں سے اسے لوٹ رہے تھے۔ وہ ڈپریشن کا مریض ہو

گیا تھا۔ اس پر کروڑوں روپے کا قرض ہے، یہ بنگلا بھی

گروی ہے۔ اس ڈپریشن میں اس نے خودکشی کر کے ایک

تیر سے دو شکار کیے۔ خود تو کتے کی موت مر گیا لیکن مجھے بھی

لہجے میں کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا اسد، خدا حافظ۔“ اس نے اپنا رخ موڑا اور کودنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

دوسرے ہی لمحے اسد اگر اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ نیچے گر

کے مرچکی ہوتی۔ اس نے چھلانگ لگا دی تھی۔ اگر اس کے

ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ آ جاتا تو واقعی مرچکی ہوتی۔ اسد نے

اسے بمشکل تمام گھسیٹ کر نیچے اتارا اور بولا۔ ”نورین.....

میں بھی تم سے محبت کرنے لگا تھا لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کہ تم

میری محبت کو ٹھکرا نہ دو۔ آئی لو یو..... آئی کو یو۔“

نورین نے اس کی گردن میں بائیں ڈال دیں اور

گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”چلو، اب پیچھے چلو۔“ اسد نے کہا۔

نورین یوں بوچھل قدمیوں سے چل رہی تھی جیسے اس

کے ہاتھ پیر قابو میں نہ ہوں۔ وہ دونوں پھر نورین کے...

بیڈروم میں آ گئے۔ اسد نے ہمدردی سے کہا۔ ”میں تمہارے

لیے ڈرنک بناتا ہوں۔“

”تم پیو گے تو میں بھی پیوں گی۔“ نورین نے کہا۔

”ورنہ نہیں۔“

اسد اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا پھر نورین سے

بولا۔ ”چلو، اب نیچے چلو۔ لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ

شہو نہ جانے ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟“

”سوچتی رہے۔“ نورین نے بے پروائی سے کہا۔

”لیکن وہ جو کچھ سوچے گی اگر اس نے پولیس یا زبیری

کے سامنے بک دیا تو فضول کا شک پیدا ہو جائے گا۔“

نورین نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا اور دونوں

نیچے آ گئے۔ اسد نے ڈرنک تیار کی اور دونوں ایک ساتھ

پینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہاں نورین کے سر پر بے تہقہ گو بجنے

لگے۔ اسد بھی ہنس رہا تھا لیکن اسے اپنی ہنسی پر کنٹرول تھا۔

نورین نے مزید ڈرنک کی فرمائش کی لیکن اسد نے سختی سے

اسے روک دیا۔ ”بس کافی ہے، تم سے تو یہ دو پیگ بھی

برداشت نہیں ہو رہے ہیں۔“

”میں..... آج بہت..... خوش ہوں۔“

سرور تو اسد کے رگ و پے میں بھی تھا لیکن وہ ہوش و

حواس میں تھا۔ وہ بوتل اور گلاس وہاں سے اٹھا کر کچن میں

لے گیا۔ شہو اس دوران میں کئی بار وہاں سے گزری تھی اور

حیرت سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی چلی گئی تھی۔

”دیکھو نورین، اب اردو میں بات مت کرنا۔“ اسد

نے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ نورین کو کوئی ایسی ویسی بات نہ کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



نورین نے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“
 ”آج ہمارے پلان کا آخری مرحلہ ہے۔ مجھے اس کے لیے تھوڑی سی شاپنگ کرنا پڑے گی کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہوں گی۔ میری واپسی تک تم شیو کو ایک مرتبہ پھر آفتاب کے زندہ ہونے کا یقین دلا دینا۔“
 ”ویسے ایک بات بتاؤں۔“ نورین نے کہا۔
 ”شیو اتنی بوڑھ اور احمق ہے نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ اس سے محتاط رہنا۔“

اسد وہاں سے نکل کر سیدھا ایک معروف بینک کی اس برانچ میں پہنچا جہاں اس کا دوست منیجر تھا۔ اس نے وہاں اپنا اکاؤنٹ کھولا اور تین لاکھ رکھ کر باقی تمام کیش بینک میں جمع کرادیا۔ اس نے اسی بینک میں ایک لاکھ بھی لیا اور اس میں نورین کے تمام زیورات رکھ دیے۔ آج کل کراچی کے حالات خراب تھے۔ اتنا کیش اور زیورات رکھنا مناسب نہیں تھا۔ کسی بھی وقت ڈکیتی ہو سکتی تھی۔
 ”اتنا پیسا کہاں سے آیا یار؟“ اس کے دوست نے پوچھا۔

”یار! تم تو جانتے ہو کہ میں کافی عرصے سے کسی فنانسر کی تلاش میں تھا۔ میرے ذہن میں بزنس کے کئی بہترین آئیڈیاز تھے۔ اب مجھے فنانسر بھی مل گیا ہے تو بزنس ہی کروں گا۔“

بینک سے فارغ ہو کر وہ بلا مقصد شام تک ادھر ادھر گھومتا رہا، کبھی وہ لینڈ کروزر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ لینڈ کروزر نہ سہی، اسے کوئی چھوٹی موٹی مہران ہی دلا دے۔ بسوں کے دھکے کھانے سے اسے الرجی تھی۔ اب اس کے پاس جدید ماڈل کی لینڈ کروزر تھی اور ایک نہیں، کئی قیمتی گاڑیاں تھیں۔ وہ سب اس کی ہونے والی تھیں۔ وہ نورین کی جنونی محبت سے بھی خوف زدہ تھا اس لیے گھر جانے سے احتراز کر رہا تھا۔

وہ شام ڈھلے گھر پہنچا تو نورین کا منہ پھولا ہوا تھا۔
 ”تم تو تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے اور پورا دن لگا کر واپس آئے ہو۔ آخر تم گئے کہاں تھے؟“

”تم نے ابھی سے بیویوں والا برتاؤ شروع کر دیا۔“ اسد ہنس کر بولا۔
 ”اچھا لاؤ، ایک ایک ڈرنک پی لیں، پھر کھانا کھائیں گے۔“

”نہیں۔“ اسد نے سختی سے انکار کر دیا۔ ”آج نہیں، آج ہمارے پلان کا سب سے مشکل اور اہم مرحلہ

کنگال کر گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی انشورنس پالیسی مجھے ملے۔ وہ جاتے جاتے مجھے بھی ذہنی مریض بنانا چاہتا تھا۔ تم وہ پہلے مرد ہو اسد جس نے اپنے مرد ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں اس وسیع و عریض جنگلے میں کب سے تمہارے ساتھ تنہا ہوں لیکن تم نے آج تک بری نیت سے میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔“
 ”رات بہت ہو گئی ہے نورین۔“ اسد نے کہا۔
 ”اب جا کر سو جاؤ۔“

”آج تم بھی آؤٹ ہاؤس کے بجائے میرے بیڈ روم.....“
 ”نہیں نورین۔“ اسد نے کہا۔ ”ابھی نہیں، پہلے اس آفتاب کی مصیبت سے فارغ ہو جائیں، پھر میں تم سے شادی کروں گا.....؟“
 ”تم..... مجھ سے شادی کرو گے؟“ نورین خوشی سے بولی۔

”ہاں نورین! میں تم سے شادی کروں گا۔ ہم اس منحوس جگہ کو چھوڑ کر اپنا چھوٹا سا خوب صورت گھر بنائیں گے۔ میں بزنس کروں گا اور تم میرا گھر سنبھالو گی۔ میرے بچوں کو سنبھالو گی۔“ اسد جذباتی ہو گیا۔
 نورین خوشی سے جھومتی، لہرائی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسد بھی سوچ رہا تھا کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے جو عورت دولت کی ہوس میں اپنے شوہر کی خودکشی کو قتل ثابت کرنا چاہتی ہے، وہی عورت سب کچھ مجھ پر نچھاور کرنے پر آمادہ ہے بلکہ کر چکی ہے۔
 ”اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔“
 ”ویسے اتنی انگریزی بول کر تمہاری زبان ٹیڑھی نہیں ہوتی؟“
 اسد بھی اٹھ گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کے بعد نورین نے پھر اصرار کیا کہ میرے تمام زیورات اور کیش تم لے لو۔
 ”نورین!“ اسد نے کہا۔ ”یہ زیورات اور کیش تمہارے پاس رہیں یا میرے پاس، بات تو ایک ہی ہے۔“
 ”تو پھر لیتے کیوں نہیں؟“ نورین نے منہ بنا کر کہا۔
 ”بات تو ایک ہی ہے۔“ اس نے زیورات کے ڈبے اور کیش کی رقم ایک بیگ میں رکھ کر اس کے حوالے کر دی۔
 نہ چاہتے ہوئے بھی نورین کے اصرار پر اس نے وہ بیگ لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر جانے کو تیار ہو گیا۔

آفتاب بیماری کی حالت میں کبھی سلیپنگ سوٹ یا کسی عام لباس میں باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس نے آفتاب کا جوتا پہننے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے پاؤں میں تنگ تھا۔ اس نے اپنا ہی جوتا دوبارہ پہن لیا، سر پر اوئی ٹوپی پہنی اور روشنی سے بچنے کے لیے نہ صرف ڈارک شیشوں کا چشمہ لگا لیا بلکہ ایک تولیا بھی سر پر ڈال لیا۔

اسی وقت اسد کے سیل فون میں واٹس ایپشن ہوئی اور نورین کی آواز سنائی دی۔ ”اسد! صاحب کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں خود ہی انہیں لے کر اسپتال جا رہی ہوں۔ تمہاری گاڑی کا ٹائر بھی ابھی پتھر ہوتا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ اوپر آتے ہوئے شبو سے چیخ کر بولی۔ ”یہ زینے کی روشنی کیوں جلائی ہے، بند کرو اسے۔ جانتی نہیں ہو صاحب کو روشنی سے الرجی ہے۔“

فوراً ہی زینے میں اندھیرا چھا گیا۔ نورین نے کمرے میں آکر اسد کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”ویری گڈ! اب تم میرا سہارا لے کر لڑکھڑاتے ہوئے چلو۔ زینے میں اندھیرا ہے اس لیے شبو تمہیں نہیں پہچان پائے گی، پھر تمہارا چہرہ تو لیے اور اوئی ٹوپی میں چھپا ہوا ہے۔“

وہ اسد کو سہارا دے کر زینے پر لا گئی اور بولی۔ ”سنجھل کر ڈارلنگ!..... ہاں، بس اسی طرح آہستہ آہستہ چلو..... یہ اسد تو نہ جانے کہاں رہ گیا..... ہاں سنجھل کر۔“

”ہینگم صاحبہ!“ شبو کی آواز آئی۔ ”میں آپ کی کچھ مدد کروں؟“

”تم اسد کے آنے تک گھر کا خیال رکھنا۔“ نورین نے سخت کچھ میں کہا اور سہارا دے کر اسد کو لاؤنج میں لے آئی۔

شبو بہت غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ نورین، اسد کو آہستہ آہستہ گاڑی تک لے گئی اور اسے احتیاط سے عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔ پھر شبو سے مین گیٹ کھولنے کو کہا اور جاتے جاتے بولی۔ ”گھر کا خیال رکھنا۔“ اس نے تیزی سے گاڑی باہر نکال لی۔

کچھ دور آنے کے بعد اسد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آفتاب کا سوٹ، اوور کوٹ، ٹوپی اور تولیا سب کچھ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

وہ اپنی گاڑی تک آیا اور نورین سے کہا۔ ”میرے پیچھے چلی آؤ۔“ کچھ دور جانے کے بعد اسد نے اپنی گاڑی روکی، نورین کی گاڑی ایک غیر آباد جگہ کے سامنے کھڑی کی اور نورین کو بھی اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ اس نے آفتاب کے

ہے۔ میں پوری طرح ہوش میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی ہوش میں رہو تو بہتر ہے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں کھانا کھائیں گے، پھر میں گاڑی لے کر نکل جاؤں گا۔ اب تو چوکیدار کا کٹا بھی نکل چکا ہے۔ بس تم ذہنی طور پر تیار رہو۔“

اچانک ٹیلی فون کی کرخت کھنٹی بجنے لگی۔ نورین نے شبو سے ٹیلی فون سیٹ نزدیک لانے کو کہا پھر ریسور اٹھا کر بولی۔ ”ہیلو..... ارے زبیری صاحب، کیسے ہیں آپ؟..... ہاں، آفتاب کی طبیعت اب بہتر ہے لیکن انہیں شدید ڈیپریشن کے دورے پڑ رہے تھے اس لیے ڈاکٹر نے انہیں مسلسل ٹرگولائزر پر رکھا ہوا ہے..... اب بھی وہ شاید سو رہے ہیں..... نہیں ابھی ابھی سوئے ہیں..... آپ کب واپس آئے؟..... اچھا کل شام کو آئیں گے..... اوکے، پھر کل شام کو آپ سے ملاقات ہوگی..... خدا حافظ۔“ اس نے ریسور کرڈل پر رکھ دیا اور بولی۔ ”یہ منحوس بھی کل آ جائے گا۔ یہ انتہائی کانیاں شخص ہے۔ اگر ہم نے اسے جل دے دیا تو سمجھو کہ منزل ہمارے نزدیک ہوگی۔“

کھانے کے بعد شبو کافی لے آئی۔ کافی پی کر اسد نے کہا۔ ”اب میں نکلتا ہوں۔ گاڑی چھوڑ کر تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک تم شبو کو یہ یقین دلا دینا کہ صاحب کی طبیعت بگڑ رہی ہے اور انہیں اسپتال لے جانا ضروری ہے۔ تم بار بار مجھے کال کرنا اور جھنجھلا کر کہنا کہ جلدی پہنچو، صاحب کی حالت خراب ہے۔“

”سمجھ گئی بابا۔ سمجھ گئی۔“ نورین نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اپنے اضطراب کو نہ چھپا سکی۔

اسد گاڑی لے کر نکلا اور اسے نزدیک ہی ایک کمرشل ایریا کے پارکنگ لائٹ میں کھڑا کر دیا۔ واپسی کے لیے اس نے ٹیکسی پکڑی اور پروگرام کے مطابق اسے دو بلاک پہلے ہی چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پیدل ہی جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اس دوران میں نورین اسے مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ اس کی اداکاری پر مسکرا رہا تھا۔ وہ مین گیٹ سے اندر آیا لیکن شبو کی وجہ سے اسے سیورج پائپ سے چڑھ کر آفتاب کے کمرے تک پہنچنا پڑا۔

آہٹ سن کر نورین بھی کمرے میں آگئی اور بولی۔ ”جلدی کرو۔“

”تم باہر جا کر ایک مرتبہ پھر مجھے کال کرو۔ میں اس وقت تک آفتاب کا گیٹ اپ کر لوں گا۔ فکر مت کرو، میرا سیل فون سائلٹ پر ہے۔“

اس نے بہت تیزی سے آفتاب کا سوٹ پہنا۔

کان سے لگا کر بولا۔ ”جی بیگم صاحبہ..... ہاں، میں گھر پہنچ گیا ہوں..... صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے..... اچھا ٹھیک ہے، میں..... اوکے۔“ اس نے سیل فون رکھ دیا اور شبو سے بولا۔ ”وہ لوگ ابھی راستے میں ہیں۔ اسپتال پہنچے ہی والے کہیں۔ بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ صاحب کی طبیعت اب خاصی بہتر ہے، انہیں اسپتال ایڈمٹ کر کے وہ وہیں ایک دوسرا کمرالے کر رہ جائیں گی۔ تم ایسا کرو، مجھے ایک گرم گرم کافی پلا دو۔“

شبو کافی لے کر آئی تو اسد کافی پیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا، پھر وہ شبو سے بولا۔ ”شبو! میں بہت بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔“

”کیسی مصیبت؟“ شبو گھبرا کر بولی۔

”ابھی واپس آتے ہوئے میں بہت تیز رفتاری سے آ رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے ایک موٹر سائیکل والا نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ میں بری طرح گھبرا گیا اور گاڑی کی ٹکر سے اس کی موٹر سائیکل اڑتی ہوئی دور جا گری۔ وہ بے چارہ خود بھی کہاں بچا ہوگا۔ اب اگر کوئی پوچھے تو تم بھی کہنا کہ اسد تو گھر میں تھا، کہیں گیا ہی نہیں تھا۔“

”لیکن بیگم صاحبہ..... وہ تو.....“

”میں انہیں بھی سمجھا لوں گا اور صاحب کو بھی..... تم ان کی فکر مت کرو۔“

”اگر تم ان لوگوں کو سمجھا لو گے تو میں بھی یہ کہہ دوں گی کہ تم یہیں موجود تھے، جب بیگم صاحبہ، صاحب کو لے کر گئیں، تب بھی تم یہیں موجود تھے۔“

”تھینک یو، تھینک یو ویری مچ۔“ اس نے شبو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شبو نے بھی اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس رات اسد آؤٹ ہاؤس کے بجائے بنگلے میں ہی سویا۔ نیچے بھی مہمانوں کے لیے دو بیڈرومز تھے۔

شبورات میں اس کا سرد ہانے کے بہانے آئی لیکن اسد نے عیند کا بہانہ کر کے اسے چلتا کر دیا۔ صبح جب شبو اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اس نے کہا۔ ”تم اسپتال ٹیلی فون کر کے صاحب کی طبیعت تو معلوم کرو۔“

”ہاں، میں ابھی کال کرتا ہوں۔“ اس نے اسپتال کال کی اور پوچھا۔ ”دیکھیے میں مسٹر آفتاب غنی کا پی اے بول رہا ہوں۔ وہ رات وہاں ایمر جمی میں آئے تھے۔ آپ ان کی منر سے بات کرادیں۔“

”آفتاب صاحب! دوسری طرف سے پوچھا گیا۔“

کپڑے وغیرہ بھی اپنی گاڑی میں رکھ لیے۔ وہ نورین کو لے کر اس اسکول پر پہنچا جو اس نے پہلے ہی دیکھ رکھا تھا۔ وہاں چونکدار نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں احتیاطاً اسکول کی عقبی سمت سے پاؤنڈری وال پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔ ایک خالی کلاس روم میں لے جا کر اسد نے نورین کو ایک کرسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھا اور اس کے چہرے پر کئی زوردار تھپڑ رسید کر دیے پھر بولا۔ ”سوری، یہ ضروری تھا ڈارلنگ..... اس واردات میں حقیقت کا رنگ بھی تو بھرنا ہے۔ تم بعد میں مجھے اس سے دگنے تھپڑ مار لیتا۔“

”اُس آل رائٹ۔“ نورین نے کہا۔ اس کے چہرے پر اسد کے تھپڑوں کے نشانات تھے۔ اسد نے دستانے پہن رکھے تھے تاکہ اس کی انگلیوں کے نشانات کہیں نہ رہ جائیں۔

نورین کو اچھی طرح باندھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک رومال نکالا اور نورین کے منہ میں ٹھونس دیا۔ نورین ”اوں اوں“ کی آوازیں نکالتی رہی لیکن اسد بولا۔ ”یہ بھی ضروری ہے ڈارلنگ۔“ پھر اس نے جیب سے ٹیپ نکالا اور نورین کے ہونٹوں پر مضبوطی سے چپکا دیا۔ ”اب بنا پرفیکٹ سٹین۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”سوری انکین۔“ یہ کہہ کر اس نے نورین کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار دیا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کے فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔

اسد نے جھٹک کر اس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سنی، سانس کا جائزہ لیا۔ ہر چیز نارمل تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہوئی تھی۔ اس نے پیار سے نورین کے گال تھپتھپائے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسی راستے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح جب اسکول کھلے گا تو صفائی کرنے والا ملازم نورین کو یہاں دیکھے گا اور اسے آزاد کر کے پولیس کو اطلاع دے دے گا۔

اس نے آفتاب کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کو ایک شاپر میں بھرا اور روانہ ہو گیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے واپس گھر پہنچا۔ گیٹ چو پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کم بخت شبو نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔

شبو گاڑی کی آواز سن کر باہر آ گئی۔ اسد گاڑی سے اتر ا اور بھاگ کر برآمدے میں پہنچا، پھر شبو سے بولا۔ ”صاحب کہاں ہیں؟ ان کی حالت اب کیسی ہے؟“

”بیگم صاحبہ انہیں اسپتال لے گئی ہیں۔“ شبو نے کہا۔

وہ لاؤنچ ہی میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت تیز بارش شروع ہو گئی۔ اس نے خود ہی اپنے سیل فون کی گھنٹی بجائی اور اسے

”لیکن وہ تو رات یہاں پہنچے ہی نہیں۔“

”پہنچے نہیں، پھر وہ کہاں گئے؟“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”صاحب اسپتال نہیں پہنچے۔“ شبو تشویش سے بولی۔ ”کہیں خدا نخواستہ ان کا ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔“

”اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے؟“ اسد نے پوچھا۔

”سات بج رہے ہیں۔“ شبو نے بتایا۔

”اور تم نے مجھے..... ہاں تم نے اچھا کیا کہ مجھے جلدی اٹھا دیا۔ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔“

اسے امید تھی کہ ابھی کچھ دیر بعد جب اسکول کھلے گا تو پولیس کی طرف سے خود ہی کال آجائے گی لیکن جب ساڑھے آٹھ بجے تک کال نہیں آئی تو اسد واقعی پریشان ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔ پھر وہ زبیری کو کال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا ٹیلی فون آ گیا۔ اسد نے اسے بھی بتا دیا کہ آفتاب صاحب اور مسز آفتاب رات سے غائب ہیں۔

زبیری اور پولیس دونوں آگے پیچھے ہٹ گئے۔

پہنچے۔ پولیس انسپکٹر شکل سے سخت گیر اور ذہین لگ رہا تھا۔ معاملہ چونکہ ایک ارب پتی سیٹھ کا تھا اس لیے انچارج خود ہی دوڑا چلا آیا تھا۔

”جب مسز آفتاب انہیں اسپتال لے گئیں تو تم کہاں تھے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں گھر میں ہی تھا۔“ اسد نے جواب دیا۔

”پھر تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ میں نے سنا ہے کہ تم ان کے ڈرائیور بھی ہو۔“

”میرا ہاتھ گاڑی کے دروازے میں آکر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔“ اسد نے اپنا دایاں ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا جس پر واقعی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ”ایسے میں میرے لیے ڈرائیونگ کرنا مشکل ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے صاحب کو لے جانے کی کوشش کی لیکن بیگم صاحبہ نے منع کر دیا۔“

”تم نے صاحب اور بیگم صاحبہ کو جاتے ہوئے دیکھا تھا؟“ انسپکٹر نے شبو سے پوچھا۔

”جی..... دیکھا تھا۔“

”اس وقت صاحب کی حالت کیسی تھی، ان کے چہرے سے کیسا محسوس ہو رہا تھا؟“

”ان کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی سر..... میں ان کا چہرہ صاف نہیں دیکھ سکی کیونکہ زینے پر اندھیرا تھا۔“

”کیوں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”آفتاب کو تیز روشنی سے الرجی تھی۔ بیماری کی حالت میں تو ان سے معمولی روشنی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔“ زبیری نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ انسپکٹر نے کہا پھر وہ شبو سے بولا۔ ”اس وقت اسد صاحب کہاں تھے؟“

”اسد صاحب یہیں تھے صاحب جی۔“ شبو نے کہا۔

”تم نے مسز آفتاب سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”نہیں، انہوں نے خود ہی کال کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ راستے میں ہیں، پھر اس کے بعد ان کی کال نہیں آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں بھی اسپتال میں کوئی کمرالے کر رات وہیں رہ جاؤں گی۔“

”کمرالے کر کیوں؟“

”آغا خان میں ایڈمنسٹریٹر کورکے نہیں دیتے اس لیے اکثر لوگ وہاں دوسرا کمرالے کر رہ جاتے ہیں۔“ زبیری نے بتایا۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“ انسپکٹر نے اسد سے پوچھا۔

”میں نے صبح اٹھتے ہی اسپتال کال کی تو معلوم ہوا کہ مسز اور مسز آفتاب تو رات میں وہاں پہنچے ہی نہیں۔“

”عبدالرحیم!“ انسپکٹر نے ایک سب انسپکٹر سے کہا۔

”تم گاڑی لے کر آغا خان کے راستے پر جاؤ اور معلوم کرو کہ رات کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہوا؟“

اس کے جانے کے بعد انسپکٹر آفتاب کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔

”مسز آفتاب کب سے بیمار تھے؟“

”وہ گزشتہ چار پانچ دن سے بیمار تھے۔“

انسپکٹر نے کچھ سوالات زبیری سے بھی کیے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ان کی کوئی بھی اطلاع ملے تو فوراً مجھے بتانا اور یہیں موجود رہنا۔ ممکن ہے، بعد میں بھی تمہاری ضرورت پڑے۔“ پھر وہ زبیری سے بولا۔ ”مسز زبیری! آپ بھی میرے رابطے میں رہیے گا۔“

”شیور انسپکٹر خان۔“ زبیری نے کہا۔ ”میں تو آفتاب کا لیگل ایڈوائزر بھی ہوں۔“

انسپکٹر کے جانے کے بعد زبیری نے شبو کو گھور کے دیکھا تو وہ ہم گئی اور جلدی سے بولی۔ ”صاحب، آپ کے لیے کافی لاؤں؟“

”ہاں، لے آؤ۔“ زبیری نے کہا۔ اب بارہ بج رہے

واقعی اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس نے یونہی بے خیالی میں ٹی وی آن کر دیا۔

اچانک ٹی وی پر بریکنگ نیوز شروع ہو گئی۔ ”آج صبح سن رائزر گرامر اسکول سے کسی عورت کی لاش ملی ہے۔ عورت کے ہینڈ بیگ سے جو کاغذات برآمد ہوئے ہیں، ان کے مطابق وہ معروف صنعت کار اور بزنس مین آفتاب غنی کی اہلیہ مسز نورین غنی کی لاش ہے۔ آج دودن کی چھٹی کے بعد جب اسکول کھلا تو صفائی کرنے والے ملازم نے سب سے پہلے وہ لاش دیکھی۔ اس نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی۔ اب پولیس جائے واردات پر موجود ہے۔ واضح رہے کہ جمعے کی رات کو مسز آفتاب اپنے شوہر کو آغا خان لے کر روانہ ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ پولیس مزید تفتیش کر رہی ہے۔ مسز آفتاب ابھی تک لاپتہ ہیں۔“

ٹی وی پر نورین کی لاش بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے ذہن میں آنندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نورین اس کی وجہ سے مری تھی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ اس دن جمعہ تھا اور اسکول دودن بند ہوتا ہے۔ وہ تو دم گھٹنے سے مر گئی ہوگی۔ نورین کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف انسپٹر خان تھا۔ وہ اسے اسی وقت سن رائزر اسکول بلا رہا تھا تاکہ لاش کو شناخت کر سکے۔

☆☆☆

”اس عورت کو پہچانتے ہو؟“ انسپٹر خان نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اسد نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ جواب دیا۔ ”یہ میڈم نورین ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ بری طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

”دیکھو، حوصلہ رکھو۔ اتنا مضبوط اور لمبا چوڑا نوجوان عورتوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔“ انسپٹر خان نے نرم لہجے میں کہا پھر وہ زبیری سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کیا کہتے ہیں؟“

”یہ مسز آفتاب ہی ہیں۔“ اس نے کہا اور اسد کو گھورا۔

”حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقتولہ کا ہینڈ بیگ بھی موجود ہے اس میں اچھی خاصی رقم بھی ہے۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کڑے بھی موجود ہیں لیکن اغوا کرنے والوں نے ان چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان کی انگلی میں ڈائمنڈ کی قیمتی انگلی بھی ہے۔ وہ بھی اسی طرح موجود ہے۔ وکیل صاحب! آپ کے خیال میں اغوا کرنے والوں کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“

تھے اور نورین کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس وقت تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ اب وہ واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

زبیری نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا ہاتھ واقعی زخمی ہے یا تم نے یونہی پٹی باندھ رکھی ہے؟“

اسد نے گھور کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”میں نے یونہی شوقیہ پٹی باندھ رکھی ہے۔“

”شٹ اپ، یو ایڈیٹ۔“

”یو شٹ اپ۔“ اسد بھر کر بولا۔ ”ایڈیٹ لاسٹ۔“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”تم سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ اسد چیخا۔ ”میں نے یونہی پٹی باندھ رکھی ہے؟“

”ارے تو اتنی سی بات پر ناراض کیوں ہو رہے ہو۔ یہی سوال تم سے انسپٹر خان بھی کرے گا۔“

”تو میں اسے پٹی کھول کر اپنا زخم دکھا دوں گا۔“

کافی لمبی کڑواہٹ اور گھبراہٹ ہو گیا اور بولا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔ تمہیں آفتاب یا بھابی کی کوئی اطلاع ملے تو مجھے بھی بتانا۔“ زبیری چلا گیا لیکن فوراً ہی دوبارہ آگیا اور بولا۔

”میری گاڑی کا ٹائر چکچر ہو گیا ہے۔ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ میں ٹائر تبدیل کرنے کا انتظار کروں۔ تم اگر مجھے کورٹ تک چھوڑ دو تو.....“

”ہاتھ میں تکلیف اب کم ہے میں آپ کو کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں گا جہاں سے آپ کو آسانی سے ٹیکسی مل جائے۔“ انسپٹر خان نے مجھے گھر پر رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسد نے کہا۔ وہ زبیری کو چھوڑ کر واپس آیا تو پولیس اسٹیشن سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسکول جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوا ہے مگر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اسے انسپٹر خان کا چہرہ یاد آگیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلاکی و ہانت تھی اور اسد کو اس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگا تھا۔

اس نے زبیری کی گاڑی کا ٹائر تبدیل کیا، پھر ڈکی بند کر کے خود ہی مسکراتا ہوا اندر آگیا۔

شام کے سات بجے تک نورین کا کچھ پتا نہیں چلا تو اسد بے چین ہو گیا کہ آخر نورین گئی کہاں؟ کیا اسے واقعی ڈاکوؤں نے تو اغوا نہیں کر لیا؟

دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ اسد نے کئی مرتبہ پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کیا۔ کئی مرتبہ زبیری اور انسپٹر خان نے اسے کال کی لیکن نہ نورین کا کوئی سراغ ملا نہ آفتاب کا۔

تیسرے دن تو اسد بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ نورین کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہے یا اسے

”یہاں ایک مالی ہے جو ہفتے میں دو دفعہ آکر لان کی صفائی اور دیکھ بھال کرتا ہے۔ چوکیدار تھا جسے مسٹر زبیری نے بے عزت کر کے یہاں سے نکال دیا۔“

”وہ نشہ کرنے لگا تھا۔“ زبیری نے جواب دیا۔
”ایسے آدمی کو بے عزت نہ کرتا تو کیا انعام دے کر نکالتا۔“
میں آفتاب کا بہت پرانا دوست اور اس کا لیگل ایڈوائزر ہوں۔ میرا تاحق تو ہے کہ میں نشے کے عادی اس چوکیدار کو نکال سکوں۔ میں دوسرے چوکیدار کا بندوبست کر دیتا لیکن مجھے ایک کیس کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔“

”احمد خان!“ انسپٹر نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا۔ ”تم یہیں رہو۔ ممکن ہے مسٹر آفتاب کی کوئی اطلاع موصول ہو۔“
”جی سر۔“ سپاہی نے کہا۔

انسپٹر خان ان لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے چلا گیا۔
کچھ دیر بعد زبیری بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب خطرہ اسد کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ انسپٹر کی بھی وقت ڈیپ فریز رکھول کر دیکھ سکتا تھا۔ وہ آفتاب کی لاش کو آج رات ہی ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

رات کا کھانا اس نے مشکل سے زہر مار کیا۔ پولیس کے سپاہی احمد خان کو بھی باہر کھانا بھجوا دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شبو بھی کبھی ہوتی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اسد اٹھا۔ اس نے چائے بنائی، ایک کپ میں اس نے نشے کی دو گولیاں ڈالیں اور کپ لے کر احمد خان کے پاس پہنچا۔ ”لو یار! تم بھی چائے پی لو۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو گے۔“ اس نے چائے کا کپ احمد خان کی طرف بڑھا دیا۔

”بہت شکریہ جناب۔“ سپاہی نے کہا۔

اسے چائے دے کر وہ اندر آیا اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد باہر جھانکا۔ سپاہی بیچ پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے شبو کے کمرے کا دروازے کھول کر جھانکا۔ وہ بھی بہت گہری نیند سو رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی ڈیپ فریزر سے بوتلیں ہٹانا شروع کر دیں۔ ساری بوتلیں ہٹانے کے بعد وہ ایک چادر لایا تاکہ آفتاب کی لاش کو اس میں لپیٹ کر لے جاسکے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے ڈیپ فریزر کا ڈھکنا کھولا تو اس کی نظر آفتاب کی لاش پر پڑی۔ اس کی لاش جوں کی تو پڑی تھی، بالوں اور چہرے پہ برف کی ہلکی سی تہ تھی۔ وہ ابھی لاش کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک کسی کی

زبیری نے شانے اچکا دیے۔ ”آئی ڈونٹ نو انسپٹر۔“

”شہزاد خان! یہاں سے تمام نشانات اٹھاؤ اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دو۔ میرا خیال ہے کہ ان کی موت سر کی چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انہوں نے کرسی سے آزاد ہونے کے لیے زور آزمائی کی ہوگی۔ کرسی لڑھک گئی ہوگی اور ڈیسک کا ٹکیلا سرا ان کے سر میں لگا ہوگا۔ پھر ان کا منہ بھی بند تھا۔ انہیں سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی ہوگی یہاں بہت سا خون بھی جما ہوا ہے۔ چوٹ لگنے سے ان کا خون بھی ضائع ہوا ہے۔ حتیٰ وجہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہوگی۔“ پھر وہ زبیری سے مخاطب ہوا۔
”ڈیکل صاحب! آپ آفتاب صاحب کے بہت نزدیک تھے۔ میں آپ کو بھی ایک بار پھر زحمت دوں گا۔“ پھر وہ اسد سے مخاطب ہوا۔ ”اور تم بھی وہ گھر چھوڑنے کی کوشش مت کرنا۔ کہیں جانا ضروری ہو تو مجھے ضرور انفارم کرنا، اب اس واقعے کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب یہ ایک قتل کی واردات میں تبدیل ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

”تم یہاں کب سے ملازم ہو؟“ انسپٹر خان نے اسد سے پوچھا۔

”مجھے ایک مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔“ اسد نے جواب دیا اور اسے وہ داستان سنا دی جس کی وجہ سے اسے یہاں ملازمت ملی تھی۔

”تمہارا کام کیا تھا؟“ انسپٹر نے پوچھا۔

”میں آفتاب صاحب کا ڈرائیور، پی اے، سب کچھ تھا۔“ اسد نے جواب دیا۔

”اور یہاں کب سے ملازم ہو؟“ انسپٹر نے شبو سے پوچھا۔

”مجھے تو ابھی صرف ایک ہی ہفتہ ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مسٹر آفتاب کو واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی یا انہوں نے تمہاری سفارش پر اس لڑکی کو ملازم رکھا تھا؟“ انسپٹر نے اسد سے پوچھا۔

”انہیں واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی۔ آفتاب صاحب... کے بیمار ہونے کے بعد وہ زیادہ وقت ان ہی کے کمرے میں گزارتی تھیں۔“

”مسٹر آفتاب نے مجھ سے بھی کسی ملازمہ کے لیے کہا تھا۔“ زبیری نے کہا۔ ”انہیں واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی۔“

”یہاں تم دونوں کے علاوہ کوئی اور ملازم نہیں ہے؟ مالی، کک، چوکیدار وغیرہ۔“ انسپٹر خان نے پوچھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آواز آئی۔ ”خبردار۔“ اسد بری طرح چونک اٹھا۔ وہ گھبرا کر مڑا۔ اس کے پیچھے زبیری کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پٹیل تھا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم نے آفتاب کو قتل کیا ہے؟“ ”نہیں، میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔ انہوں نے تو خودکشی کی ہے۔“ ”خودکشی کی ہے؟“ زبیری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تو پھر ان کی لاش ڈیپ فریزر میں کیا کر رہی ہے؟“ زبیری نے پوچھا۔ ”یہ میڈیم ٹورین کا پلان تھا۔ وہ اس خودکشی کو قتل ثابت کرنا چاہتی تھیں۔“ ”بکومت۔“

”میرے پاس اس کا ثبوت ہے کہ مسٹر آفتاب نے خودکشی کی ہے۔“ اسد نے گھبرا کر کہا۔ ”کیسا ثبوت؟“ زبیری چونکا۔

”انہوں نے آپ کے نام ایک خط لکھا تھا کہ وہ خودکشی کر رہے ہیں، اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔“ ”کہاں ہے وہ خط؟“ زبیری نے کہا۔

”مجھے لے کر آتا ہوں۔“ اسد نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں وہی لفافہ تھا جس میں آفتاب کا خط تھا۔

زبیری نے وہ لفافہ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”اب تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آفتاب نے خودکشی کی ہے۔ اب اس کے قتل کے الزام میں تم جیل جاؤ گے۔“

”نہیں، ایسا مت کرنا۔ مجھے تو لمبی سزا ہو جائے گی۔“ ”لمبی سزا؟“ زبیری نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں پھانسی بھی ہو سکتی ہے ایڈیٹ۔“

”پھر..... پھر میں کیا کروں؟ آپ ہی میری مدد کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آفتاب صاحب کو قتل نہیں کیا۔“ ”میں تمہارے ساتھ ایک رعایت کر سکتا ہوں۔“

زبیری نے مکاری سے کہا۔ ”تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا موقع دے دوں۔“ ”ہاں، یہ ہو سکتا ہے لیکن..... میں قانون سے کب تک بھاگوں گا؟“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ زبیری نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ آفتاب نے سوچا کہ اس کے پاس بینک میں تقریباً ایک کروڑ روپے۔۔۔ نقدی اور ستر اسی لاکھ

کے زیورات ہیں۔ وہ اس رقم سے کہیں بھی جاسکتا ہے۔ امریکا، کینیڈا، دبئی۔ ”تو پھر میں جاؤں؟“ اسد نے کہا۔ ”وقت بہت کم ہے۔ باہر پولیس کا ایک سپاہی بھی سو رہا ہے۔“ ”ایسے نہیں بچے۔“ زبیری نے کہا۔ ”پہلے جو کچھ میں کہوں، وہ لکھو اور اس پر سائن بھی کرو۔“ اسد نے وہاں رکھا ہوا ایک پیڈ اٹھا لیا اور پین لے کر بولا۔ ”بتائیے کیا لکھوں؟“ ”رہنے دو۔“ زبیری مکاری سے مسکرایا۔ ”میرے پاس ٹائپ کیا ہوا ایک ڈرافٹ موجود ہے۔ تم اس پر سائن کرو اور چلے جاؤ۔“

اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسد کی طرف بڑھا دیا۔ اسد نے اس کی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔ ”پڑھنے میں وقت ضائع مت کرو۔“ زبیری نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں اسے پڑھے بغیر سائن نہیں کروں گا۔ یہ کورٹ کا اسٹیپ پیپر ہے۔“ ”چلو جلدی پڑھو۔“ اسد نے وہ پیپر پڑھا اور بولا۔ ”یہ تو میری طرف سے آپ کے نام پاور آف اٹارنی ہے۔ یعنی میں آپ کو یہ اختیار دے دوں کہ میرے بدلے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔“ زبیری نے کہا۔ ”پھر ہم اس لاش کو ابھی ٹھکانے لگا دیں گے اور تم بھی قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے۔“

”لیکن میں اس پر سائن کیوں کروں؟ جبکہ میں نہ وارنٹ ہوں اور نہ ہی بااختیار۔“ ”سائن کرو ورنہ میں گولی مار دوں گا، آفتاب نے اپنی تمام جائیداد تمہارے نام کر دی ہے اس لیے۔“

”اوہ پھر تو میں سائن نہیں کروں گا۔“ اسد چیخ کر بولا۔ ”مار دو گولی، باہر پولیس کا سپاہی سو رہا ہے۔ وہ گولی کی آواز سے جاگ جائے گا۔ پھر تم کہاں ہو گے مسٹرایڈ ووکیٹ؟“

اسی وقت شبو کمرے سے نکل کر باہر آگئی اور چیخ کر بولی۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

زبیری نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور بولا۔ ”سائن کرو ورنہ پہلے میں اسے ماروں گا، پھر تمہیں گولی ماروں گا۔ تم آفتاب کی لاش ٹھکانے لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس ملازمہ کی آنکھ کھل گئی۔ تم نے اسے گولی مار دی۔ اسی وقت

بولا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

میں یہاں پہنچ گیا۔ تم نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں گولی مار دی، جلدی سائن کرو۔“ اس نے شبو کی کنپٹی پر گن رکھ دی۔

”ہینڈ زاپ!“ باہر سے انسپکٹر خان کی آواز آئی۔

”اپنی گن پھینک دو زبیری۔“

”انسپکٹر اس مردود نے میرے دوست کو ہلاک کر دیا ہے۔“ زبیری نے کہا۔ ”اس کی لاش ڈیپ فریزر میں موجود ہے۔“

”مجھے تو کچھ معلوم نہیں انسپکٹر صاحب۔“ اسد نے کہا۔

”آفتاب صاحب کو بھی وکیل صاحب نے ہلاک کیا ہو گا۔ وہ ان کی لاش نکال کر لے چارے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے انہیں رگے ہاتھوں پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے پر گن تان لی اور جیب سے یہ کاغذ نکال کر کہا کہ اس پر سائن کرو اور فرار ہو جاؤ۔“

”یہ بکواس کر رہا ہے انسپکٹر۔“ زبیری بپھر کر بولا۔

”میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا بلکہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ وہ خودکشی کر رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔“

”وہ خط کہاں ہے؟“ انسپکٹر خان نے پوچھا۔

”وہ خط میرے پاس ہے۔“ زبیری نے کہا اور وہ لفافہ نکال کر انسپکٹر کو دے دیا جو اسد نے اسے دیا تھا۔

”تم نے آفتاب صاحب کی وصیت کا بھی تذکرہ کیا تھا، وہ کہاں ہے؟“

”وہ میرے پاس ہے۔“ زبیری نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور انسپکٹر کو دے دیا۔

انسپکٹر نے پہلے اس وصیت کی ورق گردانی کی پھر لفافے میں سے وہ خط نکالا جو آفتاب نے اس کے نام لکھا تھا۔ خط دیکھ کر انسپکٹر بپھر گیا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔ سادہ کاغذ! تم کیا پولیس کو بالکل ہی الو سمجھتے ہو۔ تم ایک بے قصور نوجوان کو قتل جیسے سنگین جرم میں پھنسا رہے ہو، کیوں؟ اور اس سے یہ پاور آف اٹارنی کیوں لے رہے تھے؟ میں تمہیں آفتاب غنی کے قتل میں گرفتار کرتا ہوں۔ تم نے پہلے چوکیدار کی چھٹی کی، پھر آفتاب صاحب کو قتل کیا اور مسز آفتاب کے ساتھ مل کر

ہسپتال جانے کا ڈراما ایج کیا۔ آفتاب کی وصیت کے بارے میں صرف تم جانتے تھے کہ اس نے پوری جائیداد اسد کے نام لکھ دی ہے۔ اس لیے تم نے مسز آفتاب کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔ تمہارا پلان تھا کہ آفتاب کی لاش کو کہیں پھینک دو گے اور اسد سے پاور آف اٹارنی لے کر ساری جائیداد اور انشورنس پالیسی پر قبضہ کر لو گے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔۔۔۔۔ انسپکٹر۔۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔ یہ لڑکا بہت حرا مزادہ ہے۔۔۔۔۔ قتل اس نے کیا ہے۔“ زبیری چیخا رہا۔

انسپکٹر اسے گرفتار کر کے باہر کی طرف چلا، پھر بولا۔

”تمہاری گاڑی کی چابی کہاں ہے؟“

”میری جیب میں ہے۔“

اس نے سپاہی سے کہا۔ ”احمد خان! اس کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالو اور اس کی تلاشی لو۔“

احمد خان نے گاڑی کی تلاشی لی پھر ڈکی کھولی تو اس میں سے آفتاب کے کپڑے برآمد ہوئے۔ اس میں ادنیٰ ٹوپی، ادور کوٹ، سوٹ اور تولیا بھی تھا۔

زبیری نے نفرت اور غصے سے اسد کو دیکھا۔

”احمد خان! ان سب چیزوں کو سیل کرو اور پولیس اسیشن پہنچو۔“ انسپکٹر نے زبیری کو پولیس موبائل میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اسد بیگلے پر نیارنگ کر رہا تھا۔ اس نے انشورنس کی رقم ملتے ہی اس بیگلے کا قرض ادا کر کے اس کے کاغذات واپس لے لیے تھے۔ اب وہ بنگلا اس کا تھا۔ نہ صرف وہ بنگلا بلکہ پچاس کروڑ روپے اور تین کاریں بھی۔

اچانک وہاں ایک رکشا آ کر رکا۔ اس میں سے شبو اتری اور بولی۔ ”اوہو، نیارنگ وروغن ہو رہا ہے؟“

اسد بری طرح چونک اٹھا کیونکہ اس نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

”حیران مت ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے انگلش لینگویج کا کورس کر رکھا ہے اور انگلش اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اور میڈم جو باتیں کرتے تھے میں سب سنتی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم یہ سب کچھ اکیلے ہڑپ کر جاؤ گے۔“

”نہیں، تم بھی میرے ساتھ ہی ہڑپ کرو گی۔“ اسد مسکرایا اور بولا۔ ”مجھ سے شادی کرو گی؟“

”اب تم خوشامد کر رہے ہو تو مجبوری ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسد بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔